allurdupdfnovels.blogspot.com

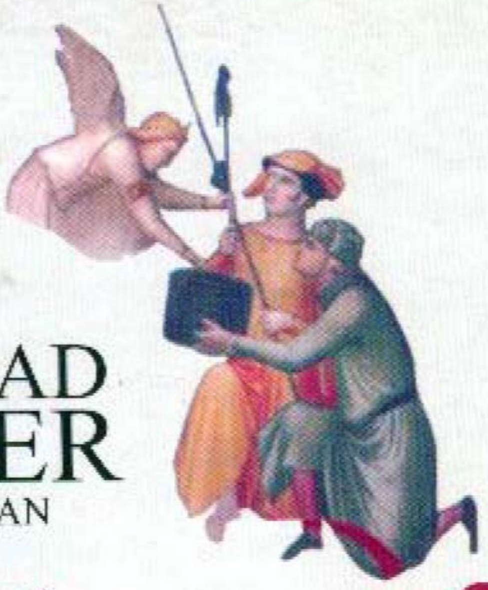

GOOD AND BAD POWER

GEOFF MULGAN

اچھی اور بری حکومت

جیف ملگن

ترجمہ۔ حنیف کھوکھر

مشعل

allurdupdfnovels.blogspot.com

1

اچھی اور بری حکومت

جیف مُلگن

ترجمہ: حنیف کھوکھر

مشعل
آر۔ بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600 ' پاکستان

allurdupdfnovels.blogspot.com

اچھی اور بری حکومت

جیف مُلگن
ترجمہ: حنیف کھوکھر

کاپی رائٹ اردو© مشعل 2010
کاپی رائٹ © جیف مُلگن 2006

ناشر: مشعل
آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور-54600، پاکستان
فون وفیکس: 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk

allurdupdfnovels.blogspot.com

فہرست

باب 1: اچھی حکومت کی تعریف 7
اقتدار کے متعلق کیسے سوچا جائے 10
دلیل کی شکل 19
باب 2: ریاست کے ماخذ 23
حکومت کی جڑیں 25
ریاستوں پر قبضے کی کوششیں 26
ریاستوں کی ضرورت اور دیگر لوگوں کے پیدا کردہ مسائل 31
تشدد، زر اور اعتماد 34
باب 3: تیز تر ارتقاء 40
علم اور روابط 42
خدمت کے نظام جمہوری فلاحی سرمایہ داریت کا عروج 49
دنیا کا غیر ہموار اخلاقی جغرافیہ 53
اخلاقی ترقی 55
باب 4: خادم ریاست 57
حفاظت کی ذمہ داری 59
فلاح و بہبود کی ذمہ داری 64
انصاف فراہم کرنے کی ذمہ داری 70

allurdupdfnovels.blogspot.com

صداقت اور علم کی ذمہ داری 72

خدمت کا مفہوم 74

عمرانی معاہدے 80

ریاستوں اور لوگوں کا انحصار باہمی 82

خوشی اور ضروریات کی یکسانیت 85

انسانی ضروریات اور ریاست کا کردار 89

خاندان بطور استعارہ 82

باب 5: ریاست بطور ملکیت 97

جنگ اور تسلط 110

چاروں ذمہ داریوں کا تاریک پہلو 116

باب 6: خود غرض ریاست 118

ریاست بطور ایک عالمگیر مشین 119

افسانے اور جواز 129

ثبات کی جستجو 133

اطاعت اور شناخت 145

باب 7: اخلاقی اہداف اور اخلاقی طریقے 156

ریاستوں کی انوکھی اخلاقیات 165

وفاداریوں کا تصادم 171

ذرائع کی دبدھا 175

شیطانی دلیلیں 179

باب 8: بغاوت اور انقلاب 183

باب 9: گرم اور سرد جمہوریت 197

جمہوریت مخالف دلیلیں 199

allurdupdfnovels.blogspot.com

طاقت کو روکنے کی تدابیر 201
مقابلہ 202
اصول وضوابط 205
تقسیمیں 209
نموداری 215
ہنگامی اختیارات 218
نمائندگی 219
مساوات اور جمہوریت کا مخلوط ارتقاء 227
چندسری نظام حکومت 234
ایسی چیز جو خود اپنے افعال پر حکومت کرتی ہے 236
باب 10: بیگانگی اور چکر 238
باب 11: عادات بنانے والی اخلاقیات 249
اقتدار کی تحریصات اور برائیاں 251
لیڈروں کی اخلاقیات 255
سرکاری اخلاقیات 261
اخلاقی رویے کیسے سیکھے جا سکتے ہیں؟ 265
اخلاقی گونا گونی اور اتحاد 267
اقتدار بطور عطیہ 270
باب 12: شہری کومٹ منٹ 275
مجہول سیاست کا عدم استحکام 278
بے اقتداروں کا اقتدار 281
جمہوریت بطور مکالمہ 285
عمل بطور دلیل 288
مشروط حقوق 293
ریاست بطور انفراسٹرکچر 298

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 13: بے چینی پیدا کرنے والا علم بطور وسیلہ تجدید 306
سچائی کے متعدد راستے اور رواداری 307
شفاف اور با اخلاق ذرائع ابلاغ 312
ریاستوں کا انحصار علم پر 317
توثیق اور ثالثی 323
تجزیہ اور اختراع ریاست بطور لیبارٹری 325
باب 14: کیا کوئی حکومت پوری دنیا کی خدمت کر سکتی ہے؟ 329
جدید قومی ریاست کے دو رخ 329
ریاست کا سرحدوں سے باہر دائرہ اختیار 340
عالمی حکومت 347
استعماریت کے بعد کی دنیا 351
چاروں ذمہ داریاں اور عالمی حکومت 355
عالمی تحفظ 356
عالمی بہبود 359
عالمی انصاف 359
عالمی علم 360
مشروط عالمی شہریت 364
باب 15: مستقبل کی خدمت 368
باب 16: ریاست بطور فن پارہ 375
خدمت کے سات ابہامات 377
اچھی حکومت کی آنک 379
اخلاقیات اور بدلاؤ 380
خلاصہ کلام 382
حواشی 387

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 1

اچھی حکومت کی تعریف

''کسی بھی سیاسی نظام کو ایک حادثے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ فی الواقع آزمائش و خطا کے طویل عمل سے سلامت بچ نکلنے والے رسوم و رواج، عادات وتعصّبات اور اصولوں اور بدلتے ہوئے حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسلسل ردعمل کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اگر مجموعی طور پر یہ نظام ٹھیک کام کرتا دکھائی دے تو اسے ہم ایک خوشگوار حادثہ تعبیر کرتے ہیں۔ کسی معاشرے، اس معاشرے کے تمام اداروں، اس کے پورے کردار اور اس میں وضع پانے والی انسانی اصناف کا اصل دارومدار حکومت اور سیاسی نظام پر ہوتا ہے''۔ (1)

(ایڈورڈ بین فیلڈ)

گذشتہ صدی کے دوران حکومتوں نے ہم پر یہ بات اچھی طرح آشکارہ کر دی ہے کہ وہ خیر وخرابی، دونوں کے فروغ میں کس قدر اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اسی لیے لوگ اس قدر دلچسپی سے ان کا مطالعہ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اتنے زیادہ افراد یہ جاننے کی جستجو کرتے ہیں کہ حکومتیں کیسے عمل کرتی ہیں، کیسے سوچتی ہیں، وہ ہمیں کیسے تبدیل کرتی ہیں اور انہیں تبدیل کیونکر کیا جا سکتا ہے۔

مشہور زمانہ ڈرامہ نگار سیموئل بیکٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''دنیا میں اشکوں کی تعداد ایک سی رہتی ہے''۔ مطلب اس کا یہ کہنے کا ہے کہ حکومتیں یا کوئی ادارہ انسان کے دکھ کو کم کرنے کیلئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تاہم اگر تاریخ انسانی کو سامنے رکھ کر اس ''حکمت پارے'' کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

تجزیہ کیا جائے تو یہ بات درست محسوس نہیں ہوتی۔ انسان نے ایسے زمانے بھی دیکھے ہیں جب زیادہ لوگوں کے ہونٹوں پر مسکان تھی یعنی اکثریت خوشحال تھی اور ایسے برے دن بھی آتے ہیں کہ زیادہ لوگ روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔[2]

یہ فرق کیسے پیدا ہوتا ہے؟

ہماری خوشی کا سارا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ ہمیں وراثت میں کیا ملا ہے، ہمارا کردار کیا ہے، ہمیں رشتے میں کیسے لوگ ملے ہیں اور ہم کہاں اور کن حالات میں پیدا ہوئے ہیں اور پھر یہ بھی کہ ہمارا نصیب کیسا ہے۔[3] لیکن شہروں اور قوموں میں انسانی خوشی کیلئے سب سے زیادہ اہم جو بات ہوتی ہے وہ آب و ہوا یا آس پاس کے قدرتی مناظر، اچھے یا برے جین یا قومی کردار[4] نہیں ہوتے بلکہ وہاں جاری حکومت کا معیار ہوتا ہے اور یا پھر یہ بات اہم ہوتی ہے کہ وہ لوگ اپنے افعال اور رویوں کو کس حد تک کسی قاعدے یا نظام میں لا سکتے ہیں۔ خواہ افراد کے ذاتی اوصاف جیسے بھی ہوں، اگر ان کے ہاں امن و انصاف کا دور دورہ ہے، قانون اور حقوق انسان کو بالا دستی حاصل ہے اور انہیں اچھے حکمران میسر ہیں تو ان کی زندگی میں بہتری کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور آمریت کے ماحول میں زندگی بسر کرنیوالے افراد یعنی ایسے ماحول کہ جس میں قوانین وحقوق کو اہمیت نہیں دی جاتی اور جہاں اچھے اور دیانت دار افسروں اور حاکموں کا فقدان ہوتا ہے، کی زندگی بری ہونے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔[5]

انسان کی خوشی کیلئے ریاستیں کس درجہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، اس کا اندازہ ان اولین ریاستوں کی طرف دیکھ کر کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے شہروں کی حفاظت کے لئے تدابیر کیں اور شہریوں پر ٹیکس لگائے، لیکن اب یہ حقیقت اور بھی عیاں ہو کر سامنے آ گئی ہے کیونکہ اب ریاستوں کی خیر یا خرابی پھیلانے کی طاقت پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ کرغیزستان سے لے کر کینیڈا اور کوریا تک اب یہ ریاست کے اوصاف ہی ہیں جو لوگوں کی خوشحالی کا تعین کرتے نظر آتے ہیں، تیل، سونا یا جوہرات نہیں کیونکہ تیل، سونے یا ہیروں سے لوگوں کو راحت کم ملی ہے اور ان سے آفت زیادہ ان کے حصے میں آئی ہے۔ ثقافت اور مذہب کو بھی وہ وقعت نہیں دی جا سکتی جو کہ ریاست وحکومت کو حاصل ہے کیونکہ وہ بھی اکثر معاملات کی غلط تشریحات اور توضیحات کرتے نظر آتے ہیں۔[8]

allurdupdfnovels.blogspot.com

حال ہی میں دنیا کے پچاس ملکوں سے اعداد و شمار حاصل کر کے ایک تجزیہ مرتب کیا گیا ہے جس میں مختلف علاقوں اور معاشروں میں پائے جانے والے خوشی و مسرت کے مختلف درجوں اور ان کے تعین میں اہم کردار ادا کرنے والے عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس تجزیے جسے کہ ہم اب تک کیا جانے والا بہترین تجزیہ قرار دے سکتے ہیں، کے مطابق عوام کی خوشی و خوشحالی پر اچھی حکومت جس قدر زیادہ اثرات مرتب کرتی ہے وہ ان اثرات سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہیں جو کہ اچھی تعلیم، اچھی آمدن اور بہتر صحت سے مرتب ہوتے ہیں، کیونکہ یہ سب چیزیں خود بھی معیارِ حکومت کی مرہون منت ہوتی ہیں۔[9] یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ جمہوری حکومتیں آمریتوں سے بہت زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں اور عوام سے ڈرنے والی ریاستیں عوام کو ڈرانے والی ریاستوں کی نسبت زیادہ خیر بانٹ رہی ہیں اور خلق خدا کی خوشحالی میں زیادہ بہتر کردار ادا کر رہی ہیں۔

اچھی حکومت اور بری حکومت کے درمیان فرق کی بہترین عکاسی معروف مصور آمبروجو لورینزیٹی نے اپنی تصویری تخلیقات میں کی ہے جو اس نے سی اینا میں پلازو پبلکو کی فرمائش پر جدید دور کے آغاز میں تیار کی تھیں۔ ان تصاویر میں اچھی اور بری حکومت کی تمثیل پیش کی گئی ہے۔ جس دیواروں پر اچھی حکومت کو پیش کیا گیا ہے ان میں کلاسیکی خوبیوں سے متصف ایک حکمران دکھایا گیا ہے جس میں سے دو ڈوریاں نکل کر شہریوں کے ہاتھوں سے گزرتی چلی جاتی ہیں (جس سے ایک رضا کارانہ سیاسی نظام دکھانا مقصود ہے) اور پھر یہ ایک ایسی شخصیت کی طرف چلی جاتی ہیں جو عدل و قضا کی نمائندگی کرتی ہے۔ مزید برآں اس میں ایک خوشحال اور بھرے پرے قصبے کو دکھایا گیا ہے جس کے بازار مال سے لدے ہیں اور لوگ ہاگ ہنسی خوشی اپنے اپنے کام کی طرف رواں دواں ہیں۔ دیواروں سے پرے ایک خوبصورت مضافاتی منظر ہے۔ یہ ایک فلاحی نظام کا وژن ہے جو حکام اور رعایا کے درمیان اشتراک، انصاف اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ اس کے مقابل میں بری حکومت کی تمثیل دکھائی گئی ہے۔ اس تصویر میں ایک شیطان صفت مورکھ کو حکومت کرتے دکھایا گیا ہے، عدل کا کوئی پرسان حال نہیں اور بیماری، قتل و غارت اور قحط نے ملک کا ستیاناس کیا ہوا ہے۔

یہ تصاویر ایک فلسفہ اور ایک وژن پیش کر رہی ہیں۔ فلسفہ ان میں یہ ہے کہ ریاست

allurdupdfnovels.blogspot.com

کی حکومت کا مطمح نظر فلاح عامہ ہونا چاہیے بجائے اس کے کہ اس کا مرکز بادشاہ یا شہنشاہ کی ذات ہو۔ ان میں اس اصول کی عکاسی بھی کی گئی ہے کہ ریاست کی آزادی کا انحصار اس کے شہریوں کی آزادی پر ہوتا ہے۔

لیکن یہ دیکھئے کہ آنیوالے دنوں نے لورنیزیٹی کی اچھی حکومت کی تمثیل کا کس بے دردی سے مذاق اڑایا۔ ہوا کیا کہ چند ہی سال بعد اس کے شہر کو طاعون نے آ لیا جس میں وہ بھی مارا گیا اور اس کا بیشتر خاندان بھی۔ سی اینا پر بیرونی حملوں کا سلسہ شروع ہو گیا جن میں سے بیشتر کے پیچھے سی اینا کے پرانے حریف فلورنس کا ہاتھ تھا۔ پھر اس مدنی جمہوریہ کی جگہ سفاک آمریت وجود میں آ گئی۔ وہ فلاحی نظام جس کی تصویر کشی لورنیزیٹی نے اتنے پیار سے کی تھی ملیامیٹ ہو گیا اور جمہوری حکومت کا تصور آئندہ کئی صدیوں تک ایک ناقص نظریے کے طور پر دیکھا جاتا رہا۔

سی اینا کے باسیوں نے سوچا کہ انہوں نے اس قدیم مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا ہے کہ اچھی حکومت کے خدوخال کیسے ہونے چاہئیں۔ اس مسئلے کو دو ہزار برس سے زائد عرصے تک فلسفہ سیاسیات میں ایک مرکزی مسئلے کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس سلسلے میں غور و فکر اور خیال آرائیاں عیسائیوں اور بودھیوں کی تحریروں میں بھی ملتی ہیں اور مسلمانوں کی تصنیفات میں بھی اور آزاد خیال، اشتراکی اور قدامت پسند دانشوروں کی کتابوں میں بھی۔

ان تحریروں میں ایک خاص بات جو ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ زمانے گزرے مگر دلائل کے ناک نقشے میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ایک فریق کہتا ہے کہ اچھی حکومت کا دارومدار بہترین افراد کے ہاتھ میں بہترین پالیسیاں دے کر انہیں حکمران بنانے پر ہے۔ یہ بہترین افراد فلسفی بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ افلاطون اپنی ''جمہوریہ'' میں کہتا ہے، بہت زیادہ دانا اور نیک لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ ہمیں ارسطو کی ''سیاست'' میں ملتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگ اقتدار میں آئیں جو ایسا معیار پیش کریں جسے دوسری اصناف کی حکومت کیلئے ایک کسوٹی کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

دنیا کی دوسری طرف یعنی چین و ہند میں بھی اسی نوع کے دعوے کئے گئے۔ چین دنیا کی وہ پہلی سلطنت تھی جس نے اس تصور کو رد کیا کہ حکمران محض آسمانوں سے ودیعت کردہ اختیار سے اپنے حسب نسب یا ہتھیاروں کے بل بوتے پر حکومت کرتے ہیں۔ 1000

allurdupdfnovels.blogspot.com

ق م کے لگ بھگ اسی بات کو تسلیم کیا جا چکا تھا (کم از کم نظریاتی طور پر) کہ حکمرانوں کو صرف اپنی ذاتی واخلاقی صفات کی بنا پر حکمرانی کرنا چاہیے اور اگر وہ ان اخلاقی خوبیوں سے عاری ہو جائیں تو عوام کو حق حاصل ہے کہ وہ انہیں چلتا کریں۔ بعدازاں ان سے ملتے جلتے دلائل نے ہندوستان کی سرزمین میں بھی جڑیں پکڑ لیں اور گوتم بدھ کو تو اس بات سے صاف انکار تھا کہ حکمران کے تعین میں دیوتاؤں یا حسب نسب کا بھی کوئی کردار ہونا چاہیے۔ اس کے بجائے کسی حکمران کیلئے کردار کی پاکیزگی اور نیکوکاری ہی اولین و واحد سند تھی جس کی بنا پر وہ خود کو مسند اقتدار پر قائم رکھ سکتا تھا۔

تاہم ہر تہذیب کے مفکرین نے اس امر کو بھی تسلیم کیا کہ قائدین کی انفرادی نیکوکاری ہی ہر مسئلے کا حل نہیں ہو سکتی اور یہ ہر جگہ کارگر نہیں رہتی۔ لیڈروں کے اخلاق پر اس قدر انحصار سے لوگ مغالطے میں آ کر رویوں کو حالات سے منسوب کرنے کے بجائے لوگوں کے کرداروں سے منسوب کرنے لگتے ہیں۔ ارسطو کا موقف تھا کہ اگرچہ حکمران کے نیک کردار کو اچھی حکومت کی واحد اور بہترین ضمانت قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ سب سے قابل اعتماد بھی یہی چیز ہےلیکن اقتدار حکمرانوں کو بگاڑ بھی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک بہترین شخص بھی خراب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا لیڈروں کی ذاتی صفات اور ان کی کامیابی کے درمیان کبھی کوئی سادہ تناسب یا ربط ممکن نہیں ہوتا۔ (سابق امریکی وزیر خارجہ جارج شلز اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں کہ یہ بات کبھی ان کے پلے نہیں پڑی کہ صدر ریگن اتنی کم علمی کے باوجود اس قدر زیادہ کامیابی کیونکر حاصل کر پائے) لہٰذا اچھی حکومت کی بہتر ضمانت ان قوانین کی حکمرانی ہی تھی جو لوگوں کے وسیع تر مفادات کو تحفظ دے سکیں۔ کیونکہ کوئی بھی حکمران، خواہ وہ کتنا ہی ذہین و فطین کیوں نہ ہو، ایسے قوانین وضع نہیں کر سکتا کہ وہ ہمیشہ اس کے مفادات کی آبیاری کریں۔[10] یہ قوانین اختیارات و اقتدار کی اس طرح کی تقسیم کی ضمانت دے سکتے ہیں جیسی کہ جمہوریہ روم میں دیکھنے کو ملی۔ بظاہر آنکھوں کو بیہودہ محسوس ہونے والے مناصب وودر جات کی بھرمار نے کامیابی سے بادشاہت کے متبادل کا مقابلہ کیا۔ قوانین شہروں کے الحاق (کنفیڈریشن) کو چلا سکتے ہیں اور یہ قدیم ایتھنز کی طرح حاکمیت یا خود انتظامی عوام کو بھی تفویض کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد کی دو ہزار سالہ تاریخ ان دلائل کے ناک نقشے میں بمشکل ہی کوئی تبدیلی

allurdupdfnovels.blogspot.com

پیدا کر پائی ہے۔ ہم اب بھی حکومت کیلئے اچھے افراد کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور ہم آج بھی قوانین سے یہ توقع وابستہ کرتے ہیں کہ وہ بدمعاش اور بد دیانت افراد کو لگام دے سکتے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ حکومتوں کو درپیش بنیادی امور میں بھی کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ لوگوں کو اپنے تحفظ، بہبود اور عدل و راستی کے نفاذ و بالا دستی کیلئے ریاستوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ان امور کی انجام دہی میں موجودہ دور کی ریاستوں کو بعض ایسی ہی پیچیدگیوں اور مشکلات کا سامنا ہے جیسا کہ ان سے پہلے کی ریاستوں کو تھا۔ سب کو اپنی حاکمیت قائم رکھنے کیلئے طاقت اور بعض دفعہ فریب سے کام لینا پڑتا ہے، سب کو معاشی خوش حالی کیلئے تگ و دو کرنا پڑتی ہے تا کہ وہ افواج اور شاہراہوں کیلئے ٹیکس اکٹھے کر سکیں۔ عین اسی طرح جیسے ہزاروں برس قبل ان کی پیش رو ریاستیں کرتی تھیں۔ سب کو اپنی حدود و قیود میں رہنا پڑتا ہے اور ان افراد کی زندگیوں میں بیجا دخل اندازی سے پرہیز کرنا پڑتا ہے جن کی خدمت کیلئے وہ وجود میں آتی ہیں، اور سب کو غیر مقبول کارروائیاں کرتے وقت اپنا قانونی جواز برقرار رکھنا پڑتا ہے۔

ناول نگار کارلوس فینٹس کہتا ہے کہ سیاست نام ہے منہ بگاڑے بغیر مینڈک کھانے کا۔ یہ بات قدیم بادشاہوں پر بھی اتنی ہی صادق آتی ہے جیسے کہ جدید وزرائے اعظم پر۔

زیر نظر تصنیف دونوں قسم کی چیزوں سے بحث کرتی ہے، وہ چیزیں جو تبدیل ہو گئی ہیں اور وہ جو ابھی ویسے کی ویسے ہیں۔ یہ اخلاقیات کو بھی خاطر میں لاتی ہے لیکن اس کے وسیع ترین مفہوم میں، یعنی حکومتوں کو کیا کرنا چاہیے، انہیں اپنے شہریوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے، انہیں جنگ کیلئے کب کمر بستہ ہونا چاہیے، اور انہیں کب دیانت دار یا فریبی، وفا شعار یا بے ایمان ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں یہ کتاب حکومت و ریاست کے ضمن مین ''اچھائی'' کے جتنے مفاہیم ہو سکتے ہیں ان پر بھی بحث کرتی ہے۔

ان مسائل کو سمجھنے کیلئے میں نے بہت سے ذرائع سے استفادہ کیا ہے۔ پہلا ذریعہ تو ادب ہے۔ حکومت و اقتدار پر اتنا زیادہ ادب لکھا گیا ہے کہ اس کا احاطہ کرنے کیلئے کئی زندگیاں درکار ہیں۔ مجھے چیزیں بہت چن چن کر پڑھنا پڑیں۔ تاہم اس مفروضے پر عمل کرنے کے بجائے کہ جدید مغربی دنیا ہی اچھی حکومت سے متعلق تمام دانش و بینش کی اجارہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

دار ہے میں نے دانستہ دنیا کے مختلف علاقوں اور خطوں کے ادب وفکر سے اکتساب کیا ہے اور تہذیب انسانی کے مختلف زمانوں اور ادوار کا تجزیہ کیا ہے ۔ انسان خطا کر سکتا ہے اور اتنے زمانوں اور خطوں کے ادب کو استعمال کرتے وقت غلطیوں کا احتمال بھی زیادہ ہوتا ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ بعض مہربان میری تاویلات و تفاسیر سے اختلاف کریں یا یہ انہیں معتبر محسوس نہ ہوں لیکن میرے پاس جواز یہ ہے کہ میرا تحقیقی انداز ان نقوش کو نمایاں کر کے سامنے لائے گا جو کہ ابھی تک لوگوں کی نظروں سے چھپے رہے ہیں اور یہ ایسے وقت میں جبکہ چین اور ہندوستان ایک مرتبہ پھر سپر پاور بن کر عالمی قیادت کا منصب اپنے ہاتھ میں لینے والے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ مغرب کی سیاسی فکر ان کی روایات سے زیادہ دیر تک غفلت برتتے رہنے کی متحمل ہو سکتی ہے۔

میرا دوسرا بڑا ذریعہ میرا تجزیہ ہے۔ میں نے اپنے کیریئر کے دوران ایک لوکل گورنمنٹ آفیسر، سماجی کارکن، وکیل، پارلیمانی اہلکار اور بعد میں وزیر اعظم کے مشیر اور ایک سینئر سول سرونٹ کے طور پر کام کیا ہے۔ میں نے دنیا کے بہت سے ممالک کی سیاحت کی ہے اور ان کی حکومتوں کیلئے کام کیا ہے۔ میرے مشاہدے میں ایسے بہت سے لوگ بھی آئے ہیں حکومت کے زیر اثر جن کی زندگیون میں مثبت تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور میں نے متعدد ایسے دیانتدار اور متعین سرکاری افسروں کی صحبت میں بھی کام کیا ہے جو ذاتی اغراض کو بالائے طاق رکھ کر لوگوں کی حالت سنوارنے کیلئے جدو جہد کرتے رہتے ہیں۔ اور ہاں میں نے حکومت کے تیرہ و تار پہلوؤں کو بھی خوب اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔ حکومتیں لوگوں کو حل طلب مسائل کے طور پر دیکھتی ہیں اور وہ فعال تشکیک پر سپاس مجہول کو ترجیح دیتی ہیں، ایسا کئے بغیر ان کا گزارہ نہیں۔ [12] ممکن ہے کہ وہ ٹی وی ، رسالوں اور فلموں میں حکومت کے بارے میں دکھائے جانے والے خاکوں اور کارٹونوں سے زیادہ مشابہ نہ ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ زیادہ حکومتوں کا جھکاؤ معاشرے کے امیر اور طاقتور افراد کی طرف ضرور ہوتا ہے اور اکثر حکومتوں میں ایسے سازشی عناصر ضرور ہوتے ہیں جن کا مشغلہ جوڑ توڑ اور لوٹ کھسوٹ ہوتا ہے، جو اپنے اخلاقی پیمانے بھول جاتے ہیں اور جو حد درجہ تلخ و ترش انداز سے اپنے اقدامات اور اپنے آپ کو قائم رکھنے اور اقتدار کو طوالت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

یہ کتاب ایک دوہرے انقلاب کے ردعمل کے طور پر لکھی گئی ہے اور اس کیلئے تحریری ذرائع اور براہ راست تجربے دونوں سے اکتساب کیا گیا ہے۔ ایک انقلاب نے تو اس طریق کار کو تبدیل کیا ہے جس سے قوموں پر حکومت کی جاتی ہے۔ آج کے دور میں ہمیں خود ساختہ سلطنتیں، فلسفی بادشاہ یا اشرافیہ حکومتیں نظر نہیں آتیں۔ موجودہ مطلق العنان حکومتوں کو ماضی کی مطلق العنان حکومتوں کا محض ایک خفیف سا پرتو ہی قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ فوجی آمریت کا بھی اب فیشن نہیں رہا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت سو سے زائد جمہوری ریاستیں کام کر رہی ہیں (اس میں بلغاریہ کو بھی شامل کر لیجئے جہاں کچھ عرصہ کیلئے ایک سابق بادشاہ کو بھی حکومت کرنے کیلئے منتخب کیا گیا) اسی طرح فرماں روائی اور حکومت کے ادارے میں بعض نئی اختراعات بھی مشاہدے میں آ رہی ہیں مثلاً یورپی یونین کا قیام۔

بادشاہت، فاشزم اور کمیونزم کے مقابلے میں نمائندہ جمہوریت کے فوائد واضح نظر آتے ہیں۔ اگرچہ جمہوریتوں میں بھی ہمیں بہت سے ست اور خود غرض سرکاری افسر ملتے ہیں لیکن ظلم، حرص، جھوٹ اور تشدد جیسی طاقت و اقتدار کی وہ پرانی بیماریاں اب کم ہو گئی ہیں۔ تاہم منگولیا اور مڈغاسکر جیسے مختلف خطوں تک جمہوریت کے پھیلاؤ سے اس نظام کی کشیدگیاں اور اخلاقی تضادات بھی زیادہ واضح ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ بہت سے قدیم فلسفی متنبہ کرتے ہیں، جمہوریت بڑی آسانی سے پاپولزم، تعصب اور حقیقی و تصوراتی دشمنوں کی تلاش پر اتر سکتی ہے اور اس کی آڑ میں آمرانہ حکومتیں اور وسیع ناہمواریاں پنپ سکتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ بڑی آسانی سے اپنی ہی توانائیاں سلب کر کے ایک منحوس سی تقدیر پرستی کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ عالمی معاشرے کی ایک بڑی اکثریت اب جمہوریت کو حکومت کی بہترین شکل تصور کرتی ہے لیکن اتنی ہی بڑی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ سیاسی رہنما بے اخلاق اور بد یانت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی بڑی جمہوری ریاستوں میں بسنے والی بڑی اقلیتیں یہ محسوس کرنے لگی ہیں کہ ان کی حکومتیں عوام کی خواہشات کی صحیح نمائندگی نہیں کر رہیں۔ لگتا ہے کہ حالیہ صدی کے اہداف میں ایک بڑا ہدف یہ بھی ہو گا کہ جمہوری نظام کی خامیوں اور کمزوریوں کا علاج کیسے کیا جائے اور جمہوریت کو اس کے داخلی قابل تجدید ذرائع توانائی کیسے بہم پہنچائے جائیں۔ یہ ایسے کام ہیں جن کے بارے میں ہمیں ماضی سے کوئی واضح رہنمائی نہیں ملتی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دوسرا انقلاب عالمگیر ہے۔ آج سے کوئی پانچ ہزار قبل مشرقی چین اور شرق الاوسط کے اس علاقے میں جسے ''ہلال زرخیز'' کا نام دیا گیا ہے، بڑھتی ہوئی اور گنجان سے گنجان تر ہوتی آبادیوں نے اس ضرورت کو جنم دیا تھا کہ ریاستیں تشکیل دی جائیں۔ آج کا نیوکلیائی پھیلاؤ، تغیر آب و ہوا، غربت و امراض جیسے مسئلے اور عالمی پیمانے پر بڑھتا ہوا باہمی انحصار بھی اس دور میں وہی کام کر رہے ہیں۔ اور ایک عالمی پیمانے کی اتھارٹی کے بغیر ان مسائل کا حل ممکن نظر نہیں آتا۔ موجودہ عالمی اداروں میں وہ کس بل نظر نہیں آتا کہ وہ ان مسائل کے تدارک کیلیئے کوئی خاص کارکردگی دکھا سکیں۔ ان عالمی اداروں کی ان بڑے ملکوں سے تنگ و دو چل رہی ہے جو خود کو بین الاقوامی قوانین کے تابع کرنے میں متأمل نظر آتے ہیں۔ موثر عالمی اداروں کی تشکیل اس صدی کا ایک اور بڑا ہدف ہوگا اور اس کیلیئے بھی ہم ماضی سے کوئی خاص استفادہ نہیں کر سکتے۔

میرا مؤقف ہے کہ قومی یا عالمی سطح پر حکومت کی کارکردگی کو خدمت کی عینک سے ہی بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مغرب کا بیشتر سیاسی فلسفہ افراد سے شروع ہوتا ہے اور پھر اس بارے میں نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ حکومتیں اور آئین کیسے تشکیل دیئے جائیں تا کہ افراد کے حقوق کو تحفظ دیا جا سکے اور انہیں ایک دوسرے سے بچایا جا سکے۔ میں حکومت کو ایک ایسے تعامل کے طور پر لیتا ہوں جس میں ہم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ادھوا اور پراگندہ تعامل ہے جو اپنی بہترین شکل میں خدمت اور بدترین شکل میں جبر و استبداد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ریاست کے تمام قوا اسی تعلق سے جنم لیتے ہیں اور یہ رعایا اور حکمرانوں کا باہمی انحصار ہی ہوتا ہے جو کہ تمام تر سیاسی عمل کو اس کا امتیازی رنگ بخشتا ہے۔ قوانین اور دساتیر کو دیوتا یا فطری قوانین یا فطرت انسانی سے منسوب کرنا مآل کار پراگندگی کو جنم دیتا ہے۔ افرادی حقوق کو حکومت پر کوئی فوقیت حاصل نہیں بلکہ انہیں صرف اس تعلق کے ایک پہلو کے طور پر ہی سمجھا جا سکتا ہے جو لوگوں کا حکومت کے ساتھ ہوتا ہے اور ہماری بہت سی آزادیوں کی طرح ان کا دارو مدار حکومت کی ان کے دفاع کیلیئے طاقت استعمال کرنے کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ اس نظریے کے ڈانڈے کہ حکومت لوگوں کی خدمت کی ذمہ دار ہوتی ہے، ماضی بعید میں چین میں جنم لینے والے (آسمانی مینڈیٹ)، راج دھرم (بادشاہوں کے اخلاقی فرائض) اور ان مغربی دلائل سے ملتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اقتدار کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

دارومدار رعایا کی رضا مندی پر ہوتا ہے۔ تاہم یہ صرف پچھلی صدی میں ہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ریاستوں کو وہ آلات اور تکنیکیں میسر آئی ہیں کہ وہ حقیقی خادموں کا کردار ادا کر سکیں۔ ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ "انیسویں صدی کے اواخر سے قبل کوئی شخص بھی محکوم نہیں تھا"[13] اور ریاستیں پنشن اور صحت عامہ کی خدمات، امن و امان قائم رکھنے کیلئے پولیس یا فضا اور پانی کو محفوظ رکھنے کے ضوابط کے متعلق سوچنے کے قابل لاکھوں افراد کی زندگیوں کے سروے، نگرانی اور اصلاح کے ذرائع میسر آنے کے بعد ہوئیں۔

یہ تبدیلیاں بہت اچھی ہیں لیکن اگر ہم حکومت کے خادم ہونے کی بات کریں تو ان کے اس منصب میں بہت سے ابہام بھی موجود ہیں اور یہ ابہام حکومتوں کے اختیارات میں اضافے کیساتھ مزید شدید ہو گئے ہیں۔ اچھی حکومتیں عوام کے خادم کا کردارادا کرتی ہیں لیکن جب وہ ٹیکس اکٹھے کرتی ہیں اور قوانین بناتی ہیں تو وہ ان لوگوں کے آقا کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں جن کی خدمت کیلئے وہ تشکیل میں آتی ہیں۔ حکومتوں کے ایسے مفادات بھی ہوتے ہیں جو عوام کے مفادات سے مختلف ہوتے ہیں۔ تمام حکومتیں ایسے طریقے بروئے کار لاتی ہیں جو غیر شخصی، تجریدی اور سرد مہرانہ ہوتے ہیں۔ یقیناً ہم ایسی باتیں اور رویے خدام سے توقع نہیں کر سکتے اور پھر یہ بھی ہے کہ تمام حکومتیں کسی نہ کسی مقام پر آ کر وہ اصول معطل کر سکتی ہیں جو ان پر نافذ ہوتے ہیں۔ ان ابہاموں کی تحقیق و تفہیم حساس سیاست کی شرط اولین ہے، خواہ کوئی انقلابی اصلاحات لانا چاہتا ہو یا قدامت پسندانہ احتیاط کی پالیسی پر گامزن ہو۔

اقتدار کے متعلق کیسے سوچا جائے

پاسکل نے ایک جگہ کہا کہ تصویروں کو نہ تو بہت قریب سے دیکھنے میں مزہ ہے اور نہ ہی زیادہ دور سے دیکھنے میں، صرف ایک خاص ناقابل تقسیم نقطہ ایسا ہوتا ہے جسے ہم مناسب مقام کہہ سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے تصویروں کے معاملے میں تناظر کے اصول اس بات کا تعین کرتے ہیں لیکن سچائی اور اخلاق کے معاملے میں اس کا فیصلہ کیسا ہو گا؟

اقتدار و حکومت سے بحث کرنے والے لکھاریوں کو مستقل یہ مسئلہ درپیش رہا ہے، وہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

مناسب فاصلہ کیا ہو کہ سطحیت اور ظاہر کی بجائے داخلی اسباب و علل سمجھ میں آنے لگیں۔ ریاست وحکومت کے بارے میں لکھا جانے والا بیشتر ادب ناقص ہے کیونکہ یہ محدود تناظر میں لکھا گیا ہے۔ بڑے لوگوں کے سوانح اور تزکیں عموماً بہت قریب سے مشاہدہ کرتی ہیں جبکہ وہ تجزیات جو اندر گہرائی کی قوتوں اور نا قابل مفر منطقوں اور ساز باز، فریب اور بے وفائی کی کہانیوں اور بہادری کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں عموماً چیزوں کو بہت فاصلے سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

مغرب کے بیشتر سیاسی فلسفے نے معاملات کو کسی مقام تفوق پر کھڑے ہو کر جانچنے کوشش کی ہے اور نیچے دیکھتے ہوئے حکومت کی کوئی حتمی وضاحت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً تاریخ کے دوش پر سفر کرتی عقل، طبقاتی کشمکش، انسانی ارادہ یا طاقت کے حصول کی خواہش یا جبلتوں کا کوئی اور مجموعہ۔ اس کا بیشتر حصہ استخراجی ہے جس تک حکومت اور اس کی اخلاقیات کے متعلق اولین اصولوں کی مدد سے پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جدید دور کے قارئین کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ سترھویں اور اٹھاوہویں صدی میں یہ ایک عام عقیدہ تھا کہ علوم فطری کی نسبت سیاسیات اور اخلاقیات علم کی زیادہ ٹھوس اور ارضی شکلیں ہیں۔ لیکن حکومت سے متعلق ٹامس ہابز یا جان لاک جیسے جدید سیاسیات کے آبا کے دلائل مشاہدے یا تجربے پر مبنی نہیں تھے۔ اس کی بجائے وہ ان فطری قوانین سے اخذ کئے گئے تھے جو خدا نے اس دنیا کو ودیعت کیے اور ان استخراجات کو اس علم کی بنیاد بنایا گیا جسے امور انسانی کا علم گردانا گیا۔

کوٹلیہ، کنفیوشس اور ارسطو سے لے کر میکیاولی تک بیشتر مفکرین اس سے زیادہ نتائجیت پسند تھے۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے کسی نہ کسی حکمران کے ساتھ بطور مشیر کام کیا۔ ایک روایت کے مطابق کوٹلیہ نہ صرف مہاراجہ چندرگپت موریہ کا وزیر اعظم تھا بلکہ اس نے اس فرمانروا کو اپنا تاج وتخت حاصل کرنے میں بھی مدد دی[15] تو گم بدھ مگدھ کے حکمران بمبسار کے دربار کے ساتھ بطور مشیر منسلک رہا اور وہ اس قت کی شمالی ہند کی کئی ریاستوں سے بھی واقف تھا۔ ارسطو نو عمر سکندر کو اس کی عظیم فتوحات کیلئے روانہ ہونے سے قبل پڑھاتا رہا۔ افلاطون بھی کسی بادشاہ کے دربار سے منسلک ہونے کا متمنی تھا او وہ ایک مختصر عرصے کیلئے آمر ڈائیونائسس کے مشیر کے طور پر بھی کام کرتا رہا تاہم اس تعلق کے نتائج اس کیلئے

allurdupdfnovels.blogspot.com

خوشگوار نہ نکلے۔ کنفیوشس بھی کسی فرمانروا سے وابستگی چاہتا تھا لیکن ناکام رہا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں دہائی دیتا رہا کہ ''آہ کسی ذی عقل بادشاہ کو یہ سجھائی نہیں دیتا کہ مجھے اپنا اتالیق بنائے''۔ میکیاولی نے فلورنس کے پیروسوڈرینی کے سفیر اور پھر مشیر کے طور پر کام کیا (اگرچہ اس کی عظیم تصانیف میڈیچی کے اقتدار میں آنے کے بعد اس کے زمانہ بیروزگاری سے شروع ہوتی ہیں)۔

یہ سب کے سب دانشور حکومت و اقتدار کے معاملات سے آگاہ نظر آتے ہیں۔ اس لئے وہ استدلال استخراجی پر زیادہ بھروسہ کرنے سے کتراتے دکھائی دیتے ہیں۔۔ تب اور اب کے بہترین سیاسی مفکرین اس فہم کے حامل محسوس ہوتے ہیں کہ سیاست کا دارومدار بظاہر متناقض صداقتوں پر ہوتا ہے۔ امن جنگ پر منحصر ہوتا ہے، آزادی حدود و قیود پر، استحکام تغیر و تبدل پر، حریت تشدد پر اور تحفظ خوف پر، لہٰذا عظیم سیاسی مفکرین تجریدی منطق کو اپنے زمانے میں نظر آنیوالی بادشاہتوں اور جمہوریتوں کی سیاست و حکومت کی پیچیدگی اور بحران سے حاصل ہونیوالے مشاہدات و بصائر کا خمیر لگاتے رہے۔[16]

ایسا کرنے کی معقول وجوہات بھی موجود ہیں۔ عین اس وجہ سے کہ حکومت روزمرہ زندگی کے ہر دیگر پہلو سے اسی قدر مربوط ہے کوئی بھی واحد نظریاتی تناظر اس کی وضاحت کے وظیفے پر پورا نہیں اترتا۔ استخراج سے فکر بھٹک جاتی ہے اور سائنس حقیقی معاشروں اور لیڈروں کی اغراض یا پارٹیوں اور ریاستوں کی تنظیمی حرکیات کی نفسیاتی پیچیدگی کی کاملاً قابل اعتماد وضاحتیں پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس تحقیق میں بہت سے متغیرات سے واسطہ پڑتا ہے اور سماجی علم کے دیگر مناطق کی طرح ہم جو بھی سیکھتے ہیں وہ خود بھی اس تحقیق میں ایک علت کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ لہٰذا ایک ایٹم کی اندرونی حرکیات کا مطالعہ کرنے والے طبیعیات دان کی طرح ، ریاست کی حرکیات سے متعلق ہر نیا مشاہدہ بذات خود ریاست کی نوعیت میں تبدیلی کا باعث بنتا چلا جاتا ہے۔ حکومت زندگی کا ایک جزو ہے، اس سے جدا کوئی چیز نہیں۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے لئے کام کریں، ہم سے محبت کریں اور ہماری اطاعت کریں۔ ہر تعلق میں حکومت موجود ہوتی ہے۔ خواہ یہ تعلق والدین اور بچے کا ہو، دوست کا دوست سے، آجر کا اجیر سے یا عاشق کا معشوق سے۔[17] یہ داخلی پیچیدگی ہی وہ وجہ ہے کہ ہمیں کوئی باقاعدہ اور سکے بند علم ریاست نہیں ملتا اور بعض اوقات

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہمیں ایک ہی ریاست ایک ہی دن میں بہت سے مختلف نظریات پر عمل پیرا نظر آتی ہے:
اقتصادی نظریے جو کہ طبقاتی اقتدار پر زور دیتے ہیں، کثرتی نظریے جو اقتدار کیلئے مقابلے اور سیاسی پارٹیوں کے ذریعے عوامی شرکت پر زور دیتے ہیں اور منطقی نظریے جو ریاست کے رویے کی حکام اور ان کے اتحادیوں کیلئے انعامات زیادہ سے زیادہ کرنے کے وسیلے کے طور پر وضاحت کرتے ہیں۔ (18)

اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہم اچھی حکومت کی شرائط سرشت انسانی، عالمگیر حقوق یا نظریات سے متعلق قیاسات سے منطقی طور پر اخذ نہیں کر سکتے۔ بلکہ انہیں تجربے کی مشقت سے گزر کر سیکھنا پڑتا ہے۔ ہم کلیوں کی زبان ان اسباق کو قابل فہم بنانے کیلئے استعمال کرتے ہیں، شاید اس لئے کہ یہ اعتراف کہ امور انسانی کا کتنا بڑا حصہ فی البدیہ ہے بہت وحشت ناک امر ہے۔ یہ تحریری تصورات کارآمد اور افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں، نہ زیادہ نہ کم۔ روسو نے بہت خوب کہا ہے:

''لوگ ایسے اصولوں کی جستجو سے آغاز لیتے ہیں جن پر کہ وہ فلاح عامہ کی خاطر متفق ہو سکیں اور پھر وہ ان اصولوں کے مجموعے پر قانون فطرت کی اصطلاح جڑ دیتے ہیں حالانکہ ثبوت ان کے پاس کوئی نہیں ہوتا سوائے اس اچھائی کے جو وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے عالمگیر عمل سے منتج ہو گی''۔

چنانچہ پاسکل کے سوال کا جواب یہ نکلا کہ حکومت کے مشاہدے کیلئے کوئی فاصلہ بھی مناسب نہیں۔ زیادہ قربت بھی معذور کر سکتی ہے اور زیادہ دوری بھی۔ دور سے حکومت پر اسرار اور سازشوں سے پر دکھائی پڑتی ہے۔ نزدیک سے متعلقہ لوگ معقول، ہمدرد اور مجبور نظر آتے ہیں۔ اہل اقتدار دور سے بے زنجیر دکھائی دیتے ہیں، لیکن بایں ہمہ وہ اپنی مجبوریوں اور پابندیوں سے ہمیشہ بڑی شدت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ دوری اور قربت دونوں صورتیں ایک ایسی چیز پر ضرورت سے زیادہ معنی ثبت کر دیتی ہیں جو اکثر ہوتی ہی بہت پراگندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین مقام تفوق اس سلسلے میں اسے کہا جائے گا جب محقق کا ایک پاؤں اندر ہو اور ایک باہر۔ یہ مقام تفوق وہ ہے جو سیاسی فلسفے کی اس طویل روایت میں ابن خلدون، میکیا ولی، ٹامس مور اور انتونیو گرامچی جیسے عظیم دانشوروں کو حاصل رہا ہے۔ انہوں نے بہتر انداز کار سے کام لیا ہے۔ یہ انداز کار کیا ہے کہ سامنے بھی دیکھیں، اندر جا

allurdupdfnovels.blogspot.com

کر باہر بھی نظر کریں اور پھر باہر سے اندر بھی نگاہ ڈالیں۔

دلیل کی شکل:

یہ کتاب ریاست کے مضمر کردار کے متعلق سوالات سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرا باب اس بات کی پڑتال کرتا ہے کہ ریاستیں کیسے وجود میں آئیں، وہ کیونکر پھلیں پھولیں یا زوال پذیر ہوئیں اور ان کی حاکمیت کی بنیاد کیا تھی۔ میں نے اس چیز کا تجزیہ کیا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے مسائل سے (یعنی ان ناقابل مفر مشکلات سے جو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب بہت سے لوگ ایک ہی جگہ پر مل کر رہنا شروع کرتے ہیں) کیسے نمٹتی رہیں۔ علاوہ ازیں میں نے اس بات کا بھی جائزہ لیا ہے کہ ریاستیں جنگ بازوں، خاندانوں اور خواص کے کیا کام آتی رہیں۔ تیسرے باب میں میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ نئے علم کی بالیدگی اور روابط کی توسیع نے ریاستوں کی خیر وخرابی کی طاقت میں کس قدر زیادہ اضافہ کیا۔

چوتھے باب میں میں نے اپنا رخ ریاستوں کے اخلاقی معیار کی طرف پھیرتے ہوئے اس سوال سے بحث کی ہے کہ مختلف معاشروں نے اس مسئلے پر کس قدر مختلف انداز سے سوچا ہے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور انہیں اپنے عوام کی خدمت کیسے سرانجام دینی چاہیے۔ بادی النظر میں جدید ریاستوں اور ان کی ان پیش رو ریاستوں میں کوئی زیادہ بات مشترک نظر نہیں آتی جن میں سماجی تحفظ کے لمبے چوڑے نظاموں کی تو خیر بات ہی کیا کرنی ہے نظم ونسق شاید نام کا بھی مشکل سے ہی نظر آتا ہے، تاہم بعض اخلاقی قضیات جو انہیں درپیش ہیں وہ حیران کن حد تک مماثل بھی ہیں۔

اس کے بعد پانچویں اور چھٹے باب میں میں نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ اتنی زیادہ ریاستیں اخلاقی اہداف پر نرے زبانی جمع خرچ سے آگے کیوں نہ بڑھ سکیں۔ میں نے اس چیز کا معائنہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ریاستیں چھوٹے گروہوں کے تسلط میں کیوں چلی جاتی ہیں اور ریاستوں کا اولین مسئلہ اپنی بقاء کیوں ہوتا ہے۔ ساتویں باب میں اقتدار کی اخلاقی گنجل کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے یعنی ہمیں اخلاقی اصولوں کے بارے میں کیسے سوچنا چاہیے اور اخلاقی ترجیحات جنگ وامن اور محصولات ورفاہ عامہ سے متعلقہ فیصلوں پر

allurdupdfnovels.blogspot.com

کیسے اثر انداز ہوتی ہیں۔

آٹھویں باب میں اخلاقی ترقی کی قوت کے طور پر سامنے آنے والی بغاوت کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نویں باب میں اس چیز کی چھان بین کی گئی ہے کہ آیا جمہوریت میں ایسی کونسی بات ہے جو اچھی حکومت کو پروان چڑھانے میں مدد دیتی ہے۔

دسویں باب میں آپ دیکھیں گے کہ دیگر اصناف کی حکومتوں کی طرح جمہورتیں بھی انحطاط اور بیگانگی کا شکار ہوتی ہیں، بقیہ ابواب میں ایک اچھی حکومت کے احیاء کیلئے ضروری شرائط پر بات کی گئی ہے۔ گیارھواں باب بتاتا ہے کہ لیڈروں اور حکام میں اخلاقی صفات کیسے پیدا کی جاتی ہیں، بارھویں باب میں عوام کے کردار اور ذمہ داریوں، تیرھویں باب میں واضح علم اور دلیل اور چودھویں میں اچھے رویے کی حوصلہ افزائی کے سلسلے میں دیگر ریاستوں اور عالمی اداروں کے کردار کی بات کی گئی ہے۔ پندرھویں باب میں حکومت کے آنے والی نسلوں سے متعلق فرائض کے بارے میں سوالات اٹھائے گئے ہیں اور سولھویں باب میں تجاویز پیش کی گئی ہیں کہ سیاست وحکومت ارتقاء پا کر انقلابی حد تک جدید جہت کی طرف کیسے گامزن ہوسکتی ہے اور انیسویں صدی کے ان مغربی ماڈلوں سے آگے کیسے نکل سکتی ہے جن سے دنیا اب اس قدر مانوس ہو چکی ہے۔

میں نے مسلسل اس بات پر زور رکھا ہے کہ حکومت کی بہترین خوبیوں کو روز مرہ کی نثر میں ہی آشکارہ کیا جائے (میرا ذہن تجریدات، بھاری بھرکم الفاظ اور فسانہ طرازیوں کے بارے میں تشکیک کا شکار ہو چکا ہے، شاید اس لیے کہ ماضی میں مجھے سیاستدانوں کیلئے بہت سی تقریریں لکھنا پڑی ہیں) بہت سے افراد شعلہ بیانی اور دلفریب آدرشوں کے دلدادہ ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان چیزوں کی حیثیت محض ڈھکوسلوں سے زیادہ کی نہیں ہوتی اور یہ ہمیں پھر اسی نابالغ سیاست کی طرف لڑھکا دیتی ہیں جس میں عوام مجہول بیٹھ کر اہل اقتدار کی شعبدہ بازیوں کی چکا چوند دیکھتے رہتے ہیں اور واہ واہ کرتے رہتے ہیں اور یا پھر وہ انقلاب کے نعرے لگانے والوں کے دام فریب میں آکر پتلیوں کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ محض فریب ہیں جن سے عوام کو کچھ نہیں ملتا جبکہ حکومت کی سادہ نثر نے اکثر انہیں بہت کچھ دیا ہے۔

میں نے اچھی حکومت کے کمزور نکات پر بھی بات کی ہے۔ اگر خدمت کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

جمہوری آدرش آج دنیا پر زیادہ غالب ہیں تو میں کہوں گا کہ یہ امور انسانی میں مضمر کسی منطق کی بجائے اچھے نصیب کا نتیجہ زیادہ ہے مثلاً سرد اور گرم جنگوں میں جمہوری ملکوں کی کامیابی کو ہی لے لیں۔ ایسا بھی کئی بار ہوا ہے کہ طاقتور قومیں متعصّبانہ مطلق العنانیت یا اس سے بھی کسی بہتر دلدل کی طرف بھی پھسل جایا کرتی ہیں۔ زیادہ نہیں دو سو برس پرانی بات ہے کہ امریکہ کی آزادی کے ابتدائی ایام میں جان ایڈم نے لکھا تھا کہ 'جمہوریت زیادہ دیر نہیں چلتی، جلد ہی تھک جاتی ہے، انحطاط کا شکار ہو جاتی ہے اور خود کو فنا کر لیتی ہے، ابھی تک کوئی ایسی جمہوریت دیکھنے میں نہیں آئی جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلہ نہ گھونٹا ہو، سامراجی آدرش نظام چلانے کیلئے وہ حقوق مانگتے ہیں جو وہ دوسروں کو نہیں دیتے۔ تاریخ نے ایسی بہت سی اچھی حکومتیں دیکھی ہیں جو اپنی ہی خطاؤں یا پھر اپنے سے زیادہ سفاک پڑوسیوں کی عیاری کے طفیل ماضی کے کباڑ خانے تک جا پہنچیں۔

ایک تو ہمیں تاریخ کی طرف دیکھ کر احتیاط برتنا چاہیے۔ پھر ماضی کی مانند حال میں بھی بہت سے لوگ اس نظریے کے گرویدہ نظر آتے ہیں کہ اخلاق بڑی مہنگی عیاشی اور سادہ لوح اور کمزور دماغ لوگوں کا وہم ہے۔ ایک مرتبہ صدر متراں کے مشیر ژاک اتالی نے ان سے پوچھا کہ لیڈر کی سب سے اہم خوبی کیا ہوتی ہے، متراں بولے ''بے اعتنائی'' متراں کو ''فلورنٹائن''(19) کی عرفیت سے پکارا جاتا تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کا شمار لیڈروں کے اس گروہ میں ہوتا ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ طاقت و اقتدار خود اپنا جواز ہوتا ہے اور اقدار کی حیثیت قمیض یا پاجامے سے زیادہ کی نہیں ہوتی جنہیں اپنی سہولت کے مطابق جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا اتار کر پرے پھینک دیا۔ فرانسیسی عہد انقلاب کی یادگار ٹیلی رینڈ کو بعض اوقات اس لچک کے ماڈل کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ فرانس کے1830ء کے انقلاب جولائی کے دوران ایک دن جب فسادات کے خاتمے کے اعلان کے طور پر بجنے والی گرجے کی گھنٹیوں کی آواز سنی تو وہ اپنے ایک معتمد سے بولا ''ہم جیت رہے ہیں۔ ہم کون؟ معتمد نے پوچھا۔ ''یہ کل بتاؤں گا''۔ ٹیلی رینڈ نے جواب دیا۔

اس قسم کے روکھے پن کو بعض اوقات حقیقت پسندی بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر عوام کے زاویہ نظر سے دیکھیں تو اس پر غداری کا لفظ زیادہ صادق آتا ہے۔ صحیح حقیقت پسندی

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں اخلاقیات کو نظر انداز نہیں کرتے۔ بجائے اس کے یہ مطلق اخلاقی اصولوں اور بدلتے ہوئے معاشرتی حقائق کے درمیان کی کشیدگیوں کو عبور کرتی ہے۔ مثال کے طور پر کنفیوشسی مسلک کے مفکرین نے اکثر 'سچ' کو 'مصلحت' سے توازن دینے کی ضرورت کی بات کی ہے اور جدید دور کے عظیم مغربی سیاسی مفکر میکس ویبر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سیاست میں صرف دو ہی بڑے گناہ ہیں: حقیقت پسندی کا فقدان اور فیصلوں کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے کا فقدان۔ یہی وجہ ہے کہ اقتدار کی اخلاقیات کبھی بھی صرف اصول وقواعد کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ اس میں یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ ہم دو یکساں ناخوشگوار متبادلات میں سے کسے لیتے ہیں اور اچھائیوں اور برائیوں میں سے کسی ایک کو چننا تو اور چیز ہے، سامنے پڑی دو متبادل اچھائیوں میں سے کس پر ہاتھ رکھتے ہیں۔[20]

اچھی حکومت کسی معاشرے کیلئے بہترین نعمتوں میں سے ایک ہے۔ روایتی حکمت تو کچھ اور بولتی ہے لیکن میں ثابت کرسکتا ہوں کہ کاروبار حکومت میں اخلاق کا عنصر زیادہ ہو رہا ہے، کم نہیں ہو رہا، بہت سی حکومتیں خدمت کے اس آئیڈیل سے قریب تر آتی چلی جا رہی ہیں جس کا تصور اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب سے ریاستوں کا خمیر بننا شروع ہوا تھا لیکن عملی جامہ پہننا جسے شاذ شاذ ہی نصیب ہوا اور جس طرح جدید علم سے حکومتوں کو بہت سی طاقت ملی ہے، اس سے وہ پہلے کی نسبت زیادہ محتاج، زیادہ جوابدہ اور اپنے معاشروں سے زیادہ مربوط بھی ہوئی ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اچھی حکومت نازک اور زد پذیر بھی ہوتی ہے، خودغرض خواص اور مفاد پرست عناصر اسے ہائی جیک بھی کر سکتے ہیں۔ ہر آن اس کے آدرشوں اور ان لوگوں سے کٹنے کا اندیشہ بھی لاحق رہتا ہے جن کی خدمت کا وہ دم بھرتی ہے۔ شاید سرکاری اعلانات کے تمتماتے اعتماد اور عوامی عمارتوں کے پر شکوہ ستونوں کے پیچھے گھات میں بیٹھی یہی غیر یقینیت ہی ہے جو حکومت کو اس قدر دلآویز رنگت بخشتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اتنے سارے لوگ اپنی زندگیاں حقیقت کو آئیڈیل کے قریب تر لانے کی جدوجہد کیلئے وقف کر دیتے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 2

ریاست کے مآخذ

''تم خدا کے خادموں کے خادم ہو، ان کے آقا نہیں، تم لوگوں کے محافظ ہو، ان کے مالک نہیں''۔ (انگلستان کے بادشاہ ہنری اول کو اس کی تاجپوشی کے بعد کی جانے والی نصیحت)

30 اپریل 2005ء ہفتے کے روز بیجنگ کے نوے لاکھ باسیوں کو ان کے موبائل فونوں پر ایک تحریری پیغام موصول ہوا۔ یہ پیغام محکمہ پولیس کی طرف سے بھیجا گیا تھا اور لکھا تھا اپنی حب الوطنی کا اظہار عقلی انداز سے کریں۔ غیر قانونی احتجاجی مظاہروں میں شرکت نہ کریں۔ کوئی مسئلہ کھڑا کرنے سے اجتناب کریں۔ فساد سے اجتناب کرکے ہماری مدد کریں اور قانون شکنی سے احتراز کرکے قوم سے محبت کا ثبوت دیں''۔ یہ پیغام اہل بیجنگ کو ان کے جاپانی حکومت کے خلاف مسلسل مظاہروں کے بعد ارسال کیا گیا تھا جو انہوں نے جاپان میں ایسی درسی کتب کی اشاعت پر کیے تھے جن میں 1930ء کے عشرے میں جاپانیوں کے چین میں ڈھائے جانیوالے مظالم کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ یہ مظاہرین چینی حکام کی شہہ پر ہی سڑکوں پر نکلے تھے لیکن اب وقت تھا کہ 'بس بہت ہوگیا' کا اعلان کیا جائے۔

یہ پیغام جدید چینی ریاست کی متذبذب صورتحال کی عکاسی کرتا ہے یعنی اسے حکمنامہ کہیں کہ استدعا۔ اس کا لب و لہجہ حکمیہ تو تھا لیکن اس میں مدد کی درخواست بھی تھی۔ اس میں لوگوں سے قانون کی فرمانبرداری کی التجا کی گئی تھی لیکن دھمکی نہیں بلکہ محبت کا واسطہ دے کر۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

آج کی اس نئی دنیا میں چینی ریاست کا انداز سب سے جدا ہے۔ جثہ تو اس کا بڑا ہے ہی اور پھر یہ ہے کہ اتنے بڑے ملک کو صرف ایک سیاسی جماعت نے متحد کر رکھا ہے اور یہ جماعت سارے سیاسی اقتدار پر اجارے کے ساتھ اپنے دفتروں کے باہر کھڑے ہو کر یہ نعرہ بھی لگاتی ہے کہ ہمارا نصب العین عوام کی خدمت ہے لیکن اپریل 2005ء میں چینیوں کے موبائل پر بھیجا جانیوالا دورنگا پیغام اس جدید ریاست کی علامت کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے جو اس جتن میں لگی ہے کہ ایک ہی وقت میں خادم کا اور آقا کا کردار ادا کیا جائے۔

آج ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جس پر ایسی ریاستوں کا غلبہ ہے جو عوام پر حقوق کی دعوے دار ہیں یعنی حکم چلانے اور سزا دینے کے حقوق، اگرچہ دور سے دیکھیں تو یہ دنیا اب بھی یوں دکھائی دیتی ہے جیسے یہ پہاڑوں اور دریاؤں، صحراؤں اور میدانوں سے بنی ہے جس میں جابجا قصبے اور شہر آباد ہیں جن میں سے روشنیاں پھوٹ پھوٹ کر آسمان کو منور کرتی ہیں لیکن غور سے دیکھیں تو گھاس کی ہر پتی، ریت کا ہر ذرہ اور ٹنڈرا کی ایک ایک انچ اب کسی نہ کسی حکومت کے تحت جکڑی نظر آتی ہے[1] اور ان کی سرحدوں کی کس طرف آپ کا بسیرا ہے، یہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں بلکہ زندگی موت کا معاملہ بن سکتا ہے۔ تاریخ سے ہمیں کسی کامیاب معاشرے کی ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی، خواہ وہ جثے میں چھوٹی تھی یا بڑی، گنجان تھی یا کم گنجان، کہ جس کی حکومت بہت زیادہ منظم اور مشکل نہیں تھی، اگرچہ آئس لینڈ اور امریکہ کے آباد کاروں کی طرح کے بہت سے لوگوں نے ''بغیر ریاست'' معاشروں کے خواب بھی دیکھے۔ یہ بہت زیادہ انفرادیت میں رچی بسی دنیا کا ایک بصری فریب ہے کہ لوگ خود کو سیلف میڈ اور آزاد و خود مختار خیال کرتے ہیں۔ ریاستیں جو نظم و نسق مہیا کرتی ہیں ہم اسے اس قدر معمولی محسوس کرتے ہیں کہ ہم اس بات پر غور ہی نہیں کرتے کہ ہمیں ڈاکوؤں اور لٹیروں، بیماریوں اور کرنسی کے بحرانوں سے کس طرح بچایا جاتا ہے۔ ہم اس کو بھی کم ہی خاطر میں لاتے ہیں کہ ہم ایک براعظم سے دوسرے براعظم کو کیسے پرواز کر جاتے ہیں۔ اپنی بچت بینک میں کیسے رکھ لیتے ہیں اور کسی دوسری ریاست کی بد اطواریوں کے خلاف تحریک کیسے چلا لیتے ہیں۔ جدید دنیا کی سب سے اہم باتوں میں صرف آزادیاں اور خوشحالی ہی نہیں بلکہ یہ چیز بھی شامل ہے کہ یہ کس درجہ تک منظم اور منضبط ہے۔

اس باب میں میں ان ریاستوں کا جائزہ لوں گا جن پر ہمارا دارومدار ہے اور اس کیلئے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ان کا ماضی ان کے حال پر کیا روشنی ڈالتا ہے۔ وہ کون سی ضروریات پوری کرتی رہیں، انہوں نے یوں ارتقاء کیونکر پایا اور انہوں نے اجتماعی موبائلی پیغامات ارسال کرنے والے ٹھیکیداروں، پنشن کے نظام چلانے والے مینجروں، اور ایٹمی ہتھیار سنبھالنے والے اداروں کی شکل کیسے اختیار کی؟

حکومت کی جڑیں

انسانی تاریخ کے ہزاروں برس لوگ ریاستوں، ٹیکسوں، فوجوں یا افسروں کے بغیر ہی زندگی بسر کرتے رہے۔ تاہم حکومت کی جڑیں بڑی دور تک جاتی ہیں۔1945ء میں ایک ماہر بشریات جارج مردوک نے ییل یونیورسٹی کے جمع کردہ شواہد کے مطابق ایسے عالمگیر ثقافتی خواص کی تھی ایک فہرست مرتب کی جو انسانی معاشروں کی بہت سی صدیوں میں سے ہر ایک میں پائے جاتے ہیں۔ اس فہرست میں نور بافی اور جنسی قیود جیسی چیزیں بھی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں حکومت، قانون، تعزیرات، اخلاقیات اور سماجی تنظیم جیسی اشیاء بھی موجود ہیں۔ مردوک کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ اصول وضوابط وضع کرنا اور حکومت کرنا ایک عالمگیر انسانی خاصہ ہے۔

علم اثریات بھی حکومت وقواعد کی قدیمیت کی تصدیق کرتا ہے۔ روس میں سنگر کے مقام پر پائے جانے والے مقابر پر جو کہ اہرام مصر سے بھی بہت زیادہ قدیم ہیں یہ بات ثابت کرتے ہیں۔ یہاں وسیع انسانی بستیوں کے بیچ دو قبریں ایسی ملی ہیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ ان میں کوئی شہزادہ یا راجہ واجہ دفن کیا گیا تھا۔ راجہ صاحب کی نعش کے ساتھ ان قبروں میں4900 موتی، قطبی لومڑی کے250 دانتوں سے مزین ایک کمر بند، ہاتھی دانت سے بنا بڑے ہاتھی کا مجسمہ اور اسی مادے سے بنا ایک نیزہ نیز ایک لڑکی کی نعش بھی ملی ہے جس پر اس سے بھی زیادہ تعداد میں موتی سجائے گئے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ایسا ایک موتی تیار کرنے میں پینتالیس منٹ کے قریب وقت صرف ہوا ہوگا اور اگر ایک موتی نے پون گھنٹہ لیا تو پھر دو نوجوان اشخاص کے کفن دفن کیلئے بہت سے لوگوں کو بہت محنت کرنا پڑی ہوگی اور یہ سب اس لیے کہ مرنے والے عالی مرتبہ بھی تھے اور ان سے کارنامے بھی منسوب تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ انسانی معاشرہ بہت شروع سے ہی نہ صرف یہ کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایسی اشیاء اکٹھی کرنے کیلئے ایسے نیٹ ورکوں میں منظّم کیا جاتا تھا بلکہ اس کا ایک نظام مراتب بھی تھا، امتیازات بھی تھے اور ایسے وڈیرے اور سردار بھی تھے جو دوسروں کے وقت کو تصرف میں لا سکتے تھے۔[3]

بہت سی ایسی تاریخ تو ویسے ہی ضائع ہو چکی ہے جو ہمیں بتا سکتی تھی کہ یہ ابتدائی قسم کے گروہ ارتقاء کے عمل سے گزر کر سرداروں کے سخت معاشروں اور پھر ریاستوں اور سلطنتوں میں کیسے تبدیل ہوئے۔[4] ہمارے پاس کوئی ایسے ٹھوس شواہد موجود نہیں جو ہمیں بتا سکیں کہ آیا ریاستوں نے اس واسطے زیادہ ترقی کی کہ تجارت نے انہیں باہمی تعاون پر ابھارا یا انہیں جنگوں کے سبب بڑے گروہوں میں منظّم ہونے پر مجبور ہونا پڑا[5]۔ ان بعد میں لکھی تحریروں سے جن میں ریاستیں اپنے مآخذ بیان کرتی ہیں، کوئی زیادہ مدد نہیں ملتی۔ مثلاً سمیری تحریری بتاتی ہیں کہ بادشاہت کا ادارہ آسمانوں پر ہی مکمل طور پر تیار ہو کر زمین پر اترا جبکہ اثری شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہوں سے قبل حکومت کیلئے عمائدین کی مجالس بھی ہوا کرتی تھیں اور محلات سے بہت پہلے معابد بھی وجود میں آ چکے تھے۔[6] تاہم ایک خاص بات سامنے یہ آئی ہے کہ ریاستیں اور فالتو وسائل ایک ساتھ معرض وجود میں آئے۔ جب یہ زائد چیزیں خصوصاً زائد خوراک ...... جمع ہونے لگیں تو اس بات کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی کہ کوئی ایسا شخص بھی ہو جو ان کا حساب رکھے، ان کا انتظام کرے اور انہیں تقسیم کرے۔ جب یہ زائد اشیاء اس شخص کے کنٹرول میں آئیں تو اس شخص کے پاس عزت اور طاقت بھی آ گئی۔ چنانچہ جلد ہی انسانی گروہوں کو یہ طے کرنا پڑا کہ کس کو کس پر طاقت حاصل ہے اور کون کس کے ماتحت ہو گا۔ جب ان چھوٹے گروہوں نے قبیلوں اور پھر قوموں کی شکل اختیار کی تو اقتدار مزید پھولتا چلا گیا، اسے زیادہ مفصل علامتی اظہار ملنے لگا اور اہل حکم دیوتاؤں اور ارواح کی دنیا تک رسائی کے اکلوتے دعویدار بن گئے۔[7]

شروع زمانوں میں بھی اقتدار کی ان قسموں کو قدرتی تسلیم نہیں کی گیا تھا۔ انسانی تخیل کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ اقتدار و حکومت کو مصنوعی سمجھتا ہے۔ زائد اشیاء کی خاطر لڑائیاں بھی ہوتی رہیں اور بادشاہوں کے تختے بھی الٹتے رہے۔ بغاوت آج بھی اور کل بھی ایسی ہی قدرتی چیز متصور کی جاتی رہی ہے جیسی کہ اطاعت اور جب فن تحریر ریاستی کنٹرول سے نکلا تو ایسے تصورات زیادہ طاقتور طریقے سے اظہار پانے لگے۔ برے حکمرانوں کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

خلاف رعایا کی بغاوت کی بات ہونے لگی (قدیم چینی دانشور مینگزے اور کہیں کہیں مہا بھارت) بادشاہت کو مایہ (فریب) کا جزو قرار دیا جانے لگا (قدیم شمالی ہند میں گوتم بدھ) اور کمزوروں کو زمین کے اصل وارث کہا جانے لگا (قدیم شرق الاوسط میں عیسیٰ ابن مریم)۔

ریاستوں پر تسلط کی کوششیں

انسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں اور ان کے پاس جمع اسباب و اموال پر قبضے کی خاطر انسانوں نے بڑی توانائیاں خرچ کیں۔ تاریخ کا بہت سا حصہ (اور بہترین تاریخی ڈرامے کا اکثر حصہ) ریاستی اقتدار کیلئے کی گئی سازشوں اور چپقلشوں کی روداد بیان کرتا نظر آتا ہے۔

اقتدار اور شناخت کا لوبھ کسی بھی طور کوئی عالمگیر چیز نہیں۔ میکیا ولی کی تحریروں کو اکثر انسانی تگ و تاز کے محرک کے سنکی زاویہ نظر کی تثبیت کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ شہری اشرافیہ میں ''دوسروں پر تسلط جمانے کی بہت زیادہ خواہش کو بہت آسانی سے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، اکثر لوگوں کی واحد خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان پر تسلط نہ جمایا جائے، نتیجتاً ان کی بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ آزادی سے زندگی گزاریں، اور' آزادانہ زندگی کے مشترکہ فائدے' سے متمتع ہوں۔

تاہم جہاں جہاں آبادی گنجان ہوتی چلی گئی، زائد وسائل کیلئے جدوجہد بڑھتی چلی گئی اور انسانی فطرت کے بدترین خصائل نمایاں ہوتے چلے گئے۔ ریاستوں کے وجود میں آنے سے قبل کے زمانوں کے آثار اس بات کو آشکار کر رہے ہیں کہ ان قدیم وقتوں میں بھی تشدد و تصادم، خندقوں اور فصیلوں، دھمکی اور عصمت دری اور ہم کو ان سے جدا کرنے کیلئے امتیازی شناختوں کا تصور موجود تھا۔ جو اقتدار ہتھیانے میں ناکام رہتا اسے دوسرے کی غلامی کا خدشہ لاحق ہو جاتا تھا۔ منہ دھیان کی کاشت کاری کی نسبت لوٹ مار اور تسخیر و فتوحات میں زیادہ فائدہ تھا اور اس کشمکش میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو سرداری، بادشاہت اور شہنشاہیت کا رتبہ اور اس کے ساتھ بہترین مکانوں، سونے اور جواہرات کے خزینوں اور خوبصورت ترین عورتوں پر اجارہ حاصل ہو جاتا تھا۔ فاتحین اپنے تخم اور دیوتا بلا روک ٹوک پھیلاتے اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

مراتب کی درجہ بندی کو تقویت دینے اور خود کو فائدہ پہنچانے والے نئے نئے قوانین تشکیل دیتے تھے۔ ان کی مرضی سے بنے ہوئے یہ قوانین یہ تعین کرتے تھے کہ کس پر کیا واجب ہے اور کس کا کس پر کیا حق بنتا ہے۔ شکست کھانے والوں کا نصیب اگر یاوری کرتا تو انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا اور بد قسمت لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے تھے۔ ہر قدیم تہذیب میں ریاست ناہمواریوں کو تقویت پہنچانے کی سعی کرتی تھی اور درجہ بندیوں کو فطری ثابت کرنے کیلئے پوری کوشش بروئے کار لاتی تھی۔ (9)

جب ریاستیں قبل از تاریخ کے دھندلکوں سے باہر نکلیں تو ان خود مختار قصبوں اور شہروں کو جنہوں نے ابتدائی مرحلے میں تہذیبی عمل کو آگے بڑھایا تھا پہلے ہی کچلا جا چکا تھا یا پھر انہیں ان بڑی بادشاہتوں میں ضم کر لیا گیا تھا جو بڑے جوش و خروش سے جنگ و جدال کیلئے اپنے پڑوسیوں کے مقابل آ رہی تھیں۔ ان میں جدید ترکیہ کے Catal Huyuk جیسے قصبے اور بحیرہ مردار کے پاس واقع ریحو جیسے زیادہ منظم شہر شامل ہیں۔ یہ قدیم ریاستیں بعض اوقات مجرمانہ مہمات کی سی محسوس ہوتی ہیں جنہوں نے اپنی مداومت اور اپنا قانونی جواز مہیا کرنے کیلئے ایک مثالی طریقہ دریافت کر لیا تھا کیونکہ از روئے تعریف ریاستیں جو بھی کرتی ہیں اسے مجرمانہ فعل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فاتحین کی اولین ترجیح عموماً زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد فائدہ حاصل کرنا ہوتی تھی۔ حکمران یا تو ارک کے بادشاہ گل گامیش کی طرح جنگجو ہوتے تھے اور یا ویسے سلاطین اور شہزادے جو ہومرنے بیان کیے ہیں اور ان کی ریاستوں پر تسلط جمانے کی کوششیں بابلیہ اور اشوریہ، شانگ اور جو کے قدیم چینی طوماروں اور عہد نامہ عتیق میں غالب دکھائی دیتی ہیں۔ مستقل جنگ و جدال سے بچنے کیلئے یہ شکاری حکمران بعض اوقات ایک دوسرے سے سرحدوں کے معاملے پر معاہدے بھی کر لیتے تھے اور ایک دوسرے کے اس حق کو بھی تسلیم کر لیتے تھے کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں لوگوں پر جیسے چاہیں تسلط جمائیں اور جو مرضی ظلم کریں۔ لیکن چونکہ چوروں کو عزت و آبرو کا زیادہ پاس نہیں ہوتا انہیں ان معاہدوں اور میثاقوں کے لوٹنے کا بھی احتمال رہتا تھا۔

پانچ ہزار برس قبل کی دنیا میں ہر سردار کو اپنی دولت اور حشمت اپنے عرصہ حیات میں خود ہی بنانا ہوتی تھی۔ یہ دنیا ایک ایسے نظام میں ڈھل رہی تھی جس میں سب کے منصب واضح اور معروف تھے اور وہ نسل در نسل آگے منتقل کر دیئے جاتے تھے۔ اس دور میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

بادشاہوں اور شہنشاہوں کیلئے نئے نئے الفاظ استعمال ہونے لگے تھے۔ ان کے اور عوام کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا تھا اور وہ محض مساوی انسانوں میں اول ہونے کی بجائے مافوق الفطرت قوتوں سے متصف کیے جانے لگے تھے۔ سمیر کا این، اینسی اور لیوگل (جس کا لغوی مطلب بڑا آدمی ہے) مصر کا فرعون اور شانگ چین کا وینگ بلحاظ اختیارات ایک دوسرے سے مختلف تھا لیکن ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا جا سکتا ہے اور وہ ان سرداروں سے ممیّز تھے جو ان کے حضور قانون وضع کرنیوالوں کے طور پر پیش ہوتے تھے۔

سمیریہ اور مصر سے لے کر چین تک تاریخی دستاویزات میں نمودار ہونے والی قدیم ترین ریاستیں حیران کن حد تک جدید دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا کام دستاویزات اور اعداد و شمار کے گرد گھومتا تھا جیسے مٹی کی تختیاں، چوبی عصا، رنگین اور گرہ دار ڈوریاں۔ وہ ایسی ریاستیں تھیں جو ایک مقررہ علاقے میں آباد لوگوں کی خدمت پر مامور تھیں۔ اس علاقے کے اکثر افراد ان کی حاکمیت اعلیٰ تسلیم کرتے تھے۔ وہ قواعد و ضوابط کا نفاذ عمل میں لاتی تھی۔ حکام کا ایک خاص گروہ ان کا نظم و نسق چلاتا تھا اور ان کی مالی ضروریات پوری کرنے کیلئے محصولات لگائے جاتے تھے، اور ماہرین کا ایک دوسرا گروہ ان کا دفاع کرتا تھا اور دوسروں پر حملہ آور ہوتا تھا۔ انہی خواص کی حامل دیگر ریاستیں ان کا وجود تسلیم کرتی تھیں۔

قدیم سمیریہ میں، جہاں بعض قدیم ترین ریاستوں نے جنم لیا، بعض بہت جدید طرز کے خط و خال نمایاں نظر آتے ہیں۔ ''حکایت گل گامیش'' میں نظر آنے والی جنگجو یانہ اقدار کے باوجود سوئم ہزاریہ قبل مسیح کی سمیری شہری ریاستیں فتوحات کے لئے تشکیل نہیں دی گئی تھیں۔ اگرچہ بعض نے دیگر کو تاراج بھی کیا۔ نہ ہی وہ بنیادی طور پر دیوتاؤں کی پوجا کیلئے بنائی گئی تھیں، گو ان میں معبد بھی موجود رہے۔ وہ بنیادی طور پر گروہی بقا کے لئے تشکیل دی گئی تھیں۔ ان میں غلہ ذخیرہ اور تقسیم کیا جاتا تھا اور تفصیل سے یہ حساب مرتب کیا جاتا تھا کہ کسے کیا ملا اور کیونکر ملا۔ وہ زرعی معاشرے کے نئے زائد وسائل پر استوار فلاحی ریاستیں تھیں۔ یہ ریاستیں آڈیٹروں اور اکاؤنٹنٹوں کی گرفت میں تھیں جو ٹیکس دہندگان کے اعداد و شمار جمع کرنے کے چکر میں فن تحریر کی ایجاد کا باعث بنے۔ ان کو افسر شاہی کے سربراہ کی حیثیت حاصل تھی اور وہ 130 مختص عہدوں پر مشتمل ایک انتہائی بے لچک مخروط کا مدار الہام شمار کیا جاتا تھا۔ اس افسر شاہی کے ذمے غلے، پارچہ جات، دھاتوں اور مویشیوں کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

حساب و انصرام تھا۔ سرکاری دستاویزات میں یہ افسر شاہی مختلف درجوں اور مرتبوں میں منقسم ملتی ہے۔ اس نظام کا انحصار بہت حد تک خواندگی اور عدد شناسی پر تھا اور ان دونوں فنون کی منتقلی کے سلسلے میں کاتبین بہت بخل اور حسد کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ معاشرہ بڑی تیزی سے طبقات میں بٹ رہا تھا، تاہم ارک (جو کہ 100 ء کے روم کے نصف کے برابر تھا) جیسے بڑے شہروں میں نجی دولت یا مالدار طبقے کے الگ رہائشی علاقوں کے آثار نہیں ملتے۔ (10)

موخر ہزاریوں میں ریاست کی کئی مختلف شکلیں ظہور پذیر ہوئیں اور پانچویں صدی قبل مسیح تک پہنچتے پہنچتے ریاست کی بیشتر وہ اصناف وجود میں آ چکی تھیں جن سے ہم اب واقف ہیں۔ آمریت، جمہوریت، ملائیت اور امرائیت اپنے معاہدوں، مجلسوں، افسر شاہیوں اور قانون سازوں کے ہمراہ دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں موجود تھی۔ سپارٹا میں (کم و بیش) ایک جماعتی نظام بھی چل رہا تھا اور ایتھنز جیسی شہری ریاستوں میں جمہوری حکومتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ روم کی جمہوریائیں بھی تھیں جس کے آخری بادشاہ کو 510 ق م میں معزول کیا گیا، شمالی ہند کی اشرافیہ جمہوریائیں بھی تھیں جہاں چھٹی صدی قبل مسیح میں گوتم بدھ نے جنم لیا اور پھر مصر جیسی سلطنتیں بھی موجود تھیں جس کے فرمانرواؤں کو دیوتا تصور کیا جاتا تھا۔ مزید برآں یہودی ریاستوں کی طرز کی ایسی بادشاہتیں بھی تھیں جن میں مذہب اور ریاست باہم دگر یکجان تھے۔ بعض اوقات ریاستیں پہلے سے مرتب شدہ تاریخی ریکارڈ میں باہر سے کود کر آتی محسوس ہوتی ہیں۔ جو عہد کے چین کے وزارتی عہدوں (جنہیں دوم ہزاریہ قبل مسیح کے آخر میں 'کتاب تاریخ' میں بیان کیا گیا) کو آسانی سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ اس چینی عہد میں تعلیم، رسومات، دفاع، تعزیرات اور معیشت کے الگ الگ وزراء تھے اور ایک وزیر اعظم ہوتا تھا۔ یہ نقشہ ہماری اس اکیسویں صدی کی ریاست سے زیادہ مختلف نظر نہیں آتا، سوائے اس کے کہ اب رسومات کے محکمے کی جگہ تعلقات عامہ کی وزارت نے لے لی ہے۔ دنیا کی دوسری جانب، پہلی صدی قبل مسیح تک روم کی ریاست، پبلک انفراسٹرکچر، عام انتخابات اور پروپیگنڈہ، انفرادی قانون حقوق، روزگار کی سکیمیں اور ایک جیسا تیسا رفاہی نظام اختیار کر چکی تھی۔

ان ریاستوں کی دستاویزات پڑھیں تو وہ یہ کہتی سنائی دیتی ہیں کہ انہوں نے اس پراگندگی و انتشار کی جگہ جو کہ ان سے قبل موجود تھا اور ان کی سرحدوں کے پار موجود ہے، ہر

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایک شے کا نظم ونسق قائم کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ہندی روایت کے مطابق حکومت کا ادارہ وجود میں آنے سے قبل لوگ نراج کی زندگی بسر کر رہے تھے جس پر بدی کا راج تھا اور یہ ایک ایسی دنیا تھی جہاں کمزور طاقتوروں کے ہاتھوں فنا ہو جاتے تھے۔

تاہم اگر حقیقت پوچھیں تو یہ نئی ریاستیں اتنے ہی مزید تشدد کو جنم دے دیتی تھیں جتنا تشدد کہ یہ روکتی تھیں۔ لقمان کی ایک حکایت میں اس نکتے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مینڈک اپنی زندگیوں کی بد امنی و انتشار سے فکر مند ہو کر خدائے زیوس کی طرف ایک وفد روانہ کرتے ہیں جو اس سے ایک بادشاہ کا طالب ہوتا ہے کہ ہمیں ایک بادشاہ عطا کر، ہمیں ایک فرمانروا دے دے۔ اس پر زیوس ایک گیلی نیچے پھینکتا ہے۔ مینڈک پہلے تو اس کے جثّے سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ کوئی احکامات صادر نہیں کرتا تو وہ بہت مایوس ہوتے ہیں۔ ایک اور وفد زیوس کی طرف بھیجا جاتا ہے جو اس سے ایک حقیقی بادشاہ کا خواستگار ہوتا ہے۔ اس پر زیوس ناراض ہو کر انہیں ایک آبی سانپ دے دیتا ہے کہ جاؤ یہ تمہارا بادشاہ ہے اور وہ سانپ فوراً اپنی نئی رعایا کو ہڑپ کر جاتا ہے۔

اگر ریاستوں کی رعایا کے لوگوں کو بہت زیادہ خدشات درپیش ہوتے تھے تو ان کے قرب و جوار میں رہنے والوں کیلئے بھی کوئی کم خدشات نہیں ہوتے تھے۔ جب بھی کوئی مضبوط ریاست وجود میں آتی تو اس کے آس پاس بسنے والوں کے پاس صرف ایک ہی راستہ ہوتا تھا کہ یا تو اس سے اتحاد کر لیں، اس کی ریس کریں اور یا پھر ہڑپ ہونے کیلئے تیار ہو جائیں۔ ابتدائی ریاستوں کے قریب آباد قوموں نے تقلید کا راستہ اختیار کیا میسو پوٹیمیا اور دجلہ و فرات کے خطوں میں، دریائے زرد اور یانگسی کے نواحی چین میں، بلاد شام میں اور وادیٔ سندھ میں[12]۔ ریاستوں کی دوغلی فطرت اسی وقت سے ان کے کردار کی صورت گری کرتی چلی آ رہی ہے۔ یعنی وہ اندر کی طرف اپنے علاقے اور اپنے لوگوں کو بھی دیکھتی ہیں اور باہر کی طرف دوسری ریاستوں کو بھی دیکھتی ہیں اور ہمیشہ ریاستوں کی کایا کلپ ان کے دیگر ریاستوں کے مقابلے میں پیدا کئے گئے ردعمل کی مرہون منت رہی ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں سپارٹا کے جواب میں ایتھنز کا ردعمل دیکھ لیں خواہ 1852-3ء میں کموڈور پیری کے سیاہ جہازوں کے ردعمل میں جاپان کا میجی انقلاب ملاحظہ کر لیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ریاستوں کی ضرورت اور دیگر لوگوں کے پیدا کردہ مسائل

ریاستیں کون سی ضروریات پوری کرتی ہیں؟ ادارو ں کو محض ان کے کام کے حوالے سے نہیں پرکھا جا سکتا کہ جیسے ان کا وجود صرف تبھی ممکن ہے کہ اگر وہ کسی نا قابل مفر احتیاج کو پورا کرتے ہوں، لیکن ریاستیں صرف اس لیے نہیں ہوتیں کہ کچھ لوگ انہیں دوسروں کے استحصال کا ایک آسان ذریعہ بنالیں۔

کسی بھی قوم کو، دوسرے لوگوں کے مسائل، حل کرنا پڑتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ تشدد کا خدشہ ہوتا ہے۔(13) ماضی کے اکثر معاشروں میں شرح قتل آج کے مقابلے میں ڈرامائی حدتک زیادہ تھی۔ ہم خواہ فطری طور پر قاتل نہ بھی ہوں، سخت سزاؤں کی غیر موجودگی میں لوگ اپنے حساب چکانے کیلئے کچھ جلد ہی چھری چاقو(یا اب پستول) پکڑ لیتے ہیں۔ پھر مفادات کا تصادم بھی ہوتا ہے۔بعض دفعہ لوگ ایک ہی اراضی ، ایک ہی شے یا ایک ہی معشوق کے پیچھے لگے ہوتے ہیں۔ معاشرہ جتنا گنجان ہوگا ایسے تنازعات کا امکان بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔ ان میں سے بعض تنازعے تو احکام عشرہ سے حل کیے جا سکتے ہیں یا دیگر معاشروں میں ان کے ایسے متبادلات سے جو کہ قتل ، چوری اور زنا وغیرہ کی ممانعت کرتے ہیں لیکن بعض چیزوں کی ممانعت سادہ اصولوں کے ذریعے اتنی آسان نہیں ہوتی۔ ان میں مثال کے طور پر استحصال کے مسئلے آ جاتے ہیں کہ ایک کسان آگاہ ہے کہ اگر وہ نہ بھی کرے تو دوسروں کو مشترکہ نظام آب رسانی کو جاری رکھنے کیلئے محنت کرنا ہوگی یا پھر سب بھائیوں میں صرف ایک کو بوڑھے ماں باپ کی دیکھ بھال کرنا پڑ رہی ہے۔بعض مسئلے ایسے ہیں جنہیں ماہرین معاشیات خارجیات(externalities) کا نام دیتے ہیں ۔ ان سے مراد وہ سزائیں ہیں جو آپ کو دوسروں کی وجہ سے بھگتنا پڑتی ہیں، مثلاً کوئی ان دریاؤں میں غلاظت پھینک دیتا ہے جن کا پانی ہم پینے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ (ایسے قبیح کام تجارتی کمپنیاں زیادہ سے زیادہ منافع کی تلاش میں زیادہ کر رہی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو مجبور کرنے کیلئے ایسے قواعد وضوابط بنائے جاتے ہیں کہ وہ اپنے ملازمین کا خیال رکھیں یا آلودگی کم کریں)۔ہمیں بہت سے ایسے حالات سے سابقہ پڑتا ہے جب ایک چیز ایک شخص کے لئے منطق کے عین مطابق ہے مگر وہ ساری آبادی کیلئے مجموعی طور پر غیر منطقی ہو جاتی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر میں نوسر بازی کرتا ہوں تو مجھے فائدہ ہوگا لیکن اگر ہم دونوں کرتے ہیں تو ہم دونوں کو نقصان ہوگا۔ بعض مرتبہ افراد مشترکہ وسائل کو زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں[14] اور پھر صاف ہوا اور دفاع جیسی عوامی چیزوں کے مسائل ہیں[15]۔ ان مسائل کے حل کیلئے ضروری قواعد وضوابط کی غیر موجودگی میں معاشرے بڑی جلدی بدحالی اور ابتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں بے یقینی کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے دوسروں کی محنت پر پلنے اور دوسروں کا خون چوسنے والے افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے جو دوسروں کا استحصال کرتے ہیں اور نتیجے میں ان کی خفگی اور تلخی مول لیتے ہیں جو کہ انسانی مزاج میں بافراط موجود ہے۔

لوگوں کو اپنے روزمرہ رویوں اور عقیدوں میں بھی افہام وتفہیم پیدا کرنا پڑتی ہے۔ کچھ افہام وتفہیم تو آپ ہی آپ طے پا جاتی ہے۔ ہم انسانوں میں اپنے اردگرد کے لوگوں سے تال میل کے ساتھ رہنے کی بہت صلاحیت موجود ہے اور ہم معاشرتی زندگی کے اداؤ بہت جلد سیکھ جاتے ہیں مثلاً ہم میں یہ سمجھ ہے کہ کسی مصروف بازار میں دوسروں سے ٹکرائے بغیر کیسے گزرنا ہے۔ لیکن وسیع پیمانے پر ارتباط وتعاون خود ہی پیدا نہیں ہو جاتا۔ ذاتی مفاد کے پیش نظر لوگ آبپاشی کے جال بچھانے، کمیاب وسائل کے اشتراک اور دوسروں کے بچوں پر نظر رکھنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر قواعد وضوابط کی ترویج اور روزمرہ زندگی کو آسان بنانے والے مشترک ذہنی سانچوں کے فروغ کا کام کسی خارجی اتھارٹی کو کرنا پڑتا ہے۔ اگر سب لوگ ایک ہی جانب گاڑی رکھیں، ایک ہی شکل کے پلگ استعمال کریں، ایک ہی دن تہوار منائیں، ایک طرح کی کرنسی تسلیم کریں، ایک ہی طرح کے قوانین کی تعمیل کریں، سماجی رویوں کے ایک جیسے نمونوں پر چلیں یا ایک ہی جیسی زبان استعمال کریں تو وہ زیادہ بہتر اور خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں اور عموماً اس چیز کو یقینی بنانے کا فریضہ ریاست سر انجام دیتی ہے۔

ان چیزوں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے لوگوں کو اعتماد درکار ہوتا ہے۔ کنفیوشس سے لے کر برٹرینڈ ڈی جوونل تک اکثر سیاسی مفکرین معاشرے میں اعتماد کے فروغ کو ریاست کا اولین فریضہ قرار دیتے ہیں۔ قوانین، مشترکہ اقدار، مشترکہ زبانیں اور رسم الخط لوگوں میں باہمی اعتماد پیدا کرتے ہیں اور ان کیلئے یہ ممکن بناتے ہیں کہ وہ بلا خوف وخطر ایک دوسرے

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے معاملہ اور لین دین کر سکیں اور زیادہ وسیع اور طویل دورانیوں کے مشترکہ منصوبوں پر کام کر سکیں۔ آج کے جدید دور میں مشترک معیارات اور پروٹوکول یہی کردار سر انجام دے رہے ہیں جیسا کہ مثال کے طور پر وہ تکنیکی اصول ہیں جن کے تحت کمپیوٹر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں، یا پھر نفرت انگیزی روکنے والے قواعد وضوابط ہیں۔ جیسے کے اچھی ہمسائیگی کا انحصار اچھی باڑوں پر ہوتا ہے، غیر مبہم اصول وقواعد لوگوں کیلئے ایک دوسرے پر اعتماد کو آسان بناتے ہیں۔[17] جب کسی گروہ کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے تو اس گروہ کے ممبران کا باہمی اعتماد اس کی بقاء کیلئے فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ باہمی نفرت وخفگی کے شکار ایسے معاشرے کا کہ جس میں کسی مشترک اخلاقی مقصد کا فقدان ہو، دفاع کمزور پڑ جاتا ہے۔

یہ سب طرح کے مسائل مثلاً متصادم مفادات، تعاون اور اعتماد، بغیر ریاست کے رضا کارانہ طور پر حل کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے ہزاروں برسوں تک لوگ شادی بیاہ، بچوں کی پیدائش، فصلیں اگانے یا کسی نئے علاقے کی طرف نقل مکانی جیسے زندگی موت کے مسئلے کسی ریاست کے بغیر سماجی تنظیموں سے ہی حل کرواتے رہے۔ جدید فلاحی ریاست کے بیشتر کل پرزے پہلے باہمی امداد وتعاون کی انجمنوں اور سنگھوں نے تخلیق کئے۔ لیکن رضا کاریت دیگر لوگوں کے مسائل کا محض ایک جزوی سا جواب ہے۔ حتیٰ کہ اگر ہم رجائیت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ فرض کر بھی لیں کہ متصادم مفادات کے مسئلے پر قابو پایا جا سکتا ہے تو بھی ایک رضا کارانہ معاہدہ طے پانے میں بڑا وقت صرف ہوگا اور اس کے نفاذ پر بہت لاگت آئے گی اور اگر بہت بڑی آبادیوں کو پیش نظر رکھیں تو ایسے مذاکرات اور ان کے نتیجے میں طے پانے والے اصولوں کا نفاذ عملاً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر ریاست بیچ میں نہ آئے تو معاشروں میں استحصال اور دھوکہ دہی پنپنے لگتی ہے کیونکہ لوگ اپنے طور پر ایک دوسرے کے رویے کنٹرول نہیں کر سکتے اور ان کے تعاملات بلحاظ وقت محدود ہوتے ہیں۔[18] ریاست کے بغیر وہ دستاویزات (سمیریہ کی لوحات، روم کے طومار اور برطانیہ کی فائلیں جو1668ء میں ایجاد ہوئیں اور جنہوں نے افسر شاہی نظام کی ترویج میں بہت اہم کردار ادا کیا) بھی ممکن نہیں جو بتاتی ہیں کہ کس کس نے ٹیکس ادا کر دیے ہیں اور کون کون جرائم کا مرتکب ہوا ہے۔ اس طرح ایک طرح کا نظام تو ممکن ہوسکتا ہے لیکن اگر آپ اس کا موازنہ ریاست

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے قائم کردہ سماجی نظام سے کریں تو یہ غیر متوازن اور نا درست ہوگا۔[19]

تشدد، زر اور اعتماد

ریاستیں اس لئے وجود میں آتی ہیں کہ وہ اپنے حکمرانوں کیلئے فائدہ مند ہوتی ہیں اور باقی سب کیلئے بھی فائدہ مند ہو سکتی ہیں۔ اس دوہرے کردار۔ یعنی آقا کا اور خادم کا...... کی عکاسی طاقت کے ان وسائل سے ہوتی ہے جن سے کہ ریاستوں نے استفادہ کیا ہے۔ کسی ریاست کی طاقت کا سب سے واضح وسیلہ قوت ہوتا ہے جسے روایتاً ریاست کی سب سے بنیادی صلاحیت خیال کیا جاتا ہے (میکس ویبر ریاستوں کی تعریف تشدد کی اجارہ داریوں کے طور پر کرتا ہے[20]) اور یہی قوت وہ فیصلہ کن منطق ہے جس کے طفیل ریاستیں اخلاقی روش اختیار کرنے میں اس قدر دقت محسوس کرتی ہیں۔[21] دوسروں کو مطیع کرنے کیلئے عموماً انعامات کی بجائے تشدد کو بہت آسان اور سستا طریقہ خیال کیا جاتا ہے۔ ریاستیں باغی فوجوں سے لے کر دہشت گردوں تک عسکری طاقت کے حریف مراکز کو کچلنے کیلئے جو کچھ بھی ان کے بس میں ہو بروئے کار لاتی ہیں اور روایتاً حکمرانوں کی حاکمیت کا زیادہ خالص اظہار ان کی اپنے لوگوں کی زندگی و موت پر اختیار سے ہوتا ہے۔ چین میں بادشاہ کی حاکمیت کی بنیاد وہ رسومات تھیں جن میں وہ قربانی، شکار اور جنگ کی صورت میں تشدد کا باقاعدہ حکم دیتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ جانیں لینے کا ایک قانونی طریقہ تھا۔ آج بھی دیکھیں تو امریکی صدر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ سزائے موت پانے والے مجرموں کی جان بخشی کر سکتا ہے۔

تاہم ویبر نے ریاست کی جو تعریف کسی خاص علاقے میں تشدد کے اجارے کی حامل کسی تنظیم کے طور پر دی ہے وہ غلط محسوس ہوتی ہے۔ عہد جدید سے قبل کسی بھی ریاست کو اس مفہوم میں اجارہ داری حاصل نہیں تھی۔ پرانے حکمرانوں کی مار اپنے پایہ تخت یا چھاؤنی سے چند یوم کی مسافت سے زیادہ کی نہیں ہوا کرتی تھی۔[23] زیادہ حکمران اپنے گورنروں، سرداروں اور باجگزاروں پر انحصار کرتے تھے۔ بعض عظیم سلطنتیں بڑے بڑے منصوبوں کا اہتمام بھی کرتی تھیں مثلاً اہرام، بڑے بڑے آبپاشی کے منصوبے، اینگکر واٹ جیسے معبد یا

allurdupdfnovels.blogspot.com

پھرتے واٹی واکان جیسے شہر اور شاہراہوں کے وسیع وعریض جال ۔لیکن ان کیلئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دارالحکومت سے سینکڑوں میل دور کسی شہر یا قصبے کے معاملات کو کنٹرول کر سکیں۔ چین کا شمار ان ریاستوں میں کیا جاتا تھا جن کی حکومت بہت مضبوط تھی اور جن کے پاس ایک اچھی خاصی افسر شاہی اور خفیہ پولیس کا نظام بھی تھا مگر اس کے باوجود ایک پرانی کہاوت کہتی ہے کہ پہاڑیاں بلند ہیں اور شہنشاہ بہت دور ، اور پھر یہ بھی ہے کہ باہر سے تو دیکھنے والوں کو بہت عظیم الشان قسم کا استحکام اور امن وامان نظر آتا تھا جب کہ ملک کے اندر بغاوتوں کے لاوے کھولتے رہتے تھے جن میں بعض اوقات لاکھوں لوگ مارے جاتے تھے۔ انیسویں صدی کی تائپنگ بغاوت میں ایک اندازے کے مطابق دو کروڑ انسان لقمہ اجل بنے تھے۔ روس کا پطرس اعظم اپنے سرداروں اور افسروں کو فرامین جاری کیا کرتا تھا لیکن ایک مرتبہ اسے پریشان ہو کر انہیں دیگر تمام فرامین کی تعمیل کا فرمان جاری کرنا پڑا۔ چنانچہ ریاستوں کی طاقتیں محدود تھیں۔ وہ جنگیں کرتی تھیں اور پلیں اور نہریں تعمیر کرواتی تھیں یہاں تک کہ نئے مذاہب بھی رائج کرتی تھیں مگر وہ امراض کے علاج یا بلووں کو روکنے سے قاصر تھیں اور چندلوگوں سے زیادہ کو امیر بنانا بھی ان کے بس میں نہیں تھا۔

یہ تو صرف ماضی قریب میں آ کر ہوا ہے کہ ریاستوں کو تشدد پر کوئی جیسی تیسی اجارہ داری حاصل ہوئی ہے جس کا سبب مواصلات و پیغام رسانی کے وسیع نظام ، شاہراہیں، ریلوے اور قومی پولیس ہیں۔ انگلستان میں ٹیوڈور حکمرانوں کا یہ بڑا کارنامہ مانا جاتا ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے سرداروں کی عسکری قوت کا خاتمہ کیا اور انہیں اپنے لشکر اور قلعہ بندیاں ختم کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد ان کی اپنے قلعوں پر مورچے بنانے کیلئے لائسنس حاصل کرنے کی درخواستیں نامنظور کی جانی لگیں۔ فرانس کے بادشاہ لوئی سیزدہم نے بھی اپنے ایک وزیر رشلو کے کہنے پر باغی سرداروں کے قلعے تباہ کروا دیے تھے۔ بقیہ یورپ میں تشدد کی ریاستی اجارہ داری کا آغاز 1648ء میں معاہدہ ویسٹ فالیہ سے جس کی رو سے وڈیروں اور نوابوں کی نجی فوجیں ختم کر دی گئیں تھیں۔ لہٰذا ویبر کی تعریف قدیم دور کی نسبت جدید دور پر زیادہ صادق آتی ہے بلکہ اب تو تشدد کی اجارہ داری کا نہ ہونا کسی ریاست کی ناکامی کی سب سے بڑی علامتبن گئیہے۔ کمزور ریاستوں میں مضبوط ریاستوں کی نسبت زیادہ بلند سطح کا تشدد دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ایسی ریاستیں گاہے خود فسادیوں سے مل جاتی ہیں اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

گا ہے ان سے چشم پوشی کی روش اختیار کر لیتی ہیں۔ سوڈانی حکومت نے ان جنجویدی لشکروں کے ساتھ مل کر یہ سب کچھ کیا جنھوں نے2000 کے عشرے میں ڈارفور میں تشدد کا بازار گرم کیا رکھا۔ اس کے برعکس مضبوط حکومت کی حامل بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نسبتاً زیادہ جمہوری ریاستوں کی بڑی نشانی یہ ہے کہ ان میں تشدد بہت حد تک کم نظر آتا ہے۔ تشدد پر کنٹرول نہ صرف قومی ریاستوں بلکہ بین الاقوامی حکومت کا بھی امتیازی وصف بن چکا ہے۔ اقوام متحدہ کے منشور کی اہم ترین شق یہ تھی کہ ریاستی جارحیت کو جرم تصور کیا جائے گا۔

ریاستوں کی فوجیں اور پولیس رکھنے کی صلاحیت کا انحصار ہمیشہ پیسے بلکہ زیادہ صحیح زبان میں ان کی لوگوں کے وقت پر تصرف کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ چارلز ٹلی کے الفاظ میں تقریباً تمام جنگ باز ریاستیں وسیع پیمانے پر ادھار لیتی ہیں، ٹیکس اکٹھے کرتی ہیں اور متامل شہریوں سے جنگی وسائل ......بشمول جوانوں کے ......جمع کرتی ہیں۔[24] پرانے وقتوں میں ہر ریاست انسانوں کی تجارت میں مشغول رہی ہے۔ یہ اکثر وہ لوگ ہوتے تھے جو پڑوسی علاقوں پر عورتوں اور کارکنوں کو پکڑنے کیلئے کئے گئے حملوں میں ہاتھ آتے تھے۔ ہان عہد کے چین میں کسانوں کو ہر سال اپنا ایک مہینہ شہنشاہ کو دینا پڑتا تھا۔ عہد آمریت کے فرانس اور دیگر کئی ملکوں میں ہر نوجوان کو اپنی زندگی کے دو یا تین سال ریاست کو دینا ہوتے تھے۔ اس قسم کی جبری لام بندی آج بھی کئی ممالک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن جس طرح قدیم ریاستوں میں تشدد کے اجارے کا فقدان تھا ویسے ہی ان میں ٹیکس اکٹھے کرنے کی طاقت کی بھی کمی تھی، یہ دونوں اختیارات خود مختاری کے تبادلے مین دینے پڑتے تھے۔ صوبیدار اور گورنر اس بات کا ثبوت ہیں کہ ریاست کی اجارہ داری بہت محدود تھی۔

ٹیکس اور جبری بھرتی کیے گئے سپاہی فالتو وسائل پر تسلط جمانے کے ذرائع تھے۔ قدیم میسو پوٹیمیا اور مصر کی آبی تہذیبوں کے زائد غذائی وسائل سلطنت اور اہراموں کی فضول خرچیوں کیلئے بنیاد مہیا کرتے تھے۔ موخر قرون وسطیٰ کی نئی حرفتیں وہ زائد وسائل پیدا کرتی تھیں جو بحری بیڑے اور محلات تعمیر کرنے والی آمریتوں کی راہ ہموار کرتے تھے اور صنعتی انقلاب کے اس سے بھی وافر وسائل نے یورپی سلطنتوں اور مطلق العنانیت کو پروان چڑھانے میں مدد دی۔

جیسے جیسے ریاستوں کے تشدد پر کنٹرول میں اضافہ ہوا ویسے ویسے ان کے وقت پر

allurdupdfnovels.blogspot.com

تصرف میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انگلستان کی ریاست نے فیصلہ کن قدم اس وقت لیا جب 1540ء میں ہنری ہشتم نے جنگی سازو سامان کے علاوہ دیگر مقاصد کیلئے بھی ٹیکس لگانے شروع کر دیئے تھے اور نپولین کی جنگوں تک آتے آتے برطانیہ قومی آمدنی کا تقریباً چوتھائی حصہ ٹیکسوں کی صورت میں اکٹھا کر رہا تھا جو کہ اس کے حریف فرانس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ جدید حکمران اپنے زر جاری کرنے کے اجارہ دارانہ اختیار کی بڑے حاسدانہ انداز سے حفاظت کرتے ہیں اور مرکزی بینک اور فوج جدید قومی ریاست کے قلب میں براجمان ہوتی ہے۔ وقت لیبر مارکیٹوں میں زیادہ آسانی سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے جہاں یہ غیر شخصی طور پر خریدا اور بیچا جاتا ہے اور آمدن، بکری اور دولت پر لگائے گئے ٹیکسوں سے بعض ویسے ہی نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جیسے جبری بھرتی کئے گئے فوجیوں سے حاصل کیے جاتے تھے۔ اکثر ترقی یافتہ معاشروں میں ہفتے کے دو یا تین دن ریاست کیلئے کام کیا جاتا ہے اور بچپن کا بیشتر حصہ بھی لازمی تعلیم کے ذریعے ریاست لے جاتی ہے۔ جمہوری ریاستوں میں یہ وصولی جبراً مسلط نہیں کی جاتی بلکہ لوگ اپنی رضا سے پیش کرتے ہیں اور امیر ملکوں میں غریب ریاستوں کی نسبت شہریوں اور تجارتی و کاروباری اداروں سے زیادہ مال وصول کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ امیر افراد میں صحت اور تعلیمی سہولیات کی مانگ زیادہ ہوتی ہے لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عالمگیریت اور انٹرنیٹ کے باوجود، امیر ریاستوں کے پاس اس بات کا علم نسبتاً زیادہ ہے کہ مختلف سرگرمیوں سے ٹیکس کیسے حاصل کیے جائیں۔ بایں ہمہ ریاست کے بارے میں آج بھی لوگوں میں یہ احساس بہت شدید ہے کہ یہ ایک طفیلیئے کی طرح ان کا خون چوستی ہے اور یہ احساس بعض اوقات ٹیکس بغاوتوں میں منظر عام پر بھی آ جاتا ہے جیسے کہ 1970ء کے عشرے میں کیلی فورنیا میں ہوا تھا۔ ایسی بغاوتیں عموماً بہت زیادہ ٹیکس ادا کرنے والے افراد بپا نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ کرتے ہیں جو محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ ٹیکس ان کی آمدنیوں کو سب سے زیادہ چاٹ رہا ہے۔

تشدد پر کنٹرول کا انحصار وقت پر کنٹرول پر ہوتا ہے لیکن وقت پر کنٹرول کا انحصار ایک دوسری زیادہ بنیادی چیز پر ہوتا ہے۔ یہ دوسری چیز دوسروں کے ذہنوں اور سوچوں کو اپنی طرف لبھانے اور مبذول کرنے کی صلاحیت ہے۔ کنفیوشس لکھتا ہے کہ ہر حاکم کو ہتھیار،

allurdupdfnovels.blogspot.com

خوراک اور اعتماد درکار ہوتا ہے لیکن اگر ان میں سے کوئی جنس ترک کرنے کی بات آئے تو اعتماد کی بجائے ہتھیاروں اور خوراک کو پہلے چھوڑنا چاہیے کیونکہ اگر اعتماد اٹھ جائے تو ہتھیار اور خوراک بھی نہیں رہیں گے۔[26] اقتدار کو خوف سے تقویت دی جا سکتی ہے مگر خوف کبھی بھی کلیتاً اعتماد کا نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتا۔

حکومتوں کیلئے نہ صرف اپنی بقاء کے لئے بلکہ اپنا روزمرہ کا کام چلانے کیلئے بھی اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کی عدم موجودگی میں قانون شکنی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور معلومات اور ٹیکس اکٹھے کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اعتماد کے بغیر فرائض اور ذمہ داریاں بانٹنا ناممکن ہو جاتا ہے اور حکومت کے بیشتر کام میں یہ ہوتا ہے کہ اوپر والے اپنے نمائندوں کو ذمہ داریاں سونپتے ہیں اور پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ وعدے کہاں تک پورے ہوئے ہیں اور کون قابل اعتماد ثابت ہوا ہے۔[27]

ریاستیں اعتماد پیدا کرنے کے لئے لوگوں کی سوچ کی صورت گری کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے پاس لوگوں کے ذہنوں پر تصرف کی ایک خاص قابلیت ہوتی ہے۔ قدیم مصر اور شاہی دور کے چین کی طرح کی مضبوط ترین ریاستوں کا طرہ امتیاز ان کی حرفتیں یا فوجی قوت نہیں بلکہ ان کی نظریاتی مہارت ہے۔ یہ وہ ریاستیں ہیں جنہوں نے لوگوں کو سوچنے میں مدد فراہم کرنے والے اہم ترین مقولات کے تعین میں کامیابی حاصل کی مثلاً کیا جائز ہے اور کیا ناجائز؟ کون اپنا ہے اور کون بیگانہ؟ کیا صحت افزاء فطری یا مقدس ہے اور کیا نہیں۔

طاقت کے ان تینوں وسائل یعنی تشدد، زر اور اعتماد کا آپس میں بڑا قریبی تعلق ہے۔[28] تشدد پر کنٹرول وقت اور پیسے پر کنٹرول پر منحصر ہے اور وقت اور پیسے پر کنٹرول اعتماد پر انحصار کرتا ہے جو ایک اخلاقی نوعیت کی چیز ہے۔

طاقت کے یہ تینوں وسیلے مل کر سیاسی اقتدار کو سہارا دیتے ہیں اور پھر یہ اقتدار اعلیٰ قوانین کا نفاذ کرتا ہے، احکامات صادر کرتا ہے اور ملک و قوم کو متحد رکھتا ہے۔ یہ اقتدار قوت، پیسے اور اعتماد کے بغیر کچھ بھی نہیں لیکن یہ اپنے آپ کو ایک مختلف نوع کی طاقت یعنی ایک ایسی خالص طاقت کے طور پر پیش کرتا ہے جس سے بقیہ سب چیزیں نکلتی ہیں۔ یہ اپنی فوجوں کے ذریعے قوت مرتکز کرتا ہے، خزانوں کے ذریعے وسائل مرتکز کرتا ہے اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

ذہن بنانے کیلئے طاقت مرتکز کرتا ہے۔ آج کل اس مقصد کیلئے بڑے بڑے تعلیمی اور مواصلاتی نظام بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔(31)

سیاسی اقتدار ایک قسم کی طاقت کو دوسری قسم کی طاقت میں بھی تبدیل کرتا ہے۔ جواز کی کرنسی کو ٹیکسوں کے ذریعے پیسے میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ پیسے سے فوجیں خریدی جا سکتی ہیں اور اسے محلات، انعامات اور عوامی یادگاروں کے ذریعے عزت اور اتھارٹی میں بھی بدلا جا سکتا ہے۔ اسے رفاعی اور فلاحی کاموں کے ذریعے حمایت حاصل کرنے کیلئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات پیسے سے احترام بھی خریدا جاتا ہے مثلاً منگول چینی بادشاہوں کو خراج تحسین پیش کرتے تھے اور اس کے بدلے میں انھیں ڈھیر ساری رقوم اور مال و متاع ملتا تھا۔ عاجزی کے لبادے میں تحفظ کا حیلہ۔(32)

طاقت کے ان تینوں وسیلوں میں سے حاکمیت کیلئے اہم ترین چیز سوچوں پر تصرف ہے جس سے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ تشدد صرف منفی طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے، پیسہ صرف دو سمتوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے، دے دو یا لے اڑو۔ لیکن علم اور سوچیں چیزوں کی کایا پلٹ سکتے ہیں، پہاڑوں کو ہلا سکتے ہیں اور دو گھڑی کے اقتدار کو ایسا بنا کر پیش کر سکتے ہیں کہ یہ ابدی دکھائی دینے لگے۔(33)

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 3

تیز تر ارتقاء

''محکومی کا مطلب یہ ہے کہ ایسی مخلوقات آپ کی نگرانی، معائنہ، جاسوسی، مخبری، جانچ، پڑتال، پرکھ، پڑچول، آنک، اندراج، تبلیغ، ہدایت، تخمینہ اور تعریف کرتی ہیں کہ جنہیں نہ تو ایسا کرنے کا حق پہنچتا ہے، نہ ہی ان کے پاس اس کی عقل ہوتی ہے اور نہ ہی ایسا کرنے کی ان میں صلاحیت ہوتی ہے۔ (پیئر ژوزف پرودواں)

جدید دور کے بہت سے ابتدائی مفکرین کو امید تھی کہ اچھی حکومت اور انسانی فطرت کا مرکب دنیا میں بہتری لے آئے گا۔ ایڈم سمتھ نے بڑے اعتماد سے لکھا تھا کہ ''کسی ریاست کو بدترین بربریت سے اعلیٰ ترین درجے کی خوشحالی تک لانے کیلئے صرف اور صرف امن، آسان ٹیکسوں اور قابل تحمل انصاف کی ضرورت ہے باقی ساری چیزیں خود بخود ہی چلی آئیں گی۔'' جان سٹوارٹ مل کا نسخہ قدرے مختلف تھا بہتر حکومت اور ملکی قوانین، توہم پرستی کی بیخ کنی اور ذہنی سرگرمی کی نشوونما اور خارجی فنون (جس سے اس کی مراد ٹیکنالوجی تھی) اور خارجی سرمائے کی پذیرائی۔ لیکن وہ بھی دنیا کی ترقی کو فطری خیال کرتا تھا جو اس کیلئے بہر طور خدا کی کاریگری تھی۔

لیکن ہمارا مشاہدہ بتاتا ہے کہ ریاستوں کا ارتقاء کسی ہموار انداز میں آگے نہیں بڑھا۔ بعض وقتوں میں ریاست کی تمام مقولات ...... جمہوریتوں اور سلطنتوں، ملائیتوں اور راجواڑوں ...... کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ بعض اوقات ہمیشہ کیلئے اور بعض اوقات زیادہ اچھے حالات کے پلٹنے تک۔ نشاۃ ثانیہ کی یورپی ریاستیں1500 برس قبل بحیرہ روم کے گرد آباد

allurdupdfnovels.blogspot.com

ریاستوں سے کوئی زیادہ بہتر نہیں تھیں۔ منگ عہد کا چین یقیناً تانگ عہد کے چین سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھا۔ بعض صورتوں میں عسکری صلاحیت تو بہت زبردست تھی لیکن سیاسی تخیل بہت پست تھا۔ بعض ریاستیں فتوحات میں تو بہت شاندار تھیں لیکن انہیں نئے علاقہ جات میں انتظام چلانا نہ آیا۔ بعض قدیم ریاستیں ہر معیار سے بہت ترقی یافتہ تھیں۔ پانچویں صدی کے بودھی سیاح فاہیان نے ہندوستان کی گپت سلطنت کے بارے میں لکھا ہے:

''لوگ بہت خوشحال ہیں، بغیر ٹیکس اور سرکاری بندشوں کے ......بادشاہ جسمانی سزاؤں کے بغیر حکومت چلاتے ہیں، مجرموں کو حالات کے مطابق جرمانہ کیا جاتا ہے ......بادشاہ کے ذاتی معاونین مقررہ تنخواہیں وصول کرتے ہیں۔'' (چند سو سال پیشتر شمالی ہند میں اشوک جیسے فرمانروا بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ روشن خیالی اور اخلاق کے منارے بھی تھے لیکن ایسا اس لیے ہے کہ ارتقاء کا کوئی پیٹرن نہیں اور جہاں تک اشوک کا تعلق ہے اس کی سلطنت 232 ق م میں اس کی وفات کے بعد بہت جلد منہدم ہو گئی تھی)۔

ایسی مثالیں کم کم ہیں اور وہ بھی کسی اور چیز کی بجائے قسمت کا نتیجہ ہیں۔ تاریخ میں کم ہی کوئی صلہ نصیب ہوا ہے، اور قدیم دنیا میں اور پھر ابتدائی جدید زمانے میں عوامی حکومتیں اور جمہوریتیں اپنے زیادہ عسکری پڑوسیوں کے ہاتھوں فنا ہوتی رہی ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی چھوٹی ریاست کی انتہائی باصلاحیت فوج کسی بڑی سلطنت کی نالائق اور بے حوصلہ فوج کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئی۔ وہی خوبیاں جو ایک صدی میں ایک شاندار تہذیب کے پنپنے کا سبب بنیں کسی اور صدی میں جمود اور عدام رواداری کا باعث بن گئیں اور یہ بات کبھی بھی ضمانت نہ بن سکی کہ ایک تہذیب کی خوبیاں اس کی ریاست کی خوبیوں میں بھی آپ ہی آپ ظاہر ہوں گی۔ سموئیل فائنر اوائل قرون وسطیٰ کی اسلامی خلافت کے بارے میں لکھتا ہے:

''آمرانہ طرز کی حکومت کے طور پر اس کے بہت سے خلفاء اور اس کے حکام کی اکثریت، بالائی اور زیریں دونوں'' اور مبینہ طور پر بہت سے قاضی خودغرض محسوس ہوتے ہیں ...... حیران کن بات ہے کہ اس قدر شاندار اور تخلیقی معاشرہ اتنا ابتر نظام حکومت پروان چڑھائے۔

تاہم حالیہ دور کی تصویر میں فیصلہ کن تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ گذشتہ دو صدیوں کی

allurdupdfnovels.blogspot.com

خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے ریاستوں کی تشدد، پیسہ اور اعتماد کو منظم کرنے کی صلاحیتوں کو بے مثال ترقی دی ہے۔ سماجی ارتقاء حیاتیاتی ارتقاء سے بہت مختلف شے ہے۔ تغیرات کے اسباب بہت مختلف ہیں Sexual recombination کا ہم پایہ کوئی نہیں اور نتیتیں فیصلہ کن ہو سکتی ہیں۔ نئے امکانات کی تیز تر پیدائش، ناکامیوں سے جلد چھٹکارے اور کامیابیوں کی تیز تر تقلید کے ساتھ تبدیلی کی رفتار تیز ہو چکی ہے۔ اس ارتقاء کو اس سرمایہ داریت، عالمی معیشت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ سے الگ نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے حکومت میں ترقی کے ساتھ دنیا کے بہت سے علاقوں میں جسامت میں 50 فیصد، عمر میں 100 فیصد اضافے اور علم میں بے حد وحساب توسیع میں ایک قابل قدر کردار ادا کیا ہے لیکن بہترین اور بدترین دونوں قسم کی جدیدیت اگر صحیح معنوں میں نظر آتی ہے تو وہ ریاستوں کے رویے میں۔

علم اور روابط

یہ بدلاؤ کیسے رونما ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نئے علم نے جیسے حکومت کو تبدیل کیا اسی طرح اس نے سائنس اور صنعت کو بھی تبدیل کیا۔ دوسرے شعبوں کی طرح سیاست میں بھی تمام ترقی نئے علم اور تصورات سے واقع ہوتی ہے، خصوصا ایسا علم جو اداروں میں مضمر ہوتا ہے، یا وہ والا کہ جو متعاون رویے کے انعامات میں اضافہ کرتا ہے۔[3]

ماضی بعید میں حکومت کی سائنس وضع کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ چین میں پانچویں صدی قبل مسیح میں کنفیوشس نے کہا تھا کہ 'کسی مسئلے کے بارے میں کسی نتیجے تک پہنچنے کیلئے زیادہ سے زیادہ مختلف قسم کی آراء جمع کی جانی چاہئیں اور مکمل غیر جانبداری اور بے غرضی کے جذبے سے حقائق کا بہت ہی احتیاط سے مطالعہ کیا جانا چاہیے اور پھر مسئلے کو متعدل، عملی اور منطقی انداز سے بہترین اخلاقی اصولوں کے مطابق حل کیا جانا چاہیے۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے ایک عالم پوہائی نے ایک کتاب تحریر کی تاکہ وہ طریقے بیان کرے جنہیں اختیار کر کے کوئی حکمران اپنا مقام برقرار رکھ سکتا ہے اور انتظامی تکنیک اور اخلاقی نفسیات کے ذریعے اپنی ریاست کو خوشحال بنا سکتا ہے[4] اور 124 ق م میں مستقبل کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

آفیسروں میں صحیح قسم کے علم اور اقدار کو فروغ دینے کیلئے ایک شاہی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔

تاہم دو ہزار سال بعد یورپ میں حکومت پر نئے علم نے نسبتاً بہت زیادہ اثرات مرتب کیے کیونکہ اس دور میں دیگر انقلابات بھی کام کر رہے تھے جس سے علم بڑی سرعت سے ترقی کر رہا تھا۔ استقرائی استدلال کا اطلاق، نیا سائنسی علم پیدا کرنے کیلئے دانستہ حکمت عملیاں (مثلاً ریاستیں مائیکرو چپ سے لے کر ورلڈ وائیڈ ویب تک انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تمام بنیادی پیش رفتوں کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کر رہی تھیں) مدنی علم کی ڈرامائی کشادگی اور جنگ سے متعلق نئے علم کا جمع ہونا (ڈریڈ ناٹس سے لے کر کروز میزائلوں تک) سائنسی حکومت کے آبا کو وہ شہرت اور ناموری حاصل نہ ہوسکی جو کہ نئے ہتھیاروں اور آلات کے موجدوں کو ملی مگر اثرات کے اعتبار سے وہ کسی سے کم نہ تھے۔ ان کی کاوشوں نے حکومت کے اخلاقی امکان نیز اس کے خطرات کی کایا کلپ کر کے رکھ دی۔

پروشیا میں فریڈرک اعظم اور فرانس میں لوئی چہاردہم نے انقلابی انتظامی مصلحین کی بہت حوصلہ افزائی کی جنہوں نے ولیم پیٹی اور ولیم پیٹرسن (جس نے 1690ء کے عشرے میں بینک آف انگلینڈ کی بنیاد رکھی تھی) جیسے اپنے انگریز ہم منصبوں کے ساتھ مل کر حکومت کے کام میں عقلیت اور ریاضی متعارف کرائی۔ انہوں نے جس طرائق سے یہ کام کیا اب وہ عام ہو چکے ہیں۔ پیٹی اور جان گرانٹ نے سیاسی حساب کا ایک غیر مرئی کالج' قائم کیا جس نے اس امر کو یقینی بنایا کہ شماریات عقلی حکومت کا سنگ بنیاد فراہم کرے۔ دیگر افراد نے حسابات، ٹیکسوں کی وصولی اور معلومات منتقل کرنے اور پراسیس کرنے کیلئے نئے طریقوں پر کام کیا۔ ان نئی تکنیکوں نے لوگوں کو مقولات کے طور پر لیا اور انہوں نے ریاستوں کو پہلے کی نسبت زیادہ غیر شخصی اور تقسیمات اور امکانات کی تشویش سے زیادہ حسابی کتابی بنا دیا۔ لیکن علم کی اس جستجو میں اخلاقی سدھار کی رنگت بھی موجود تھی۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں پرشیا میں یہ اصول رواج پایا کہ فوج، ٹیکس، سکولوں اور ڈاکخانے کے اہلکار عوام کی خاطر فرائض سرانجام دیں گے نہ کہ جاگیر دار اشرافیہ کیلئے ''کیمرالسٹ'' اصلاحی تحریک جو کہ فریڈرک ولیم اول اور فریڈرک اعظم کے دور میں پروان چڑھی، کا نصب العین تھا کہ بذریعہ قواعد وضوابط حکمران اور اس کی رعایا کے لوگوں کی مشترکہ مسرت میں اضافہ کیا جائے اور اس مقصد کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

لئے ''حسب ونسب کی بجائے قابلیت، جاگیرداری قانون کی بجائے انتظامی سائنس، مقامی رواج کی بجائے معیاری اصولوں اور روایت کی بجائے رسمیت اور پیشہ ورانیت کو ترجیح دی جائے۔(3)

ان اصلاحات نے حکومت کی روز مرہ سرگرمیوں کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور ٹیلی گراف، ٹیلی فون ،سیٹلائٹ اور کمپیوٹر کی آمد سے بہت پہلے ہی ان کیلئے بڑے معاشروں کے ہر کونے کھدرے تک رسائی ممکن بنا دی۔ انہوں نے ریاستوں کیلئے نئے عزائم کا تخیل بھی ممکن بنایا،حتیٰ کہ اٹھارھویں صدی کے پروشین مصلحین نے عوامی بھلائی میں مختلف قسم کے اخراجات کے کردار پر بحث و مباحثے کا بھی آغاز کیا۔ ایک صدی بعد یہ شماریات میں مہارت ہی تھی کہ فلورنس نائیٹ انگیل نے اس قدر جوش و جذبے سے صفائی ستھرائی کی مہم چلائی اور اس وقت سے یہ فطری وسماجی سائنس کی ترقی ہی ہے جس نے لوگوں کو غربت سے بچانے ، ان کی عمر میں اضافے اور شرح قتل میں ڈرامائی تخفیف کے سلسلے میں ریاستوں کی معاونت کی ہے۔ یہ علم اور جدوجہد کوئی اتنی سستی بھی نہ تھی۔ اس کیلئے ان گنت انسانوں کو کام کرنا پڑا۔1821ء میں برطانیہ میں کام کرنیوالے بیورو کریٹوں کی تعداد27000 ، پروشیا میں23000 اور یو ایس اے میں8000 تھی اور ساٹھ برس کے عرصے میں ان اعداد و شمار میں دس گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ ہر وہ چیز جو ہم اب جدید ریاست کی فلاح و خدمات سے منسوب کرتے ہیں اس چیز پر منحصر ہے جسے تاریخی معیارات کی رو سے نگرانی وعمل کی وسیع قوتیں کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ شاید اس کی زیادہ توقع نہیں تھی نئے علم نے ریاستوں کے اخلاقی منظرنامے کو بھی تبدیل کیا ہے۔ روشن خیال مصلحین کا خیال تھا کہ نئے علم میں بس میٹھا ہی میٹھا ہو گا۔ لیکن شجر آ گہی کا پھل چکھنے سے زندگی مزید پیچیدہ اور اخلاقی طور پر تشویشناک ہو جاتی ہے۔ مثلاً ان سوالات کے کوئی سائنسی جواب نہیں ملتے کہ ایٹمی توانائی سے کیسے نمٹا جائے، تبدیلی آب و ہوا کو روکنے کیلئے کیا ہو، فضلات کو ٹھکانے کیسے لگایا جائے، رازداری ختم ہونے کے خوف اور انفرادی ضروریات کیلئے زیادہ موزوں سیکورٹی اور خدمات کے ممکنہ فوائد کے درمیان توازن کیسے قائم کیا جائے۔ اس بات کا جواب بھی آسان نہیں کہ تمباکو نوشی جیسی چیزوں کے متوقع نقصانات کا سدباب کیسے کریں اور نئی ٹیکنالوجی (مثلاً ننیو ٹیکنالوجی) کے غیر ارادی سائیڈ ایفیکٹس کو کیسے کنٹرول کریں۔ پہلے

allurdupdfnovels.blogspot.com

یہ کہا جاتا تھا کہ اگر آپ کسی کو مچھلی دیتے ہیں تو وہ ایک دن کیلئے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے لیکن اگر آپ اسے مچھلی پکڑنا سکھا دیتے ہیں تو وہ کبھی بھی خالی پیٹ نہیں سوئے گا لیکن آج کل کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کسی کو مچھلیاں پکڑنا سکھائیں گے تو وہ ضرورت سے زائد مچھلیاں پکڑنا شروع کر دے گا۔ علم ہمیشہ اچھا نہیں ہوتا۔ جہالت ہوسکتا ہے کہ نعمت نہ ہو، کم از کم یہ سادہ ضرور ہوتی ہے۔

ریاست کے ارتقاء کو تیز تر کرنیوالے نئے علم کو افراط روابط نے اور بھی دو چند کر دیا۔ عالمی ریاست کا پھیلاؤ بہت سفاک اور متلون مزاج تھا (اتنے شہر مسمار ہوئے، اتنی قومیں تباہ ہوئی، اتنے لوگ تہہ تیغ کئے گئے اور دنیا کا بہترین خطہ موتیوں اور مرچوں کیلئے برباد کر دیا گیا، مؤنتین نے تسخیر امریکہ کے وقت اپنے جذبات کا اظہار کیا) تاہم یہ عہد اپنے پیچھے ریلوے، بحری راستوں اور بین البحری کیبلوں ریڈیو ٹرانسمٹر وں اور بندرگاہوں کا ورثہ چھوڑ گیا اور اس سے دولت، اشیاء، لوگوں اور نظریوں کے بہاؤ میں جو اضافہ ہوا اس نے فاتحین اور مفتوحین دونوں کی کایا کلپ کر کے رکھ دی۔ ایک ورثہ روز افزوں منظّم ہوتی عالمی رائے عامہ بھی تھی جس نے غلامی اور سامراجیت کے بدترین مظالم کے خلاف جدوجہد کا علم بلند کیا (کیا میں انسان نہیں ہوں، کیا میں بھائی نہیں ہوں، یہ نعرہ تھا اس اولین جدید سماجی تحریک کا جس نے اڑیل سیاستدانوں پر اخلاقی اصول نافذ کیے)۔

ایک اور ورثہ نظریات کی تیز تر تقلید تھی۔ ماضی کی ریاستیں بھی اپنے پڑوسیوں سے مفید اسباق سیکھتی تھیں مگر انیسویں صدی میں آ کر باہمی اثر پذیری میں کچھ زیادہ ہی تیزی آنا شروع ہوگئی۔ مردوں کے لئے بلا امتیاز حق رائے دہی 1870ء میں فرانس اور جرمنی سے نکلا اور 1874ء میں سوئٹزرلینڈ، 1839ء میں نیوزی لینڈ، 1900ء میں سپین، 1909ء میں سویڈن اور 1918ء میں برطانیہ تک پھیل گیا۔ زمانہ امن میں انکم ٹیکس پہلی بار 1842ء میں برطانیہ میں متعارف کرایا گیا تھا اور پھر 1861ء میں یہ سویڈن، 1864ء میں اٹلی اور 1867ء میں جاپان بھی جا پہنچا۔[8] چونکہ مختلف ریاستوں کو درپیش دباؤ بھی ایک سے تھے، نئی اختراعات بڑی سرعت سے ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچنا شروع ہوگئیں۔ سوشل سیکورٹی کا نظام بسمارک کے جرمنی سے لائڈ جارج کے برطانیہ کے راستے آگے پھیلا یہاں تک کہ ہر صنعتی ملک اسے اپنانے لگا گو اس کے پیچھے کسی حد تک مزدور تحریک کا بڑھتا ہوا خوف بھی موجود

allurdupdfnovels.blogspot.com

تھا۔ مزید ایک صدی بعد نجکاری کے پھیلاؤ کے وقت بھی یہی انداز دیکھنے میں آیا، ٹھیکے، فلاحی اصلاحات اور ماحولیاتی ضوابط جس کے نمایاں پہلو تھے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں بین الریاستی روابط کی بہت حوصلہ افزائی کی گئی کیونکہ اس وقت تک یہ احساس جڑ پکڑ گیا تھا کہ ان سے ریاستوں کی طاقت میں اضافہ ہو گا۔ لیکن اس سے ریاستوں کے اخلاقی ماحول میں بھی بدلاؤ پیدا ہوا اور ان کے دیگر ریاستوں کی سرگرمیوں اور دیگر شہریوں کے اعتقادات پر انحصار بڑھتا چلا گیا۔ یورپی لیڈروں کو اب یہ باور ہو چکا ہے کہ ان کی اپنی بقا کا دارو مدار اس بات پر ہے کہ دیگر خطوں کی مشکلک ریاستوں کو قائل کیا جائے کہ وہ اپنے ہاں کاربن کے اخراج میں تخفیف کریں۔ عین اسی طرح جیسے ان کی مادی سلامتی کا دارومدار ان سیاسی مسائل کے حل پر ہے جو دور کے علاقوں میں دہشت گردی میں اضافہ کا باعث بن رہے ہیں۔

ایک زیادہ متصل و مربوط دنیا میں بدترین آمروں کو بھی یہ سوچنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو جائز رنگ دیں کیونکہ باقی دنیا سے کٹنے کی بہت زیادہ قیمت چکانا پڑتی ہے۔ 1980ء کے عشرے میں نسل پرست جنوبی افریقہ کے خلاف بائیکاٹ کی تحریک نے اس کے حکمران ٹولے کا اعتماد پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا اور پھر اس سے دو دہائیوں بعد رابرٹ موگابے کے زمبابوے کو بھی غلط داخلی پالیسیوں کی بڑی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ میانمار کے فوجی حکمران بھی اس خوشحالی سے خالی دامن رہ گئے جس نے بیسویں صدی کے آخری حصے میں اس کے گردونواح کے پورے خطے کی قسمت بدل کے رکھ دی تھی۔ شمالی کوریا اس کے باوجود شاید ابھی تک اس لیے بچا آتا ہے کہ اسے چین کی صورت میں ایک طاقتور حمائتی ملا ہوا ہے۔

تبدیلی کی ان دونوں قوتوں یعنی علمی ترقی اور عالمی روابط میں اضافے نے ریاستوں اور شہریوں کے درمیان تعلق کو بدل کر رکھ دیا ہے اور باہمی انحصار میں ایک نئی شدت پیدا کی ہے جس نے جدید ریاستوں اور پہلے والی ریاستوں میں بہت امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ اس باہمی انحصار کے پیچھے اچھی اور بری دونوں طرح کی وجوہات کارفرما ہیں اور اس کے نتائج بھی دونوں ہی طرح کے برآمد ہوئے ہیں۔ اس کا آغاز سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے یورپ میں ریاستی مسابقت کے مخصوص حالات میں ہوا تھا جس نے تشدد، پیسے اور اعتماد کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

اتصال کے نئے طریقے ممکن بنائے تھے۔ اس مقابلے بازی میں زیادہ مضبوط اور سخت حکومت کی حامل ریاستیں اپنی حریف ریاستوں کی نسبت فائدے میں رہیں۔ وہ زیادہ فوجیں میدان میں لاسکتی تھیں، زیادہ پیسہ اکٹھا کرسکتی تھیں اور اپنے فوجیوں میں بہتر لڑائی جا جذبہ پیدا کرسکتی تھیں لیکن انہیں اس کامیابی کی ایک قیمت بھی چکانا پڑی۔ وہ یہ کہ زیادہ سخت حکمرانی سے ان ریاستوں کی نوعیت بدل گئی۔ اس سے وہ زیادہ وسیع اور بیوروکریٹک ہوگئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ محصولات کی حاجت کے سبب اپنے شہریوں کی خواہشات کی زیادہ مطیع اور لوگوں کے ساتھ طے پانے والی سودے بازیوں پر زیادہ منحصر ہوتی چلی گئیں، مزے کی بات یہ ہے کہ حکمرانوں کو زیادہ طاقت کے امکانات تو میسر آئے لیکن صرف اس صورت میں کہ اگر وہ اپنی پہلے والی طاقتوں کو بھی ارکان پارلیمان سے شیئر کریں۔ بعد میں انہیں یہ طاقت عوام کے ساتھ بھی شیئر کرنا پڑی (خواتین اور خدام وغیرہ کو کہ جو جنگی اعتبار سے زیادہ وقعت کے حامل نہ تھے، انتظار کرنا پڑا)۔

سویڈن اور ہالینڈ جنہوں نے بیسویں صدی میں خادم ریاستوں کا روپ اختیار کرلیا تھا اس ڈیل میں پہل کی۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں ان دونوں ممالک نے اپنی کل آبادی کے 5 فیصد کو مسلح کیا ہوا تھا جو کہ کسی بھی معیار سے بہت زیادہ تناسب بنتا ہے۔[9] اتنی اتنی بڑی فوجوں کو صرف بہت زیادہ ٹیکس لگا کر ہی برقرار رکھا جا سکتا تھا اور اس قدر ٹیکس اس صورت میں ممکن تھے کہ کسانوں اور برگروں کو زیادہ حقوق دیئے جائیں۔ برطانوی ڈیل کی نوعیت مختلف تھی۔ اس نے زیادہ محصولات اور پیدائش قرض کو طاقتور منتخب اسمبلی سے جوڑ دیا جو کہ ماضی میں اٹھارھویں صدی کی مہنگی جنگوں کے طفیل بادشاہ کی نسبت زیادہ اختیارات حاصل کر چکی تھی۔ فرانسیسی انقلاب ان انتظامات کو ایک نئی سطح تک لے آیا جس میں وسیع انقلابی فوج کو ہمہ گیر حقوق دینے کی کوشش کی گئی۔ ان میں سے ہر ملک ریاستوں اور ان کے عوام کے درمیان طے پانے والی زیادہ جامع ڈیلوں کو بیان کرنے کیلئے حقوق کی زبان استعمال کرتے ہوئے دوسروں کی نسبت زیادہ سرعت سے خدمت کے آئیڈیل تک جا پہنچا۔

چونکہ اکثر فعال ریاستوں نے دائرہ اقتدار وسیع کرنے کی حکمت اختیار کر لی تھی، دیگر ریاستوں کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ وہ ردعمل کی روش اختیار کریں۔ وہ برطانیہ و فرانس کی خوشحالی اور فوجی طاقت کا مقابلہ کرنے کی خواہاں تھیں اور وہ کامیابی

allurdupdfnovels.blogspot.com

حاصل کرنے کی خواہاں تھیں جو ان دونوں ممالک کو اپنے لوگوں کو قوم کی خدمت پر ابھارنے میں حاصل ہوئی تھی لیکن وہ ایسا اقتدار شیئر کیے بغیر کرنا چاہتی تھیں۔ جاپان کی حکمت عملی زیادہ واضح تھی اور اس نے اس چیز کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ اضافی کمزوری کو طاقت میں کیسے بدلا جا سکتا ہے۔1857ء میں ایک جاپانی وزیر ہوٹا ماسایوسی کے تحریر کردہ ایک میمو رنڈم میں یہ حکمت عملی بڑے کھلم کھلا انداز میں پیش کی گئی ہے۔

ہماری قومی قوت کو فروغ دینے اور دفاعی صلاحیت کی تکمیل کرنے کیلئے غیر ممالک کی بہترین چیزوں کی تقلید کر کے ہماری اپنی خامیوں کو رفع کرنے کیلئے، اس طرح بتدریج غیر ممالک کو ہمارے حلقہ اثر میں اس حد تک لانے کے کہ دنیا کے سارے ملک کامل امن و شانتی کے فوائد سے آگاہ ہو جائیں اور ہمارا تسلط پورے کرہ ارض پر تسلیم کر لیا جائے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں جاپان، روس اور جرمنی کی مقتدر حکمت عملیاں تکنیکی بالا دستی اور صنعتی قوت پر زور دیتی رہیں۔ چونکہ ہر ملک جمہوریت کو کم از کم رعایتیں دیتے ہوئے اوپر سے نیچے تک زیادہ سے زیادہ کارگر ریاست تشکیل دینے کیلئے کوشاں تھا (گو جرمنی میں اس کا میلان دوسروں کی نسبت زیادہ دیکھنے میں آیا) قومی اور استعماری شناخت کے اخلاقی دعوں نے سیاسی سریلش کا کام سرانجام دیا[10] اور پھر اخبارات اور ثانوی مدارس، پریڈوں اور اعلانات سے اس کا پرچار کیا گیا۔ شہنشاہ میجی، بسمارک اور زاروں کے بیسویں صدی کے جانشینوں نے اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر لوگوں کے جذبات حقیقی اور تصوراتی دشمنوں کے خلاف ابھارنا شروع کر دیئے۔ پھر رفتہ رفتہ زاریت کی جگہ سٹالنیت کی اجتماعی لام بندی، بسمارک کی جگہ ہٹلر (جس نے سٹالن کی طرح ایک اجتماعی سیاسی پارٹی کو عوام کی توانائی کو برانگیختہ کرنے کیلئے ایک آلے کی طرح استعمال کیا) اور ٹیکنو کریٹ میجیوں کی جگہ 1930ء کے عشرے میں نظر آنے والے جاپان عسکری جنون نے لے لی۔

یہ اعتقاد طمانیت بخش محسوس ہوتا ہے کہ جمہوریت خلقی اعتبار سے ان تمام متبادلات سے افضل تھی لیکن اس کی کوئی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی۔ اب ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ سٹالنیت، نازیت اور توجونیت کی عسکری ریاستوں نے خود فریبی، مستقل ضیاع اور آپے سے باہر نکلنے کی کوششوں کے نتیجے میں خود کو جلا ڈالا۔ لیکن گذشتہ صدی کے دوران بہت سے مواقع پر تھکی ماندی اور منقسم جمہورتیوں کی نسبت یہ ماڈل زیادہ متحرک لگنے لگے اور اس امر کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

امکان زیادہ لگنے لگا کہ یہی ماڈل مستقبل کی طرح ڈالیں گے۔

آج ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جس پر جمہورتیں حاوی ہیں، اس لیے نہیں کہ تاریخ کسی بے لچک منطق کی اندھا دھند پیروی کرتی ہے بلکہ زیادہ اس لیے کہ فیصلہ کن جنگوں میں جمہوریتوں کو فتح حاصل ہوئی۔ جمہورتیوں کی جنگ میں بہتر کارکردگی کی کچھ معقول وجوہات ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اس لیے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہوں کہ ریاست زیادہ مال غنیمت نہیں اینٹھتی، ممکن ہے وہ سائنسی تحقیق کیلئے ضروری آزادانہ فضا کی وجہ سے ٹیکنالوجی پیدا کرنے کے معاملے میں افضل ہوں اور ہوسکتا ہے کہ ان میں اپنے فوجیوں میں جذبہ ابھارنے کی صلاحیت زیادہ ہولیکن ان میں سے کوئی بھی چیز ناگزیر قرار نہیں دی جا سکتی ۔ جمہورتیں بھی منقسم ہوسکتی ہیں، اپنے حریفوں کے مقابلے میں دفاعی اخراجات سے زیادہ گریزاں ہوسکتی ہیں اور ان کے بارے میں بھی یہ امکان ہوسکتا ہے کہ وہ زیادہ اہم جنگوں میں بازی ہار جائیں۔

خدمت کے نظام : جمہوری فلاحی سرمایہ داریت کا عروج

اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں جمہورتیوں نے فوجی قوت ، پیسے اور اعتماد کے مابین روابط کے اعتبار سے اپنے حریف ماڈلوں پر بالا دستی حاصل کی ہے۔لیکن تاریخ ہمیں ایک سبق یہ بھی دیتی ہے کہ نسبتاً چند حکومتیں ہی کسی خاص عرصہ وقت میں زندہ بچ رہنے میں کامیاب ہو پاتی ہیں۔ امن و استحکام کمیاب اور بودی اجناس ہیں۔ صرف آٹھ موجودہ ملک ایسے ہیں جو1914ء میں بھی حیات تھے اور اس کے بعد بھی ان کی حکومت کا کسی پر تشدد عمل سے تختہ نہیں الٹا گیا۔ تاریخ بڑے مستقل انداز سے کمزوروں کو چھان کر الگ کر دیتی رہی ہے۔ آج اس کی نسبت صرف چند قسموں کی ریاستیں ہی باقی ہوں گی جتنی کہ ممکن ہوسکتی تھیں یا کہ جتنی ریاستوں نے ایسا کرنے کی جستجو کی ۔ یک جماعتی حکومت کی حامل اب صرف چند ہی ریاستیں دنیا میں دیکھی جا سکتی ہیں، کلاسیکی مفہوم میں کوئی بھی سلطنت یا کوئی بھی ''چوکیدار'' ریاست (انیسویں صدی کے لبرل عناصر کی پسندیدہ ٹھگنی ریاست) اب باقی نہیں بچی اور نہ ہی کوئی کمیون یا سوویت نظر آتے ہیں۔ ہر قسم کی ریاستیں خواہ وہ جثّے اور امارات کے اعتبار سے جیسی بھی ہوں اپنے شہریوں کی فلاح، ہنگامی طبی امداد اور تعلیم کیلئے کچھ نہ کچھ

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرتی ہیں۔ کوئی بھی ریاست براہ راست ریاستی عہدے فروخت نہیں کرتی اور نہ ہی کوئی ریاست غلامی پر انحصار کرتی ہے۔ اب کوئی بھی علانیہ اشرافیہ حکومتیں (اصلی مفہوم میں) نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی حکومت کا سربراہ ایسا نظر آتا ہے جو خود کو شہنشاہ کہلاتا ہو۔(11)

بیسویں صدی کے غالب سیاسی نظریے فرانسیسی انقلاب سے ماخوذ تھے جو خود انگریز مفکرین کا مرہون منت تھا: آزادی (ریاست کے استبداد سے) مساوات (بذریعہ ریاستی اقتدار) اور اخوت (جس نے قومی ریاستی اقتدار سے مطابقت کا مفہوم اختیار کیا)۔ آزادی نے لبرل ازم کے نظریات میں وضع اختیار کی جو آزاد تجارت اور حقوق انسانی کی فراوانی کے واسطے سے جدیدیت کے عام مفہوم میں جذب ہو گیا۔ نظریہ مساوات نے اپنی خالص ترین شکل کمیونزم میں آ کر اختیار کی جو 1989ء میں شکست سے دوچار ہوا لیکن پھر عصر حاضر کے عام مفہوم میں یوں جذب ہو گیا کہ اب رجعت پسند بھی مساوی حقوق، قانونی مساوات، مساوی ووٹ اور بہبود کے حق میں نعرے لگاتے نظر آتے ہیں۔ اخوت کو قومیت نے آگے بڑھایا، فاشزم اور نازیت کی شکل میں یہ انتہائی درجے تک پہنچا جو 1945ء میں چت ہوئے لیکن قومی ریاستوں کے سریش کے طور پر ایک مدہم سے انداز میں یہ آج بھی زندہ ہے۔

ریاستیں کس قدر موثر، فعال اور با اختیار ہو سکتی ہیں اور وہ ایک خادم کی خوبیاں کس حد تک اختیار کر سکتی ہیں، اٹھارہویں صدی یا اس سے قبل کا سیاسی تخیل اسے نہ دیکھ سکا۔ لیکن آزادی، مساوات اور اخوت کے ان تصورات نے جنہیں کہ جدید ریاست کی فزوں تر حرفتی صلاحیت نے جلا بخشی تھی، خدمات کے ان غالب نظاموں کی براہ راست صورت گری کی ہے جو کہ بیشتر دنیا میں حکومت کا تعین کرتے ہیں۔ ان تینوں نے مل کر جدید نمائندہ جمہوریت کو عروج دیا جس میں سیاسی آزادی، مساوی ووٹ اور قومی ریاست کی اخوت تینوں چیزیں آ کر یکجا ہو جاتی ہیں اور جو شہریوں کو بری حکومتوں کو ہٹانے کی طاقت بھی فراہم کرتی ہے لیکن انہیں اپنے ساتھیوں کی سوچ کا زیادہ مرہون منت بھی بناتی ہے۔ سو سے زائد ممالک جمہوریت یا اس سے قریب تر نظام کی مدد سے حکومت چلا رہے ہیں۔ روس، چین اور سعودی عرب جیسے ملکوں کے حکمرانوں کیلئے اہم مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آیا جمہوریت کو مکمل طور پر دور کیسے رکھا جائے بلکہ یہ ہے کہ اسے محدود کیسے کیا جائے (مثلاً اسے صرف مقامی انتخابات تک محدود کر کے)۔ آزدی کے تصورات نے سرمایہ دارانہ بازاری معیشت

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے غلبے کو پروان چڑھایا جو جمہوریت کے مصداق افزائش دولت کے بہترین طریقے کے طور پر ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ اگرچہ سرمایہ داریت کی بہت سی مختلف شکلیں ہیں اور اس میں کئی نقائص بھی ہیں، ہمیں فی الحال کوئی اور ایسا اقتصادی نظام نظر نہیں آ رہا جو اس کی جگہ لینے کے لئے تیار ہو۔ اخوت و مساوات نے فلاح کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔ تمام کامیاب ریاستوں نے تغیر اختیار کر کے کسی نہ کسی شکل میں فلاح دہندگان کی شکل اختیار کر لی ہے اور وہ وظیفہ اختیار کر لیا ہے جو پہلے خاندان اور کمیونٹیاں سرانجام دیا کرتی تھیں اور وہ اس حد تک کہ دو ایک صدیوں پہلے تک اس کا تصور بھی محال تھا۔ انگریز لبرل سیاستدان سر ولیم ہار کورٹ نے 1890ء کے عشرے میں کہا تھا 'اب ہم سب اشتراکی ہیں' ان کا یہ مقولہ عصر حاضر پر کہیں زیادہ صادق آتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس سے مستثنیٰ چین جیسے ملک ہیں جن میں پڑوسی ریاست جاپان اور سنگاپور جیسا کوئی جامع فلاحی نظام نظر نہیں آتا۔

یہ تینوں نظام ایک معیار کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جس کی ایک وجہ تو انہیں اختیار کرنے میں پہل کرنیوالے ممالک کی فوجی و اقتصادی قوت ہے اور ایک وجہ انہیں اختیار کرنے والے شہری[12] جو مادی خوشحالی، خوشی و مسرت، درازی عمر اور دوسروں پر اعتماد کرنے کے اعتبار سے بہتر زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔[13]

دنیا میں بہت سی قدریں ہیں لیکن دنیا میں کوئی خطہ بھی ایسا نہ ہو گا جو درازی عمر، خوشحالی اور اعتماد کو بڑی چیز نہ سمجھتا ہو۔

ان متذکرہ تینوں نظاموں میں سے ہر ایک خدمت سے متعلق جمہوری حکومت عوام کی خدمت کرتی ہے ...... اور اگر نہ کر سکے تو اسے چھٹی کرائی جا سکتی ہے۔ سرمایہ دارانہ کاروباری ادارے صارفین کی خدمت کرتے ہیں اور اگر گاہک ناراض ہو جائیں تو کہیں اور چلے جائیں گے کیونکہ ہماری آج کی معیشت ایک ایسی معیشت ہے جو خدمات کے گرد تشکیل پاتی ہے۔ فلاحی ریاست لوگوں کی ضروریات مثلاً صحت و سلامتی اور تحفظ وغیرہ کی ضمانت دیتی ہے اور وہ اس وقت تک جائز تصور ہو گی جب تک کہ وہ یہ فرائض خوش اسلوبی سے سر انجام دیتی رہتی ہے۔

پہلے لوگوں کو یہ امید نہ تھی کہ جمہوریت، سرمایہ داریت اور اشتراکیت تینوں باہم مل کر اور باہم دگر اعانت کر کے خدمات پر مبنی اس جمہوری و فلاحی سرمایہ داریت کے قوام کی

allurdupdfnovels.blogspot.com

شکل اختیار کر لیں گی۔ شاید ہی کوئی ہو جو یہ توقع کرتا ہو گا کہ وہ ریاستیں جو مدت مدید سے غریبوں کے دشمن کا کردار ادا کرتی چلی آ رہی تھیں ان کے دوستوں میں بدل جائیں گی۔ لیکن جوں جوں انیسویں صدی کے اواخر، بیسویں کے اوائل اور اس کے بعد کے عرصے میں حق رائے دہی میں توسیع ہوئی تو ریاستی عمل میں عوام کی شرکت میں اضافے کے ساتھ ریاستوں کی صلاحیتوں میں بھی ترقی ہوتی چلی گئی۔ 1870ء میں ترقی یافتہ ممالک میں ریاستوں نے تقریباً 11 فیصد کے قریب جی ڈی پی جذب کیا، 1930ء کے عشرے کے وسط میں یہ سطح دوگنا سے زائد ہو چکی تھی۔ پھر 1950ء کے عشرے میں جو ترقی واقع ہوئی اس سے اوسط فلاح و خدمات کے عوامی مطالبے کے ردعمل میں 1960ء میں 28 فیصد اور 1990ء میں 43 فیصد تک جا پہنچی۔ سب سے زیادہ نمو بڑی جنگوں کے دوران رونما ہوئی لیکن جنگوں کے بعد اخراجات کی سطح کبھی بھی لوٹ کر پہلے والی سطح پر نہ آ سکی۔ (14)

ان نظاموں نے کہ جنہیں مفکرین نے Positive feedback loops کا نام دیا ہے ان رجحانات کو پروان چڑھایا اور ریاستوں کو رسد رسانوں، ناظموں اور مشاہدوں کے طور پر زندگی بخشی۔ علم نو اور صحت عامہ نے معیشتوں کو نمو پانے میں مدد دی جنہوں نے ریاستوں کے خرچ کیلئے مزید وسائل پیدا کئے۔ اس پر جب ریاستوں نے جدید خدمات مہیا کیں تو انہوں نے مستفیدین اور حمایتی دونوں پیدا کئے مثلاً امریکن ایسوسی ایشن فار ریٹائرڈ پیپل کے 35 ملین اراکین جنہوں نے سرکاری اخراجات میں تخفیف کیلئے سرگرم سیاستدانوں سے اپنے طبی نگہداشت اور پنشن کے حقوق کا بڑی شدت اور کامیابی سے دفاع کیا ہے۔ بعض صورتوں میں ردعمل منفی بھی رہا۔ سب سے زیادہ انقلابی اختراعات یعنی یک جماعتی حکومت، ثقافتی انقلاب اور تھوک کی مارکیٹائزیشن پچک گئی۔ بہت سی ریاستوں نے ضرورت سے زیادہ بھاری ٹیکس وصول کرنے شروع کر دیئے اور پھر انہیں اس عمل کو لگام دینا پڑی۔ سویڈن میں سرکاری شعبے کا جی ڈی پی کا حصہ 1980ء کے عشرے کے اوائل میں تقریبا 67 فیصد کی بلندی تک پہنچ چکا تھا۔ (پبلک سرمایہ کاروں کے اپنے کاروباری دورے ہوتے ہیں اور انہیں بھی زیادہ خسارے میں جانے والے منصوبوں کو ترک کرنے کیلئے وقفہ بہ وقفہ بحران درکار ہوتے ہیں)۔ زیادہ فربہ منصوبے بھی زمین پر گرتے دکھائی پڑے۔ پہلے جنگیں ریاست کا فریضہ اول تصور کی جاتی تھیں مگر جب جنگیں بند ہوئیں تو بعض نے ریاستوں کی

allurdupdfnovels.blogspot.com

بجائے منشیات ، سرطان ، افلاس، جرائم یا دہشت گردی جیسی مسئلوں پر دھاوا بول دیا۔ ان یلغاروں میں بھی روایتی جنگوں کا سا جذبہ کارفرما ہوتا ہے کیونکہ ان کا اعلان بھی بڑے طمطراق سے کیا جاتا ہے اور ان پر بھی بڑے بڑے بجٹ خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن روایتی جنگوں کے برعکس ان جنگوں میں دشمن نظر نہیں آتے اور شکلیں تبدیل کرتے رہتے ہیں اور ان پر فتح بھی شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے آخری برسوں میں ریاستوں نے مالکوں اور منصوبہ سازوں کی حیثیت سے معیشت میں براہ راست ملوث ہونا چھوڑ دیا۔ لیکن ان ممالک میں بھی جہاں کہ ریاست کو سکیڑنے کی کوششیں کی گئیں معیشت میں حکومتی کردار کی تخفیف کی تلافی نگہداشت، تعلیم اور صحت کے شعبوں میں حکومت کے کردار میں اضافے سے کی جانے لگی۔[15] حکومت کے استعمال میں آنے والے آلات بدل چکے ہیں اور اب ان میں اشیاء اور خدمات کی براہ راست ترسیل کی بجائے زیادہ خریداری اور طبی سہولیات سے لے کر آلودگی کے کنٹرول تک ہر چیز کیلئے مارکیٹوں کا زیادہ استعمال شامل ہو چکا ہے اور پھر اس کے ساتھ قانون، ٹیکس اور جبر کے روایتی آلات بھی شامل ہیں۔[16] اس اثنا میں ریاست کے بہت سے منصب بالائی جانب (بین الاقوامی اداروں کی طرف) زیریں جانب (مقامی حکومت کی طرف) اور بیرونی جانب (نجی شعبے اور رفاعی تنظیموں کی طرف) منتقل ہو چکے ہیں۔ تاہم جمہوری فلاحی سرمایہ داریت اور مراتب و روایت کی بجائے خدمت پر مبنی ادارے ان تبدیلیوں کے نتیجے کے طور پر پہلے سے بھی زیادہ حاوی ہو چکے ہیں۔[17]

دنیا کا غیر ہموار اخلاقی جغرافیہ:

ٹالسٹائی کا کہنا ہے کہ تمام خوش باش کنبے ایک ہی طرح سے خوش باش ہوتے ہیں اور تمام ناخوش کنبے مختلف طرح سے ناخوش ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں قومیں حیران کن طور پر یکساں انداز سے ناخوش ہوتی ہیں۔ بعض اس لیے آزردہ ہیں کہ ان کی ریاستیں بہت مضبوط ہیں اور ان کے شہری بہت کمزور ہیں۔ شمالی کوریا یا ازبکستان جیسے ممالک میں خدمت کی اقدار کا بہت فقدان ہے اور ان میں زندگی بسر کرنیوالے شخص کو سانس لینے، تخلیق کرنے یا حتیٰ کہ محبت کرنے کیلئے بہت کم گنجائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض اقوام اس لیے ناخوش ہیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

کہ ان کی ریاستوں پر ظالم امراء نے قبضہ جما رکھا ہے۔ بدترین ملک مثلاً استوائی گنی یا شام بعض اوقات شکاری مجرمانہ کمپنیوں کی طرح کے رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں جس پر آئینی جواز کا باریک غلاف چڑھا ہوتا ہے اور جس نے ان بندوقوں اور ٹیکنالوجی کا سہارا لیا ہوتا ہے جسے اگر تہذیب کے گلہائے سیاہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

دیگر اقوام اس لئے ناخوش ہیں کہ ان کی ریاستیں بہت کمزور ہیں۔ پچاس برس قبل دنیا کا خوفناک ترین خواب ضرورت سے زیادہ طاقتور حکومتیں تھا (انسانی چہرے کو کچلتا ہوا بوٹ، آرولی کے الفاظ میں)۔ آج وہی ڈراونے خواب انارکی اور انتشار کے متعلق دیکھے جا رہے ہیں۔ سوڈان تا کانگو اور کولمبیا تا افغانستان بہت سی ریاستیں اپنے شہریوں کو غربت اور جنگ سے تحفظ دینے کے قابل بھی نہیں رہیں۔

ان میں سے کوئی بھی ملک اپنی موجودہ صورتحال سے نکلنے کی کوئی پر اعتماد توقع نہیں کر سکتا۔1990ء کے عشرے میں عمل میں آنے والی ایک مشہور تحقیق بتاتی ہے کہ پچھلے چالیس برس کے عرصے کے دوران پائیدار جمہوریت کے حصول کے امکانات بہت زیادہ حد تک شرح آمدنی پر منحصر رہے ہیں۔ غریب ترین ممالک میں جمہوریت کی طرف کی جانے والی کوئی بھی پیش رفت غیر پائیدار ہوسکتی ہے۔ جن ملکوں میں آمدنی کی سطح اوسط سے قریب یا زیادہ (موجودہ قیمتوں کے ساتھ6000 امریکی ڈالر) تھی وہاں جمہوریت کی طرف منتقلی مستحکم رہی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اگر عالمی معاشی نمو میں اضافہ ہوتا رہا تو جمہوریت لازماً کامیاب رہے گی۔

تاہم علتی نسبتیں اس سے زیادہ پیچیدہ برآمد ہوئی ہیں۔ بعض حالیہ بین الاقوامی سرووں کے مطابق جمہوریت اور زیریں سطح کی ترقی کے درمیان کچھ نہ کچھ نسبت موجود ہے لیکن یہ وسطی سطح کی آمدنیوں پر منفی ہو جاتی ہے (شاید اس لئے کہ بڑے لوگ سیکھ جاتے ہیں کہ وسائل پر تسلط جمانے کیلئے محض نام کے جمہوری جماعتی نظاموں سے کیسے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ...... پاکستان اور برازیل اس کی اچھی مثالیں ہیں۔[19] بڑے لوگوں کو کہ جو معاشی نمو سے مستفید ہو رہے ہوتے ہیں اس میں کوئی اچھائی نظر نہیں آتی کہ وہ غریبوں اور کمزوروں کو طاقتور بنائیں تاکہ وہ ان سے ان کی نئی نئی جمع کی ہوئی دولت چھین لیں (اس بات کا زیادہ امکان نظر نہیں آتا کہ چین مستقبل قریب میں کسی نہ کسی جمہوری نظام تک پہنچ

allurdupdfnovels.blogspot.com

پائے گا)۔[20] اس چیز کے شواہد بھی ملے ہیں کہ مطلق العنانیت سے جمہوریت کی طرف سفر کے ابتدائی مراحل کا تعلق بدترین سطح کے تشدد، نسل کشی اور جارحانہ جنگ سے بھی ہوسکتا ہے۔ جب عوام (یا طاقت کے حامل طبقے یا نسل) کی حیثیت سے خود سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو پھر جا کے دوسروں سے انتقام لینے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر معاشی نمو جمہوریت کی طرف سفر کے امکانات میں اضافہ کر بھی دیتی ہے تو یہ سفر اتنا سیدھا نہیں ہوتا۔

جب قومیں ترقی کر کے پختہ جمہوریتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو تاریخ ختم نہیں ہو جاتی۔[21] بیشتر پیمانوں کے مطابق پرانی جمہورتیوں کے عوام دوسروں کی نسبت زیادہ خوش ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں ناخوشی کے اپنے انداز ہیں۔ حکومت کے بارے میں لوگوں کی رائے جاننے کیلئے کئے گئے ایک حالیہ عالمی سروے کے مطابق پختہ جمہورتیوں میں بسنے والے بعض بڑے گروہ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن کا خیال ہے کہ ان کے ملکوں میں انتخابات تو آزادانہ اور منصفانہ طریقے سے ہوتے ہیں لیکن جو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ملک میں عوام کی امنگوں کی حکمرانی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد برطانیہ، سویڈن، ڈنمارک، فرانس اور ہالینڈ میں سب سے زیادہ تھی۔ جب ان سے اپنی حکومت کے بارے میں کچھ کہنے کو کہا گیا تو اکثریت نے بیورو کریٹک کا لفظ استعمال کیا۔[22] ایسے بہت سے ممالک میں سب سے زیادہ جمہوری ادارے ان اداروں میں آتے ہیں کہ جن پر لوگوں کا اعتماد سب سے کم ہے۔ جمہوریت سے اس بے امیدی سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ مغربی دنیا میں حق رائے دہی استعمال کرنے والے افراد کی تعداد اس قدر کم کیوں ہوتی چلی جا رہی ہے حالانکہ دیگر بعض خطوں میں یہ تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جماعتوں کی رکنیت میں اس قدر کمی کیوں واقع ہوئی ہے اور کارکن اپنا وقت اور توانائیاں کسی پارٹی کو دینے کی بجائے مفرد مسئلوں پر کیوں صرف کرتے ہیں۔ گذشتہ تیس برسوں میں ہڑتالوں، مظاہروں یا صارفی بائیکاٹ میں شرکت کرنے والے افراد کی تعداد میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے جب کہ اس دورانیے میں پارٹیوں کی روایتی سیاست اور انتخابات میں مندا دیکھنے میں آیا ہے۔[23]

allurdupdfnovels.blogspot.com

اخلاقی ترقی

پورے جدید عہد کے دوران مبصرین یہ پیش گوئیاں کرتے رہے ہیں کہ ریاستوں میں سے اخلاقیات کی حس منہا ہو گئی ہے یا پھر کچھ ہی عرصے میں ہونے والی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے پروشین کمیرالسٹوں سے لے کر جدید پبلک مینجمنٹ تک مصلحین کی ایک طویل روایت اسی بات کا عندیہ دیتی رہی ہے۔ حالیہ مثال فلپ بوبٹ صاحب کی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ جدید ریاستیں تبدیلی کے عمل سے گزر کر بازاری ریاست کی شکل اختیار کر رہی ہیں، جسے کسی انصاف یا اخلاقی اقدار کے کسی خاص نظام سے کوئی سروکار نہیں۔[24]

ان دعوؤں میں ریاستوں کے اندر کام کرنے والے بعض عہدیداروں کے اعتقادات کی بازگشت سنی جا سکتی ہے اور وہ ریاست کی منطقی اور حسابی کتابی مشین کے تصور سے خوب لگا بھی کھاتے ہیں۔ ان میں ناقدین کی کئی نسلوں کی گونج بھی سنی جا سکتی ہے جو جدید ریاست کے سرد مہرانہ، غیر شخصی کردار کی شکایت کرتے رہے ہیں کہ جو لوگوں کو عقلیت کے آہنی قفس میں بند کر دیتی ہے۔

بایں ہمہ یہ دلائل واقعات سے حیران کن حد تک متصادم دکھائی دیتے ہیں۔ وہ خدمت کی اس اخلاقی جہت کو مدنظر رکھتے نظر نہیں آتے جو جمہوریت، منڈی اور فلاح میں اس قدر مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ ان دعوؤں کے بھی برخلاف ہیں جو کہ جارج ڈبلیو بش سے لے کر نیلسن منڈیلا تک جیسے مختلف رہنما اپنے مناصب کے بارے میں کرتے ہیں۔ وہ ریاست کی ان عظیم صلاحیتوں سے بھی لگا نہیں کھاتے جو وہ ان منصوبوں کو انجام دیتے وقت ظاہر کرتی ہے جنہیں عام مفہوم میں صرف اخلاقی ہی کہا جا سکتا ہے (مثلاً علاج معالجہ، نگہداشت، تحفظ)۔ وہ نگہداشت اطفال یا اسقاط حمل سے لے کر سٹیم سیلوں پر تحقیق، منصفانہ جنگ کی نوعیت اور موسمی تغیر کی اخلاقیات پر جمہوری ملکوں میں ہونے والی اخلاقی بحث سے بھی لگا نہیں کھاتے۔

یہ درست ہے کہ لبرل جمہورتیوں نے اپنے لوگوں کی اس سلسلے میں بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ اپنی اخلاقی روشوں کا انتخاب خود کریں اور ریاست کی مداخلت کے بغیر اپنی زندگیوں کی خود صورت گری کریں۔ لیکن کسی بھی ریاست کیلئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے

allurdupdfnovels.blogspot.com

اخلاقی فرائض سے اغماض برتے بلکہ جمہوریت تو اخلاقی مباحث کو ماحولیات، حق زندگی اور بچوں سے جنسی تعلق کی طرح کے ان مناطق تک بھی لے گئی ہے جنہیں دو ایک صدی قبل ریاستیں کسی خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ خواہ آپ ان اہداف کو دیکھیں جن کیلئے جمہورتیں اپنے وسائل مختص کرتی ہیں، ان اقدار کو دیکھیں جنہیں وہ اپنے عمل میں اختیار کرتی ہیں یا ان نتائج کو دیکھیں جو وہ حاصل کرتی ہیں، آپ محسوس کریں گے کہ جمہوریت ، ریاستوں کو خدمت کے ان آدرشوں سے بہت قریب لے آئی ہے جن کا گذشتہ چند ہزار برس سے مفکرین ذکر کرتے چلے آ رہے تھے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 4

خادم ریاست

عباسی خلیفہ ہارون الرشید جن کا تذکرہ ہم ''الف لیلہ و لیلہ'' میں پڑھتے ہیں ایک بہت عظیم الشان سلطنت کا حکمران تھا جو مشرق وسطیٰ سے لے کر وسطی ایشیاء تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ایک شاعر اور علم و فضل کے مربی کے طور پر بھی شہرت حاصل کی۔ جب وہ خلیفہ بنا تو اس نے خزانے کے منہ کھول دیئے اور اپنے دوستوں اور عزیز و اقارب کو قیمتی تحائف سے نوازا۔ اسے امید تھی کہ اس کا سابق استاد سفیان بھی اس کے ہاں حاضری دے گا۔ جب وہ نہ آیا تو ہارون نے ایک قاصد عباد کے ہاتھ اسے ایک خط بھیجا۔ جب عباد پہنچا تو سفیان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک مسجد میں بیٹھا تھا۔ جب اس نے سفیان کو خلیفہ کا خط پیش کیا تو سفیان نے اسے پکڑنے سے انکار کر دیا اور پاس بیٹھے ایک شخص سے کہا کہ وہ اسے کھول کر سنائے۔ خط میں لکھا تھا: ''ہم آپ کی آمد کے منتظر ہیں؟ ہمیں اپنے درمیان دوستی کے بندھن کا بڑا پاس ہے''۔ سفیان اپنے ساتھیوں سے بولا: ''میرا جواب اس چٹھی کی پشت پر لکھ دو''۔ شاگرد بولے ''مرشد آپ نیا کاغذ استعمال کیوں نہیں کرتے'' ''نہیں! اسی کاغذ کی پشت پر لکھو''۔ اس نے دوبارہ کہا۔ پھر اس نے یہ کلمات لکھوائے: ''قرآن کی حلاوت سے محروم، گمراہ ہارون کے نام۔ تم نے مومنین کے خزانے کا منہ کھول کر اس کے مال و دولت کو اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے تقسیم کیا ہے، کیا تم نے ان لوگوں کی اجازت حاصل کر لی تھی جو کہ اللہ کے راستے میں جنگیں کرتے ہیں؟ کیا تم نے یتیموں اور بیواؤں کی اجازت حاصل کر لی تھی؟'' اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے سفیان آخر میں لکھواتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

''جہاں تک ہماری تمہاری دوستی کا سوال ہے، یہ اب گئی، ہمارے بیچ اب کسی پیار محبت کا بندھن نہیں رہا۔ ہمیں اب کبھی اگر آپ نے خط بھیجا تو ہم نہ تو اسے پڑھیں گے اور نہ ہی اس کا جواب دیں گے۔''

یہ سن کر عباد سیدھا بازار گیا اور معمولی اور سستے سے کپڑے لے کر پہنے اور پھر وہ خط کا جواب لے کر ہارون الرشید کی طرف چلا آیا جب خلیفہ نے عباد کو معمولی کپڑوں میں اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ سب سمجھ گیا اور پکار اٹھا، ''قاصد کامیاب ہو گیا اور اس کا آقا ناکام رہا۔ جب اس نے جواب پڑھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے درباری بولے، ''یا امیر المومنین ! سفیان نے بڑی گستاخی کا مظاہرہ کیا ہے، سپاہیوں کو بھیج کر اسے یہاں بلوایئے۔'' ''خاموش''، ہارون بولا'' یہ تم لوگ ہی ہو جنہوں نے مجھے گمراہ کیا ہے''۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہارون نے سفیان کا وہ خط محفوظ کر لیا اور وہ گاہے گاہے اسے نکال کر پڑھا کرتا تھا۔[1]

ہمیں بہت سی روایتوں میں ایسی حکایات ملتی ہیں۔ ایسی حکایتیں جن میں عظیم حکمرانوں کو ان کے مشیروں یا درویشوں نے شرمندگی دلائی اور انہیں حقیقت دکھائی۔[2] عموماً ایسی کہانیوں میں انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ خادم ہیں ...... آدرشوں کے خادم اور ان لوگوں کے خادم جن پر وہ حکومت کرتے ہیں۔ چند ہی روایتیں ایسی ہوں گی جن میں اس طرح کے آدرش نہ ہوں۔ چین کے قانون پسند جنہوں نے قبل مسیح دور کی آخری صدیوں میں بڑا اثر و رسوخ حاصل کیا، انہی چند فلسفیانہ سلسلوں میں سے ہیں جو بادشاہوں کے کان میں یہ ڈالا کرتے تھے کہ ہر شے اور ہر شخص کو ریاست کی خدمت کرنی چاہیے اور گونگی اور شریر رعیت کی سزا کے لیے جابرانہ قوت استعمال کی جانی چاہیے۔

ہارون کی حکایت یہاں کوئی ایسے ہی بیان نہیں کر دی گئی۔ اس میں جبر و استبداد اور انتقام کی بہت زیادہ صلاحیت موجود تھی۔ صدام حسین جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بعض اوقات اجلاس کے دوران ہی اپنے رفقاء کو قتل کر دیا کرتا تھا، بعض اوقات خود کا موازنہ ہارون الرشید سے کر کے بڑا فخر محسوس کیا کرتا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہارون کا پایہ تخت بھی یہی بغداد تھا جہاں صدام نے حکومت چلائی۔ ہارون کی کہانی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ماضی کی بیشتر ریاستوں نے اپنے لئے خدمت، فرض، نگہداشت اور سرپرستی کا کردار اختیار کیا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں ذیلی اوراق میں خدمت کے اسی دعوے کی بات کروں گا اور دکھاؤں گا کہ مختلف رسومات، جشنوں، علامیوں اور اعلانات کی چمک دمک اور شان وشکوہ کے نیچے کہ جن سے حکومتیں اپنا بناؤ سنگھار کرتی ہیں خدمت کے یہی دعوے کیسے کارفرما ہوتے ہیں۔ خدمت کا یہ نصب العین آج جیسے جدید ڈنمارک یا اقوام متحدہ کا خاصہ ہے ویسے ہی یہ سلطنت عثمانیہ یا جمہورسائینا کا خاصا ہوا کرتا تھا۔

حفاظت کی ذمہ داری:

پہلا اخلاقی دعویٰ جو ریاستیں کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ وہ عوام کو گزند سے بچا سکتی ہیں۔ اس میں ناکام رہنے کی صورت میں وہ اپنا جواز کھو بیٹھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں میکیاولی، سن زو اور ہنری کسنجر کی تحریروں میں تحفظ کی ذمہ داری ان دیگر تمام معاملات پر غالب رہی ہے جن میں روز مرہ کی اخلاقیات، آسانی سے جواز بنا لینے والا ظلم اور فریب شامل ہے۔

یہ فریضہ ہر ریاست کے اپنے عوام کے ساتھ طے شدہ مصنوعی معاہدے کا مرکزی جزو ہوتا ہے۔ یہی فریضہ ریاست کو سفاکیت کی خصلت دیتا ہے جو بعض اوقات ڈرانے کا وصف معلوم پڑتا ہے اور یہی فریضہ اس منصب کے کرتوں دھرتوں کو امتیازی مجنونانہ اخلاقی عالمی تناظر دیتا ہے۔

گزند سے تحفظ کی یہی اولیت جدید لبرل ازم کو بھی وضع بخشتی ہے۔ جان سٹوارٹ مل کی تحاریر کے مطابق دوسروں کے خلاف کچھ کرنے کا واحد جواز ذاتی تحفظ ہے اور آزادیوں پر صرف وہی قدغنیں جائز قرار دی جاسکتی ہیں جو دوسروں کو گزند سے تحفظ دیتی ہیں۔(5)

محافظت اس لیے اہم ہے کہ نظم ونسق اور امن و امان نہ صرف زندگی کو آگے چلانے کیلئے ضروری ہے بلکہ لوگوں کی زندگی کو خوشحال بنانے کیلئے بھی بہت اہم ہے۔ اعدادو شمار اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ سیاسی استحکام اور نظم ونسق اور عدل وقانون کی حکمرانی لوگوں کی خوشی وخوشحالی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ مرتبہ انسانی تاریخ میں قومی خوشی کی کم ترین شرح 1960ء کے عشرے کے ڈومینکن ریپبلک میں صدر تر دہلو کے قتل کے بعد ریکارڈ کی گئی تھی جب یہ ریاست مسلسل بدامنی کی لپیٹ میں تھی۔(6) خوشی کی بلند ترین شرح عموماً

allurdupdfnovels.blogspot.com

ناروے، سوئٹزرلینڈ اور ڈنمارک جیسی مستحکم جمہوریتوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ انسانی خوشحالی کیلئے مضبوط، مستحکم، محافظ اور جائز حکومت کی اہمیت پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے۔

مختلف ریاستوں کی اپنے عوام کو تحفظ فراہم کرنے کی صلاحیت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بیشتر ریاستیں دوسری ریاستوں کی جارحیت سے بچنے کے لئے جو کچھ بس میں ہو کرتی ہیں۔ وہ دہشت گردی کے معاملے میں چوکنا رہتی ہیں۔ دہشت گردی کا چیلنج اتنا براہ راست تو نہیں لیکن دیگر چیلنجوں کی نسبت بہت زیادہ پریشان کن ضرور ہوتا ہے کیونکہ دہشت گرد کبھی کہیں کارروائی کرتے ہیں اور کبھی کہیں، وہ کبھی کسی چیز کو نشانہ بناتے ہیں اور کبھی کسی چیز کو اور ان کا واردات کرنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا جس سے نہ صرف امن عامہ، مورال اور اعتماد باہمی کو ٹھیس پہنچتی ہے بلکہ لوگوں کا یہ اعتماد بھی چکنا چور ہو جاتا ہے کہ وہ کسی منطق اور نظام کے تحت چلنے والی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اب سے پہلے تک ریاستیں ہر تحفظ صرف ایک محدود پیمانے پر فراہم کرتی تھیں۔ پولیس والے جواب ہر جگہ نظر آتے ہیں، اکثر ملکوں میں بمشکل کوئی سو ایک سال سے زیادہ پرانی بات نہیں ہو گی اور جہاں تک منشیات، منظّم جرائم اور متعدی امراض کا تعلق ہے تو یہ اب کہیں جا کہ کوئی چند ایک ریاستیں نظر آتی ہیں جو ان سے تحفظ کی ذمہ داری سے ٹھیک طرح عہدہ برآ ہوتی ہوں گی۔ ریاستوں کو حاصل ہونے والی کامیابی نے عوام کی توقعات اس قدر بڑھا دی ہیں کہ اب وہ ان چیزوں کو بھی حکومت کی ذمہ داری سمجھنے لگے ہیں کہ جو پہلے تقدیر کا رحم و کرم سمجھ کر قبول کر لی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں غیر محفوظ کاموں، خطرناک ٹیکنالوجی، بچوں کو بھیجے جانے والے نازیبا پیغامات اور خوراک میں شامل زہریلے مادوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اب اس بات کی توقعات کہ ریاست ہمیں خطرات سے بچا سکتی ہے قومی سرحدوں سے بھی آگے نکل گئی ہیں اور موسمی تبدیلی، معاشی بحرانوں اور وباؤں جیسے مسائل ...... یعنی بغیر پاسپورٹ مسائل ...... نے ریاستوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی حاکمیت مجتمع کر کے اپنے شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے کا اہتمام کریں۔

شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری کے سلسلے میں عالمگیریت (گلوبلائزیشن) نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی میں استعماری ریاستیں یہ کہہ کر اپنی گن بوٹ ڈپلومیسی کا جواز پیش کرتی تھیں کہ وہ اپنے شہریوں کے تحفظ کیلئے ایسا کر رہی ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایسے بہت سے دعوے جھوٹے تھے اور بیشتر ریاستوں کے بس میں ایسا کچھ کم ہی تھا کہ جس سے وہ اپنی سرحدوں کے پار اپنے شہریوں کے تحفظ کیلئے کچھ کر سکیں۔ لیکن اب یہ فرض کیا جانے لگا ہے کہ ریاستیں اپنے شہریوں کے تحفظ کی ذمہ دار ہیں خواہ وہ جہاں بھی ہوں۔ مثال کے طور پر2002ء میں انڈونیشیا کے مقام بالی میں ہونے والے دھماکے کے بعد آسٹریلوی حکومت میں سرکاری طور پر تفتیش کی گئی تھی کہ اس المیے کا مورد الزام کسے ٹھہرایا جانا چاہیے۔ یعنی یہ محض برے نصیب یا ان عوام ہی کا نتیجہ نہیں تھا کہ جو حکومت کے بس سے باہر تھے۔

حکومت کی بہت سی لطیف حرکیات محافظت کے فریضے سے پیدا ہوتی ہیں۔ شروع میں یہ ریاستوں کو اجارہ دار بننے کا جواز مہیا کرتی تھیں لیکن اس سے وہ اپنی رعایا کیلئے خطرہ بھی بن جاتی تھیں۔ لقمان کی ایک حکایت سے یہ بات بڑی واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے جس میں ایک گھوڑا سور کے حملہ آور ہونے پر ایک انسان سے مدد مانگتا ہے۔ آدمی کہتا ہے کہ مدد تو وہ ضرور کرے گا لیکن پہلے سے گھوڑے کو جوتنا ہو گا (دوسرے لفظوں میں بہت شروع سے ہی آزادی کا انحصار غلامی پر ہے) بار بار دیکھنے میں آیا ہے کہ آمر اور ہونے والے آمر اس بات کی آڑ لیتے چلے آئے ہیں کہ قوم خطرے میں ہے اور صرف وہی اسے بچا سکتے ہیں۔ لیکن اقتدار میں آنے کے بعد کیا ہوتا ہے کہ یہی محافظ لٹیرے بن جاتے ہیں۔ سیاسی تاریخ میں خوف کا استحصال ٹیپ کے بند کی طرح بار بار دیکھنے میں آتا رہا ہے۔ تشویش سیاسی بدمعاشوں کی پہلی پناہ گاہ ہوتی ہے۔[7] گورنگ کہتا ہے کہ لوگوں کو کسی بھی وقت لیڈر کا مطیع کیا جا سکتا ہے ...... آپ کو صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ انہیں بتا دیں کہ ان پر حملہ ہوا چاہتا ہے اور دوسرا کام یہ کریں کہ جو لوگ جنگ کے خلاف ہیں ان پر حب الوطنی کی کمی کا الزام دے کر ان کی مذمت کرتے جائیں'' اور گوئبل نے اپنے کیریئر کی بنیاد اس نظریے کو بنایا تھا کہ خوف وہ سب سے طاقتور ہتھیار ہے جو کسی ریاست کے پاس ہوتا ہے۔ جمہوری رہنما بھی اکثر و بیشتر خوف کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ جب1867ء میں آئرش باغیوں نے لندن میں بم کا دھماکہ کیا تھا تو وزیر اعظم ڈزرائیلی نے ملزم کو جج کے سامنے حاضر کرنے کے قانون کو ختم کرنے کی حمایت کی تھی اور یہ (جھوٹا) دعویٰ کیا تھا کہ لندن میں 10000 مسلح آئرش گوریلے دہشت پسندانہ وارداتیں کرنے کیلئے موجود ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

محافظین کو لامحدود اختیارات دینے میں بہت سے خطرات مضمر ہوتے ہیں۔ اس بات کی آگاہی کا نتیجہ ہی تھا کہ چینی روایت میں جنگی سپاہیوں کے خلاف اتنی زیادہ ناپسندیدگی موجود رہی ہے کہ انہیں بڑے طبقات کی روایتی فہرست سے ہی نکال دیا جاتا تھا جبکہ عالموں، کسانوں، کاریگروں اور تاجروں کو شامل کر لیا جاتا تھا۔ ''وؤ'' یا تشدد وتہذیب کے ''وی'' سے گھٹیا تصور کیا جاتا تھا اور اسے ہمیشہ کنٹرول میں رکھا جاتا تھا (یہی وجہ ہے کہ بہت سے غیر چینی جنگجو حکمرانوں نے چین کی دانشور افسر شاہیوں پر راج کیا اور اتنے زیادہ شاہی سلسلوں کی بنیاد رکھی۔ (8)

مغرب میں بھی اس طرح کی تشویش بار بار منظر عام پر آتی رہی۔ جیمز میڈیسن نے امریکی انقلاب کے وقت متنبہ کیا تھا کہ وطن میں آزادی پر مسلط کی جانے والی زنجیریں ہمیشہ ان ہتھیاروں سے تیار کی جاتی ہیں جو حقیقی، جھوٹ موٹ یا تصوراتی خارجی خطرات کیلئے تیار کی جاتی ہیں۔ صرف بیسویں صدی میں کوئی 170 ملین افراد اپنی ہی حکومتوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے: 60 ملین سے زائد سوویت یونین میں، 35 ملین ماؤ عہد کے چین میں اور 10 ملین کومنتانگ کے ہاتھوں، بیس ملین سے زیادہ جرمنی میں اور 6 ملین جاپان میں ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد اس 40 ملین سے بہت زیادہ ہے جو اس عرصے میں جنگوں میں ہلاک ہوئے۔ کیسی بات ہے کہ لفظ دہشت گردی سب سے پہلے انقلابی فرانس میں ریاست کی طرف سے کیے جانیوالے تشدد کیلئے استعمال کیا گیا تھا۔ روبس پیئر نے 1794ء میں کہا تھا کہ نیکی اور دہشت عوامی حکومت کے سر چشمے' ہیں اور دہشت کے بغیر نیکی بے کس ہو جاتی ہے)۔

اس کے بعد سے غیر ریاستی دہشت گردی کی نسبت ریاستی دہشت گردی کہیں زیادہ مہلک ثابت ہوئی ہے، خواہ اسے سرحدوں کے اندر فروغ دیا جائے (چیکا اور اس کے جانشین، این کے وی ڈی اور کے جی بی، ساؤتھ افریقہ ڈیفنس فورس، یا پھر رسوائے زمانہ گسٹاپو) یا سرحدوں کے باہر (سی آئی اے اور کے جی بی، ایران وشام کی پروردہ دہشت گرد جماعتیں یا پھر موساد کے قاتل)۔ مارکسسٹ۔ لینینسٹ روایت میں تو ریاست کی سختی و درشتی کی استعداد پر فخر کیا جاتا رہا۔ سوویت رہنما ٹراٹسکی نے عوام پر تشدد کو جائز ثابت کرنے کیلئے ایک کتاب بھی لکھ ماری تھی جس کا عنوان ''دہشت گردی کے دفاع میں تھا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

جدید جمہوریت کے بہت سے ہیروؤں نے بھی ریاست کی خاطر خون سے ہاتھ رنگے۔ جرمنی کے سوشل ڈیموکریٹ رہنما فریڈرک ایبرٹ نے1919ء میں بہت سے شہروں کے گلی کوچوں میں فوج اتاری۔ اسے 'جرمن مزدوروں کا اجتماعی جلاد' قرار دیا گیا۔ ڈیگال نے 2-1961ء میں الجیریا کے باغیوں کو بہت مارا اور فرانس کو اس کی استعماری دلدل سے نکالنے کیلئے طاقت اور فریب دونوں سے کام لیا۔ چرچل نے پہلی عالمی جنگ کے فوراً بعد برطانیہ میں ہڑتالی کان کنوں کی گوشمالی کیلئے فوجی بھیجے۔ ان سب نے لوگوں پر حملوں کا جواز انہیں سب لوگوں کے تحفظ کیلئے ضروری کہہ کر پیش کیا۔

ریاستوں کو اپنے لوگوں کے تحفظ کیلئے کس حد تک جانا چاہیے، یہ ہمیشہ کسی مطلق اصول کی بجائے فہم و تناسب کی بات خیال کی جاتی رہی ہے۔ جدید زمانے تک دنیا کی بیشتر جمہوری حکومتیں اور ملک خود کو اور اپنے شہریوں کو تحفظ فراہم نہ کر سکنے کی وجہ سے تباہ ہوئے۔ لبرل معاشروں کے خارجی خطرات سے نقصان اٹھانے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے اور وجہ صاف اس کی یہی ہے کہ وہ فوجی اقدار کو زیادہ وقعت نہیں دیتے جب1933ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے طلباء نے ایک مباحثے میں وطن یا بادشاہ کیلئے لڑنے کے خلاف رائے دی تو اڈولف ہٹلر کے کان فورا کھڑے ہو گئے تھے۔ جنگ اس واقعے کے چھ سال بعد چھڑی اور اس مباحثے کے وقت حاضر بہت سے طلباء وطن اور بادشاہ کی خاطر لڑے بھی اور انہوں نے اس جذبے سے جان بھی دی۔ جمہوریہ فرانس جس نے71-1870ء اور پھر18-1914ء میں جنگوں سے بہت نقصان اٹھایا تھا1930ء کے عشرے میں جنگ میں شرکت سے ہچکچاتا رہا تھا اور اس کی حکومت نے جنگ میں شرکت کے حامیوں کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے کر خاموش کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس کے بعد بیشتر جمہوری ممالک نے سبق سیکھا اور اپنے نوجوان مردوں اور عورتوں کی ایک تعداد کو سفاک قاتل بنانے کی تربیت دینے کا اہتمام کرنا شروع کیا (اور قدیم ترین جمہوریت سوئٹزرلینڈ نے تو دفاع کو بڑی کامیابی سے ریاست اور عوام کی مشترکہ ذمہ داری بنا دیا ہے)۔

محافظت کی ذمہ داری اپنے ہمراہ دیگر پیچیدہ حرکیات بھی لے کر آتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا یہ حاکموں اور محکوموں کے ایک دوسرے پر انحصار میں اضافہ کر دیتی ہے کیونکہ حکمرانوں کو اپنی افواج کیلئے افراد اور پیسہ درکار ہوتا ہے۔ اور اس سے فرائض بھی بڑھ جاتے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہیں کیونکہ جیسا کہ ٹامس ہابز نے کوئی تین صد برس قبل 'لیویا تھان' میں کہا تھا، کمزور ترین شخص مکاری یا دوسروں کی مدد سے طاقتور ترین شخص کو بھی مار سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ طاقتور ترین لوگوں کے پاس کمزور ترین لوگوں کی ضروریات اور زندگی کا خیال رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا اور محافظت محض توپوں یا سرحدوں کا معاملہ ہی نہیں ہوتی (خصوصاً ایک ایسے عہد میں جب ریاستوں کو موسمی تبدیلی سے لے کر خطرناک حرفتوں کے دہشت گردوں کے ہاتھ لگنے تک نت نئے خدشات درپیش ہیں)۔

چنانچہ محافظت کی ذمہ داری کو ایک ڈیل تصور کیا جا سکتا ہے۔ ریاستیں عوام کو ایک پیشکش دیتی ہیں اور یہ پیش کش آسانی سے ٹھکرائی بھی نہیں جا سکتی۔ یہ پیشکش کیا ہوتی ہے؟ یہ پیشکش ہوتی ہے اطاعت، وفاداری، ٹیکسوں اور بعض اوقات دیگر فرائض کی ادائیگی کے بدلے میں امن و امان، استحکام، اعتماد، یقین اور خوشحالی کی۔ یہ ڈیل پائیدار ہوتی ہے کیونکہ عوام اور ریاستوں کو درپیش کئی خدشات مشترک ہوتے ہیں۔ شہریوں کو درپیش بڑے خدشات بدامنی اور بدنظمی کے ہوتے ہیں خواہ یہ بدامنی باہر کی جانب سے آتی ہے یا پھر اندر کے لٹیروں یا جرائم پیشہ عناصر کے طفیل پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ریاست کے اقتدار اور خوشحالی کو درپیش سب سے بڑے خطرات بدنظمی سے پیدا ہوتے ہیں خواہ اس بدنظمی کے ذرائع دوسری ریاستیں ہوں اور یا اس کے اپنے عوام۔ چونکہ ان جیسے خدشات مشترک ہوتے ہیں، معاہدہ عمرانی کی بنیاد بھی ہمیشہ میسر آ جاتی ہے۔ لیکن یہ معاہدہ بہت زیادہ غیر متوازن بھی ہو سکتا ہے اور ہر قوم کو گاہے بگاہے یہ سوال اٹھانا پڑتا ہے کہ آیا اسے اپنے حکمرانوں سے زیادہ خوف ہے یا اجنبیوں سے۔

فلاح و بہبود کی ذمہ داری

ریاستوں کیلئے جواز کا دوسرا وسیلہ عوام کی بہبود رہا ہے یعنی خوشحالی کو فروغ دینا اور غیر ضروری تکلیفوں میں کمی کے لئے کوشش کرنا۔ اگرچہ خاندان اور قبیلے اپنی نگہداشت اور بہبود کا خود ہی خیال رکھتے رہے ہیں، ریاستیں بھی مدت مدید سے لوگوں کی فلاح و بہبود کیلئے کام کر رہی ہیں۔ ایسی ریاستی مساعیوں میں خوراک کی تقسیم اور عزت کے خاتمے کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

پروگرام شامل ہیں جو سوم ہزاریہ قبل مسیح کی سمیریہ اور جمہوریہ روم سے لے کر جدید برازیل تک میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسی بہت سی ریاستوں کی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے خود کو اور فلسفیوں نے جن کو صرف محافظین کے طور پر ہی نہیں بلکہ خوشحالی کے فروغ کی علمبرداروں کے طور پر پیش کیا ہے۔ خوشی کی دانستہ جستجو ان تہذیبوں کی ایک بڑی علامت ہے جو ترقی کر کے محض بقاء کی جدوجہد کے مرحلے سے آگے نکل جاتی ہیں۔ سقراط کی لئے دُولت مشترکہ بنانے کا مقصد صرف کسی ایک طبقے کو خوش وخرم کرنا نہیں بلکہ مجموعی طور پر پوری قوم کیلئے ہر ممکن حد تک زیادہ خوشی ومسرت حاصل کرنا' تھا۔ اشوک بھی اپنے ایک کتبے میں 'سب کیلئے تحفظ، خود پہ قابو، عدل اور خوشی' کی خواہش کرتا نظر آتا ہے۔ عظیم مسلمان فلسفی ابونصر الفارابی سیاسی فلسفے پر دسویں صدی کی اپنی کلاسیکی تصنیف میں لکھتا ہے کہ خوشی بذات خود ایک اہم شے ہے، اس کی خواہش کوئی اور چیز حاصل کرنے کیلئے نہیں کی جاتی اور انسان اس سے زیادہ بڑی کوئی شے حاصل نہیں کرسکتا۔ بارہویں صدی کا ایک بڑا چینی مفکر شین لیانگ اسی انداز میں بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو چیز بھی لوگوں کی معقول ضروریات اور خواہشات کو تسکین بخشے، جائز ہے۔[10]

اہل مغرب نے ایسے تصورات چند صدیاں بعد وضع کیے۔ امریکہ کے اعلان آزادی میں زندگی، آزادی اور خوشی کی تلاش کا نعرہ دیا گیا اور 1793ء کے فرانسیسی آئین میں نئی قوم کو اس قرارداد پر متفق کرنے کی کوشش کی گئی کہ معاشرے کا مقصد مشترک خوشی ہے، برطانوی مفکر بینتھم نے یہ فلسفہ دیا کہ اچھی حکومت وہ ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کیلئے زیادہ سے زیادہ خوشی کا اہتمام کرے۔ اس فلسفے کا حکمرانوں پر بہت غیر معمولی اثر ہوا (اکثر اس کے برے نتائج بھی نکلے مثلاً جب پرجوش برطانوی استعماری مصلحین نے 1850ء کے عشرے میں اس کا اطلاق ہندوستان پر کرنے کی کوشش کی)۔ حالیہ دور میں اس فلسفے نے اس جدید معاشیات کے توسط سے بالواسطہ اثرات مرتب کیے ہیں جس نے اب عالمی اشرافیہ کیلئے مشترکہ زبان کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ایشیا کے ایک چھوٹے سے ملک بھوٹان کی حکومت نے خام خانگی پیداوار (جی ڈی پی) کی بجائے خام خانگی خوشی میں اضافے کو اپنا نعرہ بنا لیا ہے (دیکھیں سب کو ایک جیسا چوغہ پہننے کی ترغیب دینے اور تمبا کو پر پابندی لگانیوالے یہ بھوٹانی فرمانروا خوشی کو فروغ دینے میں کہاں تک کامیابی حاصل کرتے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہیں۔ تاحال تو کوئی واضح نتائج سامنے نہیں آ سکے)۔

لوگوں کو خوشی دینے کی خواہش کرنا ایک بات ہے لیکن ایسا کرنے میں کامیابی حاصل کرنا ایک دوسری بات ہے۔ بیشتر ریاستیں اقتصادی پالیسی سے آغاز لیتی ہیں اور نظم و ضبط اور آزادی کا ایسا آمیزہ متعارف کرانے کی کوشش کرتی ہیں جس سے خوشحالی ممکن ہو سکے۔ اس عمل میں پیسے کی فراہمی اور تحفظ، حقوق ملکیت کی تعریف اور نفاذ اور تجارت و تبادلے کے ضوابط کی نگرانی بھی شامل ہے۔ بعض ریاستوں نے معاشی معاملات کا بندوبست بہت براہ راست امداد سے کیا۔ سمیریہ میں اناج معبدوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یورپی سلطنتوں نے فن جہانبانی اور استحصال کو ایسٹ انڈیا کمپنی، ہڈسن بے کمپنی اور Compagnie des Hebitants میں ایک دوسرے میں ضم کر دیا اور بیسویں صدی کی ریاستوں نے ریل، بجلی اور ٹیلیفون نیز لوہے اور کوئلے کے عظیم انفرا سٹرکچر قائم کئے۔ لیکن عمومی طور پر ریاستوں کو اقتصادی سرگرمی کے انتظام یا اہتمام کی ضرورت نہیں پڑی۔ لقمان کی ایک اور حکایت میں ہے کہ سورج اور ہوا آپس میں مقابلہ کر رہے تھے کہ دیکھیں بکریاں چرانے والے لڑکے کا چوغہ کون اتارتا ہے۔ ہوا چلتی ہے تو لڑکا چوغے کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے لیکن جب سورج چمکتا ہے تو وہ خود ہی چوغہ اتار دیتا ہے۔ اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ ریاستیں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ اس وقت کرتی ہیں جب وہ قوت و تحکم استعمال کرنے کی بجائے لوگوں کے نجی مفاد کی مطابقت میں کام کرتی ہیں۔

حکومتوں کے اقتصادی مناصب کو بعض اوقات منفی آزادی کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے یعنی حکومتیں عدم مداخلت کی پالیسی سے کام لیتی ہیں۔ اگر وہ مداخلت کا رویہ اپنائیں تو خوشحالی کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ لیکن معاشی نمو کا دارومدار صرف بلا روک ذاتی مفاد پر نہیں ہوتا۔ خوشحالی کیلئے درکار حالات قدرتی نہیں ہوتے۔ وہ بہت زیادہ غیر قدرتی اور محتاط منصوبہ بندی اور بہت زیادہ فعال انتظام و انصرام پر منحصر ہوتے ہیں۔ عظیم امریکی قانون دان اولیور وینڈیل ہولمز نے یہ بات یوں بیان کی ہے کہ ''جائیداد' قانون کی تخلیق، قدر سے پیدا نہیں ہوتی اگرچہ یہ چیزیں قابل تبادلہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قدر حقوق ملکیت یا ریاستوں کے فعال کردار سے پہلے پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ان قوانین کی تعریف اور نفاذ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روز مرہ زندگی کی طرح معاشی زندگی میں آزادی کا تصور ایک افسانہ ہے۔ حقیقی

allurdupdfnovels.blogspot.com

آزادی انارکی کے مترادف ہے جس میں طاقتور کمزور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

بہبود کی ذمہ داری ریاستوں کو ایسے مقامات پر لے آتی ہے جہاں اخلاقی اصول ناقابل عمل ہو جاتے ہیں ......آزادی اور انضباط کو کیسے متوازن کیا جائے اور عوامی اشیاء کے طور پر کیا فراہم کیا جائے۔ ماضی کے بعض حکمرانوں، مثلاً دو ہزار سال قبل اشوک نے اپنے عوام کو تعلیم وصحت کی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کی اور ماضی بعید میں طبی سہولتوں کی فراہمی کی غیر مربوط روایات موجود رہی ہیں جو اس جدید مفروضے کی تکذیب کرتی ہیں کہ قدیم ریاستوں کو ہتھیاروں اور جنگوں کے علاوہ کسی شے سے سروکار نہیں تھا۔ عظیم بدھ فلسفی نگار جونہ نے دوسری صدی عیسوی میں حکمرانوں کو ریاست میں طبیبوں اور شفا خانوں کی فراہمی کی نصیحت کی تھی۔ پانچویں صدی کے چینی سیاح فاہیان نے پاٹلی پتر (شمالی ہند) میں صحت عامہ کی دیکھ بھال کی تعریف میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ بیشتر اسلامی دنیا میں صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ سے حاجت مندوں کی فلاح و بہبود کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے یورپ میں نجی خیرات اور قومی فرائض میں توازن پر بہت بحث مباحثے ہوئے اور ایراسمس اور دان لوئی والوز جیسے لوگوں نے غریبوں اور بیماروں کی نگہداشت کے ضمن میں ریاستی حکام کے وسیع تر کردار کی حمایت کی۔ انگلستان کی حکومت نے1597ء اور1601ء کے درمیان مقامی پیرشوں پر فرائض کا ایک قومی ڈھانچہ لاگو کیا۔ اسکے علاوہ غرباء کی اولاد کے لئے مقامی حکام کو ٹیکس لگانے کا اختیار تفویض کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ عوام میں آوارہ گردی کے رجحان کو روکنا بھی تھا کیونکہ معاشرہ پہلے ہی بدنظمی کا شکار تھا لیکن یہ مذہبی اقدار کو عملی جامہ پہنانے کی ایک کوشش بھی تھی۔ یہ ابتدائی فلاحی ریاست1750ء تک 8 فیصد اور1800ء تک 14 فیصد آبادی کی سرپرستی کر رہی تھی اور اس پر اٹھنے والے روز افزوں اخراجات سے یہ بحث چل نکلی تھی کہ اس بار کو قابو میں کیسے رکھا جا سکتا ہے اور کیا اقدامات اختیار کیے جائیں کہ ان ترغیبات کی وجہ سے غریب لوگ کاہلی کا شکار نہ ہوں۔ (12)

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں بہبود کیلئے اس سے زیادہ انقلابی دلائل نے کامیابی حاصل کی۔ کنڈاسے نے دلیل دی کہ اس عہد کی صریح ناہمواریاں، 'معاشرتی آرٹ کے نقائص' کا نتیجہ ہیں جس کا حتمی انجام 'اقوام کے درمیان عدم مساوات کا خاتمہ' اور ہر قوم میں داخلی مساوات کا فروغ ہوگا'۔ تقریباً اسی دور میں ٹامس پین نے غربت کے خاتمے کیلئے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ٹیکسوں سے ادا شدہ سماجی بیمے کی ایک مفصل تجویز پیش کی۔ تاہم ان تصورات کو حقیقت کا روپ اختیار کرنے میں سو سال کا عرصہ لگ گیا۔ پھر ایسا وقت آیا کہ ریاستوں کو ووٹروں کے مطالبے کی وجہ سے بہبودی پالیسیاں اختیار کرنا پڑیں۔ جب عوام کی اکثریت نے ووٹ جیتا تو انہوں نے اسے چھوٹی ریاستوں کے محدود لبرل ازم کے استرداد اور ایک ایسی بڑی ریاست کے حق میں استعمال کرنا شروع کر دیا جو ان کی روز مرہ ضروریات کیلئے زیادہ موزوں ہو یعنی جو انہیں پنشنیں، ڈاکٹر، سکول اور گھر مہیا کر سکے۔(13) ریاستوں کو یہ باور ہوا کہ اگر ان کے عوام بھوکے، ان پڑھ یا بیمار ہوں گے تو وہ عسکری طاقت یا معاشی تحریک کی توقع نہیں کر سکتیں۔ (انیسویں صدی کے اواخر میں برطانوی فوج میں شامل ہونے کے دس امیدواروں میں سے چار خرابی صحت کی بنا پر مسترد ہو جایا کرتے تھے)۔ چنانچہ ریاستوں نے بیمے کو اجتماعی شکل دینا شروع کر دی اور انہوں نے ڈاکٹروں، معالجوں اور طبیبوں کے گڑھ کی صورت اختیار کر لی اور ایک صدی کے عرصے میں مثالی سرکاری ملازم فوجی یا اہلکار کی بجائے عوام کی براہ راست خدمت پر مامور ایک نگہداشتی کارکن میں تبدیل ہو گیا۔

ریاست کو درپیش مشکل ترین کام انصاف اور تقسیم اور یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ انہیں آمدنیوں کو مساوی بنانے کے معاملے میں کس حد تک جانا چاہیے۔ جیسا کہ امرتیہ سین لکھتا ہے1840ء کے عشرے میں آئر لینڈ اور1940ء کے عشرے میں بنگلہ دیش میں پڑنے والے قحطوں جیسے قحط بنیادی طور پر خوراک کی قلت کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس حقوق ملکیت اور قوت خرید نہیں ہوتی جو ان کے ریاست پر اثر و رسوخ نہ ہونے کی غماض ہوتی ہے مثلاً1877ء میں جنوبی ہند میں پڑنے والے قحط میں مرنے والے 5 ملین سے زائد افراد خوراک کی کمی کی وجہ سے نہیں مرے تھے بلکہ اس لیے مرے تھے کہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ لٹن نے انگلستان کو اناج کی برآمد ہر حال میں جاری رکھنے کا حکم دے رکھا تھا اور اپنے کار پردازوں کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ امدادی کاموں کو ہر ممکن طریقے سے روکا جائے۔

غربت شاذ ہی قدرتی ہوتی ہے۔ عموماً یہ حکومت کے احوال کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست پر تقسیم کے مسائل اس قدر تواتر سے غالب رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ریاست کو کس حد تک جانا چاہیے؟ شواہد سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اضافی آمدنی

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے غریب کنبے کو ملنے والی خوشی امیر کنبے کو ملنے والی خوشی سے زیادہ ہوتی ہے۔ اضافی درجے اہمیت کے حامل ہیں اور اگرچہ ایک شخص کی آمدنی میں اضافے سے اسے زیادہ خوشی مل سکتی ہے، یہ دیگر لوگوں کو زیادہ حاسد اور اپنی قسمت سے غیر مطمئن بھی بنا سکتی ہے۔[14] ناہمواری زندگی کی طمانیت پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے، اس کا تعین ایک حد تک کلچر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ امریکہ (یوایس) کی بجائے یورپی معاشروں کو زیادہ متاثر کرتی ہے، یا تو اس لیے کہ یورپی باشندے مساوی معاشروں کے زیادہ خواہاں ہیں اور یا پھر اس لیے کہ امریکہ میں بلند درجہ سماجی حرکت پذیری کا (زیادہ تر غلط) ادراک عدم مساوات سے پیدا ہونیوالی ناخوشی کو کم کر دیتا ہے۔[15] بہر کیف ان سب شواہد کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ مادی بہبود کے فروغ کی کسی بھی مہم میں امراء سے غربا کی طرف قابل قدر تقسیم نو ضرور شامل ہونی چاہیے۔

بہبود اور محافظت کی ذمہ داری کا آپس میں بہت قریبی تعلق ہے۔ ان دونوں معاملات میں ریاست کا کردار یہ رہا ہے کہ خطرات کو کم کیا جائے، خصوصاً ان شعبوں میں جہاں شہری اپنا تحفظ نہیں کر سکتے، مثال کے طور پر امریکہ کی حکومت نے بیروزگاری، بڑھاپے کی بیماری، خراب فصل، سیلاب، آتشزدگی، بینک کی ناکامی اور مہنگائی کے خلاف متعدد مرتبہ بیمے کیے ہیں۔[16] ان تمام صورتوں میں رفاہ عامہ کا انحصار مشترکہ تشخیص یا مفاد کے سماجی یا سیاسی احساس پر ہوتا ہے۔ بعض ملکوں میں ہجرت و نقل مکانی سے لوگوں کے دوسروں کی بہبود کیلئے پیسہ دینے کے جذبے پر برا اثر پڑا ہے۔ ہم جنس معاشروں کی نسبت زیادہ کثیر جنسی معاشروں میں یکجہتی کا عنصر کم ہوتا ہے لیکن جہاں مضبوط جماعتیں اور بائیں بازو کی تحریکیں موجود ہیں وہاں دوسروں کی اعانت کے جذبے پر گونا گونی کا اثر کم دیکھنے میں آتا ہے۔[17] 'فیاضانہ سیاست' نے حکومت کے فلاحی کردار کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کیش کے لوگ اجنبیوں کو بھی وہی سخاوت اور مہربانی دینے کی کوشش کرتے ہیں جس کا مظاہرہ لوگ اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ عیسائیوں کے عہد نامہ جدید، قرآن پاک اور بائیں بازو کی سیاست کے پیغام کا مرکزی جزو ہے۔ یہ ہمدردی، تعلق اور فکر مندی کا وہ خواب ہے جسے ریاست نے بڑے وسیع پیمانے تک پہنچا دیا ہے۔ ایک سروے کے مطابق بعض ترقی یافتہ ممالک کے شہری مزید منصفانہ تقسیم کے حصول کی خاطر

allurdupdfnovels.blogspot.com

اپنی آمدن کا چوتھائی تا تہائی بھی دینے کو تیار ہیں۔[18] اس سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ دنیا میں آج کل اس قدر زیادہ تقسیم نو کا عمل کیوں جاری ہے، بھارت میں نچلی جاتیوں کیلئے اس قدر امدادی کام کیوں ہو رہا ہے، یورپ میں دیہاتی اور شہری غریب علاقوں کے لئے فلاحی پروگرام کس وجہ سے تشکیل پا رہے ہیں اور امریکہ نادار گھرانوں کی بہبود کیلئے اتنا پیسہ کیوں خرچ کر رہا ہے۔

محافظت کی ذمہ داری اور فلاح و بہبود کی ذمہ داری کا ماحولیاتی حوالے سے بھی بہت قریبی تعلق ہے۔ لوگ انٹارکٹیکا سے لے کر صحرائے اعظم تک بہت مختلف حالات میں ریاست کی مدد کے بغیر زندگیاں بسر کرتے رہے ہیں۔ وہ ہر طرح کے ماحولیاتی نظام میں زندگی بتانے کا گر سیکھ سکتے ہیں، بعض اوقات وہ اپنے ماحول کو تبدیل بھی کرتے ہیں اور ان کا اس کے ہیر پھیر پر بہت زیادہ انحصار ہو جاتا ہے۔ لیکن بہت زیادہ آبادی والے خطوں میں ریاستوں کو ماحول کے انتظام کیلئے بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ وہ کاشت کاری کو فروغ دیتی ہیں، نہریں بناتی ہیں اور بردگی سے بچاؤ کیلئے جنگلات لگاتی ہیں۔ بہت سی ریاستیں ماحول کے انتظام میں ناکامی کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اس کے ثبوت میں ہم ارک (عراق) کی اکادی سلطنت اور مرکزی امریکہ کی عظیم ریاستوں کی مثال دے سکتے ہیں۔ ارک کی زمینیں پہلے بہت زرخیز تھیں لیکن پھر وہ ریگستان میں تبدیل ہوگئیں۔ اکادی سلطنت کے عہد میں 2000 ق م تک وہاں کی زمین سفید ہوگئی تھی۔ ایتھنز کے عظیم فرمانروا سولن نے زمین کی بردگی کے سدباب کی کوشش میں زیادہ ترچھے میدانوں پر کاشت اور خوراک کی برآمد پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں بہت سے ایسے حکمرانوں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے اپنی حکومت کے جواز کی تلاش میں آب رسانی کے بڑے بڑے منصوبے تعمیر کرائے۔ یہ شہروں کی بلا روک ٹوک اور بیہودہ نمو کا ردعمل تھا کہ انیسویں صدی میں جدید منصوبہ بندی اور صحت عامہ کے نظام وجود میں آئے۔ میکسیکو سٹی، ممبئی اور لاگوس کی غریب آبادیوں کا حشر بھی ہمارے سامنے ہے جہاں کسی موثر و فعال ریاست کے نظر نہ آنے کے سبب آئے دن بہت سے لوگ جرائم، افلاس اور بیماریوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔

اگر ریاست کا ایک منصب لوگوں کو ناخوشگوار ماحول کی تکالیف سے بچانا ہے تو دوسرا فرض بہتر ماحول پیدا کر کے ان کیلئے زیادہ خوشی و مسرت کا سامان بھی پیدا کرنا ہے۔ ہم اچھی

allurdupdfnovels.blogspot.com

زندگی کو ڈھیر سارے درختوں اور خوبصورت فطری مناظر، پارکوں سے بھرے شہروں اور اچھے کھانوں سے منسوب کرتے ہیں اور جدید ریاستیں اپنے عوام کو پبلک پارک، جانوروں کی پناہ گاہیں، آرٹ گیلریاں اور کنسرٹ ہالوں کی سہولیات بہم پہنچانیکی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، امریکہ اور کینیڈا جیسے ممالک نے اپنی زمینوں کا ایک تہائی نیشنل پارکوں کو دے رکھا ہے جن کا انتظام یہ حکومتیں بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر کرتی ہیں اور امیر ریاستیں اپنے بڑے شہروں میں عوامی مقامات، یادگاروں اور پبلک آرٹ پر دل کھول کر پیسہ خرچ کرتی ہیں۔ (19)

انصاف فراہم کرنے کی ذمہ داری:

ریاستوں کے جواز کا تیسرا بڑا وسیلہ عدل و انصاف ہے یعنی وہ نظم و نسق برقرار رکھنے کیلئے مجرموں کو سزائیں دیتی ہیں اور تنازعات کا تصفیہ کراتی ہیں۔قدیم ریاستیں بہت متشدد اور غیر مساوی انصاف فراہم کرتی تھیں جو بنیادی طور پر امیر اور طاقتور افراد کو لاتعداد غریبوں اور کمزوروں سے تحفظ فراہم کرنے کیلئے بنایا جاتا تھا۔قدیم یونانی شاعر پندار نے اپنے سیاسی فلسفے کی بہت پرمشہور سطور چھوڑی ہیں ۔ وہ کہتا ہے ، قانون سب کا بادشاہ ہے، جو فانی ہیں ان کا بھی اور جو لا فانی ہیں ان کا بھی۔ یہ بہت مضبوط ہاتھوں سے کام سرانجام دیتا ہے اور سب سے زیادہ متشدد کو جواز مہیا کرتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ تمام حکمران خود کو عدل و انصاف کے خدام کے طور پر بھی پیش کرتے آئے ہیں۔قدیم مشرق وسطیٰ کا عظیم قانون ساز حمورابی نے کہا تھا کہ اس نے ایسے قوانین سورج دیوتا سے حاصل کئے ہیں جو وہ سب کچھ دیکھتا ہے جو انسان کرتے ہیں۔حکیم ارسطو کے نزدیک اچھے اور برے، منصفانہ اور غیر منصفانہ کی تمیز ہی انسان کو جانوروں سے ممیّز کرتی ہے اور وہ اس کے بہترین اظہار کے لیے ایک ایسی ریاست کا تصور پیش کرتا ہے جو اچھائی اور برائی کے درمیان امتیاز کر سکے۔ پہلے علاقے کے بزرگ غیر رسمی انداز میں انصاف کی فراہمی کا اہتمام کیا کرتے تھے لیکن جب ریاستوں نے اسے رسمی شکل دی تو اس نے حکومت کے ایک الگ عضو کی حیثیت اختیار کر لی جو کہ انتظامیہ سے آزاد اور گاہے گاہے

allurdupdfnovels.blogspot.com

اس سے برتر بھی خیال کیا جاتا رہا۔ پھر یہ غیر شخصی، سرد اور اندھا ہوتا چلا گیا جیسا کہ بعض شبیہوں میں بھی دکھایا جاتا ہے کہ ایک نابینا شخص نے ہاتھ میں ترازو پکڑا ہوا ہے۔

انصاف کے معانی اور اس کے فروغ میں ریاست کے کردار کا مطلب سیاق وسباق اور ثقافت پر منحصر رہا ہے۔ رومن قانون کا رہنما اصول یہ تھا کہ ہر ایک کو اس کا جائز حق ملنا چاہیے اور جو چیز سب پر اثر انداز ہوتی ہے، اس کی منظوری سب سے لی جانی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں کسی کے مفادات بھی نظر انداز نہیں کیے جانے چاہئیں اور کسی کو بھی کسی کا محکوم نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تصور کہ قانون یکساں ہونا چاہیے بعد میں آنے والے باغیوں کو قوت مہیا کرتا رہا ہے جن میں انگلستان میں1381ء میں بپا ہونے والی کسانوں کی بغاوت کے قائدین بھی شامل ہیں جن کا مطالبہ تھا کہ جو کوئی بھی ان پر زیادتی کرتا ہے انہیں اس کے خلاف عدالت میں کھڑے ہو کر بولنے کا حق دیا جانا چاہیے خواہ زیادتی کرنے والا ان کا آقا یا حاکم ہی کیوں نہ ہو۔

ہندوستان میں 'قوانین ہند' اس سے الٹ اصول اختیار کیا گیا اور مختلف درجے کے شہریوں کیلئے بہت مختلف فرائض وحقوق مقرر کیے گئے۔ چین کے پرانے بادشاہ کسی ایسے تصور کو خاطر میں لائے بغیر انصاف کرتے تھے کہ انصاف پانے والوں کے بھی کوئی حقوق ہیں۔ جنہیں قانون پسند دانشور اپنے بادشاہوں سے کہتے تھے کہ 'خاندان اور بھائی چارے کی اقدار کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانون اپنی پوری شدت کے ساتھ عمل میں لایا جانا چاہیئے'۔ ان کا خیال تھا کہ بادشاہ کا کردار منصفانہ سزاؤں میں بھی ویسے ہی ظاہر ہوتا ہے جیسے کہ یہ ان کی اخلاقی اثر کی طاقت سے ہوتا ہے[21] اور سولھویں صدی کے انگلستان میں ولیم ٹنڈیل نے اسی نظریے کی توثیق میں کہا تھا کہ کسی پرچھائیں کے بجائے اگر کسی ظالم کو اپنا بادشاہ بنا لو تو بہتر ہے یعنی ایک ایسے مجہول حکمران سے بہتر ہے کہ جو کچھ بھی نہ کرے۔ اس کی دلیل تھی کہ بھلے وہ اچھے لوگوں سے زیادتی کرے وہ بروں کو سزا ضرور دیتا ہے۔

ابتدائی جدید یورپ میں انصاف کیلئے کی گئی کوششوں نے جمہوریت اور حقوق کیلئے راہ ہموار کی۔ کہتے ہیں کہ جب فریڈرک اعظم نے برلن کے نزدیک واقع اپنے محل کے باغات کی توسیع کرنا تھی تو اس نے ایک چکی والے سے کہ جس کی چکی توسیع میں حائل تھی کہا

allurdupdfnovels.blogspot.com

کہ وہ اپنی چکی بیچ دے۔ چکی والے نے جواب دیا کہ نہیں وہ اسے اپنے بچوں کیلئے رکھنا چاہتا ہے۔ بادشاہ بولا چکی تو میں کچھ لیے دیئے بغیر بھی تم سے لے سکتا ہوں۔ اس پر وہ آدمی بولا، ''ہاں حضور اگر ہمارے ملک میں عدالتیں نہ ہوتیں''۔ یہ چکی حکمرانوں پر قانون کی بالا دستی کی علامت کے طور پر بادشاہ کے محل کے پاس اب بھی کھڑی ہے۔

ریاستی انصاف کا حیطہ روایتاً متشددانہ سرگرمیوں اور جائیداد، خاندان اور وسائل کے معاملات تک محدود رہا ہے۔ قانون کے لئے ایک پولی نیسی لفظ ہے 'پانی سے متعلق' جو کہ ماضی بعید میں تنازعے کی بڑی وجہ رہا ہے ...... اور شاید مستقبل میں بھی ہمیں ایسے دن دیکھنے پڑیں۔ تاہم اب مغربی دنیا اور اس کے زیر اثر پوری دنیا میں سماجی انصاف، عالمی عدل، جنسی انصاف، بین النسلی انصاف، امتیاز اور ریاست کی اپنی کارروائیوں جیسے معاملات بھی انصاف کے دائرے میں شامل ہو گئے ہیں۔

اس بنیادی طور پر ایک اخلاقی عوامی مضمون میں اب بہت سے دیگر معاملات زندگی شامل ہو گئے ہیں۔[22] خصوصاً مشترکہ قانون کے نظاموں میں جہاں جج قوانین کے پیچھے مضمر غیر صریح اصول تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مقننہ اور حکمرانوں کی صادر کردہ پالیسیوں کے سادہ نفاذ کے بجائے اصولوں کے پاسبانوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔[23]

انصاف عمومی طور پر ریاست کی اجارہ داری رہی ہے۔ بعض اوقات مذہب بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے تاہم اس کی پائیداری کا دارو مدار اکثر لوگوں پر ہوتا ہے مثلاً قدیم ایتھنز کے حکمران سولن کا قانون کہتا تھا کہ جو شخص خانہ جنگی میں کسی نہ کسی جانب سے شرکت نہ کرے اسے سزا دی جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پورا معاشرہ متحارب گروہوں کو پرسکون کرنے کیلئے اپنا اثر استعمال کرے۔ آج کل بہت سے ملکوں میں مکمل طور پر پیشہ وارانہ نظام عدل کے خلاف مزاحمت جاری ہے اور وہاں جبر سے بچنے کی خاطر عام شہریوں پر مشتمل جیوریوں اور غیر پیشہ ور مجسٹریٹوں سے کام لیا جا رہا ہے۔

صداقت اور علم کی ذمہ داری

ریاست کے جواز کا چوتھا وسیلہ قوم کی بقاء کیلئے اہم علم اور صداقت کی پاسداری کا دعویٰ ہے۔ شروع میں کائنات، آب و ہوا، شکار گاہوں اور حریف قبائل سے متعلقہ صداقتیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

اہم خیال کی جاتی تھیں۔ یہ ایسا علم تھا جو ماحول کی غیر یقینیت میں تخفیف کرتا اور انسان کی عمل داری میں توسیع کرتا تھا۔ بعد کے بادشاہوں نے اپنے دیوتا نما کردار سے جواز حاصل کرنا شروع کر دیا اور وہ دنیا میں نظام برقرار رکھنے اور مذہبی صداقتوں کی حوصلہ افزائی کیلئے رسومات کا اہتمام کرنے لگے۔

سولھویں صدی میں ہندوستان پر راج کرنیوالا بادشاہ جلال الدین محمد اکبر غالبًا وہ پہلا بڑا لیڈر تھا جس نے عقل و استدلال کو ریاست کی بلند ترین قدر کے طور پر فروغ دیا اور ایک ایسے وقت میں کہ جب اسلام کے پاس عیسائیت کو تحمل و روشن خیالی سکھانے کیلئے بہت کچھ تھا۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بہت سی مغربی حکومتوں نے علم و عقل کے حوالے سے اپنا جواز بنایا اور اپنے دستور بدیہی صداقتوں کی بنیاد پر استوار کیے۔ اس میں بیسوی صدی کے اوائل کے یورپی آئین کی تمہید بھی شامل ہے، جس میں عقل کی فضیلت تسلیم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ انجینئرنگ، شہری منصوبہ بندی اور صحت عامہ جیسے کئی پیشے ریاست کی ذمہ داری میں آئے اور جدید نصابوں میں اس بات کا تعین کیا گیا کہ بچوں کو کیا جاننے کی ضرورت ہے۔

ریاستوں کے بہت سے دعوے جھوٹے، خودغرضانہ اور ریاکارانہ تھے۔ ٹیلی رینڈ اپنے اس فقرے میں اپنی طنز سے محظوظ ہوتا محسوس ہوتا ہے کہ، سچائی وہ چیز ہے جس کا دعویٰ خوبصورت انداز سے کیا جا سکے اور جس پر اعتماد سے ڈٹا جا سکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر آپ حقائق کو مناسب حد تک اذیت پہنچائیں تو وہ کسی بھی بات کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ ماؤ اور کم ال سنگ نے تاریخ انسانی کے عظیم ترین مدبر اور شاعر ہونے پر ہی بس نہیں کی بلکہ انہیں عظیم ترین سائنسدان بھی بننا پڑا۔ چین کے ثقافتی انقلاب کا ایک نعرہ یہ بھی تھا ''خواب خواہ جتنے بھی زیادہ ہوں زمین اتنا ہی زیادہ دے گی (اب پتہ نہیں قدرت کے تقاضے کیا کہتے ہیں)۔

نازی اور ایک مختصر عرصے تک سٹالن کے پیروکار سچائی کو مروڑنے اور اسے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کے معاملے میں نمایاں رہے۔ ہٹلر کا دست راست گوئبلز اس سے بھی ایک قدم آگے نکلا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر آپ کوئی بہت بڑا جھوٹ بولیں اور پھر اسے

allurdupdfnovels.blogspot.com

دہراتے رہیں تو بالآخر لوگ اس پر یقین کرنے لگتے ہیں۔ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ ریاست کیلئے اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر انحراف کو کچلنا بہت اہم ہے کیونکہ سچائی جھوٹ کی جان لیوا دشمن ہے لہٰذا اس کا نتیجہ صریح یہ نکلتا ہے کہ سچائی ریاست کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ گوئبلز کا یہ فلسفہ زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوا۔ حاکموں کو اپنی حاکمیت کیلئے سند درکار ہوتی ہے اور وہ سچائی سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ایسی ریاست جو لوگوں پر یہ ثابت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتی کہ وہ صداقت کی پاسدار ہے تو وہ پھر اساتذہ ، پولیس افسروں، ڈاکٹروں اور سرکاری کارپردازوں کے روز مرہ رویوں کو صرف خوف کے بل پر ہی منضبط کرسکتی ہے۔[25]

خدمت کا مفہوم

ایک ریاست کیلئے بہت سی صفات اہم ہوتی ہیں جن میں یکسانیت ، اعتماد، حوصلہ اور پیش بینی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔لیکن جہاں تک جواز کے چار ذرائع یعنی محافظت ، بہبود، انصاف اور سچائی کا تعلق ہے وہ قدیم ترین تاریخی دور سے لے کر آج تک (خصوصاً مثالی) ریاستوں کے تانے بانے کا ایک لازمی جزو رہے ہیں۔ یہ سب مل کر وہ نظام تشکیل دیتے ہیں جس کا ریاست لوگوں سے وعدہ کرتی ہے۔ ایک ایسا نظام جو محفوظ اور خوشحال بھی ہوتا ہے اور سچا اور منصفانہ بھی۔ شاید ہی کوئی ریاست ہو جو یہ ذمہ داریاں نہ نبھاتی ہو یا نبھانے کا دعویٰ نہ کرتی ہو۔ اگرچہ سب ریاستیں مختلف فلسفیانہ روشوں پر چل کر اس تک پہنچی ہیں، ان کے سانچے واضح طور پر مشابہ دکھائی دیتے ہیں مثلاً ار کے بادشاہ ارنمو نے جس نے لگ بھگ 2100 ق م میں حکومت کی، اپنی رعایا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سرزمین پر انصاف قائم کرے گا اور دکھ، تکلیف اور تشدد کا خاتمہ کرے گا ، نیز قوانین بنانے اور ریاست کے مذہبی فریضوں کی پاسداری کرے گا۔ سمیریہ کے فرمانرواؤں کو مہروں، مجسموں اور مرتبانوں پر جرنیلوں، بارآوری کے منبعوں اور انصاف بانٹنے والوں کے طور پر دکھایا جاتا تھا۔ اس سے کوئی دو ہزار برس بعد یعنی 300 ق م کے لگ بھگ ہندوستان میں دنیا کے پہلے حقیقت پسند سیاسی نظریہ ساز کوٹلیہ، جو کہ اس وقت کے موریہ حکمران کا مشیر تھا، نے بھی اپنی تصنیف 'ارتھ شاستر' میں ایک فرمانروا کے فرائض بہت حد تک اسی انداز میں بیان کیئے۔ اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے مطابق ان میں بیرونی جارحیت سے ریاست کا دفاع، رعایا کی بہبود کا اہتمام، قانون کی محافظت اور داخلی نظم ونسق شامل ہیں۔ اس نے انہیں راج دھرم یعنی حکمرانوں کے اخلاقی فرائض کے طور پر پیش کیا اور ان کے بارے میں کہا کہ یہ کائنات کی فطرت میں موجود ہیں۔ انہیں ذاتی جواز کے حوالے سے بھی پیش کیا جا سکتا تھا کیونکہ جب کسی 'نا انصاف بادشاہ پر حملہ ہوتا ہے تو عوام یا تو اس کا تختہ الٹ دیتے ہیں اور یا دشمن سے جا ملتے ہیں'۔

اس سے دو ہزار سال بعد عہد جدید میں بھی مغربی حکومتیں اپنے فرائض عموماً ایسے ہی الفاظ میں بیان کرتی ہیں اور لوگوں سے تحفظ، خوشحالی، فلاح و بہبود، انصاف اور سائنس اور تعلیم کی صورت میں علم فراہم کرنے کا وعدہ کرتی ہیں۔ انتخابی معرکے اکثر و بیشتر تحفظ کے تقدم اور بہبود کے تقدم کے حق میں بحث مباحثوں میں بدل جاتے ہیں۔ قدیم ایتھنز کے پاس بھی یہی دو راستے تھے۔ جب چاندی کے نئے ذخائر دریافت ہوئے تو تھیمس ٹوکلیز نے کہا کہ اسے 200 نئے جنگی جہاز بنانے کیلئے استعمال کیا جائے مگر دیگر لوگوں کا موقف تھا کہ نہیں ہر خاندان کو دس دس درہم تقسیم کیے جانے چاہئیں۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ حزب مخالف کی جماعتیں انتخابات کا رخ سچائی کے سوالات کی طرف موڑ دیتی ہیں۔

جواز کے چاروں وسیلے وزارتی مناصب اور محکمہ جاتی ڈھانچوں (دفاع اور پولیس، فلاح اور صحت، انصاف، مواصلات اور تعلیم) اور ریاست سے سب سے زیادہ منسوب کیے جانے والے پیشوں یعنی فوج، پولیس، ڈاکٹر اور سماجی کارکنوں، منتظمین اور معاشیات دان، وکلاء اور جج، سائنسدانوں اور پروفیسروں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ہر پیشے کے خدمت کے اپنے آدرش، اختیارات کے ناجائز استعمال پر پابندیاں (جیسے کہ ڈاکٹروں کا حلف بقراطی) اور اپنی بحثیں ہوتی ہیں مثلاً آیا کہ پیشہ ورانہ علم ایک ملکیت ہے کہ جس سے فائدہ اٹھایا جائے یا یہ ایک عطیہ ہے جو دوسروں کے ساتھ تقسیم کیا جانا چاہیے۔

مزید گہری سطح پر یہ چاروں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں سے مطابقت رکھتے ہیں جن میں سے پہلا بقا کی خواہش، دوسرا خوشی کی تمنا اور تیسرا انسان کے مزاج میں موجود عدل و انصاف کی خواہش (اور مفت خوروں، لٹیروں اور بدمعاشوں کیلئے ناپسندیدگی) اور چوتھا علم حاصل کرنے کی عالمگیر خواہش۔ وہ ان اخلاقی افکار سے مطابقت رکھتے ہیں جو کہ بہت سے معاشروں کو سہارا دیتے ہیں۔ ان میں سرپرستی و تحفظ، زیادہ سے زیادہ لوگوں کیلئے زیادہ سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

زیادہ خوشی کی افادیت پسندی، قانونی طریقہ کار جس میں عمل انجام سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یونیورسٹیوں کا استدلال شامل ہے۔ ان میں سے ہر ایک علامتاً اخلاقی سوالات کے بارے میں اپنی امتیازی فکر رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ کسی قوم کی روز مرہ سرگرمیوں میں ایک دوسرے سے مل کر کام کرتے ہیں۔

اکثر ریاستوں کے جواز کے دعوے حقیقی کے بجائے زیبائشی زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن اتنے طویل زمانوں تک اتنے زیادہ خطوں پر ان کا غلبہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اگرچہ حکومت کے تقسیم ہونے اور پیشہ وارانہ رنگ اختیار کرنے کے سبب ریاستوں کا کردار بہت زیادہ تبدیل ہو گیا ہے، انسانی معاشروں کی بنیادی ضروریات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ (26)

پھر اس خدمت کی نوعیت کے بارے میں کیا کہیں کہ جو ریاستیں فراہم کرتی ہیں؟ خدمت کا آدرش بہت سی ثقافتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اصل میں اس کا مطلب ہے کہ جس شخص کی خدمت کی جا رہی ہو اسے حتمی نصب العین سمجھنا اور اس کی ضروریات کو خاموشی اور عاجزی سے سمجھنا اور پورا کرنا۔ اس میں سننے اور سمجھنے کی قابلیت بھی آ جاتی ہے (بابا فرانسس رب سے کہتا ہے 'میں تم سے یہ مانگتا ہوں کہ مجھ میں سمجھے جانے کی بجائے دوسروں کو سمجھنے کی جستجو زیادہ ہو') اس کی جڑیں اس پرورش و پرداخت اور نگہداشت میں لگتی ہیں جو خاندان بچوں کو فراہم کرتے ہیں بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ اس دیکھ بھال اور نگہداشت میں جو بیماروں اور مریضوں کو دی جاتی ہے اور جو تہذیب انسانی کو بقیہ نیچر سے ممیّز کرتی ہے۔

نجی زندگی میں خدمت ذاتی ہوتی ہے لیکن قومی زندگی میں یہ ہمہ گیر ہوتی ہے اور سب شہریوں کا احاطہ کرتی ہے۔ حکومتوں کیلئے مثالی چیز یہ ہے کہ حکمران کے اپنے مفاد کے بجائے مشترکہ مفاد میں حکومت چلائی جائے۔ افلاطون اور ارسطو کے ہاں تو قومی خدمت کا یہ آدرش حکومت کے وجود کی توجیہہ بھی کرتا ہے۔ یہ 'ریاست' میں بیان کردہ سرپرست کی تربیت کا جواز بھی مہیا کرتی ہے جو ذاتی مفاد کو کچلنے اور سرپرستوں کو پوری قوم کی فلاح میں تسکین حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ ارسطو کے نزدیک، ٹھیک شکل کی حکومتیں وہ ہوتی ہیں جن میں ایک شخص، چند یا بہت سے افراد مشترکہ مفاد کو پیش نظر رکھ کر حکومت چلاتے ہیں لیکن وہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

حکومتیں جو نجی مفاد کو مد نظر رکھ کر حکمرانی کرتی ہیں وہ گمراہ ہوتی ہیں خواہ یہ مفاد کسی ایک شخص کا ہو، چند کا اور یا پھر بہت سے افراد کا'۔ [27]

رومن ان مباحث کو ایک قدم اور آگے لے گئے۔ ان کیلئے خدمت کا مطلب دعوؤں کا ایک ہمہ گیر مجموعہ، ہر ایک کی ضروریات کا خیال، محض اجزائی کی بجائے مکمل، سسیرو لکھتا ہے کہ 'جو شخص شہریوں کے صرف ایک گروہ کی دیکھ بھال کرتا ہے اور بقیہ کو نظر انداز کر دیتا ہے، وہ شہر میں مہلک ترین عنصر متعارف کرانے کا ارتکاب کرتا ہے جس سے میری مراد فساد اور منافرت ہے'۔ [28] وہ مزید کہتا ہے کہ مدنی ہم آہنگی کی کلید یہ ہے کہ مشترکہ مفاد کے تصور کو اولیت دی جائے اور مجسٹریٹ 'پورے معاشرے کی فلاح و بہبود کی نگہداشت کریں اور کبھی ایسا نہ کریں کہ وہ معاشرے کے ایک حصے کی تو دیکھ بھال کر رہے ہوں اور بقیہ کو فراموش کر دیں'۔ آج کے جدید مغرب میں بھی قومی مفاد کے تصور میں یہ چیز شامل ہے کہ بعض ضروریات اور حقوق ایسے ہوتے ہیں جن کی ضمانت سب کو حاصل ہونی چاہیے اور جنہیں منصفانہ طور پر فراہم کیا جانا چاہیے۔

دیگر روایات میں بھی اس طرح کے تصورات موجود ہیں۔ چینی سیاسی فلسفے میں اجتماعی فائدے یا قومی مفاد (کنگ) اور نجی مفاد (سسو) کے درمیان فرق پر بہت بحث رہی ہے۔ اچھا حکمران وہ ہوتا ہے جو اجتماعی مفاد کیلئے کام کرتا ہے، جو وہ نہیں کرتا کہ جو ٹھیک ہے بلکہ وہ کرتا ہے کہ جو فائدہ مند ہے۔ [29] اسلامی معاشرے میں مصلحت (قومی مفاد) اور سیاسہ (قومی پالیسی) کے تصورات نے بھی یہی کردار ادا کیے۔

اچھے خادم وہ کچھ لیتے ہیں جس کی انہیں ضرورت ہوتی ہے، وہ نہیں کہ جسے وہ چرا سکیں۔ [30] چونکہ جس شخص کو بھی اقتدار ملتا ہے، اسے دولت کے حصول کیلئے اپنی طاقت سے فائدہ اٹھانے کی تحریصات کا سامنا ضرور ہوتا ہے، ماضی میں ایسی خوش نظمی بہت کمیاب رہی ہے۔ اسے اخلاقی ترقی کا ایک پیمانہ ہی سمجھیں کہ اب ہمارے حکمران عموماً جو تنخواہیں لیتے ہیں وہ دوسرے شعبوں کے ناظمین کی تنخواہوں کی نسبت بہت کم ہوتی ہیں (مثلاً برطانوی وزیر اعظم بی بی سی کے سربراہ کی تنخواہ کے ایک تہائی کے برابر وصول کرتا ہے اور کاروباری لیڈروں اور کامیاب وکیلوں سے تو بہت ہی کم لیتا ہوگا) اور ہم ایسے لیڈر کو تو بہت ہی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کے سوئٹزر لینڈ کی بینکوں میں اکاؤنٹ ہوں۔ اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے علاوہ اب بہت سے اصول ہیں جو ذاتی مفاد کو محدود کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان اصولوں میں سرکاری عہدوں پر اپنے حمایتیوں کی تقرریاں ، انتخابی مہموں میں بڑی کاروباری کمپنیوں کی طرف سے چندہ دینے اور اپنے انتخابی حلقوں میں سرکاری خزانے سے بیجا اخراجات پر پابندی کے لئے بنائے گئے اصول شامل ہیں۔

اچھے خادم اپنے کاموں کیلئے جوابدہ بھی ہوتے ہیں۔ بہت سی تہذیبوں میں اپنے فرائض میں کوتاہی برتنے والے حاکموں کو سزائیں دی گئیں یا انہیں ناراض دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے قربان کیا گیا۔ مغربی افریقہ کے یوروبا بادشاہوں کو جنگ میں شکست کی صورت میں قتل کر دیا جاتا تھا یا وہ خودکشی کر لیتے تھے۔ بعض معاشروں میں حکمرانوں کو عاجزی سکھانے کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔ سمیری بادشاہوں کے منہ پر بڑا کاہن سال میں ایک مرتبہ تھپڑ لگاتا تھا[31] اور جب روسی فاتحین بازاروں سے گزرتے تو ان کے ساتھ ساتھ ایک غلام ہوتا تھا جو گاہے گاہے ان کے کان میں سرگوشی کرتا رہتا تھا 'یاد رکھو کہ تم ایک فانی انسان ہو'۔ آج کل ان طریقوں کی جگہ سرعام تحقیر، رسمی شرمساری اور انتخابی مہموں نے لے لی ہے۔

ایک اچھا خادم شیخی مار اور نمائش پسند ریاست کے بالکل الٹ سنجیدہ، متین اور سمجھ دار ہوتا ہے۔ حکومت میں رہ کر خاموش خدمت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لاوزے بہترین لیڈر کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کے رخصت ہونے پر لوگ سوچتے ہیں کہ 'یہ سارا کچھ ہم نے خود کیا'۔ اسی طرح مارکس اور پیلیئس بھی عاجزی و انکساری کی بہت سی مثالیں دیتا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہمیں بہت سی مثالی ایسی ریاستوں کی بھی ملتی ہیں جنہوں نے تجاوز ،مداخلت اور غتربود سے کام لیا اور اپنے لوگوں کی کام کی صلاحیت کو نچوڑ کر رکھ دیا۔

اس کے بعد یہ مشکل سوال آتا ہے کہ ریاستیں ضبط نفس سے کام کیسے لیں۔ یہ جدید سیاسی فلسفے اور مشن کا مشکل ترین مسئلہ بن چکا ہے کیونکہ ریاستوں اور معاشروں کے درمیان کوئی سیدھی سادھی نسبت نہیں ہوتی جیسے کہ انیسویں صدی اور پھر 1980ء کے عشرے میں یہ سوچا جاتا رہا کہ ریاست جتنی بری ہوگی معاشرہ اتنا کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ اس کی بجائے کہ ریاستیں کس قدر بری ہیں یہ چیز زیادہ اہم ہے کہ وہ کیسے کام کرتی ہیں یا ان کا رویہ کیسا ہے۔ بڑی حکومتوں کے شہری مضبوط تر ہو سکتے ہیں اور چھوٹی ریاستوں کے کمزور تر۔ پسپا

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہوتی حکومتوں کی جگہ کوئی زبردست مدنی سرگرمی نہیں بلکہ منظّم جرائم لیتے ہیں، جیسا1990ء کے عشرے میں سابق سوویت یونین کی ریاستوں اور اس سے ایک عشرہ قبل کئی امریکی شہروں کو دیکھنا پڑا۔ اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا ریاستیں حاصل شدہ طاقتوں اور وسائل کو حقیقتاً مفید اشیاء میں تبدیل کر کے[32] اپنے عوام کیلئے اضافی قدر پیدا کرتی ہیں یا کہ اخیر میں جا کر قدر تباہ کر دیتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں قابل ترین ریاستوں کو بھی خود کو مسلسل آنکنا پڑتا ہے، ماضی کے منصوبوں اور سرگرمیوں کو ختم کرنا پڑتا ہے کہ کہیں یہ نہ ہو کہ ان کا ہجوم شہریوں سے بھی زیادہ ہو جائے۔

یہ مسئلہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ گمبھیر ہو گیا ہے کیونکہ ریاستیں وہ تمام اشیاء مجہول شہریوں کو فراہم نہیں کر سکتیں جو کہ اکثر لوگوں کیلئے اہم ہوتی ہیں۔ وہ مشترکہ پروڈکشنز سے زیادہ مشابہ ہوتی ہیں۔ ریاستیں اپنے عوام کی توانائی اور محنت کے بغیر معیشتوں کو خوش حال نہیں بنا سکتیں اور نہ ہی وہ لوگوں کو اس وقت تعلیم یافتہ کر سکتی ہیں جب تک کہ وہ خود تعلیم حاصل کرنے کی خواہش نہ کریں اور نہ ہی وہ اس وقت تک انہیں صحت مند بنا سکتی ہیں جب تک کہ خود ان کے دل میں صحت مند بننے کی خواہش پیدا نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر حکومتیں لوگوں کی خدمت کرنا چاہیں اور وہ جو چاہتے ہیں انہیں دینا چاہیں تو انہیں لوگوں کے سوچنے اور کام کرنے کا انداز بھی بدلنا پڑتا ہے۔ ڈیوڈ ہیوم لکھتا ہے کہ 'حکومت کے وہ تمام منصوبے جو نسل انسانی کے اطوار میں کسی بڑی اصلاح کا قصد کرتے ہیں سیدھے سیدھے تخیلاتی ہوتے ہیں' تاہم اس کے ایسا لکھنے کے دو سو برس بعد نوع انسانی کے اطوار میں بہت غیر معمولی درجے کی تبدیلی ہم نے دیکھی بھی۔ صفائی ستھرائی اور غذائی عادات دیکھ لیں، کام کے معمولات اور عائلی زندگی دیکھ لیں، خواہ فراغت کے مشاغل اور عقائد ملاحظہ کر لیں۔ مثال کے طور پر انیسویں اور بیسویں صدی میں عرصہ حیات میں اضافے کے سلسلے میں ہونے والی ڈرامائی پیش رفتوں کا انحصار عوامی رویے میں تبدیلیوں پر بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ جدید خدمات اور قواعد وضوابط پر۔ انہوں نے معاشی نمو سے حیران کن طور پر کم اثر لیا اور حالیہ شواہد اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ صحت کی بہتری معاشی نمو کے بعد ظاہر ہونے کی بجائے اس سے قبل واقع ہوتی ہے۔[33] انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی قومی ریاستوں نے نظم وضبط، تحمل اور حب الوطنی پیدا کر کے اپنے لوگوں کی عادات تبدیل کرنے

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کی۔ کوئی بھی ایسی ریاست جو کہ خوشحالی کے معاملے میں سنجیدہ ہوتی ہے رویے کے سوالات کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کر سکتی اور نوع انسانی کے رویوں کی اصلاح کیلئے کئے گئے ان کے کام لوگوں کو مضبوط تر بناتے ہیں، وہ ان سے کمزور تر نہیں ہوتے۔

وہ طریقے جن سے ریاستوں کو ایک ضبط نفس کے حامل خادم کی طرح کام کرنا چاہیے میدان کی نوعیت کے مطابق مختلف ہوتے ہیں، مثال کے طور پر محافظت و انصاف کے حوالے سے بہت سے ریاستی اختیارات کے خطرات خاص طور پر بہت زیادہ ہوتے ہیں لیکن اگر معاشرہ اپنا نظم ونسق خود سنبھال لے تو اس کے خطرات بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ ایک ہزار پولیس کے سپاہیوں کا حامل معاشرہ ایک سپاہی کے حامل ایسے معاشرے سے زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے جس میں اصول موزوں انداز میں کام کررہے ہوں۔ علم و بہبود کی نسبت سے شدید ریاستی عمل کے خطرات اتنے فوری نہیں ہوتے لیکن یہ دونوں شعبے ایسے ہیں جہاں معاشرتی خود تنظیمی عام طور پر ایک اچھی چیز سمجھی جاتی ہے اور ان شعبوں میں ضرورت سے زیادہ فعال ریاست لوگوں کو ضرورت سے زیادہ دست نگر بنا سکتی ہے۔

کچھ ان وجوہات کا سبب بھی ہے کہ ریاست کے جثے کے بارے میں اتنی طویل اور مسلسل بحث اس قدر غیر موثر رہی ہے۔1888ء میں ایک فرانسیسی معاشیات دان پیئر پال لیرو بولیو نے حساب لگایا تھا کہ کوئی جدید ریاست پائیدار طور پر جی این پی کے 12 سے 13 فیصد سے زیادہ نہیں لے سکتی اور جب ریاستی اخراجات جی ڈی پی کے40,30,20 اور 50 فیصد تک پہنچے تو اس کے متوازی دلائل بھی سننے کو ملے۔(34) جس سطح پر بھی پہنچا گیا تھا وہ حتمی حد ثابت ہوئی۔ یہ واضح بات ہے کہ کچھ اقتصادی نیز سیاسی حدود ہونی چاہئیں۔ یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ تجاوز غیر دانشمندانہ چیز ہے اور یہ کہ جو ریاست سب کچھ کرتی ہے وہ اپنے شہریوں سے تمام اخلاقی ذمہ داری بھی ختم کر سکتی ہے۔ اگر لوگوں کو زیادہ صحت مند، باعلم یا زیادہ متحرک بنا دیا جائے یا انہیں جبر و افلاس کی بیڑیوں سے آزاد کر دیا جائے تو ایک فعال ریاست ان کی اخلاقی خود انتظامی میں اضافہ کر سکتی ہے اور اگر کوئی ریاست کوشش سے کام نہیں لیتی تو وہ جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی کوششوں کے باوجود ابھی تک کوئی بھی ریاستوں کے جثے اور ان کی معیشتوں اور معاشروں کے محرک کے درمیان

allurdupdfnovels.blogspot.com

تناسب معکوس ثابت کر کے نہیں دکھا سکا۔ ریاستوں کی جسامت سے زیادہ یہ بات اہم ہوتی ہے کہ وہ کیا کرتی ہیں اور کتنی خوش اسلوبی سے کرتی ہیں۔

فلسفی مائیکل اوکشاٹ کی یہ بات بہت مشہور ہوئی ہے کہ اس سے زیادہ اخلاقی طور پر کمزور کرنیوالی چیز اور کوئی نہیں ہے کہ کوئی ناممکن کام شروع کر لیا جائے لیکن اگر ریاست کے پاس ابتلاء کے وقت کچھ کرنے کی طاقت موجود ہو اور وہ نہ کرے تو یہ بھی اخلاقی اعتبار سے کچھ کم نقصان دہ بات نہیں۔ ایسے رہنما نکمے ہوتے ہیں کہ جو صرف تقلید ہی کرنا جانتے ہوں اور اگر وہ عوام کیساتھ اس قدر احترام سے پیش آئیں کہ وہ انہیں تبدیل کرنے کی جرات بھی نہ کر سکیں۔ عوام کو صرف خدمات مہیا کرنا ہی بات نہیں بلکہ قوم کے اپنے بارے میں تصور، اس کی امنگوں اوراس کے شعور ممکنیت میں تبدیلی پیدا کرنا بھی بڑی خدمت ہے۔(35)

عمرانی معاہدے

خدمت کے تصورات کا دارومدار ان استعاروں پر ہوتا ہے جن سے لوگ ریاستوں اور لوگوں کے درمیانی تعلق کے متعلق آگاہ ہوتے ہیں۔ چین میں ریاست کو خاندان کے سربراہ سے تشبیہ دی جاتی تھی جو کہ عمومی طور پر عقلی اور اخلاقی اعتبار سے کمتر لوگوں کو تحفظ، بہبود اور اخلاقی رہنمائی فراہم کرتی ہے اور لوگ خود کو پیدائشی طور پر ہی ریاست کا مطیع خیال کرتے تھے۔

مغرب کے مقبول اخلاقی استعارے بہت مختلف رہے ہیں۔ سب سے زیادہ اثر آفریں استعارہ شہریوں کے درمیان اور شہریوں اور ریاست کے درمیان ارادی طور پر طے پانے والے معاہدے کا استعارہ رہا ہے۔ یہ اکثر کسی قدیم گاؤں یا کسی صحرائی نخلستان میں طے پایا متصور کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کی ایک واضح ترین مثال کہ یہ کیسے طے پا سکتا ہے ہمیں روس کے آئیوان چہارم کی تاریخ میں ملتی ہے۔ آئیوان نے کئی سال حکومت کی لیکن پھر بوئیر اشرافیہ کی مزاحمت کی وجہ سے اس کا اقتدار کمزور پڑ گیا اور اس نے 5-1564ء میں تاج و تخت چھوڑ کر ماسکو کو خیر باد کہہ دیا اور ایک چھوٹے سے گوٹھ میں رہائش اختیار کر لی۔ جیسا کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

وہ پہلے ہی توقع کر رہا تھا اس کے نکلنے کے بعد شہر کو خوف و ہراس اور افراتفری نے اپنی گرفت میں لے لیا کیونکہ عوام کو یہ خدشہ تھا کہ بوئیر اقتدار میں آ کر افراتفری اور جبر واستبداد کا بازار گرم کریں گے۔ آئیوان نے اس شرط پر واپسی کی حامی بھری کہ اسے کلی اختیارات سونپ دیئے جائیں۔ کچھ ہی دنوں میں اسے یہ اختیارات دے دیئے گئے اور خوف کے مارے لوگ اس سے ماسکو واپس جانے کی التجائیں کرنے لگے کیونکہ ان کیلئے بوئیروں کے حرص اور تاتاروں کے وحشیانہ پن کے مقابلے میں کوئی چیز بھی قابل ترجیح تھی۔

ٹامس ہابز نے اس واقعے کی نظریاتی توجیہہ پیش کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان اپنی زندگی کا آغاز آزاد طور پر کرتا ہے لیکن پھر اسے دوسرے انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ...... برے، جان کے دشمن، ناقابل اعتبار اور گھناونے انسانوں کا، جیسا کہ وہ خود ہوتا ہے۔ چنانچہ بقاء کیلئے سب انسانوں کو اپنی خود مختاری سے دستبردار ہونا پڑتا ہے تاکہ وہ اکٹھے ہو کر ایک واحد شخص بن جائیں جسے پھر شہر یا جمہوریہ کا نام دے دیا جاتا ہے اور جو پھر انہیں خطرات سے تحفظ فراہم کرتی ہے۔

لیکن یہ عمرانی معاہدہ صرف اکیلے اختیاری میثاق کے بل بوتے پر نہیں چل سکتا۔ اس کی بجائے اس کے نفاد کے لئے ایک ایسے فرمانروا کی ضرورت ہوتی ہے جو عام لوگوں سے الگ اور ان سے بالا ہو۔ جب کوئی ایسا نفاذ کنندہ مقرر کر دیا جاتا ہے تو لوگوں کیلئے پھر اسے دائرے میں رکھنے کا کوئی آسان راستہ نہیں رہ جاتا جیسا کہ لوگوں نے آئیوان کے اقتدار میں آنے کے جلد بعد سیکھ لیا تھا۔ یاد رہے کہ بعد ازاں آئیوان نے 'آئیوان دہشت ناک' کا لقب حاصل کیا۔ لہٰذا اس سے پھر ایک ہی منطق نکلتی ہے جو ہابز نے بھی محسوس کی اور جو آپ کو معاہدہ عمرانی سے اس قادر مطلق فرمانروا کی طرف لے جاتی ہے جس کی اطاعت آپ کا فرض ہوتا ہے۔ چونکہ انسان کیلئے سب سے بڑا خطرہ افراتفری اور انتشار ہے، اطاعت وہ واحد عقلی بنیاد ہے جس پر معاشرہ چلایا جا سکتا ہے۔ یہ معاہدہ کلیتاً یکطرفہ نہیں ہوتا۔ اگر حاکم آپ کو تحفظ دینے میں ناکام ہو جائے تو آپ کے پاس اختیار ہوتا ہے کہ آپ بغاوت کر دیں لیکن عام روز مرہ زندگی میں آپ پر لازم آتا ہے کہ آپ کو جو بتایا جائے آپ ویسے ہی کریں۔

جان لاک اور اس کے بعد بہت سے دیگر دانشوروں نے اس سے الٹ روش

allurdupdfnovels.blogspot.com

اختیار کی ہے۔ ان کے نزدیک افراتفری کی بجائے سب سے بڑا خطرہ ریاست کی طاقت کا ناجائز استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کا معاہدہ زیادہ شفاف بھی تھا اور زیادہ مساوی بھی۔ اس نے ان قوانین فطرت سے اکتساب کیا جو خدا نے اس دنیا میں بھیجے اور جن میں زندہ رہنے، جائیداد رکھنے اور آزادیوں کے حقوق شامل ہیں۔ اس معاہدے کے بامعنی ہونے کیلئے ضروری ہے کہ لوگ اس پر رضا مند ہوں لیکن اگر بعض افراد کو اس معاہدے کی شرائط منظور نہ ہوں تو دنیا میں 'خالی جگہوں' کی کوئی کمی نہیں، وہ وہاں جا سکتے ہیں۔ لیکن اس پر رضا مند ہونا ممکن ہے کیونکہ یہ لوگوں کی املاک کیلئے بہترین تحفظ فراہم کرتا ہے۔ چونکہ لوگ فطرتاً اچھے ہوتے ہیں اور اگر وہ خدا کی زمین پر 'امن و آشتی، خیر سگالی' اور باہمی تعاون سے زندگی گزارتے رہیں تو ریاست کا کاروبار آسانی سے چل سکتا ہے۔

معاہدہ عمرانی کی یہ کہانیاں[36] ان آفرنیشی حکایات کی طرح کی ہیں جنہیں بہت سے معاشرے اپنے ماضی و مستقبل کو معانی دینے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ بطور تاریخ ان کا فائدہ صرف ایک محدود حد تک ہے۔ وہ غلاموں، عورتوں اور ناداروں جیسے بہت سے نفوس کو معاہدے سے باہر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسا کہ ایڈمنڈ برک نے نشاندہی کی ہے وہ مرے ہوئے اور ان جنمے افراد کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں اور ریاست کی سرحدوں سے پار کے لوگوں سے کوئی حقوق و فرائض منسوب نہیں کرتیں۔ حالیہ دور تک بھی سیاسی تھیوری ہر معاشرے کو ایک بند اور زیادہ تر خودکفیل وجود کے طور پر ہی لیتی رہی ہے۔ لیکن ایک ازلی معاہدہ عمرانی کی تعریف کی یہ کوششیں (اور یہ تصور کرنے کی کوششیں کہ اگر ریاست کو پھر ایک نئے سرے سے شروع کیا جائے تو یہ کیسی لگے گی)[37] خدمت کے متعلق اور اس بارے میں سوچنے کا ایک زبردست طریقہ مہیا کرتی ہیں کہ بڑی ریاستوں اور چھوٹے لوگوں کے درمیان موجود شدید عدم توازن کو کم کس طرح کیا جائے۔

ریاستوں اور لوگوں کا انحصار باہمی

اچھی حکومت کے تصورات اتنے مختلف زمانوں اور ثقافتوں میں مشترک کیوں رہے ہیں؟ ممکن ہے کہ وہ ہماری جینیاتی پروگرامنگ میں شامل آرکی ٹائپ ہوں اور یا پھر ثقافتی حافظے کی طاقت انہیں اس قدر طویل زمانوں تک لے آئی ہو۔ بہت سے معاشروں نے اسی

allurdupdfnovels.blogspot.com

طرح کی اخلاقی منطق تسلیم کی ہے۔ یہ تصور کہ کسی بھی اختیار کی عملداری کے ساتھ اخلاقی فرائض لازم و ملزوم ہوتے ہیں تا کہ اقتدار کے موصولی سرے پر لوگوں کے انحصار اور زد پذیری کو اہل اقتدار کی ذمہ داری سے متوازن کیا جا سکے۔ اس اصول کا اطلاق خاندانوں میں والدین ، اداروں میں ناظمین، مالکان، آجرین، اور ریاست کے لیڈروں اور کار پردازوں پر کیا جا سکتا ہے۔ انحصار جس قدر زیادہ ہو گا، اس میں مضمر اخلاقی ذمہ داری بھی اسی قدر زیادہ ہو گی۔

خدمت کے ان تصورات کے ہر جگہ موجود ہونے کی ایک اور وضاحت یہ ہے کہ ریاستوں کے پاس ان کے اپنی رعایا پر انحصار کی وجہ سے اپنے اقتدار کے اخلاقی مضمرات کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ ہی نہیں ہوتا۔ ریاستوں کا انحصار اپنے اہلکاروں ،فوجیوں اور نمائندوں کی اطاعت پر ہوتا ہے اور جب وہ تعمیل کرنا بند کر دیتے ہیں تو ریاست کا اقتدار بھی اسی آن مسمار ہو جاتا ہے۔ آجروں اور اجیروں کے درمیان بھی یہی نسبت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ٹریڈ یونینوں کو باور ہوا آجروں کا دارومدار بھی مکمل طور پر اجیروں پر ہوتا ہے۔ کبھی اس باہمی انحصار کو ان کارنیوالوں میں منایا جاتا تھا جن میں مناصب الٹ جاتے تھے اور آج کے دور میں بھی انتخابات کے موقع پر یہی دیکھنے میں آتا ہے جب طاقتور لیڈر ایک مختصر عرصے کیلئے منکسر مزاج عرض پردازوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

تمام شکاریوں کا انحصار شکار پر ہوتا ہے لیکن حکومت کے معاملے میں یہ انحصار ایک زیادہ شدید شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہیگل نے آقا و غلام کی جدلیات کے متعلق لکھتے ہوئے اس باہمی انحصار کو بڑے شاندار طریقے سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ دنیا لوگوں کے درمیان ایک جنگ سے شروع ہوئی اور اس کا آغاز نہ صرف اشیاء کیلئے جدوجہد سے ہوا بلکہ اس وقت تشخص کیلئے بہت بڑی پیکار رونما ہوئی۔ یہ جدوجہد بہت تلخ تھی اور جب اس کا اختتام ہوا تو جیتنے والے آقا اور ہارنیوالے غلام بن گئے۔ چنانچہ فتح کا اثر متناقض ہوتا ہے۔ چنانچہ فاتح کے آقا بننے کا انعام یہ ہوتا ہے کہ اسے مزید کوئی کام نہیں کرنا پڑتا لیکن اقتدار و فراغت کے تعشیات اسے پہلے سے بھی کم آزاد بنادیتے ہیں اور چونکہ اسے کسی چیز کے خلاف جدوجہد نہیں کرنا پڑتی وقت گزرنے کے ساتھ اس کا عزم کمزور پڑتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس غلام دنیا پر اپنی محنت کے توسط سے پہلے سے بھی زیادہ بھرپور اور آزاد تشخص

allurdupdfnovels.blogspot.com

حاصل کر لیتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ آقا کا اس پر انحصار بڑھ جاتا ہے جبکہ غلام کی خود آگاہی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ آقا کو بھی نیچے کھینچ مارتا ہے اور ایک ایسے چکر کو حرکت میں لے آتا ہے جو خود کو دہراتا چلا جاتا ہے اور آخر کار ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ انقلاب کے ذریعے ایک نئی ریاست وجود میں آجاتی ہے جس میں ہر شہری کو تشخص حاصل ہو جاتا ہے۔(38)

یہ مظہر ہمیں ان حکمرانوں کی تقدیر میں بھی نظر آتا ہے جو اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے فوجیوں پر انحصار کرتے ہیں اور پھر کیا ہوتا ہے کہ اس کی حکومت کو سہارا دینے والے یہی فوجی اسے تخت سے نیچے گرا دیتے ہیں۔ قدیم روم، بازنطین اور ازمنہ وسطیٰ کی ریاستوں میں بارہا ایسا دیکھنے میں آیا۔ حالیہ دور پر نظر ڈالیں تو1960ء اور1970ء کے عشروں میں استعماریت کی راکھ سے ابھرنے والی بہت سی نئی ریاستوں کے غیر فوجی رہنماؤں کو بھی فوج کا مرہون منت ہونا پڑا۔ حتیٰ کہ اکثر ترقی یافتہ جمہوری ممالک بھی ان خطرات سے محفوظ نہیں ہیں۔

1950ء کے عشرے میں امریکی صدر آئزن ہاور نے متنبہ کیا تھا کہ امریکہ سیاستدانوں پر بے جا حد تک زیادہ طاقت اور اثر و رسوخ کا حامل ایک فوجی و صنعتی ڈھانچہ، کھڑا کر رہا ہے۔ آئزن ہاور چونکہ خود بھی ایک سابق جرنیل تھا، ہم اس کے اس تبصرے کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

اس خطرناک انحصار کو کم کرنے کیلئے بہت سے حربے استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ ریاستیں فوج پر روپے پیسے، وقار اور اعزازات بھی نچھاور کرتی رہی ہیں اور اس پر آئینی حدود و قیود بھی عائد کرتی رہی ہیں۔ بازنطینی شہنشاہ اپنے محلات کیلئے غیر ملکی باڈی گارڈوں کی خدمات حاصل کرتے تھے جن کا مکمل انحصار ان پر ہوتا تھا اور بہت سے سیاسی رہنما ایسے مشیروں کی معیت میں خود کو محفوظ محسوس کرتے ہیں جن کا کیریئر مکمل طور پر ان کی سرپرستی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ بعض رہنماؤں نے اپنے ہراول دستوں کو اس لیے تباہ کر دیا کہ وہ کسی قسم کے خطرے سے ایک قدم آگے رہیں۔ ابن سعود جس نے1920ء کے عشرے سے لے کر1953ء تک حکومت نے اخوان المسلمین کے ان جانبازوں کا بیڑہ غرق کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی جنہوں نے اس کی مملکت متحد کرنے میں اس کی اتنی مدد کی تھی۔ ایک

allurdupdfnovels.blogspot.com

دفعہ مطلب نکل جانے پر ہٹلر نے 'لمبی چھریوں کی رات' (ایس اے) کی پوری قیادت کو موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے کبھی ہٹلر کو اقتدار میں لانے کیلئے اس کے ساتھ اتنا تعاون کیا تھا۔

کوئی شخص جتنی زیادہ اراضی، ہتھیار، سپاہی یا شہر جمع کرتا ہے، اسے اپنی املاک کے انتظام اور نگرانی کیلئے اتنے ہی زیادہ افراد کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ ایک بڑا شہنشاہ ممکن ہے دیکھنے میں قادر مطلق دکھائی پڑتا ہوگا، اس کی سلطنت جس قدر وسعت اختیار کرتی تھی وہ ان لوگوں اور اداروں کا اسی قدر زیادہ محتاج ہوتا چلا جاتا تھا جو کہ بظاہر اس کے زیر فرمان ہوتے تھے۔ وہ اس محتاجی کو کسی خاص محکمے یا شعبے کا عہدہ سنبھال کر قبول کر سکتا تھا لیکن اس میں تعجب نہ ہونا چاہیے کہ بہت سے حکمرانوں نے اپنے اوپر لگے جکڑ بندوں سے تنگ آ کر تلخی کا اظہار بھی کیا۔

مزے کی بات ہے کہ زیادہ طاقت واقتدار سے انسان زیادہ کمزور اور خطرے کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم دوسری صدی قبل مسیح کے متحدہ چین کے پہلے شہنشاہ چن شی ہوآنگ کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ جب اس نے اپنی غیر معمولی حکمت اور عیاری سے اپنے تمام دشمنوں کو زیر کر لیا تو اس کے دل میں اپنے قاتلوں کا خوف اس قدر گھر کر گیا کہ وہ اپنے محل میں گھس کر بیٹھ گیا تھا اور وہ کبھی ایک کمرے میں دو بار نہ سوتا تھا۔ سفر بھی وہ ہمیشہ چھپ کر یا بھیس بدل کر کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے انتقال تک اس کے تمام اختیارات اس کے وزیروں اور زنخوں کو منتقل ہو چکے تھے اور وہ بس چھپ چھپا کر اپنے مفتوحہ صوبوں کے گرداگرد سفر کرتا رہتا تھا۔ شہنشاہ بس وہ نام کا ہی رہ گیا تھا۔

خوشی اور ضروریات کی یکسانیت

اخلاقی منطق اور حکمرانوں اور محکموں کا باہمی انحصار اس امر کی وضاحت میں مدد کرتا ہے کہ اچھی حکومت کے تصورات اتنے زمانوں اور اتنے خطوں میں یکساں کیوں رہے ہیں لیکن ایک دیگر وضاحت اس امر کی یہ ہے کہ انسانی گروہوں کی ضروریات میں مقابلتاً بہت کم تغیر واقع ہوا ہے۔ پہلے کی نسبت زیادہ عمر، زیادہ دولت اور زیادہ آزادی کے باوجود اس میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

نسبتاً کم تبدیلی پیدا ہوئی ہے کہ لوگ زندگی کیسے بسر کرنا چاہتے ہیں (ہم گوتم بدھ، عیسیٰ، کنفیوشس اور لاؤزے کے بشمول دو ہزار سال قبل کے خلفاء اور پیغمبروں کے تصورات سے آگے نہیں بڑھ پائے ہیں اور نہ ہی یہ تصورات متروک ہوئے ہیں)

ایک مرتبہ فلسفی دان رابرٹ نوزک نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ میریلن منرو، البرٹ آئن سٹائن، لڈوگ وٹگنسٹائن اور لوئی آرمسٹرانگ جیسے مختلف افراد پر مشتمل نوع انسانی کیلئے ایک ہی طرح کی اچھی زندگی بھلا کیسے ٹھیک ہوسکتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اچھی زندگی کا کوئی ایک واحد تصور اور یقیناً اگر وہ ریاست کی طرف سے مسلط کیا جائے، لازماً جابرانہ ہوگا۔ بہترین چیز جس کی ہم امید کرسکتے ہیں وہ ایک ایسا معاشرہ ہے کہ جس میں ہر شخص کو ہر ممکن آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنے لیے اچھی زندگی کی تعریف خود کرسکے۔ چنانچہ ریاست کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس اصول کو ہر ممکن حد تک پھیلائے۔ ایک تو اس نظام کی ضمانت دے کر جو کہ انتخاب کو ممکن بناتا ہے اور دوسرا لوگوں کیلئے ان قانونی اور دیگر ذرائع کو جگہ دے کر کہ جن سے وہ اپنی زندگیوں کی صورت گری کرسکیں۔ جیریمی بینھتم اپنے نظریہ افادیت کی وضاحت کے وقت کم وبیش ایسے ہی نتیجے پر پہنچا تھا۔ زراعت، صنعت اور تجارت حکومتوں سے جو فرمائش کرتے ہیں وہ اسی قدر معمولی اور معقول ہے جو کہ دیو جانس کلبی نے سکندر اعظم کو کی تھی کہ ''بھئی بس دھوپ نہ روکو، دھوپ آنے دو مجھ تک''۔ ہمیں کسی مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں صرف ایک محفوظ اور فراخ راستہ درکار ہے۔ بعد میں یہ تصور جدید لبرل ازم کی تعریف کی حیثیت اختیار کرگیا۔

یہ تصور کہ انسانی ضروریات لا انتہا طور پر مختلف ہیں اور کسی تہذیب کی ترقی کی نشانی یہی ہے کہ لوگ اپنی زندگیوں کی صورت گری میں کہاں تک آزاد ہیں بلاشبہ ایک بہت زبردست تصور ہے خصوصاً اگر ریاستوں میں ماضی میں نظر آنے والے جبر کے رجحان کو پیش نظر رکھا جائے۔ لیکن یہ اس بات کی وضاحت نہیں کرتا کہ ریاستیں اس طرح کی شکل کیوں اختیار کرلیتی ہیں اور آزاد لوگ فی الواقع اپنی ریاستوں سے کیا چاہتے ہیں۔ انفرادیت پسند کا اصول روزمرہ زندگی کی ناہمواریوں کے حوالے سے ایک بہت ہی نازک مسئلہ ہے۔ جس میں لوگوں کی پسند ناپسند آپس میں بہت زیادہ مربوط ہوتی ہے۔ سفر یا پیسہ ادھار لینے کی آزادی جیسی بہت سی آزادیاں ضوابط نافذ کرنے کی پاستی قابلیت پر بہت زیادہ منحصر ہوتی ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہماری روز مرہ کی خوشحالی کا دارومدار ہمارے اس اعتماد پر ہوتا ہے کہ جرائم اور وباؤں جیسے خطرات سے اجتماعی طور پر نمٹ لیا جائے گا کیونکہ ایسے قابل بھروسہ طریقے کم ہی ہیں کہ لوگ ان سے انفرادی حیثیت میں نمٹ سکیں۔ ہماری روز مرہ آزادی کا بیشتر دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ ریاستوں نے دوسرے لوگوں کو معاشرتی آداب کس خوش اسلوبی سے سکھائے ہیں اور انہیں کس حد تک قانون کا فرمانبردار، متحمل اور تعلیم یافتہ بنایا ہے۔ اور اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ لوگوں کو اپنی زندگیوں کے انتخاب اور ان پر اثر انداز ہونے والے فیصلوں میں شامل ہونے کی آزادی ہونی چاہیے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ بجائے خود کفیل ایٹموں کی طرح رہنے کے لوگوں کو ایک دوسرے کی پسند ناپسند پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔(40)

مختلف زمانوں میں حکومت کی ذمہ داریوں کے متعلق سوچ کی یکسانیت ایک سیدھی سادھی حقیقت کی عکاس ہے جو رابرٹ نوزک کی فکر سے بہت مختلف سمت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لوگوں کی خوراک، پانی، مکان اور تحفظ کی بنیادی مادی ضروریات عالمگیر ہیں (جو دنیا کی بیشتر آبادی کو میسر نہیں) جب لوگوں کو ریاست سے مطالبے کا اختیار دیا جاتا ہے تو وہ یہ چیزیں سب سے پہلے مانگتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب بنیادی حیاتیاتی ضروریات پوری ہو جائیں تو بہت مختلف زمانوں اور بہت مختلف خطوں میں اچھی زندگی کے تناظر میں بہت کم فرق دیکھنے کو آتا ہے۔ ثقافتوں سے پیدا ہونے والے معانی کی کوئی حد نہیں اور اکثر وہ منتشر دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں تاریخ، بشریات اور نفسیات سے جو بھی پتہ چلتا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اگرچہ انسانی امنگوں میں بہت تنوع پایا جاتا ہے، یہ تنوع نہ تو لامتناہی ہے اور نہ ہی بے سروپا۔ لوگ کیا چاہتے ہیں اور کون سی چیزیں انھیں خوشی دیتی ہیں، ان میں بڑے یکساں خطوط دکھائی دیتے ہیں اور یہ ریاست کی تحفظ و بہبود کی ذمہ داریوں سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔

ان عوامل کی اب معاشرتی سائنس نے خوشحالی کے بین الاقوامی اور بین الزمانی تجزیات کی مدد سے بڑی اچھی طرح تصدیق کر دی ہے۔ ان تجزیات کیلئے دیگر چیزوں کے علاوہ ان سروؤں کو بنیاد بنایا جاتا ہے جن میں لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے کس حد تک مطمئن ہیں۔(42) یہ اعداد و شمار ان گنی چنی حاجات و ضروریات کی نشاندہی کرتے ہیں جنہوں نے بہت مختلف قسم کے معاشروں میں بسنے والے کروڑوں افراد کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

رویوں کی صورت گری کی ہے۔ میں پہلے ہی کچھ بنیادی ترین ضروریات کا ذکر کر چکا ہوں جو کہ ان ذرائع کی صورت گری کرتی ہیں جنہیں ریاستیں اپنا جواز بناتی رہی ہیں۔ میری مراد مادی اشیاء، صحت، تحفظ اور مساعد ماحول کی ضروریات ہیں۔

بعض دیگر ضروریات عالمگیر نہیں لیکن ہم انہیں تقریبا عالمگیر کہہ سکتے ہیں۔ ان کا ریاست کی ذمہ داریوں سے اتنا براہ است تعلق نہیں لیکن وہ بھی اس چیز کی وضاحت میں مدد دیتی ہیں کہ خدمت کے تصورات اس قدر یکساں کیوں ہیں۔ ان میں سے ایک ضرورت کنبے کی ہے۔ اگر ہم پوری تاریخ انسانی پر نگاہ دوڑائیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ لوگون کی اکثریت کنبوں میں رہنے کو ترجیح دیتی رہی ہے۔ ان کے خط وخال میں بہت زیادہ فرق رہا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ خاندان بعض اوقات بہت بڑا ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ بہت چھوٹا۔ بعض اوقات خاندان ایک ساتھ مل کر رہنے والی تین یا اس سے بھی زیادہ پشتوں پر مشتمل دکھائی دیتا ہے اور بعض اوقات ایسے خاندان مشاہدے میں آتے ہیں جن کا سربراہ متعدد بیویوں کے ساتھ رہ رہا ہوتا ہے اور بعض اوقات عورت خاندان کی سربراہ بن جاتی ہے جو متعدد شوہروں اور ان سے ہونیوالے بچوں کی معیت میں زندگی گزارتی ہے۔ تاہم خاندانی اکائی بہت مختلف قسم کی (کسی بھی دوسرے ادارے کی نسبت بہت زیادہ) جذباتی قوت اور سہارے فراہم کرتی رہی ہے۔(43) ایک اور ضرورت گروہ کی ہے۔ لوگوں کو عزیز و اقارب کے ساتھ مل کر ایک معاشرہ بنا کر رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرتی روابط ہماری صحت، صدمات برداشت کرنے کی صلاحیت اور ہمارے تشخص کو تقویت بخشتے ہیں۔ اکثر افراد کو علیحدگی و تنہائی بہت زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ گاؤں، قصبے اور شہر میں اس قدر کشش محسوس کرتے ہیں۔ معاشرہ انسان کو تشخص، معنی اور مواقع فراہم کرتا ہے۔ بعض اوقات معاشرہ بھی جبر کرتا ہے لیکن یہ وہ نظم و نسق بھی مہیا کرتا ہے جو ہمیں اپنے پھلنے پھولنے کیلئے درکار ہوتا ہے۔(44)

روحانی ضروریات بھی مختلف ثقافتوں اور زمانوں میں تقریباً عالمگیر حیثیت کی حامل رہی ہیں اور یہ بات زندگی کی روحانی جہت اور خاندانی و گروہی بندھنوں کے درمیان تناؤ پر بھی صادق آتی ہے۔ بہت سے پیغمبروں نے اپنی نبوت کا آغاز عزیز و اقارب کو مسترد کر کے کیا۔ لیکن ماورائیت اور تعلق کی روحانی تفہیم اور کائنات کے سامنے تحیر ہمیں ان

allurdupdfnovels.blogspot.com

گرجوں، مندروں اور مساجد میں ہویدا نظر آتا ہے جو ہر معاشرے کے قلب میں موجود پائے جاتے ہیں۔ یہ روز مرہ زندگی کی پراگندگی کے پیچھے کارفرما بنیادی صداقتوں کی علامات ہیں (جیسے کہ قرون وسطٰی کے عظیم مسیحی متصوف ایکہارٹ فرماتے ہیں خدا روح میں کوئی چیز جمع کر کے نہیں ملتا بلکہ وہ تنہائی کے عمل سے ہاتھ آتا ہے)، اور کسی مذہب سے وابستگی اور تسکین کے درمیان بھی بہت گہری مطابقت پائی جاتی ہے۔[45]

آخر میں خود اختیاری اور خود انتظامی کی یکساں ضرورت یعنی ہم پر تسلط جمانے والی خارجی قوتوں کے خاتمے کی ضرورت کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ یہ کوئی جدید اختراع نہیں ہے بلکہ لگتا ہے کہ یہ ہمارے خمیر کا حصہ ہے۔اس بات کے بڑے قوی شواہد موجود ہیں کہ کسی مراتبی مخروط کے پیندے پر زندگی گزارنے والے افراد کو اوپر والوں کی نسبت زیادہ دباؤ برداشت کرنا پڑتا ہے جس سے ان کے حیاتیاتی امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں۔[46] ہمارے ہاتھ میں زیادہ کنٹرول ہونے کی صورت میں ہم خود کو زیادہ جاندار محسوس کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر کوئی اپنے لئے نئی شناخت ایجاد کرنا چاہتا ہے اور ایک بے حد آزادی کی دنیا میں اپنی زندگی سے ایک فن پارے کے طور پر برتاؤ کرنا چاہتا ہے۔ خود اختیاری کو منفی الفاظ میں زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم اصل میں دوسروں کی دھونس اور چودھراہٹ سے بچنا چاہتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ پر پھیلی جبر واستبداد کے خلاف بغاوتوں کی بہتات اور تائیوان، بھارت، ترکی اور میکسیکو جیسی مختلف ثقافتوں میں موجزن جمہوریت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ خود اختیاری کی بھوک صرف لبرل مغربی دنیا سے ہی خاص نہیں۔

سوئز اصول دان برونو فرے[47] اور اس کے رفقاء کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ خود انتظامی ہمارے لئے ایک اچھی چیز ہے۔ زیادہ براہ راست قسم کی جمہوریت لوگوں کی خوشی میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود شرکت اور شمولیت کا فعل بہت قابل قدر ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جمہوری معاشروں میں حکومتوں کے منصوبوں اور عوام کی امنگوں میں مطابقت کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی بات دفاتر، کارخانوں اور اداروں پر صادق آتی ہے جہاں تسکین، طمانیت اور کنٹرول کے درمیان بہت گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ صنعتی معاشرے کا مسئلہ حد سے زیادہ کام نہیں بلکہ حد سے زیادہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایسا کام ہے جسے دوسرے کنٹرول کرتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو آزادانہ اور تسکین دہ کام وہ ہوتا ہے۔ جو کام ہی کی خاطر سرانجام دیا جائے اور جس کے پیچھے کوئی 'خارجی دباؤ' کارفرما نہ ہوں۔

انسانی ضروریات اور ریاست کا کردار

یہ امر کہ زمانی و مکانی اعتبار سے انسانی ضروریات میں بہت یکسانیت پائی جاتی ہے از خود ریاست کے کسی کردار کا جواز مہیا نہیں کرتا لیکن انسانی ضروریات کی یکسانیت اس صورت کی بہت زیادہ وضاحت ضرور کرتی ہیں جو ریاستوں نے اختیار کر لی ہے۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی اس وضاحت میں معاونت کرتا ہے کہ ریاستوں میں لوگوں کو اچھی زندگی گزارنے میں مدد دینے کی بہت زیادہ اہلیت پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ ضروریات بہت براہ راست طور پر ریاستوں پر منحصر ہوتی ہیں مثلاً تحفظ کا دارومدار پولیس کے اداروں اور قواعد و ضوابط پر، صحت کا دارومدار سرکاری طور پر فراہم کردہ صاف پانی اور معالجین پر، خوشحالی کا دارومدار دانشمندانہ مالی پالیسیوں پر اور موافق ماحول کا دارومدار سرکاری توجہ اور آلودگی کے خلاف سرکاری طور پر وضع کردہ قوانین پر ہوتا ہے۔

ریاستیں انتہائی قریبی تعلقات پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہیں مثلاً شمالی کوریا اجتماعی شادیوں کا اہتمام کرتا رہا، ریاست یوٹا نے کثیر الزدواجی کی اجازت دی اور کئی یورپی ممالک نے اب ہم جنس شادیوں کو جائز قرار دے رکھا ہے۔ دیگر ممالک میں حکومت کی طرف سے دی جانیو الی مراعات اور محصولیاتی نظام تعلقات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور فن لینڈ اور ڈنمارک جیسے بعض ملکوں میں سرکاری پالیسیوں کے نتیجے میں شادیوں اور پیدائش کی شرح میں نمایاں کمی رونما ہو رہی ہے۔

بالواسطہ طور پر حکومتیں فرصت، فراغت، باغبانی اور کلبوں کی رکنیت جیسے مشاغل پر بھی کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہو سکتی ہیں جو خوشی و مسرت کے حصول کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ معاشروں کی قوت پر پلاننگ، پالیسیاں، سڑکوں کا محل وقوع اور مدارس کی تنظیم جیسے عوامل بہت زیادہ اثرات مرتب کر سکتے ہیں۔ حکومتیں یہ تو نہیں کر سکتیں کہ لوگوں کو کسی خاص معبود یا دیوتا

allurdupdfnovels.blogspot.com

پر ایمان لانے کیلئے مجبور کریں تاہم وہ مذاہب کی پیروی یا پرچار کی اجازت اور مالی مراعات اور تعظیم دے کر روحانی زندگی کو فروغ ضرور دے سکتی ہیں۔ حکومتیں لوگوں کے احساس خود انتظامی کی براہ راست صورت گری تو نہیں کر سکتیں لیکن اس پر دساتیر اور ان سے فروغ پانے والی آزادی و رواداری کے ذریعے اثرات مرتب کیے جا سکتے ہیں۔

ان تمام شعبوں میں ریاستوں اور معاشروں کے درمیان طاقت اور ذمہ داری کے توازن پر مستقل بحث جاری رہتی ہے مثلاً ازمنہ وسطیٰ میں روحوں کی نگہداشت کیتھولک چرچ کی اجتماعی ذمہ داری خیال کی جاتی تھی لیکن یہ برطانیہ جیسے معاشروں میں ایک نجی معاملہ زیادہ تصور کیا جاتا ہے جہاں مذہبی وابستگی اب بہت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ جسموں کی نگہداشت پہلے ایک نجی مسئلہ ہوتا تھا لیکن اب اسے عام طور پر سرکاری ذمہ داری سمجھا جاتا ہے۔ خاندان پہلے کلیتاً نجی سمجھے جاتے تھے لیکن اب یہ روز افزوں سرکاری عملداری میں آتے چلے جا رہے ہیں۔ اب سرکار بچوں کے تحفظ کیلئے بھی کام کرتی ہے اور خانگی تشدد کی تادیب کیلئے بھی اور والدین کیلئے اس تربیت کا بندوبست کرتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کیسے کریں۔ ٹی وی کی وساطت سے خاندان اب خود کو خوشی خوشی عوام کے سامنے بھی لانے لگے ہیں اور ایسے طریقوں سے کہ جنہیں اگر ماضی کی نسلیں دیکھتیں تو بہت بیہودہ خیال کرتیں۔

اکثر سیاسی لیڈران بنیادی اور ہمہ وقت موجود ضروریات کو تقریباً وجدانی طور پر سمجھتے ہیں تاہم بیسویں صدی میں ایک بہت عجیب شے دیکھنے میں آئی۔ وہ اس دور کے دو بڑے نظریوں یعنی کمیونزم اور پرو مارکیٹ نیو لبرل ازم کا خوشحالی کے ان صورت گروں سے غافلانہ اغماض تھا۔ مارکس ازم اور لینن ازم ارادی طور پر خاندان اور روحانیت کے خلاف تھا اور ماحولیات کے معاملے میں کچھ اور نہیں تو غافل ضرور تھا۔ مارکس کا خواب ایک ایسا مستقبل تھا کہ جس میں 'میں صبح کے وقت شکار کر سکوں' سہ پہر کو مچھلیاں پکڑ سکوں، شام کو مویشی پالوں اور شام کے کھانے کے بعد تنقید کر سکوں اور وہ عین اسی طرح کہ جیسے میرے پاس ایک ذہن ہے یعنی بغیر شکاری، مچھیرا، گوالا یا تنقید نگار بنے۔ (48) لیکن اس کے باوجود مارکس ازم اور لینن ازم کے پیروکاروں نے بعض معاشروں میں نہ صرف خاندان، کمیونٹی اور ماحول بلکہ مذہب اور مادی اشیاء کی فراہمی کو بھی ناپید کرنے کی کوشش کی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

لبرل ازم اکثر و بیشتر برادری ، دیوتا اور خاندان کے متروک بندھنوں کو شک کی نظر سے دیکھتا رہا ہے اور سرمایہ داریت پر دو سو سال سے اس کے روحانی کھوکھلے پن اور اس کے خاندان اور کمیونٹی سے وقت اور توانائی نچوڑ کر کام اور تجارتی سرگرمی میں ڈالنے کے رجحان کی وجہ سے تنقید کی جاتی رہی ہے۔1980ء اور1990ء کے عشرے کے نیو لبرل ازم کے مادی خوشحالی پر مکمل زور نے بطور ایک سیاسی پراجیکٹ کے اس کے اثر و رسوخ میں کمی کی اور تھیچر پسندوں اور ریگن پسندوں کیلیے ضروری کر دیا کہ وہ اسے خاندان، قوم اور مذہب سے متعلق ایک معاشرتی طور پر قدامت پسندانہ موقف سے (اکثر وقت کے ساتھ) وابستہ کریں۔

دونوں نظریوں نے اچھی زندگی کے خواب دکھائے لیکن ایک بنیادی فریب کے ذریعے۔ کمیونزم نے آزادی اور امکان کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا لیکن پھر یہ فرمایا کہ وقتی طور پر انہیں معطل کر دیا جائے۔ اس کے برعکس منڈی کی معیشت جیسا کہ ایڈم سمتھ 'قوموں کی دولت' میں بڑی وضاحت سے کہتا ہے، ہمیشہ ایک ایسے خفیہ ہاتھ کی پر فریب نوعیت پر مبنی رہی ہے جو خوشحالی پیدا کرنے کیلیے عجیب و غریب کارنامے سرانجام دے سکتا ہے لیکن یہ لوگوں کو ایسی بیکار اشیاء حاصل کرنے کیلیے محنت کرنے پر بھی ابھارتا ہے جو اسے خوشی نہیں دے سکتیں۔ خدمت کے ضمن میں ان دونوں فریقوں کے پاس کہنے کو کوئی زیادہ مواد نہیں تھا۔ اس کے باوجود ان کی عقلی توانائیاں اہداف کی بجائے ذرائع (حقوق اور ملکیت، منڈیاں اور آئینی عمل) کے متعلق پر جوش بحث مباحثوں پر لگی رہیں۔

خاندان بطور استعارہ

میں نے ریاست کے فرائض کے اخلاقی ڈھانچے کو بیان کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ ان عالم گیر ضروریات پر استوار ہوتا ہے جو ریاست کی ابتداء سے بھی قبل موجود تھیں۔ اب میں ان فرائض کا ایک اس سے بھی زیادہ بنیادی ماخذ بیان کرنا چاہوں گا۔ ریاستیں جو دعوے کرتی ہیں وہ زیادہ تر خاندان سے متعلقہ تصورات سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ چونکہ خاندان زیادہ مساوی، کشادہ اور جمہوری ہو گئے ہیں اس لیے اس کا جو مفہوم بنتا ہے وہ تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن ہمارے بنیادی استعارے اور ذہنی ڈھانچے تحفظ، سہارے اور نگہداشت کے والدینی منصب سے آتے ہیں اور ہم جس سب سے بنیادی ذمہ داری کا تقاضہ لیڈروں سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ نگہداشت کا فریضہ انجام دیں۔

سطحی درجے پر یہ آسانی سے نظر آ جاتا ہے کیونکہ ریاستیں ہمیشہ سے ہی خاندانی زندگی کی زبان سے استفادہ کرتی چلی آئی ہیں۔ ریاستوں کی بنیاد قوم کے باپ رکھتے ہیں، محبّ وطن افراد وطن پر یقین رکھتے ہیں، شہری برادری تشکیل دیتے ہیں، حکمران چاچا جو (سٹالن) بھی ہوسکتا ہے اور بڑا بھائی بھی، چاچو سام قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کو جنگ پر بھیجتا ہے جبکہ بے رشیا اور بے بھارت اپنے لوگوں کے ساتھ دکھ جھیلتی ہے اور ان کو پالتی پوستی ہے۔ قدیم چین کو 'کوچیا' یعنی ایک خاندانی ریاست تصور کیا جاتا تھا۔

لیکن یہ بندھن اس سے گہرے ہیں۔ خاندانی تعلقات بہت سے ما بعد الطبیعیاتی تصورات کے ازلی اور لاشعوری مآخذ ہیں مثلاً یہ کہ میں کون ہوں، میرا تعلق کس جگہ سے ہے، مجھے کیسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے اور مجھے کس کی اطاعت کرنی چاہیے؟ حتیٰ کہ ترقی یافتہ معاشروں میں اب بھی بچے اخلاقیات کے متعلق بیشتر چیزیں خاندان میں ہی سیکھتے ہیں مثلاً مجھے دوسروں کے ساتھ ساجھ کس طرح کرنی ہے، منصفانہ تقسیم کیسی ہوتی ہے، اقتدار کس کے پاس ہے، حقوق کس کے پاس ہیں وغیرہ۔ کسی معاشرے کے حکومت کے ساتھ تعلق کے اشارے، کبھی ظاہر تو کبھی پوشیدہ، اس نصاب میں ملتے ہیں جو خاندان میں سکھایا جاتا ہے اور بچپن میں ماں کے دودھ کے ساتھ ایک ایسے ادارے میں پیا جاتا ہے جو ریاست کی طرح کمزوروں کی حفاظت کرتا ہے اور ان کی طاقتوروں کے آگے اطاعت کو رسمی شکل دیتا ہے۔

اگر ہم خاندانی اصناف (جائنٹ فیملی، نیوکلیئر فیملی، مساویانہ خاندان یا حاکمانہ خاندان) اور اس طرح حکومت کی اقسام کی محدود تعداد پر نظر ڈالیں تو خاندانوں اور ریاستوں کے درمیان یہ روابط اس سے بھی زیادہ اجاگر ہو جاتے ہیں۔ عمانوئیل ٹوڈ[49] کی تحقیق کے مطابق کمیونزم سب سے زیادہ ان علاقوں میں پنپی جہاں مساویانہ خاندانی اصناف کا غلبہ تھا اور قوم پرستی ان خطوں میں پروان چڑھی جہاں حاکمانہ خاندان کا رواج تھا۔ انگلستان کی انفرادیتی منڈی کی معیشت اور اس کی مصر جمہوری ثقافت نے ان خاندانی ڈھانچوں کو راغب کیا جن میں بچے (اگرچہ جن کا باپ اب بھی غالب تھا) کسی حد تک زیادہ خود مختار تھے لیکن برابر نہ تھے۔ جرمن خاندان بچوں کی باپ کی رضا کے آگے اطاعت پر مبنی روایتاً حاکمانہ خاندان تھے جو

allurdupdfnovels.blogspot.com

مساوات سے بے نیاز تھے۔ روسی خاندان برابری اور تنظیم، بھائیوں کے درمیان مساوات اور باپ کی فرمانبرداری کا مرکب ہے۔ چین اور روس کے قرابتی ڈھانچوں کے درمیان مماثلتیں نظر آتی ہیں ...... اخوت کا شدید احساس، یکجان ہونے کی فراواں گنجائش اور یہ ماننے سے انکار کہ انسان بنیادی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس حاکمانہ خاندانی ڈھانچوں اور بچوں کے درمیان عدم مساوات والے آئر لینڈ، بیلجیئم اور جاپان جیسے خطوں میں لوگوں کے ان جگہوں میں امتیازات دیکھنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں کہ جہاں وہ موجود ہی نہیں ہوتے۔ (50)

ان خاندانی آدرشوں کو کسی نہ کسی حد تک سمجھے بغیر کہ جو ریاستوں کے ذہن میں ہوتے ہیں ریاستوں کے تصور کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ درحقیقت یہ مختلف روایتیں خاندان کے ان غالب تصورات کی صورت اختیار کر گئی ہیں جو کہ مغربی دنیا کے بیشتر سیاسی منظرنامے کی صورت گری کرتے ہیں۔ جارج لیکوف بتاتا ہے کہ ریاستوں اور سیاستدانوں کی کسی قدر زیادہ اخلاقیات کو صرف مثالی خاندانی اصناف کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ اصل خاندانوں سے مطابقت نہیں رکھتیں اور نہ ہی پرورش کے طریقوں اور ان نظریوں کے درمیان کہ جنہیں بچے اپناتے ہیں، کے درمیان کسی نسبت کا کوئی واضح ثبوت ملتا ہے۔ لیکن وہ ان سیاسی نظریات کی داخلی سریش فراہم کرتے ہیں جو لوگ اختیار کرتے ہیں اور جن کی پھر ریاستیں تجسیم کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور وہ وہ استعاراتی ڈھانچہ مہیا کرتے ہیں جس کے ذریعے ملکی سیاست کے بنیادی رنگ تشکیل دیے جاتے ہیں۔

قدامت پسندانہ سیاست ان بہت سی مختلف روایات سے ماخوذ ہے جو بالترتیب خلقاً بدسرشت انسانی کو لگام دینے کیلئے کسی مضبوط نظام یا ایسی چھوٹی حکومت کی کہ جس میں لوگ بغیر کسی مداخلت کے اپنی زندگیاں بسر کر سکیں یا ایسی منڈیوں کی کہ جس میں لوگ آزادانہ تجارت کر سکیں اور یا ایسی اقوام کی کہ جو تشخص اور تعلق کی تجسیم کر سکیں کی حمایت کرتی رہی ہیں۔ یہ سب چیزیں اکٹھی ہو کر نیوکلیئر خاندانوں کے اس سخت گیر باپ کے داخلی سانچے میں سمو جاتی ہیں کہ جو دیکھ بھال کی ذمہ دار ماں کے شانہ بشانہ خاندان کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے اور اصول بناتا اور ان کا نفاذ عمل میں لاتا ہے۔ بچے تعظیم اور فرمانبرداری کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ذریعے خود تنظیمی، خود انحصاری اور دنیا کے بارے میں وہ بنیادی صداقتیں سیکھتے ہیں کہ جو وقت گزرنے کے ساتھ انہیں خودمختار بننے کے قابل بناتی ہیں۔ پھر مقابلہ، محنت اور ضبط نفس کے شعار کے حامل افراد کو جزا دیتا ہے جن کی ذاتی مفاد کی جستجو سب کو فائدہ پہنچاتی ہے اور یہ مسابقت ہی ہے کہ جس کے ذریعے ہم یہ سیکھتے ہیں کہ کس کا رویہ اخلاقی رہا ہے اور خود تنظیمی کا گر کس کو آتا ہے۔ اس تناظر سے کسی غلط حرکت کی سزا بھی ملنی چاہیے اور صرف سزاؤں کے خوفناک اثرات کی وجہ سے نہیں، درحقیقت اگر کوئی حاکم ایسا نہیں کرتا تو اس کیلئے یہ ایک غیر اخلاقی بات ہو گی۔ بچوں کے بلوغت تک پہنچنے تک ان کے کردار تشکیل پا چکے ہوتے ہیں اور اب اس چیز کا امکان باقی نہیں رہتا کہ ان میں اصلاح کی جا سکے۔ لیکن ازاں بعد تحریصات اور سزاؤں کا ایک مناسب آمیزہ تقریبا کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اقتدار اور حاکمیت ایک مخروطی شکل کی ترتیب نزولی میں یعنی اوپر سے نیچے کی طرف چلتی ہے یعنی خدا سے لیڈروں کے ذریعے بڑوں تک پھر بچوں تک اور بالآخر فطرت تک۔ اس مراتبی مخروط کے ہر طبق پر نیچے والوں کی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ عین اسی طرح کہ جیسے والدین پر بچے کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اس اخلاقیات کا مرکزی استعارہ اخلاقی مضبوطی ہے یعنی راستی کے راستے پر رہنا، شر کی قوتوں کے آگے ڈٹے رہنا اور خود میں کڑا پن پیدا کرنا۔

ترقی پسند سیاست نے بھی ایسی ہی مختلف امواج کے مجموعے سے استفادہ کیا ہے، ان دلائل سے کہ انسانی فطرت سلیمہ کو بندشوں سے آزاد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، انصاف قائم کرنے کیلئے ریاست کی کایا کلپ کی حمایت کے توسط سے اور ان دعاوی سے کہ حاشیہ نشین اور اقلیتی عناصر کو براہ راست با اختیار بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم ایک مرتبہ پھر یہ سب اکٹھی ہو کر خاندانوں کے متعلق ایک تصور میں سمو جاتی ہیں جو ان کی جزوی وضاحت بھی کرتا ہے۔ یہ تصور پالنے پوسنے والے ایک ایسے خاندان کا ہے جو محبت اور احساس کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ محبت اور خبر گیری سے بچوں میں خود تنظیمی پیدا ہوتی ہے۔ ان میں ذمہ داری کا احساس آجاتا ہے اور وہ دوسروں کا احساس کرنے لگتے ہیں۔ فرمانبرداری تعظیم اور رابطے سے نمو پاتی ہے۔ بچوں کو ضرر رساں چیزوں مثلاً جرائم، منشیات

allurdupdfnovels.blogspot.com

اور زہریلے کیمیائی مادوں سے بچانے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن انہیں سوال کرنا اور اس بات کا خیال رکھنا بھی سکھایا جاتا ہے کہ دو برائیوں سے ایک اچھائی نہیں بن سکتی۔ زندگی کی منزل کی تکمیل ضروری ہے۔ خبر گیری بچے کے اندر گھر کر جاتی ہے اور وہ دوسروں کیلئے فیاض اور متعاون بن جاتا ہے۔ اخلاق، احساس کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔

یہ متضاد سوچیں اس بات کی وضاحت میں مدد دیتی ہیں کہ بصورت دیگر یہ غیر موافق عناصر سیاسی پروگراموں میں یکجا ہونے پر کیسے ہوتے ہی۔ قدامت پسندی کا مضبوط ریاست سے عشق انضباط کی مخالفت کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے جبکہ قدامت پسند سیاست کی اسقاط حمل کی حمایت بچوں سے زیادتی کے سد باب کیلئے فعال ریاستی مداخلت سے کندھا ملائے بیٹھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ حریف حکومتی فلسفوں کی وضاحت میں بھی مدد دیتی ہیں۔ قدامت پسندانہ سوچ ریاست کو ایک سخت، کڑے لیکن دیکھ بھال کرنیوالے باپ کے طور پر دیکھتی ہے اور ترقی پسندانہ سوچ ریاست کو پالنے پوسنے والی ماں کے طور پر دیکھتی ہے۔ اصل میں قدامت پسند سوچ محافظت کو اولیت دیتی ہے، انصاف کو نتائج کے حصول کے ذرائع کی بجائے بروں کی سزا کے طور پر لیتی ہے اور سچائیوں کو معین، مستقل اور ابدی خیال کرتی ہے۔ ترقی پسند سوچ بہبود کو اولیت دیتی ہے۔ انصاف کو حاصل شدہ نتائج کے حوالے سے آنکتی ہے اور سماجی و اخلاقی سچائیوں کو عموماً عارضی دریافتیں تصور کرتی ہے۔

وہ سیاسی تصورات جو منطقی اور پیچیدہ دکھائی دیتے ہیں اکثر سادہ جذبوں سے تعمیر ہوتے ہیں۔ یہ چیز ان کی طاقت بھی ہے اور ان کا خطرہ بھی۔ سادہ جذبوں میں دوستوں اور خاندان کی خبر گیری، تشدد کا خوف، عزیزوں کے دکھ کا غم بھی شامل ہے اور ان میں سے ہر ایک بہترین افعال کا باعث بن سکتا ہے لیکن سیاسی نظریے اور ادارے اپنی بیشتر کشش ان سادہ جذبوں کو دوسری سمتوں میں موڑ کر اور مرکوز کر کے حاصل کرتے ہیں۔ وہ مبالغے اور استعارے کے توسط سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ اکثر ان تصورات کے ماخذ بالکل ناقابل شناخت ہو جاتے ہیں جیسے بصورت دیگر شائستہ لوگ دوستوں اور خاندان کی محبت کے نام پر قتل کرتے، مثلہ کرتے یا ایذا پہنچاتے ہیں۔ نسل کشی اور جنگ کے بہت سے مطالعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ اپنے خاندانوں کو بچانے، آزادی کو فروغ دینے یا انسانی اخوت

allurdupdfnovels.blogspot.com

قائم کرنے کے خواہاں عام افراد کے نیک ارادے ہی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ اپنے قدم اخلاقی ڈھلوان پر رکھتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 5

ریاست بطور ملکیت

''اکثر اوقات وہ چیزیں جو حاکم کو فائدہ دیتی ہیں اس کے شہر کو نقصان پہنچاتی ہیں جبکہ وہ چیزیں جو شہر کو فائدہ دیتی ہیں حاکم کو نقصان پہنچاتی ہیں''۔ (میکیا ولی)

انتخابات کے دنوں میں بہت بڑے بڑے ڈرامے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان میں بہت تکڑے تکڑے لوگ غصے، امید، رنج اور اعداد و شمار کے غیر یقینی بھنور میں گھرے غوطے کھاتے دکھائی دیتے ہیں اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکومت میں بیٹھی جماعتوں کو الیکشن میں ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر ہارنے والوں کے شکست تسلیم کرنے کے فوراً بعد بجلی کے قمقموں کے چکا چوند میں تمتماتا فاتح نیا لیڈر خوشی سے پاگل ہوتے اور چیخیں مارتے ہجوم کے سامنے اپنی بالکونی یا سٹیج سے ہاتھ ہلاتے نمودار ہوتا ہے اور پھر اسے ٹیلیویژن والے انٹرویو کیلئے لے جاتے ہیں۔ سکرپٹ عموماً ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ کتنی عاجزی اور انکساری محسوس کر رہا ہے۔ وہ اس بہت بڑے اعزاز کی بات کرتا ہے کہ اسے لوگوں کی خدمت کا موقع دیا گیا ہے اور بیان کرتا ہے کہ وہ عوام کی خدمت کیسے کرے گا بشمول ان افراد کی کہ جنہوں نے دوسری جماعت کو ووٹ دیا تھا۔ سب طرف فتح کی ایڈر نیالن لوگوں کی رگوں میں کسی ڈرگ کی طرح گردش کرتی رہتی ہے۔

اگلی صبح پس منظر میں ایک اور سکرپٹ جگہ لے لیتا ہے۔ فونوں کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوتی ہیں۔ ایک نئی ٹیم سرکاری دفاتر میں داخل ہوتی ہے تقریباً یوں کہ جیسے فوجی کسی حکمران کا تختہ الٹ رہے ہوں (امریکہ میں صدارتی الیکشن کے فوری بعد سفارتوں اور نظامتوں کے بشمول ہزاروں سیاسی تقرریاں عمل میں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ سرکاری افسر نئے وزیروں اور مشیروں کے گرد دم ہلاتے وفادار کتوں کی طرح منڈلانے لگتے ہیں۔ جماعت پر مال

allurdupdfnovels.blogspot.com

لگانے والے وصولیوں کا آغاز کر دیتے ہیں، جماعت کے پرانے نمک حلالوں کو وہ نوکریاں اور ملازمتیں ہاتھ آ جاتی ہیں کہ جن کا وہ اتنی دیر سے انتظار کر رہے تھے اور وہ پہیہ گردش میں آ جاتا ہے جو کہ چند ماہ یا برسوں میں منتظر بیٹھے افراد کے حوالے ان کے من چاہا قانون اور امدادی رقوم فراہم کرے گا۔

یہ ذو معنی کردار ہر جمہوری حکومت میں دیکھنے میں آتا ہے جو ایک ہی وقت میں بہت سے لوگوں کے خادم ہونے کا دعویٰ بھی کرتی ہے اور چند مٹھی بھر افراد کی خدمت بھی کر رہی ہوتی ہے۔ ہر حکومت کے پاس ان لوگوں کو نوازنے کیلئے ٹیکسوں میں چھوٹ، امدادی رقوم، قانونی تحفظ اور بعض دیگر مراعات کی شکل میں انعامات موجود ہوتے ہیں کہ جو انہیں بر سر قتدار رکھنے کیلئے کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ ماہر اقتصادیات ڈگلس نارتھ کے بقول 'بعض صورتوں میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بر سر اقتدار لوگ چوروں کی حکومت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور دوسری صورت میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سرکار سیاسی سرگرمی کو سیاسی اثر و رسوخ کی حامل جماعتوں کے حق میں کارٹلائز کر دے گی۔[1] دونوں صورتوں میں عوامی مفادات کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔

یہ ڈیلیں اور نوازشات ان دنوں کی یاد دلاتی ہیں جب ریاست کو شکاری حکمرانوں کی نجی جائیداد کی حیثیت حاصل تھی۔ بہت سی خود کو شکاری درندوں کے ساتھ مشخص کرتی رہی ہیں ...... روم میں بھیڑیے، انگلستان میں باگھ اور امریکہ و جرمن میں عقاب کے ساتھ۔ ریاستیں جو بعض سرکاری خطابات استعمال کرتی ہیں وہ ماضی کے پرائیویٹ مناصب کی منجمد شدہ شکل ہیں۔ (مثال کے طور پر پریوی کونسل) شاہی گھوڑوں کے رکھوالے کو 'مارشل' کہتے تھے، شاہی اصطبلوں کا نگران ''کانسٹیبل' کہلاتا تھا ...... اور سب بادشاہ خزانے کو اپنے نجی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کیلئے اپنی حکومت کے بقیہ افراد سے لڑتے رہتے تھے۔[2] برطانیہ میں سرکاری ملازموں کو اب بھی رسماً 'تاج کے خدمتگار' کہا جاتا ہے (یہاں کی حکومت خود کو ایچ ایم جی یعنی 'ہر مجسٹیز گورنمنٹ' کہلواتی ہے) اور یہ حکومت عملاً موجودہ سیاسی حکمرانوں کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے جبکہ دیگر روایات میں حکومتیں عوام کے سامنے جوابدہ ہوتی ہیں۔

جب روس کی ایک اولین کثیر جلدی تاریخ کے مصنف کرا مازن سے اپنے پیغام کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

خلاصہ بیان کرنے کو کہا گیا تو اس نے صرف ایک لفظ بولا تھا:'Voruiut' یعنی[3] 'سب چور ہیں'۔ اس کے لئے حکمرانوں اور چوروں میں تھوڑا ہی فرق ہو گا کہ وہ دولت اکٹھی کرنے کیلئے ریاست کو استعمال کرنے میں ذرا نہیں جھجکتے تھے۔ ریاستوں کے لئے لڑائیاں اس لیے ہوتی تھیں اور اب بھی ہوتی ہیں کیونکہ ان سے حکومتیں بہت زیادہ مستفید ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ مستحکم جمہوری ریاستیں بھی خاندانوں، طبقوں اور نسلوں کے حریف گروہوں کے درمیان ان ڈیلوں اور سودے بازیوں کی عکاسی کرتی ہیں جو عموماً اب بھی جاری ہیں گو اب انہوں نے نئے روپ دھار لئے ہیں۔ گروہی جھگڑوں کے شکار معاشروں میں ریاستی اقتدار پر تسلط جمانے کیلئے بہت زیادہ توانائیاں خرچ کی جاتی ہیں تاکہ اسے بدلے چکانے کیلئے بروئے کار لایا جا سکے۔

حالیہ دور کے بہت سے حکمران اندر کے اور باہر کے اسی امتیاز کی بعض تبدیل شدہ شکلوں میں پڑے رہے ہیں۔ قوم پرست لیڈروں نے بدقسمتی سے ان کی سرحدوں میں بسنے والی اقلیتوں کو کبھی نمائندگی دینے کی کم ہی زحمت گوارا کی ہے۔ ذات اور دھڑے کیلئے لڑنیو الوں کے اپنے بٹوارے ہیں۔ لینن صاحب فرماتے ہیں کہ 'اخلاقی چیز وہ ہے جو مزدور طبقے کے مفادات کی تکمیل کرے' اور وہ اس بات کو خاطر میں نہ لاتا تھا کہ دوسرے لوگوں کے (بشمول کسانوں کے) بارے میں بھی ریاست کے کوئی فرائض ہوتے ہیں۔[4] حتیٰ کہ لبرل جمہوری سیاسی نظریہ بھی اسی موقف کی تائید کرتا ہے: اگر سیاست کو جماعتوں اور مفادات کی جنگ کہا جائے تو مال غنیمت جیتنے والوں کے پاس آتا ہے (صرف اقلیتوں کے لئے چند قانونی تحفظات کے تحت)

چینی تاریخ میں ایک نمونہ جو گھوم کر بار بار سامنے آتا رہا ہے اس کی کچھ نظیر جدید جمہوری ریاستوں میں بھی ملتی ہے۔ اس کے آغاز میں اقتدار میں آنے والا نیا شاہی خاندان ٹیکسوں کے تعین کیلئے مردم شماری کراتا ہے بعد میں مقامی سردار ٹیکسوں سے مستثنیٰ ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں خواہ انہیں 'کھاتوں کی تلفی' سرکاری ملازموں سے ملی بھگت یا قانونی جعلسازی،[5] سے ہی کیوں نہ لینا پڑے جس سے لامحالہ ٹیکس دہندگان (خصوصاً کسانوں) کے بوجھ میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ مال کا جب بوجھ حد سے بڑھ جاتا ہے تو کسان بغاوت کر دیتے ہیں اور برسراقتدار خاندان بے قابو ہو جاتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہماری ان جدید ریاستوں میں بھی اس طرح کی خصوصی مراعات پہلے جمود اور پھر بغاوت کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں۔

چارلز ٹلی نے سولھویں اور انیسویں صدی کے درمیان جدید ریاست کے ظہور کی جو بات کی ہے وہ بھی بہت حد تک ایک لوٹ کھسوٹ اور تسخیر کی کہانی لگتی ہے: ''بیشتر براعظم یورپ میں بورژوا زمیندار شکاریوں، مچھیروں، اشیاء اکٹھی کرنے والوں، گڈریوں اور گھر گرہستوں کو اپنی ان جاگیروں سے باہر نکال رہے تھے جنھیں وہ گھیر کے دوسروں کے لیے بند کرتے چلے جا رہے تھے، تاجر سرکاری اہلکاروں سے مل کر غذائی منڈیوں کو مقامی کنٹرول سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے اور آخر خود کو ملازموں کی خدمات لینے اور انہیں معاوضے دینے کے مروج سلسلوں سے خلاصی دلوا رہے تھے۔ سرکاری افسر نہ صرف ان کوششوں کی پشت پناہی کرتے تھے بلکہ وہ محصولات، لام بندی اور آبادیوں کے اندراج کو بھی توسیع دے رہے تھے....ان تبدیلیوں کے طفیل جابجا حملے ہونا شروع ہو گئے تھے: احاطوں کو ڈھایا جا رہا تھا، ممنوعہ جانوروں کا شکار کیا جا رہا ہے، جنگل کے چوکیداروں کو مارا جا رہا ہے، لگان وصول کرنے والوں کے ساتھ بلوے کیے جا رہے تھے، مردم شماری کرنے والوں کو بھگایا جا رہا تھا اور کہیں کوتوالوں کو زدوکوب کیا جا رہا تھا، علیٰ ہذالقیاس۔''(6)

لیکن چونکہ مرکزیت کی حامل، منظم اور متحد اقلیتیں غیر منظم اکثریتوں کو ہمیشہ پچھاڑتی چلی آئی ہیں، ریاستی اقتدار کو توسیع دینے کی یہ حکمت عملیاں عام طور پر کارگر رہتی ہیں۔ مارکس ریاست کو بورژوا طبقے کی مجلس عاملہ قرار دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے ریاست کی خودمختاری کا اندازہ ٹھیک نہ لگایا ہو لیکن اس نے ایک بنیادی حقیقت کی نشاندہی ضرور کر دی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قانون حکمرانی کی غیر جانبدارانہ اور دقیق زبان کی آڑ لے کر ایک اقلیتی طبقے کے مفادات پورے ضرور کر رہا تھا۔ اس تسخیر کی خام ترین نشانی وسائل کا مراعات یافتہ لوگوں کی جیب میں جانا ہے۔ آجکل کینین کے روزانہ اوسط بجٹ کا ایک تہائی رشوت (7) پر خرچ کرنا پڑتا ہے اور بدعنوانی ان عوامل میں آتی ہے جو قومی خوشحالی کے تقابلی سرووں میں عوامی آزردگی سے سب سے زیادہ منسوب دکھائی دیتے ہیں۔(8) تاہم ٹیکس دہندگان سے خاص گروہوں تک دولت کے مراعاتی بہاؤ ان معاشروں میں بھی عام ہیں جہاں بدعنوانی زیادہ کھلے بندوں میں دیکھنے میں نہیں آتی مثلاً ان کی شکل امدادی رقوم اور ایروسپیس، نیوکلیئر

allurdupdfnovels.blogspot.com

پاور اور ایگری بزنس جیسی صنعتوں کے تحفظ کی ہوسکتی ہے۔

اس باب کے آغاز میں دیے گئے اقتباس میں ملکیاولی کچھ مبالغہ کرتا محسوس ہوتا ہے لیکن اچھی سے اچھی نیت کے لیڈروں کے مفادات بھی ان لوگوں سے مختلف ہو سکتے ہیں کہ جن کی خدمت کا بیڑہ اٹھا کر وہ اقتدار میں آتے ہیں اور یہ مفادات انہیں ان کے اخلاقی فرائض سے روگرداں کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں اور حامیوں کو نواز سکتے ہیں۔ وہ بدعنوانی، دولت اور سیکس کی ان تحریصات میں آسکتے ہیں کہ کرسی اقتدار پر بیٹھے آسانی سے نظر آ رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنے عہدے کو اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے نجی مفاد کے لیے عوامی مفاد کو داؤ پر لگا سکتے ہیں اور اپنی ناکامیوں، غلطیوں اور داخلی تنازعوں کے بارے میں سچائی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

سیاسی علم کی کئی روایات میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ یہ وہ واحد بامعنی چشمہ ہے کہ جسے پہن کر ہم سیاست کو سمجھ سکتے ہیں۔ صاحب اثر جرمن دانشور کارل شمٹ نے دونوں جنگوں کے درمیانی پُر آشوب زمانے میں لکھتے ہوئے کہا تھا کہ دوستوں اور دشمنوں کے جھگڑے کی تہہ میں ریاست کارفرما ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی سیاسی نظام عالمگیر نہیں ہو سکتا خواہ اس کے دعوے کتنے ہی لبرل، عالمگیرانہ اور جمہوری کیوں نہ ہوں۔ اسے طرفداری کرنا پڑتی ہے۔ لڈوگ فان میزس اور برٹرنیڈ ڈی جوونل جیسے آزادی پسند فلسفیوں نے جدید ریاستوں کو ان مجرمانہ شکاری مہمات کی براہ راست جانشینوں کے طور پر بیان کیا ہے جنہوں نے تاریخ کو کریملن، تاج محل اور ورسائی جیسی عظیم الشان یادگاریں دی ہیں[9] گو بیسویں صدی میں آ کے ان کے شاہی خاندانوں کی بجائے مزدور تحاریک اور عوامی جماعتوں کے تسلط میں آنے کا امکان زیادہ رہا۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں ریاستوں پر تسلط اس لیے جمایا جاتا ہے کہ ان کے کنٹرول میں فالتو وسائل ہوتے ہیں۔ یہ وسائل آرٹ اور تہذیب کو فروغ دیتے ہیں لیکن ان سے بدعنوانی بھی جنم لیتی ہے کیونکہ وہ دولت کے حصول کیلئے چور راستہ فراہم کرتے ہیں۔ مال و دولت بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔ درالحکومتوں میں جمع وافر وسائل سیاست میں بد عنوانی کے عنصر کی آمیزش کرتے ہیں کیونکہ حکمرانوں کے درباروں کے اندر اور ان کے قرب و جوار میں کھیلی جانیوالے کھیل مال و دولت اور عزت و وقار کے حصول کا ایک زیادہ براہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

راست راستہ فراہم کرتے ہیں جو محنت کی نسبت بہت آسان ہوتا ہے۔ اسی سبب سے وسائل کی موجودگی جنگ کو شہہ دیتی ہے۔ زیادہ وسائل کی حامل بڑی ریاستوں کیلئے مہم جوئی کو لگام دینا مشکل ہوا تھا چنانچہ وہ اپنے عوام کیلئے خطرہ بن جاتی تھیں۔ بارہویں سے انیسویں صدی تک جب جرمنی چھوٹی ریاستوں، مملکتوں اور راجواڑوں میں منقسم تھا تو اس نے صرف 13 جنگوں میں شرکت کی جبکہ اسی دورانیے میں ڈنمارک نے 15 ، سویڈن نے 24 ، آسٹریا اور روس نے 40 ، فرانس نے 42 ، برطانیہ نے 44 اور سپین نے 48 جنگوں میں حصہ لیا۔ چھوٹے ملک جنگ سے زیادہ فائدے کی توقع نہیں کرتے تھے۔ لیکن دیکھیں کہ متحد ہونے کے بعد ایک سو سال کے عرصے میں پے درپے اقتدار میں آنے والے جنگ کے شوقین فرمانرواؤں کے طفیل جرمنی کی ڈنمارک، آسٹریلیا اور فرانس سے جنگیں ہوئیں اور پھر اسے دو عالمی جنگوں کا بھگتان بھی بھگتنا پڑا۔ (10)

مطلق العنان ریاستوں میں اقتدار کی حرکیات وافر وسائل اور اس چیز کے گرد گردش کرتی ہے کہ ان وسائل کی فوجی سربراہوں ، سول حکام اور اطلاعات، مواصلات اور معاشیات کے کرتوں دھرتوں پر مشتمل ایک چھوٹے سے ٹولے میں تقسیم کیسے عمل میں آتی ہے۔ حکومتی حلقے میں شامل ہر شخص کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ یہ حلقہ ہر ممکن حد تک چھوٹا رہے۔ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں فلپائن پر راج کرنیوالے آمر مارکوس کی حکومت کے خاتمے کی وجہ یہی تھی کہ اعلیٰ طبقے کے بہت سے امراء کو اس طلسماتی حلقے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ غریب ممالک میں برسر اقتدار آمر اگر وسائل کا رخ مٹھی بھر طاقتور افراد سے ہٹا کر بے کس اکثریت کی طرف کریں تو انہیں ذاتی سیاسی خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ (11)

مطلق العنان حکومتیں نسبتاً زیادہ واضح مثال ہیں۔ ایسی اکثر حکومتیں خدمت کا تھوڑا بہت غازہ لگا کر اپنے عوام سے زیادہ سے زیادہ دولت ہتھیانے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ 1993ء سے 1998ء تک نائیجیریا پر حکمرانی کرنے والے سنی اباچہ جیسے فرمانرواؤں پر لالچ اس قدر غالب آ جاتا ہے کہ ان کے حامی بھی انہیں گرانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اباچہ کی ایک طوائف کے ہاتھوں پراسرار موت زہر کے نتیجے میں واقع ہوئی اور بالکل اسی انداز سے اس کا بڑا حریف ابیولا بھی چند ہفتوں بعد قید میں پر اسرار حالات میں ہلاک ہوا کیونکہ وہ بھی فوجی حکمرانوں کیلئے ایک خطرے کی علامت تھا۔ ان

allurdupdfnovels.blogspot.com

واقعات کے پورے ایک عشرے بعد آج بھی جمہوری بناؤ سنگھار کے باوجود نائیجیریا کی آبادی کے دسویں حصے سے بھی کم باشندے اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کے ملک پر عوامی رائے کی حکمرانی ہے۔ (13)

جمہوری معاشروں میں حکمرانوں اور عوام کے مفادات کا فرق زیادہ لطیف شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حتمی اقتدار رائے دہندگان کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اپنے حکمرانوں کو نکال باہر کرنے کا اختیار استعمال کر سکتے ہیں اور اس سے تحریک کو فروغ ملتا ہے کیونکہ کچھ حکمران گروپ کسی خارج شدہ گروہ سے اتحاد بنانے میں فائدہ محسوس کرتے ہیں۔ جمہوریت کی بیشتر تاریخ اس قسم کے شواہد سے پر نظر آتی ہے مثلاً جب انیسویں صدی میں برطانیہ کے ٹوریوں نے مزدور طبقے کے رائے دہندگان سے رجوع کیا، جب 1990ء کے عشرے میں لیبر پارٹی نے وسطی طبقے سے رجوع کیا یا پھر اگر آپ حالیہ سیاست پر نظر ڈالیں تو ہمیں امریکی ریپبلکن ہسپانیوں کی طرف رجوع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم جمہوری ریاستوں میں بھی تسخیر کے ویسے ہی نمونے عام دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہمارے انتخابی نظام اس طرح کے ہیں کہ ان کے نتیجے میں ایسے لوگ برسر اقتدار آ جاتے ہیں جو بہت بڑی بڑی اقلیتوں اور بیشتر اوقات کسی اکثریت کی رائے سے حکومت میں نہیں آئے ہوتے۔

جب ریاستیں سب کی خدمت کا بیڑہ اٹھاتی بھی ہیں تو گریزاں عوام سے ٹیکس کی وصولی اور تعزیرات کے نفاذ کیلئے کچھ افراد کو دوسروں پر حکم چلانا ہی پڑتا ہے۔ اس صریح ناہمواری میں تخفیف کیلئے عام شہریوں پر مشتمل جیوریوں اور لیڈروں کے بار بار اقتدار میں آنے پر پابندی جیسی کوششیں عمل میں لائی جاتی رہتی ہیں۔ انتہائی صورت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حاکموں کو اتنا کمزور کر دیا جاتا ہے کہ وہ بھی محکوموں کے ایسے ہی نظر آنے لگتے ہیں اور کچھ جمہوریاؤں اور کمیونوں نے تو اس زمین پر فردوس گم گشتہ جیسی مساوات بھی قائم کرنے کی باقاعدہ کوشش کی ہے۔ لیکن ایسے سماجوں میں بھی اور انقلابی جوش و جذبے کے مختصر دورانیوں میں بھی تو کچھ افراد ایسے خاص عہدوں پر متمکن ہوتے ہیں جن کی ذمہ داری دوسروں کو حکم دینا ہوتی ہے جب دوسرے احکامات وصول کرتے ہیں اور ان کی تعمیل کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ خدمت کے آدرش کو ہمیشہ سمجھوتے یا دغا کے خدشات لاحق رہتے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہیں۔

سب ریاستوں میں، خواہ یہ جس قدر بھی جمہوری نظر کیوں نہ آتی ہوں، اقتدار تک رسائی کے کچھ مراعاتی راستے موجود ہوتے ہیں۔ انہیں نظاموں کے مقامات اتصال پر سب سے زیادہ واضح طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے جہاں منظّم مفاد پرست عناصر لوگوں کی نظر سے دور رہ کر اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ ووٹروں کو ٹھینگا دکھانے کی ایک کلید سیاسی و جماعتی محاصل ہیں۔ اگر آپ ان محاصل کے کھرے ناپیں تو آپ کو جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ کن عناصر کی بات چل رہی ہے۔ اس سلسلے میں امریکی ٹیکس قوانین کی مثال بہت مناسب ہے جس میں بعض حلقوں کو مفاد دینے کی خاطر خصوصی شقیں رکھی گئی ہیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ شراب بنانیوالے صرف ایک واحد گیلو خاندان کیلئے خصوصی شق رکھی گئی ہے۔[14] حتیٰ کہ بظاہر غرباء کی نمائندگی کا دم بھرنے والی سیاسی جماعتوں کا انحصار امراء اور وڈیروں پر ہوسکتا ہے۔ امریکی ڈیموکریٹوں کا اب امراء پر انحصار بہت بڑھ چکا ہے اور انہیں ریپبلکن سیاست دانوں کے مقابلے میں کروڑ پتی افراد کی انتخابی حمایت زیادہ حاصل ہے۔2004ء میں کیری کی صدارتی انتخاب کیلئے چلائی جانے والی مہم میں اکٹھے ہونے والے پیسے میں 20 ڈالر یا اس سے کم کے چندوں سے حاصل ہونے والی رقم کا حصہ بمشکل ایک چوتھائی ہوگا۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی کی جیب میں بھی اب ٹریڈ یونینوں کے ارکان کی بجائے تجارتی لیڈروں کا پیسہ آنے لگا ہے۔ اسی طرح دیگر یورپی ممالک میں بھی سینٹر لیفٹ پارٹیاں گاہے گاہے چپکے سے بھی، دولت مند کاروباری اداروں سے مال و متاع وصول کرنے لگی ہیں۔

جمہوری دنیا کے بہت سے سکینڈل...... بشمول ان کے جنہوں نے1980ء کے عشرے میں متراں اور اٹلی کے بیتینو کراکسی،1990ء میں کوہل، گونزالیزاور جان میجر اور 2000ء کے عشرے میں برازیل کے لولا کو رسوا کیا...... رقوم کی وصولیوں سے ہی متعلق تھے۔ اس اثناء میں انتخابی مہموں پر خرچ کیے جانیوالے سرمائے میں غیر معمولی اضافہ امریکہ، برازیل اور بھارت جیسے ملکوں میں بھی دیکھنے میں آیا۔ امریکہ میں تو ایک صحافتی رپورٹ کے مطابق گذشتہ صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران تقریبا 4 بلین ڈالر کی خطیر رقم خرچ کی گئی تھی۔ ٹونی بلیئر کو حکومت میں آنے کے بعد پہلے بحران کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب فارمو

allurdupdfnovels.blogspot.com

لاوں کار دوڑوں کے کروڑ پتی برنی ایکل سٹون نے حکمران لیبر پارٹی کو ایک ملین پاؤنڈ عطیے کے طور پر دیا تھا۔ کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ عطیہ برنی کے اچانک سیاسی قبلہ تبدیل کرنے کی وجہ سے پیش کیا گیا ہے اور پھر سگریٹ کمپنیوں پر کھیلوں کی سرپرستی کی پابندی کیلئے جاری جدوجہد میں بھی برنی نے کبھی کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آئندہ برسوں میں پارٹی کو چندہ دینے والے امیر افراد کو مجلس امراء کی رکنیتیں فروخت کی گئیں اور پارٹی کی سب سے بڑھ چڑھ کر مالی معاونت کرنیوالے ایک صاحب لارڈ سینسبری کو وزارتی عہدے پر فائز کر دیا گیا جس سے برطانوی عوام کا اعتماد بحال ہونے کی بجائے مزید مجروح ہوا۔

جب امریکہ میں انتخابی مہمات سے متعلقہ مالی معاملات کی اصلاح کی کوشش کی گئی تو امارت اور سیاست کی عشق معشوقی سے فائدہ اٹھانیوالے عناصر نے اس کی بڑی شدومد سے مزاحمت کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ اب تو وہاں کا نظام اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اب وہاں پیسے والوں یا پیسے والوں سے پیسہ وصول کرنیوالوں کے علاوہ کوئی الیکشن لڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ امریکی صدر روز ویلٹ نے 1936ء میں کہا تھا کہ منظّم پیسے کی حکومت بھی اتنی ہی خطرناک ہے جتنی کہ منظّم ہجوم کی۔ پتہ نہیں وہ آج زندہ ہوتا تو کیا کہتا؟

ذرائع ابلاغ پر کنٹرول ایک اور ایسا چور راستہ ہے جسے نجی طاقت ریاست پر تسلط جمانے کیلئے استعمال کر سکتی ہے۔ یہ توجہ حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور توجہ سیاستدانوں کیلئے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل چیز ہے۔ مرڈرک، ہرسٹ اور بیور بروک جیسے ذرائع ابلاغ کے بادشاہ توجہ کے بھوکے سیاستدانوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اٹلی کے سلویو برلسکونی نے بھی اپنے سیاسی کیریئر میں ذرائع ابلاغ سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس نے غیر موافق قوانین کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پہلے تو ذرائع ابلاغ اور کاروبار کے بل بوتے پر ریاستی اقتدار کو زد میں لیا اور پھر ریاستی اقتدار کے بل بوتے پر ذرائع ابلاغ پر اپنے تسلط کو مزید تقویت دی (اس نے اپنے مشیر مارسل ڈیل اتری سے ایک بار کہا تھا کہ 'اگر کوئی چیز ٹی وی سکرین پر نہیں ہے تو پھر وہ ہے ہی نہیں')۔

کوئی بھی گروہ جو ٹی وی یا ریڈیو کے دورانیے، سرمائے، خصوصی مہارت یا کسی بڑے بیرونی ملک کی خوشنودی کو اجارے میں لاتا ہے، وہ اس کا فائدہ اٹھا کر مزید طاقت و اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی ایسا گروہ جو کہ ریاستی انعام و اکرام پر

allurdupdfnovels.blogspot.com

خاص طور پر انحصار کرتا ہے وہ اس کی مراعات کے تحفظ کیلئے زیادہ محنت کرتا ہے۔ محصولیاتی صنعتیں، برآمدی صنعتیں، اسلحے کی صنعتیں اور ضبط شدہ خدمات سب کوئی داخلی راستہ تلاش کرنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔

ان روابط کی اہمیت کا اندازہ ان ثالثوں اور وچولوں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن کی خدمات ان کے انتظامات کیلئے حاصل کی جاتی ہیں اور جو ریاست پر تسلط کی کوششوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر خفیہ طور پر کام کرتے ہیں اور اگر ان کی فنکاریاں افشاء ہو جائیں تو ان کے گاہکوں اور سرپرستوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ان کا کام ہوتا ہے کہ وہ قانون اور ضابطے کی دفعات کو ٹیڑھا میڑھا کریں اور پبلک ایجنڈے کی صورت گری کرکے اس بات پر اثر انداز ہوں کہ معاشرہ اور اپنے اہداف اور انتخابات کے بارے میں کیسے سوچتا ہے۔ آراء کی فضا کی صورت گری اور خطرات کے سد باب کیلئے بڑے لطیف آلات استعمال کیے جاتے ہیں جن میں ریسرچ کی سرپرستی، فاؤنڈیشنوں اور یونیورسٹیوں کی مالی معاونت، طرح طرح کی کمیٹیاں، زیبائشی مشاورت، متنازعہ مسائل کو مزید خراب کرنے والے ماہرین کی خدمات اورعوامی مسائل کی منتخبہ نج کاری وغیرہ شامل ہیں۔[15] جب ان کی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے تو وہ اپنے آجروں کی طرف سے جو خاص الخاص دلائل پیش کرتے ہیں وہ کچھ اس نوع کے ہوتے ہیں کہ 'اس سب کے باوجود آپ کو ہماری ضرورت اس ضرورت سے زیادہ ہے کہ جو ہمیں آپ سے ہے'۔ فیڈل کاسترو نے ایک بار کہا تھا کہ بین الاقوامی کارپوریشنوں کے استحصال سے بدتر شے صرف یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آپ کا استحصال نہ کریں۔

یہ وہ بعض طریقے ہیں جن سے منتخب رہنماؤں پر قبضہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنی بقاء اور دوبارہ انتخابات کے امکانات کو اولیت دینے کے بھی پابند ہوتے ہیں ۔[16] درحقیقت جدید لیڈروں کے بہت سے وسوسے اس مسئلے کے گرد گھومتے ہیں کہ انہیں اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کیلئے کس حد تک جانا چاہیے؟ کیا انہیں ناجائز رقوم وصول کرلینی چاہئیں (متراں کی طرح) نقب زنوں کی توثیق کرنی چاہیے (نکسن کی طرح) اپنے ممکنہ جانشینوں کو حراست میں لے کر ان پر مقدمہ چلانا چاہیے (مہاتیر کی طرح) یا اپنے وعدوں سے پھر جانا چاہیے (اکثریت کی طرح)؟

allurdupdfnovels.blogspot.com

بقاء کے سوال کی بہت اہمیت ہے۔ سیاسی جماعتوں کیلئے یہ دیگر منازل کا ذریعہ ہونے کی بجائے بڑے آرام سے خود ایک منزل بن جاتا ہے اور اٹھارہویں صدی کے اواخر کے برطانیہ میں وال پول کے وگز اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے جاپانی لبرل ڈیموکریٹوں کی طرح کی بعض بہت پرانی پرانی جماعتوں کی حیثیت دوبارہ الیکشن جیتنے کے ایک ذریعے سے زیادہ کی نہیں رہی۔ ایسی جماعتیں حالات کے مطابق اپنی سماجی وفاداریاں تبدیل کرتی رہتی ہیں اور اپنی بنیادی وفاداریوں کی تعریف کرتی رہتی ہیں جو عموماً ان کے مالی ذرائع کے مطابق ہوتی ہے۔1990ء کے عشرے کے اواخر میں برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ کے ایک وزیر نے کہا تھا کہ اس کی جماعت کو، جسے کہ غریبوں کی خدمت کیلئے قائم کیا گیا تھا لیکن جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امیر سرپرستوں کی دست نگر بنتی جا رہی ہے، لوگوں کے انتہائی امیر ہوتے چلے جانے پر کسی قسم کی کوئی بے چینی نہیں ہے۔ اس سے گراؤچو مارکس کی وہ بات یاد آجاتی ہے کہ 'یقیناً میرے کچھ اصول ہیں اور اگر وہ آپ کو پسند نہیں آتے تو میرے پاس اور بہت سے ہیں'۔

لہٰذا سیاسی رہنماؤں کو ایک مستقل چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں اپنی بقاء کیلئے ایک ہی وقت میں خود کو اپنے خاص حلقہ انتخاب کے وفادار خادم کے طور پر پیش کرنا ہوتا ہے اور بحیثیت مجموعی قوم اور عوام کے خادم کے طور پر بھی۔ مثال کے طور پر جارج ڈبلیو بش کو خود کو مسیحی دائیں بازو اور غالب اکثریتی رجحان دونوں کے پکے حامی کے طور پر پیش کرنا پڑتا تھا۔ قدرتی بات ہے کہ یہ دونوں ذمہ داریاں لیڈر کو مخالف سمتوں میں کھینچتی ہیں اور سیاستدانوں کے پاس ایک مہارت یہ ہونی چاہیے کہ وہ کشیدگیوں پر پردہ ڈال دے (اور اس قسم کے مسائل سے احتراز کرے کہ جنکا سامنا جرمنی کے اس سوشل ڈیموکریٹ لیڈر کو کرنا پڑا تھا کہ جس نے غیر ملکی سرمایہ کاروں کو ایک پارٹی میٹنگ کے دوران 'ٹڈی دل' قرار دیا تھا لیکن بعد ازاں یہ الفاظ قومی ذرائع ابلاغ میں پہنچ گئے)۔ یہ ہمیشہ کوئی دغا یا فریب کی بات نہیں ہوتی گو استعمال میں لائے جانے والے بہت سے طریقے غیر اخلاقی ہو سکتے ہیں۔ پیچیدہ اور جھگڑالو معاشروں کو اکٹھا رکھنے کیلئے فریب سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ لیڈروں کو عوام کے سامنے یہ دکھانا پڑتا ہے کہ وہ انہیں بہت کچھ دے رہے ہیں خواہ حقیقت میں وہ کچھ دے رہے ہوں یا نہیں انہیں یہ بھی سیکھنا پڑتا ہے کہ لوگوں کو تقسیم کر کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ان پر حکومت کیسے کی جاتی ہے، نقائص اور خامیوں کو بلند بانگ دعوؤں اور شعلہ بیانی سے کیسے چھپایا جا سکتا ہے، دشمنوں کے خلاف گروہی تشخص کو اجاگر کیسے کیا جا سکتا ہے، اپنے کارناموں کی تشہیر کیسے کی جاتی ہے، خواہ وہ معمولی سے بھی کیوں نہ ہوں، داخلی وسوسوں اور اختلافات کو کیسے ڈھانپا جا سکتا ہے اور جہاں مفادات اور آدرشوں کے درمیان مصالحت ممکن نہ ہو وہاں ابہام کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو آمریتوں اور بادشاہتوں یا آمریتوں اور جمہورتیوں کے درمیان کوئی زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں میں اقتدار رکھنے اور نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک پاٹ ہوتا ہے گو جمہوریت کی صورت میں اس پاٹ میں کمی آنا ممکن ہے۔ ان دونوں صورتوں میں حکمران کو کچھ نہ کچھ مقبولیت اور عوامی محبت کی ضرورت ہوتی ہے تاہم جمہوریت میں یہ ہوتا ہے کہ حاکم کو محبت بھی کم ملتی ہے اور اسے نفرت کا بھی کم سامنا کرنا پڑتا ہے اور سٹالن، ہٹلر اور ماؤ کی طرح نہ تو لوگ اسکی طرف دیکھ کر فرط مسرت سے جھومنے لگتے ہیں اور نہ ہی خوف سے ان کا پیشاب خطا ہوتا ہے۔

جمہوریتیں اور آمریتیں دونوں اتحاد و ہم آہنگی کی عوامی امنگ سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ یہ امنگ قوم پرستی کو ہوا دیتی ہے۔ اشتراکیوں کے اخوت و بھائی چارے اور حقوق نسواں کے لئے کام کرنے کی جد و جہد کے پیچھے بھی یہی امنگ کار فرما ہوتی ہے۔ یہی چیز ہے جس نے سویڈن کے ان سوشل ڈیموکریٹس کے دل میں جذبہ پیدا کیا تھا جو معاشرے کی تصویر کشی عوام کے گھر کے طور پر کرتے تھے اور یہی چیز ہے جو مسلم نوجوانوں کے دل میں خلافت کے احیاء یا ہندو سیاستدانوں کے دل میں رام راج کی تڑپ پیدا کرتی ہے۔ یہ سب چیزیں سیاست کی اسی سری جہت کی تجسیم کرتی ہیں۔ تاہم حاکموں اور محکوموں کے درمیان محنت کی تقسیم کچھ ایسا تناؤ پیدا کر دیتی ہے کہ جس سے بچا نہیں جا سکتا اور اس نے بہت سی روایات، خصوصاً ترقی پسند، کو جنم دیا ہے جن میں مایوسی کے بعض ایسے وقت بھی دیکھنے میں آئے جب ان کے قائدین بے وفائی اور غداری کے مرتکب ہوئے، دوسروں کے ساتھ جا ملے اور یا ایسا محسوس ہوا کہ وہ تحریک کے نصب العین کیلئے کام کرنے کی بجائے محض اپنا الو سیدھا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ریاستی مشینری چلانے والے سرکاری کار پردازوں کو دیگر قسم کی تقسیموں اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

ناہمواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ افسر اور اہلکار بھی ریاستی اقتدار پر قبضہ جمانے اور فالتو وسائل میں حصہ بٹانے کے اتنے ہی آرزو مند ہوتے ہیں جتنا کہ وہ حکمران جنکی بظاہر وہ ملازمت کررہے ہوتے ہیں۔ بہت سے شہنشاہوں کو دولت وحکومت کیلئے اپنے ہی افسروں سے پنجہ آزمائی کرنا پڑی۔ چھٹی صدی عیسوی کے فارسی شہنشاہ خسرو اول کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے کہا تھا کوئی مملکت اسی صورت میں پھل پھول سکتی ہے کہ اس کے حکمران اپنے افسروں کی لوٹ مار کو لگام دیں اور کاشت کاری اور کاریگری کو پنپنے کا موقع فراہم کریں اور اس طرح ان محصولات کا اہتمام کریں کہ جن پر ریاست کا سارا دارومدار ہوتا ہے۔

سرکاری عہدہ داروں کیلئے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اگر ان کی تاریخ پر غور کیا جائے تو بظاہر لگتا ہے کہ وہ محض مشیر اور اپنے آقا کے احکامات کے نافذ کنندہ ہیں۔ سنسکرت لفظ منتری سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے مشیر، عربی لفظ وزیر، کا لغوی 'mendrin' مفہوم 'اٹھانے والا' (منصب کا بار اپنے کندھوں پر اٹھانے والا) اور آج کے دور کی سول سروس میں مشاورت دینے اور نفاذ کرنے والے افسروں اور فیصلے کرنیوالے منتخب وزیروں کے منصوبوں کے درمیان واضح فرق موجود تصور کیا جاتا ہے۔

بایں ہمہ تمام حقیقی افسر شاہیاں نہ صرف مشاورت کے فرائض سرانجام دیتی ہیں بلکہ وہ فیصلوں اور کارروائیوں میں بھی طاق ہوتی ہیں۔1908 میں برطانوی خزانے کے سربراہ سرجارج مرے نے خزانے کی مہر والے ایک کاغذ پر حزب اختلاف کے ایک ممتاز سیاستدان (سابق وزیر اعظم لارڈ روز بیری) کو اکسانے کیلئے ایک رقعہ لکھا تھا جس میں اس نے اسے اپنے ہی چانسلر کے پیش کردہ بجٹ کی مخالفت کرنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ اپنے ایک خط میں اپنے وزیر لائیڈ جارج کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ ایک 'ویلش بکری ہے جو میرے ہاتھ سے خوشی خوشی گھاس کھاتی ہے'۔[17] ہر سطح کے افسر اور اہلکار عوامی مفاد میں کام کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مفادات بھی پورے کررہے ہوتے ہیں خواہ تحت الشعوری طور پر ہی سہی۔ ڈی ٹوکول نے ایک بار کہا تھا کہ اگر افسروں کو حکمران کی مرضی کے مطابق نہ جھکایا جائے تو وہ خود ہی ایک جدا اور مطلق حکومت کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اور اس کے ایک صدی بعد عظیم انگریز سیاسی مفکر جی ڈی ایچ کول لکھتے ہیں 'پارلیمان کے ذریعے جمہوری کنٹرول تماشے سے زیادہ نہیں ہوتا' اور یہ کہ 'اجتماعی ریاست

allurdupdfnovels.blogspot.com

افسر شاہی کی جنت ارضی ہوتی ہے'۔[18] بیسویں صدی کی آخری دھائیوں میں 'عوامی پسند' کے نظریے نے اس کے پھول پات نکال کر اس جنت ارضی کو چیلنج کیا اور ان بہت سے راستوں کی مفصل طریقے سے نشاندہی کی جنہیں استعمال کرکے سرکاری عہدیدار اپنی تجوریوں اور طاقت کو عوامی خدمت کی آڑ لے کر بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ انہیں لگام کیسے دی جا سکتی ہے۔

حریص سرکاری ملازموں کی یہ داستانیں حقیقت کا صرف ایک جزو پیش کرتی ہیں۔ برطانیہ میں آکسفورڈ اور کیمبرج، فرانس میں نیشنل سکول آف ایڈمنسٹریشن اور ٹوکیو یونیورسٹی آف جاپان سے فارغ التحصیل ہو کر آنے والے بہت سے سول ملازمین خود کو حریص سیاستدانوں کے بجائے عوامی مفاد کے خادم سمجھتے رہے اور خود کو ضرورت سے زیادہ گرما گرم جمہوریت کے خلاف کام کرنیوالے ایسے شاک ابزوربروں اور سٹیبلائزروں کے طور پر پیش کرتے رہے کہ جنہوں نے حکومت کو عوامی مفادات سے قریب تر رکھنے کی کوشش کی۔[19]

لیکن اس میں کوئی شک والی بات نہیں کہ سرکاری اہلکاروں کے ایسے مفادات بھی ہوتے ہیں جو کہ عوام اور سیاسی لیڈروں دونوں سے مختلف ہوتے ہیں۔2000 ق م کے لگ بھگ سمیریہ میں بنائی جانے والی ارکا جینا کی اصلاحی لوحات میں آئندہ کے چار ہزار سال کی تاریخ کی پیش بینی نظر آتی ہے جن میں اک نئے فرمانروا کی روداد بیان کی گئی ہے جو ایک ایسے بگڑے ہوئے مقتدر انتظامی طبقے کو سیدھا کرکے اپنی حکومت کا جواز بناتا ہے کہ جس نے اپنے اختیارات کو ناجائز طریقے سے استعمال کیا تھا، گدھے اور بھیڑیں چرائی تھیں، راشن میں کمی کی تھی اور لوگوں سے ناجائز روپیہ پیسہ اینٹھا تھا۔

ریاست اور اس کی افسر شاہی کی جانبدرانہ یا مقبوضہ نوعیت سے ماخوذ بہت سی ناہمواریاں ریاستوں کے کاموں میں مضمر طرفداریوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور ان سے پھر ان ناہمواریوں کو بھی مزید تقویت ملتی ہے۔ ایک طرف داری تو نظام کے حق میں ہوتی ہے کیونکہ نظام ونسق گذشتہ باب میں بیان کردہ چاروں ذمہ داریوں کا مشترک دعویٰ ہے۔ انتشار کی بجائے نظم ونسق کی حمایت ریاستوں میں باغیوں کے خلاف حکومت کیلئے حمایت کے رجحان کی افزائش کرتی ہے (بہت شاذ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ریاست خود بھی نظم ونسق کے خلاف کام کرنے لگتی ہے جیسا کہ مثال کے طور پر ماؤ کے ثقافتی انقلاب

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے وقت دیکھنے میں آیا) ۔نظم ونسق کے حق میں یہ تعصب ریاستوں کو موجود نظام ہائے مراتب سے جوڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں پہلے پہل کی پولیس فورسز اکثر و بیشتر آجروں کو ہی تحفظ مہیا کیا کرتی تھیں جبکہ ملازمین کو شاذ ہی ان کی محافظت نصیب ہوتی تھی اور یہی سبب ہے کہ افواج عموماً اقلیتوں کی بجائے غالب نسلی گروہوں کی طرفداری کرتی ہیں۔[20] ایک دیگر تعصب کا مظاہرہ معاشی ناہمواریوں کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ امیر طبقے کے افراد آپس میں بہت زیادہ مربوط ہوتے ہیں اور کسی معاشی نظام سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے ان لوگوں کے پاس حکومت پر اثر انداز ہونے کے لئے وسائل بھی سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس قدر اہم بات یہ بھی ہے کہ حکومت کیلئے اہم ترین وسائل (محصولات، عوام،معلومات) بھی انہی نظاموں سے حاصل ہوتے ہیں کہ جو یہ ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں۔ ریاستوں کو زائد وسائل مہیا کرنے والے نظاموں کو چیلنج کرنے سے ان حاصلات میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے جس سے نظم ونسق کیلئے ایک اور خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

بہت سے ایسے فیڈ بیک لوپس جو ان تعصّبات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ان ناہمواریوں کو مزید مستحکم کرنے کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ حکومت کی اچانک تبدیلیوں کے باوجود محفوظ رہتے ہیں۔موجودہ دور میں اس کی ایک عمدہ مثال2004ء کے 'نارنگی انقلاب' کے بعد یوکرائن میں امراء کے حریف ٹولوں کے درمیان ہونے والی تگ و دو ہے۔ بظاہر تو یہ عوامی انقلاب تھا لیکن فی الواقع یہ اشرافیہ کے ایک حصے کی دوسرے سے لڑائیوں کیلئے ایک جنگی ترانے سے زیادہ کچھ نہ نکلا (اس کا اظہار اس کامیابی سے ہوتا ہے جو صدر لیش چینکو کے بیٹے کو ان سیاسی مارکوں کے جملہ حقوق محفوظ کرانے میں ملی جنہیں کہ بظاہر عوامی بغاوت نظر آنیوالی تحریک میں استعمال کیا گیا تھا)۔

جنگ اور تسلط

جنگی تاریخ تسلط کی نوعیت کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہے۔ ایک مشہور قدامت پسند ماہر عمرانیات کا کہنا ہے کہ 'ریاست بنیادی طور پر جنگ کرنے کے اختیار کو

allurdupdfnovels.blogspot.com

قانونی شکل دینے کی ایک کوشش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی'۔[21] ایک تخمینے کے مطابق 1500ء تا حال بڑے ملک ہر چار سال میں سے تین سال جنگ میں ملوث رہے۔ اشوک جیسے فرمانروا اس سے مستثنٰی ہیں جو اپنی حکومت کے نویں سال کلنگا کی فتح کے موقع پر ہونے والے قتل عام کے بعد جنگ سے تائب ہو گیا تھا یا پھر سینائی جمہوریہ کا ذکر سنتے ہیں جس کا آئین حکمرانوں کو پابند کرتا تھا کہ وہ 'شہر میں مستقل امن اور خالص انصاف قائم کریں'۔ اشوک سے پہلے چند حکمران ہی ایسے ہوں گے جنھوں نے گوتم بدھ کی اس تنبیہ پر کان دھرا کہ 'قاتل کے ماتھے قاتل لگتا ہے...... جو غارت گری کرتا ہے بدلے میں وہ بھی غارت ہوتا ہے' اور تاریخ بتاتی ہے کہ چنگیز خان کی موت کے چند عشروں بعد اس کے بہت سے جانشینوں نے بدھ مت قبول کر لیا تھا اور پھر یہ نسلوں کی نسلیں کھا پی جانیو الے منگول راتوں رات امن پسند گڈریوں میں تبدیل ہو گئے۔ بہت سی جدید ریاستیں جنگ سے بچنے کا پورا جتن کرتی ہیں۔

تاہم اپنی تاریخ کے بہت ابتدائی دور میں ریاستیں جنگی مشینوں کے سوا کچھ نہ دکھائی دیتی تھیں۔ فتوحات سے انہیں مزید شہہ ملتی تھی، چپکا بیٹھے رہنا ان کے بس میں نہ تھا، وہ اپنے لوگوں کا خون چوستی رہتی تھیں اور مفتوحہ قوموں کا خون چوسنے کے معاملے میں تو وہ اور بھی زیادہ بے شرم ہو جاتی تھیں۔ ان کے کرتوتوں نے ریاست کے بارے میں موخرافکار میں بہت رنگ بھرا ہے۔ چرچل لکھتا ہے کہ 'بنی نوع انسان کی داستان جنگ کی داستان ہے۔ دنیا میں ما سوائے چند مختصر اور نازک وقفوں کے کبھی بھی امن قائم نہیں رہا اور تاریخ کے آغاز سے بہت پہلے ہی دنیا میں ہر طرف جنگ و جدل پھیل گیا تھا جس کا کوئی خاتمہ نظر نہیں آتا تھا'۔ چرچل کے ان الفاظ میں ہیراقلیطس کے ان الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ 'جنگ عام ہے اور تصادم ہی انصاف ہے' اور یہ کہ 'جنگ سب کی باپ اور سب کی بادشاہ ہے'۔

تاہم جنگوں میں ریاستوں کے کردار کو انسانی فطرت کے ردعمل کی بجائے تسلط و تسخیر کے مظہر کے طور پر زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے اور انسانیت کو خلقاً پرامن تصور کرنے کی بجائے خلقاً جنگجو خیال کرنا گمراہ کن بات ہے۔ بلا شبہ خطرات سے بچاؤ کی خواہش بہت قوی ہوتی ہے اور تقریباً اتنی ہی قوی آرزو پسندیدہ چیزوں کے حصول کی ہوتی

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہے۔ تشدد غریب اور کم ترقی یافتہ خطوں سے خاص رہا ہے۔ بعض مطالعات کے مطابق قدیمی دور کی جنگ میں ایک چوتھائی کی شرح سے بالغ مرد ہلاک ہو جایا کرتے تھے۔ نیوگنی اور بعض دیگر معاشروں میں شرح قتل آج بھی بہت زیادہ ہے۔

تاہم بڑی جنگوں کو قدرتی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بڑی جنگ کسی مادی بنیاد پر چھڑتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسی جنگ کیلئے لوگوں کی مناسب تعداد کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور پھر ہتھیانے کے قابل چیزوں کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کم آبادی کی حامل پہاڑیوں کی نسبت زیادہ آباد زرخیز وادیوں میں تشدد کی سطح کہیں زیادہ بلند رہی ہے اور یہ بات آج کی دنیا پر بھی صادق آتی ہے ۔ سادہ معاشروں میں ایسے احوال کا امکان کم ہوتا ہے۔ اشیاء خراب ہو جاتی ہیں اور انہیں ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا اور ایسے عہدے زیادہ نہیں ہوتے کہ جن کیلئے جنگ کی جائے۔

جنگ نے مستحکم اور منظّم حکومت کے ساتھ ساتھ ارتقاء پایا۔ اس کی نسبت مستحکم معاشروں، گنجان آبادیوں اور متوفر وسائل کے ساتھ رہی ہے۔ جنگ اس وقت ہوتی ہے جب تعیّشات پر قبضہ جمانا ہو اور ان کو ذخیرہ کرنے کا انتظام بھی موجود ہو، بڑے بڑے تاج وتخت پر تسلط قائم کرنا ہو اور یا پھر نمود کیلئے فتح وتسخیر کیلئے جنگ کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہ رہ جائے۔ مثال کے طور پر قرون وسطیٰ کے سپین میں یہ تصور عام تھا کہ تجارت کی نسبت جنگ مال و دولت کے حصول کا زیادہ تیز اور باعزت طریقہ ہے ۔ ایسے معاشروں میں کہ جہاں جنگجو برسر اقتدار ہوتے ہیں یہ سوچ عام ہو جاتی ہے کہ طاقت ہی برحق ہے اور طاقتور افراد کو دیوتاؤں کی آشیر باد حاصل ہوتی ہے۔ جب اہل میلیتس نے اہل ایتھنز سے رحم کی فریاد کی تھی تو ایتھنز والوں نے کہا تھا 'طاقت والے وہ کرتے ہیں جو کرنے کی ان کے پاس طاقت ہوتی ہے اور کمزور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو انہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے'۔

انتہائی صورتوں میں ریاست کا ہرعضو تاراجی جنگ کی طرف مبذول کر دیا جاتا ہے۔ چنگیز خان اور تیمور تسخیرات اور مال غنیمت میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں مفتوحہ علاقوں کی حکمرانی کیلئے درکار مہارت حاصل کرنے کی پرواہ تک نہ تھی۔ نازیت اس مرض کی جدید شکل تھی۔ نازیوں نے سارے سرمائے اور سیاست کو تاراجی جنگوں میں جھونک رکھا تھا اور ان کے پلے ظالمانہ طریقے سے املاک وممالک ہتھیانے کے علاوہ کوئی سوچ نہ تھی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

جب کوئی ریاست جنگ و جدال میں پڑتی ہے تو وہ ایک ایسی منطق کی نذر ہو جاتی ہے جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہتا اور اس کے ذہن پر تسخیر و تسلط اور توسیع کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ جب ہم گذشتہ سلطنتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ ان کی فوج کے لئے سب سے زیادہ مایوسی کا لمحہ وہ ہوتا تھا جب کسی عسکری مہم کو منسوخ کیا جاتا تھا۔ جنگ میں سوچ والی بات زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہتی اور جب دشمن سے پالا پڑتا ہے تو سب منصوبے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کلاز وتس کے بقول جنگیں جذبات سے شروع ہوتی ہیں اور جذبات ارادوں کو ہمیشہ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ نفرتیں جنگ کی کشتم کشتا میں اور بھی سوا ہو جاتی ہیں اور محدود لڑائیوں کو لا محدود تباہیوں میں تبدیل کر کے رکھ دیتی ہیں۔ معقول اہداف پیچیدگیوں اور پراگندگیوں میں بدل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دانا لیڈر جنگ کو صرف آخری حربے کے طور پر لیتے ہیں اور ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ وہ جنگ مول لینے کی بجائے جنگ کے دباؤ کا رخ ادھر ادھر پھیر دیں۔ پیریکلیز کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی خونریزی کی ہوس کو افاقہ پہنچانے کیلئے کئی چھوٹی موٹی لڑائیاں لڑیں لیکن وہ بڑی جنگ سے آخر تک گریز کرتا رہا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو یہ سوچ بھی وفات پا گئی اور ایتھنز صقلیہ سے جنگ کیلئے چڑھ دوڑا جس سے وہ تباہی کے دھانے تک جا پہنچا۔

ریاستیں مسخر کرنے والے گروہ جنگ کا رخ اس لئے کرتے ہیں کہ یہ بیک وقت ان کے بہت سے مقاصد پورے کرتی ہے۔ جنگ کے عملی تقاضے خوراک سے لے کر اطلاعات تک ہر چیز پر ان کے تصرف میں اضافے کا جواز مہیا کر دیتے ہیں۔ ماضی بعید کے سرداروں کو یہ ضرور محسوس ہوتا ہو گا کہ جونہی خطرہ ٹلا ان کا اقتدار بھی زوال میں آ جائے گا۔ جنگ اس لئے بھی لبھاتی ہے کہ یہ گروہیت کے جذبے میں اضافہ پیدا کرتی ہے۔ اس سے لوگوں میں اپنی قوم سے وفاداری کا احساس بڑھ جاتا ہے اور امتیازی تشخص جاگ اٹھتے ہیں۔ اس میں محض اتفاق والی بات نہیں ہے کہ بہت سی انقلابی حکومتیں بار بار جنگ کی طرف رجوع کرتی رہیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ انہیں انقلاب کی پیدا کردہ متوفر توانائیوں کو ٹھکانے لگانا ہوتا تھا۔ انقلاب کے بعد فرانس کی اتنی جنگیں، 1920ء میں پولینڈ پر بالشویک حملہ اور 1980ء کے عشرے میں لبنانی حزب اللہ کی ایران کی طرف سے سرپرستی، سب اسی بات کے مظہر

allurdupdfnovels.blogspot.com

تھے۔ نازی اور بالشیوک دونوں کا اپنے دشمنوں کے خلاف سیاسی جنگ کے عسکری استعارے پرگزارہ تھا اور انہوں نے خطرے کے اس مستقل احساس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ صدام حسین کا ایران اور تاریخ بشر کے سب سے بڑے فوجی اتحاد (پہلی خلیجی جنگ) سے ہلاکت خیز جنگوں میں سلامت بچ جانا ہمیں یہ بتاتا ہے کہ حربی فضا کو اقتدار مضبوط بنانے کیلئے کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔

جمہوری حکومتیں بھی ایسی تحریصات سے محفوظ نہیں ہوتیں۔ ایک تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ گذشتہ دو صدیوں کے دوران مطلق العنان اور بالغ جمہوری ریاستوں کے مقابلے میں جمہوری عمل نیا نیا شروع کرنیوالے ملکوں میں جنگ چھیڑنے کا رجحان زیادہ رہا۔ اس رجحان کا تعلق ان کا اپنی اقلیتوں سے مخاصمت سے ہے جس کا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔[23] اس کے برعکس بالغ اور مستحکم جمہوری حکومتیں جارحانہ جنگوں میں زیادہ کشش محسوس نہیں کرتیں اور جو حکومتیں اپنے عوام میں واقعی مقبول ہوتی ہیں انہیں تو خوف کی فضا پیدا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

کچھ ریاستیں جنگی مشین کو اپنے عوام کی خدمت کیلئے بھی استعمال کرتی ہیں۔ سلطنت رومہ میں فوج کو محصولات اکٹھے کرنے، سڑکیں کھلی رکھنے بلکہ انہیں تعمیر کرنے پر بھی مامور کیا جاتا تھا۔ جنگوں سے ملنے والے مال و متاع سے رعایا کیلئے خوراک اور روزگار کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاہم ایسی مثالیں کم ہیں۔ زیادہ ریاستیں اس چیز کو منزل بنا لیتی تھیں جسے کہ منزل تک پہنچنے کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے تھا۔ وہ اپنی جنگیں جیتنے کیلئے بہت زیادہ وعدے کرتی تھیں اور پھر جب جنگ انجام کو آتی تو انہیں لوگوں کی توقعات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگیں اس قدر اکثر انقلابات پر منتج کیوں ہوتی ہیں اور بڑی جنگیں اس قدر اکثر خود جنگیں بپا کرنیوالوں کو کیوں نگل جاتی ہیں۔ پہلی عالمی جنگ سے نہ صرف یہ کہ روس میں اور کافی حد تک جرمن اور اٹلی میں بھی، انقلاب برپا ہوا بلکہ اس نے برطانیہ (جہاں ہیروؤں کے لیے گھروں کے وعدے کی خلاف ورزی کی گئی) میں بھی انقلابی اصلاحات کے تخم کاشت کیے۔ امریکہ (یو ایس) میں اس جنگ نے دو اہم ترین عوامی مطالبے یعنی شراب پر پابندی اور خواتین کیلئے حق رائے دہی منوانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

عسکریت پسند ریاستوں کو درپیش دوسرا خطرہ اپنے عوام سے تصادم کا ہوتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

چونکہ جنگ اس قدر اکثر بڑوں کے تنگ نظرانہ مفادات کی تکمیل کیلئے لڑی جاتی ہے، عوام کی وفاداریاں برقرار رکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ فوجی ریاستیں لوگوں میں عسکری خصائل کو فروغ دیتی ہیں اور تفریح اور پرسکون زندگی کی کشش کو دبانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسی ریاستیں پراپیگنڈہ، رشوت یا جبر سے اجنبیوں پر تشدد کو شہہ دیتی ہیں۔ بہت سی ریاستیں اپنے لشکروں میں غلام رکھا کرتی تھیں جن سے ان کی خدمت کے صلے میں آزاد کرنے کا وعدہ کیا جاتا تھا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انگلستان جبری لام بندی کے ذریعے سپاہی اور ملاح بھرتی کرتا رہا۔ بہت سی جدید ریاستیں بھی جبری بھرتی سے کام لیتی رہی ہیں ۔ بعض بھرتی ہونے والوں کو یہ خواب دکھاتی تھیں کہ اگر وہ مارے گئے تو انہیں شہادت کا رتبہ ملے گا اور وہ سیدھے جنت میں جائیں گے۔ بعض ان کو یہ سمجھاتی تھیں کہ قوم تا ابد ان کی احسان مند رہے گی۔

بھرتی ہونے پر نوجوانوں کو ان کی سرشت کے خلاف قتل کرنے کی مشینوں میں ڈھال دیا جاتا تھا۔ جب 1939ء اور 1945ء کے درمیان بحرالکاہل اور یورپی محاذوں پر لڑنے والے 400 پیادہ دستوں میں شامل جوانوں کے گولی چلانے کی شرح کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ ایک لڑائی میں صرف 15 فیصد فوجیوں نے دشمن پر محض ایک مرتبہ گولی چلائی تھی گو ان مین سے 80 فیصد ایک گولی چلا سکتے تھے یا گرنیڈ پھینک سکتے تھے۔ سنگین بازی کی تربیت اس غیر فطری کشت وخون کی مزاحمت کو کچلنے کا ایک طریقہ تھا۔ فوجیوں کو انسانی جسم پر گھاؤ لگانے کی مشق بورے سے بھری بوریوں سے کرائی جاتی تھی۔ وہ ان پر بار بار وار کرتے تا کہ شقاوت ان کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ تاہم اس کی لاگت بھی بہت زیادہ نکلی۔ ویتنام کی جنگ سے واپس آنے والے نفسیاتی عوارض میں مبتلا بعض جوانوں کے بارے میں یہ بات سامنے آئی کہ انہوں نے لڑائی میں بالکل حصہ ہی نہیں لیا تھا۔

جنگ ممکن بنانے کیلئے تشخص اجاگر کرنا بھی بہت ضروری تھا یعنی اس تصور پر سے ہر ممکن حد تک توجہ ہٹانے کیلئے 'ہم' اور 'ان' کے درمیان ایک پکا سرحدی خط کھینچنا بھی اہم تھا کہ 'ہم' جوان ہیں اور 'وہ' افسر۔ اس کا نتیجہ نفرت کے اس عجیب وغریب جغرافیے کی صورت میں نکلا کہ جو جنگ عظیم اول جیسی جنگوں میں سامنے آیا۔ لڑنے والوں کی نسبت ان فوجیوں کے دل میں دشمن کیلئے زیادہ نفرت پائی گئی جو کہ پیچھے اپنے ملک میں ہی رہے۔ گھر دار

allurdupdfnovels.blogspot.com

خواتین کے دل میں سب سے زیادہ خون آشام قسم کی نفرت نکلی جنہوں نے ان مردوں کو پرندوں کے سفید پر بھیجے کہ جنہوں نے ان کے خیال میں بزدلی کے کارن لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ چونکہ محاذ پر لڑنیوالے سپاہیوں کو اس قدر نفرت کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا، بہتر تھا کہ انہیں قوم یا کسی بڑے نصب العین کی بجائے اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کی خاطر لڑنے پر آمادہ کیا جائے۔ یہ حقیقی جنگ و جدل کی ایک مشترک کہانی ہے یعنی مشکل آدرشوں کی بجائے دوست اور رفیق شجاعت و دلیری کا محرک زیادہ بنتے ہیں۔

یہاں ہمارے سامنے ایک خاص نمونہ آ رہا ہے۔ زمانہ حال تک جنگیں عموماً چند افراد کیلئے لڑی جاتی تھیں زیادہ کیلئے نہیں۔ جنگیں اس لئے رونما ہوتی تھیں کیونکہ ان ریاستوں کو کہ جن پر اشرافیہ نے تسلط جما یا ہوتا تھا، مزید وسائل کی جستجو ہوتی تھی، لیکن انہیں جیتنے کیلئے گہرے جذبوں سے استفادہ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ نفرت محبت پر استوار کی جاتی تھی، خواہ یہ محبت رفیقوں کی ہو، خاندان کی اور یا پھر قوم کی، عین اس طرح کہ جیسے نسلی تشدد دوستوں اور خاندانوں کی محبت اور ان کی حفاظت یا ان کا انتقام لینے کے جذبے سے پنپتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں تصوراتی نفرت روزمرہ کی محبت سے اکتساب کرتی ہے۔

چاروں ذمہ داریوں کا تاریک پہلو

گذشتہ باب میں میں نے ریاست کی چار بڑی ذمہ داریوں کا ذکر کیا تھا اور اس باب میں میں نے اس چیز پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ یہ حقیقی ریاستوں کے جانبدرانہ کردار سے مسلسل کیسے متصادم ہوتی رہی ہیں۔ تاہم قارئین نے غور کیا ہوگا کہ ریاست کے خادم کے طور پر اور آقا کے طور پر کردار کے درمیان تناؤ اس سے زیادہ بنیادی ہے۔ کیونکہ ان چاروں میں سے ہر ذمہ داری جبر پر انحصار کرتی ہے اور اسے صرف محکوم عوام کی آزادی پر قدغن لگا کر ہی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔

محافظت کی ریاستی ذمہ داری ریاست کو جبری بھرتی اور مارشل لاء کے نفاذ کے حقوق بھی دیتی ہے۔ بہبود کی ذمہ داری ریاست کو ٹیکسوں میں اضافے اور نجی زندگی میں مداخلت کے حقوق دیتی ہے۔ انصاف کی ذمہ داری ریاستوں کو قید کرنے اور بعض اوقات سزائے

allurdupdfnovels.blogspot.com

موت دینے کے حقوق دیتی ہے۔ سچائی کی ذمہ داری ریاستوں کو ایسے بیانات پر پابندی کے حقوق دیتی ہے جس سے نفرت کو ہوا ملنے یا بچوں کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو۔

اس کا مطلب یہ نکلا کہ اچھی حکومت کا کوئی بھی مطلق آدرش محض ایک فریب ہوتا ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے انہی چیزوں کا کہ جو اچھی ہوتی ہیں، کاانحصار بری چیزوں پر ہوتا ہے۔ آزادی، انصاف اور بہبود جبر کا محتاج اور امن کا دارو مدار تشدد پر ہوتا ہے۔ اس سے ریاست اور عوام کے درمیان کوئی بھی شناخت واہمے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ لوگوں کی خدمت کیلئے ریاستوں کو انہیں احکامات بھی دینا پڑتے ہیں اور ان پر قدغن بھی لگانا پڑتی ہے اور وسیع تر مفہوم میں ہی سہی ریاست محض ایک ایسا وسیلہ ہوتا ہے کہ جس کے ذریعے لوگ خود پر حکم نافذ کرتے ہیں۔ ریاست کے روزمرہ فعل میں ایک گروہ لازماً دوسرے گروہ پر حکم نافذ کر رہا ہوتا ہے۔

یہ بات بڑی حد تک ہر ایک قسم کی حکومت پر صادق آتی ہے جس مین اندرون خانہ والدین کی حاکمیت بھی شامل ہے جنھیں اپنے بچوں کو انہی کے فائدے کیلئے نظم و ضبط میں رکھنا ہوتا ہے۔ یہ دوغلاپن اس بات پر مہر ثبت کرتا ہے کہ کوئی بھی ریاست مکمل طور پر کبھی اچھی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے آدرش کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں ان جبری ذرائع نے کہ جو اسے استعمال کرنا پڑتے ہیں اور ان بہت سے طریقوں نے کہ جن سے اسے عوام کے سامنے رکاوٹ کھڑا کرنا ہوتا ہے کہ جن کی سیوا کے لئے یہ وجود میں آتی ہے، اس کے کردار پر اثر انداز ہونا ہی ہوتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 6

خودغرض ریاست

''دوسروں کو مائل کر کے ہم خود کو قائل کرتے ہیں''۔ (فرانسسکس جونیئس)

میں نے اپنی زندگی میں تین مرتبہ سول سرونٹ کے طور پر کام کیا ہے، لندن کی بلدیاتی حکومت میں، برطانوی قومی حکومت میں اور یورپی کمیشن میں۔ مجھے ہر دفعہ یہ باور ہوا کہ مستقل منتظم بن کر آپ کو اپنی سوچ کا زاویہ تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ ظاہراً آپ قوم کے خادم بنتے ہیں اور آپ سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ آپ اپنے سیاسی نظریات اور ذاتی تعصّبات کو ایک طرف رکھ کر وسیع تر مفادات کیلئے کام کریں۔لیکن آپ سمیریہ، چین، پروشیا اور فرانس کے اپنے پیش روؤں کی مانند ایک ایسی چیز کا حصہ بن جاتے ہیں جو اس سے بہت مختلف ہوتی ہے یعنی آپ ایک ایسی مشین کے پرزے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جسے اپنا وجود برقرار رکھنے کیلئے موجود رہنا ہوتا ہے، ایک ایسی مشین جو خود کو پرنظم دنیا کی بنیاد تصور کرتی ہے۔

گذشتہ دو ابواب میں میں نے اس پر بات کی تھی کہ ریاستوں کے داخل میں لوگوں کی خدمت کا ایک اخلاقی مقصد کارفرما ہوتا ہے اور ہر ریاست پر کسی نہ کسی حد تک خود غرضانہ مفادات سوار ہوتے ہیں ۔ تاہم ریاست کے ان دونوں پورٹریٹوں سے مکمل تصویر سامنے نہیں آتی ۔ یہ سمجھنے کیلئے کہ ریاستیں ایسے کیوں پیش آتی ہیں، ہمیں یہ تجزیہ بھی کرنا ہوگا کہ ریاستیں خود اپنی سیوا کیسے کرتی ہیں اور اپنے معانی کیسے اخذ کرتی ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ریاست بطور ایک عالمگیر مشین :

ریاستوں کو بسا اوقات مشینوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ باقاعدگی اور تکرار پسند کرتی ہیں۔ لیکن وہ بہت خاص قسم کی مشینیں ہوتی ہیں۔ انجنوں اور پمپوں کی طرح کم اور ایسے کمپیوٹروں کی طرح کی مشینیں زیادہ ہوتی ہیں جنہیں بنانے سے قبل عالمگیر فکری مشینوں کے طور پر تھیورائز کیا گیا تھا اور جو کسی بھی کسی قسم کی انفارمیشن لے کر اسے کسی بھی طریقے سے پراسیس کرتی چلی جاتی ہیں۔ ریاستوں کو تھیورائز کرنے سے قبل بنایا گیا تھا مگر ان میں بھی کچھ اس طرح کے خواص موجود ہیں۔ ان کے زمرہ بندی، پیمائش، انتظام اور انصرام کے مشترک آلات انہیں بھی لیڈروں اور لوگوں کی خدمت میں مصروف عالمگیر مشینوں کا روپ دے دیتے ہیں۔ انہیں دیوتاؤں کو رام کرنے، حملے سے بچاؤ یا خوراک کے انتظام کیلئے استعمال کیا جا سکتا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ انہیں سائنسی دریافتوں سے لے کر عالمی تحقیق اور نسل کشی سے لے کر علاج معالجے تک جیسے بہت سے دیگر کاموں کیلئے بھی ماہر ثابت کر دکھایا گیا۔

ریاستوں نے یہ سب کام آرڈرنگ مشینوں کے طور پر کر دکھائے ہیں۔ یہ ان کی داخلی منطق ہے، ان کی جنگی مشینوں کی نوعیت سے بھی پہلے، اور یہی ان کے جواز کا ذریعہ ہے جن کا انحصار تغیر ماحول سے منسوب خطرات کی تخفیف پر ہے۔ آب رسانی کا انتظام کرنا، قحط کے سدباب کیلئے خوراک ذخیرہ کرنا، شکاری جانوروں کو دور رکھنا، ایڈز جیسی بیماریوں اور غیر قانونی منشیات کی آمدورفت میں کمی کرنا۔

یہ ذہنیت زراعت شروع ہونے سے پہلے کے معاشروں میں موجود نہ تھی۔ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد زرعی ذہن جو یہ سیکھنے کے بعد کہ فطرت کے دوروں کو منضبط کیسے کیا جا سکتا ہے نوحجری عہد کے اواخر میں ارضی مناظر کی ترتیب و تنظیم کیلئے کوشاں تھا، اور ادبی ذہن، کہ جو عقائد، تصورات اور حکایات میں نظم پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کے سنگم پر رکھی گئی۔ پھلنے پھولنے والی ریاستوں کی جڑیں زمین میں تھیں اور ان کی حکومت تحریر کے ذریعے چلائی جاتی تھی ہاں ان کا کوئی رسم الخط نہیں تھا اور وہ لوگ ریکارڈ محفوظ رکھنے کے بعض دیگر پیچیدہ طریقے استعمال کرتے تھے۔ بیشتر کیلئے ٹیکس وصول کرنے اور وفاداریوں کی جزا دینے

allurdupdfnovels.blogspot.com

کیلئے لکھنے اور محفوظ رکھنے کی اہلیت نے حکومت کو ممکن بنایا (اور بلا شبہ ریاستی بیورو کریٹ قدیم میسوپوٹیما کے ریکارڈوں میں فن تحریر ایجاد کرنے کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں)۔ فن تحریر نے سرکاری کارپردازوں کو ایک تجریدی قانون کو ٹھوس حقیقت میں رسمی سرحدوں کو بے قاعدہ جغرافیوں میں، معین کتب کو سیال سماجی حقائق میں بدلنے میں مدد دی اور ریاستوں کو یہ مشن دیا کہ وہ دنیا کو مجبور کریں کہ وہ مثالیہ کے قریب تر بننے میں بہتری پیدا کرے[1] (اس طرح مشکل مشکل رسوم الخط پر عبور حاصل کرنے والے کاتبین بھی مراعات یافتہ اشرافیہ میں بدل گئے)۔

تاریخ کے بیشتر سفر میں خانہ بدوشی کو بڑے متبادل کی حیثیت حاصل رہی۔ خانہ بدوش حضری تہذیبوں کو اکثر و بیشتر حسد، لالچ اور خوف کے ملے جلے جذبات سے دیکھتے رہے۔ انہیں حضری انسانوں سے اکثر خطرہ رہتا تھا خصوصاً جب ان کی آبادیوں میں اضافہ ہوا (بعض اوقات یہ اضافہ بہت رفتار سے ہوا جیسے انیسویں صدی میں امریکہ اور روس میں، لیکن ان میں خطرہ پیدا کرنے کی اہلیت بھی تھی، گوتھ، ہن، منگول اور تاتاری سب ان لوگوں سے کہ جن سے وہ نبرد آزما ہوئے، عسکری لحاظ سے برتر تھے اور پھر ان کی ذہنیت نے بھی انہیں بہت فائدہ پہنچایا۔ وہ یہ کہ ان کے پاس دولت کے ذخائر کی حامل حضری آبادیوں کے مقابلے میں وہ سب ہوتا ہی بہت کم تھا کہ جسے وہ گنواتیں۔ حضری آبادیاں انہیں خریدنے کی کوشش کرتی تھیں ۔ رومنوں نے جرمنیک قبائل کو دور رکھنے اور چینیوں نے بربروں کو ان کے وسطی اور شمال ایشیائی علاقوں میں رکھنے کیلئے بڑا بڑا مال خرچ کیا۔ پہلے ہزاریے کے اخیر پر برطانیہ میں وائیکنگ حملہ آوروں کو ادا کیا جانے والا اضافی ٹیکس 'ڈین گیلڈ' بتاتا ہے کہ یہ تحفظی سودے کتنے منافع بخش ہوا کرتے تھے۔ تاہم انجام کار ان حضری قوموں نے یہ چپقلش فیصلہ کن انداز سے جیت لی انہوں نے شہروں میں اپنی جڑیں پیوست کر لی تھیں اور یہ ان کی ریاستیں ہی تھیں کہ جو مستقبل کیلئے مثال بنیں۔ خانہ بدوش، لغوی اور مجازی دونوں، اب بھی ریاستوں کو خوف سے دیکھتے ہیں اور انہیں حواشی میں دھکیلا جا چکا ہے اور اب اگر کوئی خانہ بدوش تاراجی ریاستیں بچی بھی ہیں تو صرف مجرمانہ گروہوں کی صورت میں۔

جب خانہ بدوشوں نے ریاستیں فتح کیں تو وہ خانہ بدوش بھی نہ رہے، مثلاً چنگیز خان نے چند عشروں کے اندر تاریخ انسانی کی سب سے بڑی سلطنت بنا ڈالی لیکن اس کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

پاس اسے چلانے کے وسائل نہ تھے۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ منگول رسم الخط ایجاد کرے اور کاتبین و منتظمین کا ایک لشکر تیار کرے۔ باوجود حضری تہذیب سے اپنے کد کے وہ اتنا ذہین ضرور تھا کہ دیکھ سکے کہ اس کے مفادات کس چیز میں ہیں (اور اس نے منگولوں کے انتہائی مستعد ڈاک کے نظام پر تکیہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے جانشینوں نے کہ جو اتنے قابل نہ تھے اور جنہوں نے لکھنا پڑنا نہ سیکھا تھا، اپنے کام کو آسان بنانے کیلئے شمالی چین کے کسانوں نیز انتظامی افسروں کا صفایا کرنے کی ٹھان لی لیکن تہذیب کا ایک بطل جلیل یےلو چوتسا آڑے آیا اور اس نے انہیں اس اقدام سے باز رکھنے کیلئے یہ مشورہ دیا کہ کاتب جنگجو خانہ بدوشوں کے وفادار خادم ثابت ہوں گے اور ان کیلئے اور زیادہ مال غنیمت اور عزت و وقار کا باعث بنیں گے۔[2]

چنانچہ ریاستوں نے قدیم ترین دور سے ہی لوگوں کی زندگیوں کی ژولیدہ حقیقت پر تحریری لفظ اور عدد کی منطق کا اطلاق شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے دنیا کو اپنے قیاسات کے مطابق بنا کر اور اسے ان قیاسات کی تعمیل پر مجبور کر کے اپنی دنیا میں معانی پیدا کرنے شروع کر دیے تھے۔ ریاستوں کیلئے کام کرنیوالوں نے ریاستوں کے انداز میں دیکھنا، شروع کر دیا تھا...... آنکنے، ماپنے، کنٹرول کرنے اور منصوبہ بندی کے عمل سے اور شاید کچھ زیادہ ہی تواتر سے لوگوں کو منزل کی بجائے وسائل خیال کر کے اور زندگی کے کھردرے گگروں کو ایسے مسائل تصور کر کے کہ جن کو نظم و ضبط میں لانا ضروری تھا۔[3] ریاست کو ایسا کرنے کیلئے زمروں کی ضرورت تھی۔ ہم چیزوں کو کیسے بیان کرتے ہیں، یہ اکثر و بیشتر بذات خود ایک اخلاقی عمل ہوتا ہے اور بہت سے وہ ثانوی زمرے جنہیں ریاست استعمال کرتی ہے ناقابل مفر طور پر اخلاقی نیز عملی ہوتے ہیں۔ کوئی قانونی ہے یا غیر قانونی، کوئی شخص شہری ہے یا پھر نہیں ہے، افراد امداد کے مستحق ہیں یا نہیں ہیں۔ ان زمروں کے ذریعے ریاست اس بات کا تعین کرتی ہے کہ لوگ اپنے سادہ ترین سوالوں کا جواب کیسے دیتے ہیں میں کون ہوں؟ مجھے کیسے پیش آنا چاہیے؟ میں کیا بن سکتا ہوں؟

ٹیکسوں کی وصولی کیلئے زمین، دولت اور تجارت کی فہرستوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اراضیوں کو ان کی پیداواری صلاحیت کے اعتبار سے آنکنا پڑتا ہے، فوجیں بھرتی کرنے کیلئے جوانوں کی فہرستیں درکار ہوتی ہیں۔ روز مرہ نظم و نسق کیلئے یہ چیز ضروری ہوتی ہے کہ حدیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

متعین ہوں اور ان کیلئے لڑنا نہ پڑے۔ شہریوں کو ٹیکس دہندگان، امداد کے مستحقین، مریض یا والدین کے طور پر زمروں میں گھسیٹنا پڑتا ہے۔ ان کو آنکنا پڑتا ہے اور ان کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ہر ریاست سے علم کا ایک پیچ در پیچ آرکیٹیکچر منسوب ہونے لگتا ہے جسے وقت گزرنے کے ساتھ لوگ خود میں جذب کر لیتے ہیں اور مثال کے طور پر بچوں، پنشنروں، منحرفین یا دوسرے درجے کے شہریوں کے طور پر خیال کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ زمروں میں بانٹے جانے والے لوگ اس آرکیٹیکچر سے کم از کم جزوی طور پر اجنبیت محسوس کرتے ہیں (عام آنکھ اس گہرائی تک نہیں پہنچ پاتی کہ جہاں تک اعداد و شمار پہنچ جاتے ہیں) اور ان زمروں کیلئے جدوجہد کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر برطانوی حکومت نے 1990ء کے عشرے میں شراب پی کر تشدد کرنے اور دیواروں پر لکھنے کی سزا کیلئے سماج دشمن رویہ آرڈرز کی وساطت سے سماج دشمن رویے کا ایک نیا زمرہ تخلیق کیا تاہم پولیس والوں کو اس نئے زمرے کے استعمال پر مائل کرنے کے لئے کافی جدوجہد کرنا پڑی اور پھر کچھ ایسے من چلے نوجوان بھی دیکھنے میں آئے کہ جن کے لئے یہ آرڈر ایک تمغہ فخر بن گیا۔

حکومت کے استعمال میں آنے والے زمرے اکثر پہلے سے موجود حد بندیوں۔ مثلاً جو مرد و عورت، اکثریتی مسلک کے ماننے والوں اور دوسروں، مختلف نسلی ولسانی گروہوں کے ارکان کے درمیان پائی جاتی ہیں ...... سے اکتساب کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ان میں مزید قوت آ جاتی ہے۔[5] درحقیقت کیونکہ ریاستیں ان حد بندیوں کو تقویت دیتی ہیں، عین اسی وجہ سے مذہبی یا نسلی بٹواروں کے شکار معاشروں میں ریاستی اقتدار کیلئے لڑی جانے والی لڑائیاں بہت زیادہ شدید ہو جاتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کچھ داؤ پر لگا ہوتا ہے۔ 1975ء کے بیروت میں کہ جہاں کاروں کو روک روک کر ان کے مسلم یا عیسائی مالکوں کو قتل کیا جاتا تھا یا 1994ء کے روانڈا میں جہاں ہوٹوؤں نے ٹٹسیوں کی (اور ان ہوٹوؤں کی کہ جنہوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا) نسل کشی کی کوشش کی، زمراتی حد کی غلط جانب ہونا مہلک ہو سکتا تھا۔

دیگر وقتوں میں ریاستیں ان طریقوں کی از سر نو تعریف بھی کرتی ہیں جن سے لوگ اپنے بارے میں زیادہ مہربان طریقوں سے سوچتے ہیں۔ امریکہ کے سروس مینز ری ایڈجسٹمنٹ ایکٹ مجریہ 1944ء جو کہ جی آئی بل کے نام سے زیادہ جانا جاتا ہے، میں کالج کی تعلیم اور روزمرہ اخراجات کیلئے امداد کا پروگرام پیش کیا گیا تھا اور اس سے کوئی 16 ملین

allurdupdfnovels.blogspot.com

افراد کو اپنے مستقبل کے بارے میں کیریئر اور ترقی کے حوالے سے سوچنے میں مدد ملی جب کہ ان کے والدین کو نری ملازمت اور تنخواہ پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ شمالی یورپ میں ریاستوں نے انسانی و سماجی حقوق کے گہرے عقائد کی پرورش پر داخت کی ہے۔ اسی طرح یورپی اتحاد نے اس بات کی حوصلہ افزائی کیلئے بڑی کڑی محنت کی ہے کہ یورپی باشندے اپنے بارے میں یورپی شہریوں کے طور پر سوچنا شروع کر دیں (گو اسے اس میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی) اگرچہ اسے بھی یہ تعین کرنے میں بہت بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ اس حیثیت پر کون پورا اترتا ہے یا یہ کہ قلیل اور طویل مدتی مقیموں، غیر ملکی باشندوں، پناہ گزینوں اور ان کے رشتہ داروں سے کیا سلوک کیا جائے۔

ریاستیں زمروں کی تعریف کرتے وقت سیاسی ممکنات کو تبدیل کر دیتی ہیں۔ امریکہ (1960ء کے عشرے سے قبل) اور جنوبی افریقہ (نسلی امتیاز کے خاتمے سے قبل) نے اس بات کی تعریف کرتے وقت بہت بے لچک قواعد نافذ کر رکھے تھے کہ سیاہ فام کون ہے اور سفید فام کون ہے اور وہ کس قسم کے ووٹ، حقوق، مدارس اور گھروں کے مستحق ہیں۔ قلیل المدتی اعتبار سے ان قواعد نے سیاہ فام لوگوں کو جبر و افلاس کی زندگیوں میں مقید کیے رکھا لیکن طویل المدتی اعتبار سے ان زمروں نے انتہائی مختلف النوع آبادیوں کی کایا کلپ کر کے انہیں بہت منظّم اور خود آگاہ تحریکوں میں بدل کر رکھ دیا جن کی رسائی ایک ایسی زبان اور اعداد و شمار تک تھی جنہیں وہ اپنے مفادات کی جنگ میں بروئے کار لا سکتے تھے۔ برازیل کے سیاہ فام سابق غلاموں پر بھی ایک ایسے معاشرے میں عین اسی طرح جبر کیا گیا جو کہ رنگ اور طبقے کی درجہ بندیوں کے متعلق بہت زیادہ حساس تھا لیکن انہیں ایسے رسمی تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ انہیں امریکی غلاموں کی نسبت بہت زیادہ ظلم وستم اٹھانا پڑے کیونکہ انہیں وہ زمرے نہ مل سکے کہ جو انہیں سیاسی طور پر حرکت میں لانے کیلئے درکار تھے۔

معاشرے اور اس چیز کو کہ وہ کیسے سوچتا ہے منظّم کرنے کی صلاحیت ریاستوں سے خاص ہے اگرچہ کچھ مذاہب اور سماجی تحریکوں نے بھی یہ صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ سمیریہ اور مصر میں بھی موجود تھی لیکن القابات اور عملداری کی ان نئی حرفتوں نے اسے بہت جلا دی جنہوں نے یورپی روشن خیالی میں فلسفیوں اور حکمرانوں کے تخیل کو جکڑے رکھا۔ بنجمن کونسٹینٹ نے انیسویں صدی کی ابتداء میں لکھا تھا:

allurdupdfnovels.blogspot.com

''ہمارے وقتوں کے فاتح، خواہ وہ قومیں ہوں یا سلاطین، اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کی سلطنت کی سطح یکساں ہو جس پر حکومت کی برتر نگاہ کسی ایسی ناہمواری سے بھٹکے بنا گھوم سکے کہ جس سے اس کے تماشے کو کوئی نقصان پہنچے یا وہ محدود ہو کر رہ جائے۔ وہی ضابطہ قانون، وہی اقدامات، وہی قواعد اور اگر ہم بتدریج وہاں تک پہنچ سکیں تو وہی زبان، یہی چیز ہے، جسے سماجی تنظیم کا کمال کہا جاتا ہے''۔[6]

ریاستیں اکثر اس بات پر کف افسوس ملتی ہیں کہ کس قدر کم چیزوں کو قواعد میں اور لہٰذا کسی معانی میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مسولینی نے کہا تھا کہ اٹلی کا انتظام چلانا ناممکن نہیں، صرف بے مقصد ہے اور ڈیگال نے ایک مرتبہ یہ شکوہ کیا تھا کہ کوئی شخص ایسے ملک کو بھلا کیسے چلا سکتا ہے جو کہ 246 قسم کا پنیر تیار کرتا ہو۔ گورباچوف نے ڈیگال کی بات یاد کر کے پوچھا تھا کہ کسی ایسے ملک کو چلانا کیونکر ممکن ہے کہ جس میں 100 اقلیتیں آباد ہوں (اور خصوصاً اس کا ایک معتمد بڑبڑایا، ''اگر کوئی پنیر بھی میسر نہ ہو'')۔

انگلستان میں نامطلق ریاست کا سب سے بڑا بانی سر ولیم پیٹی تھا جس کی تصنیفات نے جہانبانی میں سائنسی طاقت متعارف کرانے کی کوشش کی۔ اس کا پیش کردہ حساب زمینوں اور محنت کے درمیان ایک مساوات قائم کرتا ہے تا کہ ان میں سے کسی بھی چیز سے حاصل ہونے والی کسی شے کی قدر بتائی جا سکے۔ پیسہ آرٹ، طاقت، دوستوں اور نوازش کے بشمول ہر شے کی قیمت متعین کرتا ہے۔ لگ بھگ اسی دور مین اس کے ایک دوست جان گرانٹ نے 'سماجی اعداد' کے مطالعے کی طرح ڈالی اور مستقبل کی حکومتوں کی لئے پیدائشوں، اموات، امراض اور جرائم کے تخمینے کی راہ ہموار کی۔

بعض صورتوں میں یہ کام خوش آئند ہو سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے وہ ماہرین شماریات جو گرانٹ کے کام کو سرکاری پالیسی کے مرکزی دھارے تک لے آئے عموماً ترقی کے حق میں تھے۔ گرانٹ کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کا شماریات جن سماجی نمونوں کو بے نقاب کرتا ہے ان کی وضاحت انفرادی انتخابات یا اخلاقی صفات کی بجائے صرف سماجی علل کے نتائج کے طور پر ممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ ان کا حل صرف سماجی عمل کے ذریعے ہی تلاش کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح چارلز بوتھ کا لندن کے غرباء کا سروے (جو 1902ء میں سترہ جلدوں میں شائع ہوا) اس 'مسکینوں کے مسئلے' کو حل کرنے کیلئے عمل میں لایا

allurdupdfnovels.blogspot.com

گیا تھا کہ جو اس نے دریافت کیے تھے، محض انہیں بیان کرنے کیلئے نہیں۔ آنکنا اور زمرہ بندی کئی دیگر اعتبار سے بھی ترقی کی ضامن ہوسکتی تھی۔

1840ء میں رولینڈ ہل کی ایجاد کردہ 'پینی پوسٹ' کا تقاضا تھا کہ برطانیہ کی ہر عمارت کیلئے ایک سا ایڈریس سسٹم ہوں۔ کوئی نصف ایک صدی بعد ٹیلیفون کے طفیل ہر عمارت کیلئے یکساں اعداد کی ضرورت بھی پیش آ گئی۔ تاہم اس معیار بندی کی فضا میں گفتگو کی لامتناہی کثرت، نگہداشت اور محبت کیلئے نیا سکوپ فراہم کیا گیا۔

تاہم دیگر زمانوں میں ریاستوں نے زمرہ بندی میں بہت سفاک کردار بھی ادا کیا۔ حافظے کے بغیر عمل اور اشتعال خام کو اجتماعی عمل میں ڈھالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک منظم فاتح کا اولین کام اس بات کو منضبط کرنا ہوتا ہے کہ لوگوں کی زمرہ بندی کیسے کی جاتی ہے اور انہیں شناخت کس طرح کیا جاتا ہے جیسا کہ انگلستان کے ایڈورڈ اول نے جب تمام یہودیوں پر زرد نشان لگائے تھے اور نازیوں نے یہودیوں کو ستارہ داؤدی اور جپسیوں کو سیاہ مثلث پہننے پر مجبور کیا تھا۔ دوسرا کام اس تشخص کو مٹانا ہوتا ہے جیسا کہ ایڈورڈ نے ویلز میں کیا تھا جہاں اس نے مقامی ثقافت کا نام ونشان تک مٹانے کی کوشش کی۔ بہت سی سامراجی حکومتوں نے مقامی مذاہب کو نابود کیا، مقامی زبانوں میں تعلیم حتیٰ کہ گفتگو کی ممانعت کی اور بعد میں متعدد قومی ریاستوں نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کو ترجیح دی۔ تھائی لینڈ کو اگرچہ عموماً کوئی اتنا جابر و سفاک ملک خیال نہیں کیا جاتا، تاہم اس نے1930ء کے عشرے میں اپنی جنوبی مسلم اقلیتوں کے خلاف اسی طرح کی زمراتی یلغار کی۔ ان پر تھائی زبان مسلط اور سرکاری ملازموں پر یہ پابندی عائد کر دی کہ وہ اپنے اسلامی نام ترک کر کے تھائی نام رکھیں۔ اسلامی عدالتیں بند کر دی گئیں اور مسلمان بچوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ بدھ کی پرستش کریں (ان اقدامات کے نتیجے میں نصف صدی تک شورش بپا رہی اور حکومت اسے انتہائی شقاوت سے کچلنے کی کوشش کرتی رہی)۔ (7)

کچھ ریاستیں اس سے بھی بہت زیادہ آگے تک گئیں۔ چین میں چن عہد کے پہلے شہنشاہ (جو چین کا پہلا شہنشاہ تھا) نے دوسری صدی قبل مسیح میں کتب جلانے اور عالموں کو زندہ دفن کرنے کی وجہ سے بہت بدنامی حاصل کی۔ (ماؤ نے اٹھارہ برس کی عمر میں ایک مضمون میں اس کی بہت تعریف کی۔ ماؤ کہتا ہے کہ ایسے قوانین بے وقوف اور پسماندہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

لوگوں کو شیر بنانے کیلئے ضروری ہوتے ہیں) ماؤ کے نو عمری کے افکار بہت اہم ثابت ہوئے۔ بعد میں اس نے چینی عوام کو ایک امکانی فن پارہ اور ایک ایسا خالی کینوس قرار دیا کہ جس پر وہ تصویر کشی کر سکتا تھا۔ 'چین کے 600 ملین افراد دو حیران کن خصوصیات کے حامل ہیں' وہ لکھتا ہے:

''اول یہ کہ وہ غریب ہیں اور دوم وہ کورے ہیں۔ ممکن ہے بظاہر یہ چیز بری دکھائی دے لیکن فی الواقع یہ اچھی ہے۔ غریب لوگ تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں، ان کے اندر کچھ کرنے کی تڑپ ہوتی ہے۔ وہ انقلاب چاہتے ہیں۔ صاف کاغذ پر کوئی دھبے نہیں ہوتے چنانچہ اس پر نئے اور خوبصورت ترین الفاظ رقم کیے جا سکتے ہیں، اس پر نئی اور خوبصورت ترین تصاویر بنائی جا سکتی ہیں[8] اور نئے سرے سے لکھنے کیلئے سلیٹ کو صاف کرنا پڑتا ہے۔ ''شہنشاہ چن نے ایسی کون سی الگ بات کی تھی''؟ ماؤ کہتا ہے 'اس نے تو صرف 460 عالم مارے تھے۔ ہم نے 46000 کو موت کے گھاٹ اتار دیا''۔ [9]

بیسویں صدی میں ریاستیں زمراتی تعریف کو نئی بلندیوں تک لے گئیں جس سے پورے کے پورے معاشروں کی کایا پلٹ گئی (جیسے کہ اتا ترک نے عربی رسم الخط، ترکی ٹوپی اور حجاب پر پابندی عائد کر کے کیا) اور وہ لوگوں کے پورے کے پورے زمرے ختم کرنے کے درپے ہو گئیں...... یہود، قلقہ، بورژوا...... اور انہوں نے سماجی زمرے نئے سرے سے دوبارہ بنانے شروع کر دیئے۔ کھمیر روج کا شہریوں کو انتباہ انیسویں صدی کے انقلابی جذبے کو ایک منطقی انجام تک لے آیا۔ 'زندہ تم ہمارے لیے کسی فائدے کے نہیں ہو' مر جاؤ تو ہمیں کوئی نقصان نہیں'۔ (وہ واحد کتاب جسے کہ سالوتھ سار، جو کہ بعد میں پول پاٹ کے نام سے مشہور ہوا، پیرس میں اپنے ایام طالب علمی سے یاد رکھ سکا وہ کروپوٹکن کی 'انقلاب عظیم' تھی)۔

ان میں سے ہر اقدام کو ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ ریاستوں نے جب بھی اپنے زمرے مسلط کرنا چاہے ان کی مزاحمت کی گئی ۔ بغاوتوں نے اپنی توانائیاں اکثر ریاستی پیمائشوں اور زمروں کو تباہ کرنے کی طرف کیے رکھیں۔ 1381 کی بڑی شورش میں انگریز کسانوں کا پہلا ہدف قانونی اور محصولاتی ریکارڈ تھے اور جب باغیوں نے دیہی علاقوں سے گزر کر لندن کا رخ کیا تو بہت سے وکیلوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔ سولہوں صدی میں محصور اینا

allurdupdfnovels.blogspot.com

بیپٹسٹوں نے ٹھیکوں اور قرضوں کے تمام ریکارڈ جلا دیئے اور بچنے کیلئے خوراک کا کمیونل نظام اپنا لیا۔1877ء میں ایزیکو مالا ٹیسٹا اور اس کے نراجی ساتھیوں نے قصبہ قصبہ پھر کر اطالوی ریاست کے تمام ریکارڈ غارت کر دیئے اور18-1917 ء میں ہزاروں روسی کسانوں نے اپنے آس پاس پھیلی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر اپنے زمینداروں کے بہی کھاتے جلا ڈالے۔

مقامی لوگوں کو رسمی ریکارڈوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں یہ سارا ویسے ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دور بیٹھی حکومت کو زیادہ سے زیادہ ثانوی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے (اسی وجہ سے بین الاقوامی ادارے ہمیشہ ثانوی اعدادوشمار کے پیچھے ہلکان ہوئے رہتے ہیں) ۔ تاہم باغی اکثر خود بھی ریاست کے علم اور اس کے افسانوں کا نشانہ بنے۔ جب بے کسوں نے طاقتوروں کے خلاف بغاوت کی تو انہوں نے بھی ایسا ان تصورات کی رہنمائی میں کیا کہ جو طاقتوروں کے تصورات کی عکاسی کرتے تھے اور انہوں نے سادہ لوحی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ فرض کر لیا کہ ایک شفیق حکمران کو اس کے لالچی مشیر گمراہ کر رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بات کر چکے ہیں سچائی کو ہمیشہ ریاستوں کے جواز کے مرکزی وسیلے یعنی اتھارٹی کیلئے اتھارٹی کی حیثیت حاصل رہی ہے۔شہنشاہیت حسب ونسب اور مذہبی منظوری میں جواز تلاش کیا کرتی تھیں۔ جمہوریتیں انہیں قانون فطرت میں ڈھونڈتی رہیں اور مطلق العنان حکومتوں نے بھی اپنی صداقتیں تخلیق کرنے کیلئے بہت جتن کئے خواہ یہ جتن نازیوں کی نسلی تطہیر کے ذریعے کئے گئے یا سٹالن کے لائسینکو ازم کے توسط۔ ہر ایک مثال میں ریاستوں نے اس چیز کی جستجو کی جسے ہم 'معرفتی اتصال' (cognitive coherence) کہہ سکتے ہیں ...... یہ ایک ایسی منطق ہے جو ان کی دنیا کی تاویل، ان کے اقتدار کے جواز اور ان کے افعال کی اچھائی کو ملاتی ہے۔

ریاست کا معرفتی اتصال اس معاشرے کے عقائد سے الگ ہی اوپر نہیں اٹھ آتا کہ جس پر یہ حکومت چلا رہی ہوتی ہے۔کسی گروہ میں مشترکہ عقائد کی تعداد جتنی زیادہ ہو گی تو اس گروہ کا اپنے ساتھ مکالمہ بھی اتنا ہی زیادہ رواں ہو گا (اور اس کی ریاکاریاں جس قدر زیادہ پیچ دار ہوں گی، کہے اور کیے میں فرق بھی اسی قدر زیادہ ہو گا) ۔ جو ریاست ایسے زمرے پیدا کر سکتی ہے کہ جن سے لوگ سوچ سکیں وہ زیادہ موثر طریقے سے کام کرے گی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

خود تخلیقی ریاست، دوسرے لفظوں میں، خود کو نہ صرف دنیا کو اپنی شبیہہ کے مطابق بنا کر محفوظ کرتی ہے بلکہ لوگوں کو اس طرح سے سوچنے پر مجبور کر کے بھی کہ جس سے اس کے اپنے تصور عالم کو تقویت پہنچے مثلاً اہل ثقلیہ کو خود کو اطالوی سمجھنے پر مجبور کر کے یا نوجوان مجرمین کو یہ سوچنے پر مجبور کر کے کہ وہ ایسے خطا کار ہیں کہ جنہیں بحالی کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں باب 8 میں اس پر مزید بات کروں گا کہ فرانس، روس اور حالیہ دور میں ایران میں ریاستوں کو گرانے والی تحریکیں عین اسی نوع کے معرفتی اتصال کے خلاف جدوجہد بھی تھیں ...... یعنی ان صداقتوں کا انکار کہ جن پر وہ ریاستیں استوار ہیں۔

اگر اس روشنی میں دیکھا جائے تو ریاستوں کا بیشتر رویہ مزید قابل فہم ہو جاتا ہے۔ مغربی سیاسی نظریہ ریاستوں کو چیزوں کے حصول کے آلات کے طور پر دیکھنے پر مائل رہا ہے۔ وہ مارکسی سرگزشت میں سرمایہ دار طبقے کی لونڈیاں بھی ہو سکتی ہیں اور یا پھر رابرٹ ڈال جیسے امریکی حریت پسندوں کی تحاریر میں کثرتی عوام کی باندیاں بھی، نمائندگی کا نظریہ ریاست کو ایسی ترسیلی میکا نیہ کے طور پر بیان کرتا ہے جو اعتقادات و خواہشات کو عملی اقدامات میں بدل دیتی ہے۔ لیکن یہ نظریات اس بات کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں کہ ادارے، خصوصاً ریاستیں کس درجے تک خود اپنی خدمت کرتے ہیں اور ان کا بنیادی مقصد کس درجے تک اپنی بقا و نمو ہوتا ہے (سسیرو کا قول ہے کہ اعلیٰ ترین قانون ریاست کی سلامتی ہے)۔ وہ ایسی سیدھی سادھی خادمائیں نہیں ہوتیں کہ جنہیں ہر احکامات، منشوروں اور استصواب رائے کے توسط سے ذمہ داری دی جائے۔ ان کا بنیادی دھندا ان کی اپنی سالمیت ہوتا ہے، جو علامتی بھی ہوتا ہے اور حقیقی بھی[10] اور جواز کی خاطر انہیں خود کو عمیق تر صداقتوں کا سرپرست ظاہر کرنا پڑتا ہے، خود کو تاریخی جڑوں کی حامل فطری اور مستقل ظاہر کرنا پڑتا ہے، خواہ وہ مصنوعی اور حالیہ ہی کیوں نہ ہوں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ریاستیں اخلاقی نہیں ہو سکتیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو بھلائی کرتی ہیں وہ بنیادی طور پر ان کے اس ماحول سے پیدا ہوتی ہے جو ان کی بقا کیلئے بھلائی کرنا ضروری بنا دیتا ہے۔ اتصال کی خواہش ریاستوں کو تحریک دیتی ہے کہ وہ اخلاقی ظاہر ہوں لیکن بذات خود وہ لا اخلاقی ہوتی ہیں۔ جمہوریتوں میں ریاستوں کو بقاء کیلئے عوام کی سیوا کرنا پڑتی ہے، اسی طرح مسابقانہ منڈی میں تجارتی اداروں کو بقاء کی خاطر گاہکوں کی

allurdupdfnovels.blogspot.com

سیوا کرنی پڑتی ہے۔ انتہائی ناہموار معاشروں میں ریاستوں کو امراء کی سیوا کرنی پڑتی ہے اور یا پھر انہی وجوہات کے پیش نظر انہیں کچلنا پڑتا ہے۔ یہ ریاستوں کے خصائل کو سمجھنے کی کلید ہے : ان کا یقین سیاق وسباق سے ہوتا ہے اور ریاستیں نہ تو خلقاً نیک ہوتی ہیں اور نہ ہی خلقاً بد۔

autopoiesis کی اصطلاح قدیم یونانی زبان سے اخذ کی گئی ہے جو اس عمل کو بیان کرتی ہے کہ جس کے ذریعے نظام خود کو متغیر خارجی ماحول کے ردعمل میں ڈھالتے ہیں۔ بجائے اس بات پر توجہ مرکوز کرنے کے کہ نظام افعال سے ردعمل کیسے ظاہر کرتے ہیں، 'autopoicsis' کے اصول دان اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ کسی نظام کی ساخت تبدیل کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ autopoietic خاصیت ہی ہے کہ جس نے ریاستوں کو معرفتی اتصال کی جستجو پر مجبور کیا ہے: ریاستوں کو خود کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسروں کو سمجھانے کی بھی ، اور تحریری لفظ تحریری پراپیگنڈہ اور تحریری ہدایات کی محکوم دنیا میں واضح تضادات کی توضیح کرنا اور اس سے بھی اہم، اپنے افعال کے جواز کے حامل منتظمین اور نمائندے فراہم کرنا بہت مشکل امر ہے۔

معرفتی اتصال ان سرکاری اہلکاروں، اتحادیوں اور عوام کے اعتماد کو تقویت دیتا ہے۔ جو کہ ہوسکتا ہے ریاستی مرکز سے بہت دور ہوں اور جن کا ریاست میں یقین کھو بیٹھنے کا احتمال ہو۔ ریاست کے بہت سے اور اکثر ناموافق اعضا کے افعال کی صف بندی مفید رہتی ہے۔

اس اتصال اور یکسانیت میں فرق ہے......حکومت کو بروئے کار لانے والے کسی بھی شخص کو کام کرنے کیلئے کم از کم مخالف صداقتوں کو بیک وقت اپنے ذہن میں رکھنے کے قابل ہونے کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ سچائی کا الٹ لازم نہیں کہ جھوٹ ہو۔ یہ کوئی دوسری سچائی بھی ہوسکتی ہے (مثلاً یہ بیانات کہ تمام لوگ برابر پیدا ہوتے ہیں اور 'تمام لوگ نابرابر پیدا ہوتے ہیں') معرفتی اتصال کا سادہ مطلب اس گاہے بے معنی دنیا کو بھی جہاں تک ممکن ہو سکے معنی دینا ہے۔

افسانے اور جواز

allurdupdfnovels.blogspot.com

ریاستوں کی ترویج سے بہت پہلے قدیمی رہنما خود اپنے ہاتھوں سے قتل و غارت اور شکار کرتے تھے اور واقعی اپنے پیروکاروں کی جنگلوں، صحراؤں اور چراگاہوں میں رہنمائی کرتے تھے اور اکثر وہ اپنی جسمانی طاقت کو اپنے اقتدار کے جواز کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

ریاستوں کی دنیا میں اکثر رہنما شاذ ہی ایسا کرتے ہیں۔ بعض رہنما اب بھی اپنے لوگوں کی واقعتاً رہنمائی کرتے ہیں جیسا کہ ماؤ نے لانگ مارچ کے وقت چینیوں کی تھی یا پھر جیسے 1643ء میں برطانیہ کے جارج دوم نے جنگ کے دوران اپنے سپاہیوں کی رہبری کی تھی۔ لیکن اکثر رہنماؤں کا اقتدار ان کے کردار کے مرہون منت ہوتا ہے نہ کہ ان کی جسمانی طاقت یا عسکری صلاحیت پر۔ زمانہ قدیم سے ہی بعض ایسے بادشاہ اور شہنشاہ بھی موجود رہے ہیں جو جنگ کے میدانوں سے کنی کتراتے رہے ہیں۔ مصر کے فرعون اور چینی شہنشاہ نے بھی خود کو تیروں اور نیزوں سے بچائے رکھا۔ وہ لڑتے نہیں تھے بس تقریریں کرتے تھے اور فرمان صادر کرتے تھے۔ ایزٹک باشندے اپنے بادشاہ کیلئے 'تلاطونی' کا لفظ استعمال کرتے تھے سہواتیل زبان میں جس کا مفہوم ہے 'عظیم اور قابل تعظیم مقرر'۔[13] اکثر رہنماؤں کی سرگرمیاں حقیقی زندگی اور اس کے خطرات سے ہمیشہ بالا رہی ہیں۔ وہ مذہبی رسومات کا افتتاح کرتے، اجلاسوں میں شریک ہوتے، تقریریں کرتے اور یا پھر احکامات و فرامین جاری کرتے نظر آتے ہیں۔ لفظوں پر تصرف کسی زیادہ مادی شے پر تصرف سے زیادہ اہم ہے۔ ان کی تمام تر کامیابیاں اور کارنامے دوسروں کے مرہون منت رہے ہیں۔ وہ تدریس، علاج، لڑائی، محافظت دوسروں سے کرواتے رہے ہیں۔ وہ بس دنگل کروانیوالوں میں سے تھے، اکھاڑے میں خون پسینہ بہانا اوروں کا کام تھا۔ ان کا کام بس یہ تھا کہ ورثے میں ملنے والی حکومت اور اپنے حصے میں آنے والے القابات کے استعمال سے دوسروں سے اپنا آپ اور اپنے احکامات منوائیں۔ جب سحر زائل ہوتا ہے تو وہ نرے بدھوؤں کی طرح بٹر بٹر ادھر ادھر تکتے دکھائی دیتے ہیں اور یقین مانیے کہ ایسے حکمران سے زیادہ قابل ترس چیز اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہوتی کہ جس کا اقتدار ختم ہو رہا ہو۔ وہ فضول اشارے کرتا رہ جاتا ہے لیکن سب اس کی سنی ان سنی کر کے آگے چل دیتے ہیں۔

جیمز میڈیسن کہتا ہے کہ 'تمام حکومتوں کا دارومدار رائے پر ہوتا ہے'۔ ریاستیں بلند و بالا

allurdupdfnovels.blogspot.com

عمارتوں، آئینوں اور فوجوں سے بڑی دکھائی پڑتی ہیں مگر ان کا سارے کا سارا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ آیا عوام ان پر اعتماد کرتے ہیں یا نہیں۔ ان کے مادی اور طبیعی وجود کا دارومدار بھی فقط اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کی نفسیاتی بنیادیں کس حد تک مضبوط ہیں۔ چنانچہ ہر ریاست کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے اقدامات کی حمایت کریں۔ وہ ان اقدامات کو معانی دینے کی کوشش کرتی ہے۔ صرف خوف اور دہشت پھیلانے سے کام نہیں چلتا۔ برطانوی وزیر اعظم ہرالڈ ولسن کے الفاظ ہیں :

'most politics is presentation and what isn't is timing.'

ریاستوں کے سربراہ اور عہدے دار اپنا استحقاق ثابت کئے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتے۔ یہ ایک عملی اور نفسیاتی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوئی ریاست خود کو جائز ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اسے اپنے اہداف حاصل کرنے کیلئے کم لاگت لگانا پڑتی ہے لیکن اگر یہ دوسروں کو قائل نہیں کر پاتی تو پھر اسے جبر، دھونس اور رشوت کا بہت سارا خرچہ اٹھانا پڑتا ہے اور اگر یہ خود کو بھی قائل کرنے سے عاجز آ جائے تو پھر یہ جلد ہی فنا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سارے کے سارے اقتدار کا دارومدار افسانوں پر بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ اس کے مادی کردار پر اور نتیجہ صریح یہ ہے کہ کوئی بھی لیڈر افسانے اور حقیقت کو خلط ملط کرنے کے جال میں بڑی آسانی سے آ سکتا ہے مثلاً بعض یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر وہ کوئی موزوں محاورہ یا روزمرہ تلاش کر لیں تو وہ اس کے پیچھے کارفرما حقیقی مسئلے کو بھی حل کر لیں گے۔[14]

روزمرہ زندگی اور ریاستی امور میں اقتدار کی عملداری کی ابتداء ایک دعوے کے طور پر ہوتی ہے۔ اقتدار لیا جاتا ہے۔ اقتدار کے استعمال کا فن یہ ہے کہ اس طرح ظاہر کیا جائے کہ جیسے دوسرے تابعداری اور تعمیل کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے زبردست قسم کے حاکم یہ ظاہر کر کے حکومت کرتے ہیں کہ جیسے کھیل پہلے ہی طے پا چکا ہے اور دوسرے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر پیروی کرتے چلے آئیں گے۔ اسی طرح بہترین قائد آغاز فیصلہ کن قسم کے جراتمندانہ اقدامات سے کرتے ہیں (اقدامات کا انداز فیصلہ کن نظر آ جانا چاہیے خواہ اندر کچھ ہو یا نہ ہو)۔ آپ اس طرح کی سب کارروائیوں کو اعتماد کی شعبدہ بازیاں کہہ سکتے ہیں۔ بعض اوقات ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں لیکن اگر وہ ساختی میلانات کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں تو انہیں ایسے افراد کی اتنی تعداد میسر آ ہی جاتی ہے کہ جن کی خوشی پیروی

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرنے میں ہی ہوتی ہے، جن کو یہ تشخص گوارا ہوتا ہے، یا پھر وہ محض جمود یا تخیل کی کمی کے باعث سر جھکائے دوسروں کے ساتھ چلتے چلے جاتے ہیں۔ میکیاولی جولیئس سیزر کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس کا کمال یہ تھا کہ اسے پتہ ہوتا تھا کہ حوصلے اور دھڑلے کے بل پر کس قدر اقتدار پر گرفت قائم کی جا سکتی ہے یعنی اسے یہ باور ہو چکا تھا کہ عوام کی آنکھوں میں اس قدر دھول جھونکی جا سکتی ہے انہیں وہ طوق بھی نظر آنا بند ہو جاتا ہے کہ جو وہ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے گلے میں لٹکا رہے ہوتے ہیں۔

تاہم لیڈر کا جواز صرف راستہ ہی نہیں، منزل بھی ہوتا ہے۔ لیڈروں یا ان کے پیرو کاروں کے محرکات کو سمجھنے کیلئے ابھی تک کوئی ٹھوس سائنس وجود میں نہیں آ سکی۔ لیڈروں کا خمیر ہی ایسا نہیں ہوتا کہ انہیں کسی تجربہ گاہ میں رکھ کر ان کی پرکھ پڑچول یا تجزیہ کیا جا سکے لیکن شواہد بتاتے ہیں کہ تعریف، پہچان اور قدر افزائی بھی اتنی اہم ہوتی ہے جتنی کہ حاکمیت اور خوف یا پھر اقتدار سے لطف اندوز ہونے کا عمل۔ میکیاولی کا کہنا ہے کہ شان وشوکت اور عزت و وقار کی خواہش ہی حکمرانوں کیلئے محرک کا کام کرتی ہے اور مادی آلات ان اہداف کے حصول کا محض ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کی دنیا کی عوامی پہچان کیلئے زور شور سے جاری و ساری مقابلے بازی، جو خود بھی قدیم روم کی مثال کو سامنے رکھ کر رواج دی گئی تھی طرح طرح کے ذرائع ابلاغ سے بھری جدید جمہوریتوں کی دنیا سے کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ سترھویں صدی کا عظیم عرب دانشور الیوسی لکھتا ہے کہ 'لوگ خوف یا لالچ کی وجہ سے بادشاہ کی خدمت گذاری کرتے ہیں اور جب خوف آتا ہے تو محبت فضول لگنے لگتی ہے، لیکنا لیوسی یہ بھی جانتا تھا کہ بیشتر فرامانروا صرف خوف پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ احترام اور محبت کے بھی خواہاں ہوتے ہیں۔

کوئی حکمران بھی نہیں چاہتا کہ وہ برہنہ دکھائی دے اور نہ ہی انہیں یہ سوچنا پسند ہے کہ ان کے پاس تن ڈھانپنے کو کچھ نہیں ہے۔ پیئر بورڈیو نے فرانسیسی حکمرانوں پر اپنی کلاسیکی تحقیق کے نتائج مرتب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'کوئی بھی حکومت محض حکومت کے طور پر قائم رہ کر مطمئن نہیں ہوتی، مطلب ہے کہ کسی جواز یا قانونی استحقاق سے قطعاً عاری ایک جابر قوت کے طور پر'۔ (15) 'بڑے عہدیدار'، اس کا کہنا ہے کہ 'صرف اپنی حیثیت اور حاکمیت کو ہی کافی خیال نہیں کرتے بلکہ انہیں اپنے کارناموں کی تعریف و توصیف اور احترام کا لوبھ

allurdupdfnovels.blogspot.com

بھی ہوتا ہے۔ اصل میں ہر لیڈر اور بیشتر صورتوں میں تمام ریاستی کارپردازوں کے ذہن میں اپنے بارے میں ایک شبیہ اور اپنے ورثے کے بارے میں ایک مثالی تصور موجود ہوتا ہے اور ان کا بیشتر انداز کار اس سے تعین پاتا ہے۔ اگر اس چیز کو سمجھ لیا جائے تو ہمیں ان کے اقدامات بھی سمجھ میں آنے لگتے ہیں جو کہ بصورت دیگر اس قدر ناقابل فہم دکھائی دے رہے ہوتے ہیں۔ یہ تصور انہیں اپنا رویہ اور طرز عمل تبدیل کرنے پر بھی مائل کر سکتا ہے۔

جواز کی بات صرف علامتوں تک ہی نہیں ہوتی۔1950ء کے عشرے میں فرانسیسی افسر شاہی کو عزت وقار اس لیے ملا تھا کہ ان کے طریقے کامیاب ثابت ہوئے اور اس لیے کہ عوام کو سیاستدانوں کی نیچ حرکتوں اور دھینگا مشتی کے مقابلے میں ان کی اہل اور باصلاحیت ٹیکنو کریسی بہت بہتر محسوس ہونے لگی تھی۔ اس سے بعد کے ادوار میں بھی حکومت پر اعتماد کے نمونوں کی وضاحت میں حقائق کو بھی اتنی ہی اہمیت حاصل رہی ہے جتنی کہ علامتوں کو۔ بیسویں صدی کے موخر برسوں میں اعتماد میں کمی کا الزام تعلیمی معیار میں اضافے اور اقدار میں نسل در نسل پیدا ہونے والی ان تبدیلیوں کے سر دیا جاتا رہا ہے کہ جنہوں نے انفرادیت کو ہوا دی ہے لیکن شواہد بتاتے ہیں کہ ان میں سے کسی امر نے بھی حکومتوں اور سرکاری اداروں پر اعتماد کی سطح میں تبدیلی کے معاملے میں فیصلہ کن کردار ادا نہیں کیا۔(16)

جہاں جہاں اعتماد میں کمی واقع ہوئی ہے وہاں عموماً بعض دیگر زیادہ فوری اسباب کارفرما نظر آتے ہیں مثلاً ناقص کارکردگی، اخلاقی نصب العین کا فقدان اور وضاحت اور غلطیوں کے اعتراف اور ان کی تطہیر کی صلاحیت کا نہ ہونا۔ اور پھر سکینڈے نیویا کی ریاستوں سے لے کر بعض مرکزی بینکوں اور پولیس کی تنظیموں تک پوری دنیا میں ایسے اداروں کی مثالیں بھی آپ کو نظر آئیں گی کہ جن پر اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے بیشتر کی صفت یہ رہی ہے کہ وہ اپنی بنیادی فرائض کی انجام دہی میں مستعد ثابت ہوئے ہیں، ان کی سرگرمیاں اور طریق کار شفاف رہا ہے اور وہ اپنے سرکاری اور اخلاقی مقاصد میں واضح رہے ہیں اور اس کے علاوہ یہ کہ اگر ان سے کوئی کوتاہی سرزد ہوئی تو انہوں نے معذرت کرنے میں بھی دیر نہیں کی اور انہوں نے عوام کے ساتھ مکالمہ استوار کرنے میں بھی بڑی اہلیت کا ثبوت دیا۔

امریکی فوج کا تجزیہ اس سلسلے میں بڑی اچھی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ 1975ء میں ویت نام جنگ کے خوفناک صدمے کے بعد صرف 20 فیصد نوجوان (عمر 18 تا

allurdupdfnovels.blogspot.com

29) ایسے تھے کہ جنہیں فوج کے بڑے کارپردازوں پر کوئی اعتماد تھا لیکن پچیس برس بعد صورت کیا بنی کہ عسکری کامیابیوں ، فعال رابطوں، امتیازات کی بیخ کنی کیلئے کئے گئے سخت اقدامات اور ایک واضح اور صاف اخلاقی نصب العین کے طفیل فوجی قیادت پر نوجوانوں کے اعتماد کی فیصد شرح 75 فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن لگتا ہے کہ امریکی فوجی قیادت نے جو اعتماد کمایا تھا وہ اخلاقی اعتبار سے گدلے اور غیر شفاف اس عراقی مشن پر آ کے پھر زائل ہو گیا جس کے دوران ساری دنیا کے لوگوں نے امریکی فوجیوں کو مشتبہ عراقیوں کو تشدد و شقاوت کا نشانہ بناتے دیکھا لیکن اس سارے عمل سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اعتماد بنایا جاتا ہے، دیا نہیں جاتا۔ (17)

ثبات کی جستجو

انسانی ذہن سیال روابط کی نسبت اشیاء اور زمروں کے ساتھ زیادہ آسانی سے کام کرتا ہے۔ چنانچہ ریاستوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی بجائے مناصب پر مشتمل اشیاء کی مانند زیادہ دکھائی دیں۔ فی الواقع کوئی ریاست جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہو گی، لوگوں اور مناصب کے درمیان فاصلہ بھی اتنا ہی زیادہ ہو گا کیونکہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں لیکن منصب پائیدار ہوتے ہیں۔ بہت سے معاشروں میں اقتدار حکمرانوں پر کسی ایسی خلعت یا منڈیٹ کی مانند نازل ہوتا ہے کہ جو کہیں اور سے آتا محسوس ہوتا ہے اور بیشتر اوقات تو یوں دکھتا ہے کہ جیسے یہ انسانوں کی دنیا سے ماورا کسی جگہ سے ان پر اترا ہے۔ اس نسبت سے خالص مثال تبت کے دلائی لاموں اور پنچھوں کی ہے جن میں بچپن سے ہی مافوق الفطرت نشانیاں اور طاقتیں شناخت کر لی جاتی ہیں۔ ایوانز پرچیارڈ ہمیں افیقی نکانگوں کے اس عقیدے کے متعلق بتاتا ہے جس کے مطابق دنیوی بادشاہ اقتدار کی روح سے متصف ہوتا ہے اور جب بادشاہ مرتا ہے تو یہ روح واپس اپنی جسمانی شکل میں چلی جاتی ہے اور اسے نئے بادشاہ کو شکست دینے کیلئے ایک فوج کو ساتھ لے کر آنا پڑتا ہے۔ ایوانز نے اسے 'بادشاہ بادشاہت کے قبضے میں آ جاتا ہے'، کے تصور کی ڈرمائی تشکیل قرار دیا ہے۔

زائرے کی شابہ قوم میں اقتدار کے بارے میں سوچنے کیلئے ایک بہت مختلف استعارہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

استعمال کیا جاتا ہے۔ اس قوم کے افراد ایک پرانی کہاوت کا حوالہ دیتے ہیں جس کے مطابق 'اقتدار پورے کا پورا کھایا جاتا ہے'۔ اقتدار ایک ایسی چیز ہے جو اچھی بھی ہے اور صحت مند بھی، جو سرداری کے عہدے کے کھائے جانے کے بعد سردار کی کایا کلپ کر دیتی ہے۔ لوبا قوم کے لیڈر جیسن سینڈو کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس نے 1960ء میں زائرے کی آزادی کے دنوں میں اپنی ایک تقریر ایسے شروع کی تھی کہ 'چونکہ میں نے اپنا اقتدار کھا لیا'۔ اقتدار کے بارے میں یہ خیال نہیں کیا جاتا تھا کہ اس پر قبضہ جمایا جاتا ہے یا اسے مسلط کیا جاتا ہے بلکہ یہ سوچا جاتا تھا کہ یہ کوئی نگلے جانیوالی چیز ہے۔ ایک ایسی ملک ہے کہ جو نگلنے والے کے پیٹ میں جا کر اس کی ہو جاتی ہے۔ (18)

ان مثالوں میں ہمیں عہدے کا تصور کسی بھی فرد سے بڑا نظر آتا ہے۔ یہ عارضی نہیں، پائیدار ہوتا ہے اور شکوہ وحکمت اور پراسراریت سے متصف ہوتا ہے۔ اس تصور کے بعض بچے کھچے اجزاء ہمیں جمہورتیوں کی افتتاحیہ رسوم میں بھی نظر آتے ہیں۔ امریکی اور فرانسیسی صدروں کے عہدہ سنبھالنے اور نومنتخب برطانوی وزیراعظم کی شاہی توثیق کی رسوم کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ منصب کے بُعد کو مزید بڑھا دیتی ہیں جس سے اس کا پھیکا پن اور منصبی پن کم لگنے لگتا ہے۔ سب لیڈر عہدہ سنبھالنے کے بعد بڑے لگنے لگتے ہیں خواہ ان کی یہ تبدیلی لوگوں کو آسانی سے نظر نہ بھی آ رہی ہو، مرد یا عورت کو بنانیوالی چیز عہدہ ہوتا ہے۔ ڈی جوونل کے بقول لیڈر محسوس کرتا ہے کہ 'اس کا جسم تک پہلے سے بڑا ہوا گیا ہے......حکومت پہاڑ کی چوٹی کی مانند ہوتی ہے۔ وہاں جو ہوا سانس کے ساتھ اندر جاتی ہے اس کی باس ہی اور ہوتی ہے اور جو منظر وہاں سے دکھائی دیتے ہیں وہ ان مناظر سے بہت مختلف ہوتے ہیں جو کہ وادی اطاعت سے نظر آتے ہیں۔ (19)

عہدوں سے وابستہ پراسراریت جدید معاشرے میں اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ اس معاشرے میں زیادہ براہ راست طاقت استعمال کرنے والے افراد یعنی وہ افراد کہ جو اجنبیوں کو گرفتار کرتے ہیں اور انہیں پاگل خانوں میں بھیجتے ہیں، کبھی بھی مخروط مراتب کی پھننگ پر نظر نہیں آتے۔ عموماً وہ متوسط یا نچلے مرتبے کے افراد ہوتے ہیں جو تفویض کردہ اختیارات کو بروئے کار لا رہے ہوتے ہیں۔ اوپر والے حتیٰ کہ قانون ساز بھی زیادہ وقت کم رسمی قسم کے اقتدار کو بروئے کار لا رہے ہوتے ہیں جس کا انحصار اثر و رسوخ،

allurdupdfnovels.blogspot.com

مردم شماری میں ہیرا پھیری اور لوگوں کی سوچ کو موڑنے پر ہوتا ہے اور مزے کی بات ہے کہ کسی عہدے کا مرتبہ جتنا بلند ہوگا، وہ اتنا ہی زیادہ غیر محفوظ ہوگا اور اس میں بے ثباتی کا عنصر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

بیشتر اوقات نومنتخب رہنماؤں کو عہدوں کے گرد پھیلا کروفر اور پراسراریت قابل اعتراض لگتی ہے۔ انہیں لگتا ہے کہ یہ حکمرانی کی ابدی صفات کی نمائندگی نہیں بلکہ پرانے نظام کے نفس پرستانہ واہموں کی نمائندگی کر رہی ہے اور بہت سے افراد چین کے ہان سلسلے کے بانی گاؤزو کے نقش قدم پر چلنے کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ وہ ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوا اور تربیت حاصل کر کے پولیس آفیسر بن گیا۔ اسے لمبی چوڑی درباری رسمیں پر اسراف اور احمقانہ محسوس ہوتی تھیں جنہیں اس نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ختم کروا دیا۔ لیکن اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کا دربار مدہوشی اور بدنظمی میں ڈوب گیا ہے اور یہ کہ یہ رسوم ہی تو تھیں جو اس کے دربار کا نظم ونسق برقرار رکھتی تھیں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ اسے محسوس ہوا کہ لوگ اسے وہ عزت و احترام نہیں دے رہے جس کا کہ وہ مستحق ہے۔ چنانچہ کیا ہوا کہ ان رسوم کو شہنشاہ کے منصب جلیلہ سے وابستہ تمامتر طمطراق کے ساتھ بحال کر دیا گیا۔ رسوم میں کچھ تھا یا نہیں لیکن انہیں ان کے اثمار کو پیش نظر رکھ کر بحال کیا گیا تھا اور اس اقدام نے 2000 سالہ شان وشکوہ اور عظمت وسطوت کے در کھول دیے۔

تمام ریاستیں کسی نہ کسی صورت میں رسوم کو بروئے کار لاتی ہے اور انتہا اس کی یہ ہوتی ہے کہ وہ رسوم جو بظاہر وسیلہ لگتی ہیں خود منزل کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کلفرڈ گیرٹز انیسویں صدی کے بالی کو ایک ایسی 'تھیٹر ریاست' قرار دیتا ہے جہاں 'حکومت کروفر کے کام آتی تھی نہ کہ کروفر حکومت کے'۔[20] اور اس زمین نے ایسے زمانے بھی دیکھے ہیں جب مصری فرعونوں، وینس کے فرمانرواؤں اور چین کے شہنشاہوں کو بھی یہی محسوس ہونے لگا کہ ہم رسم و تماشے کی کسی بہت طویل و عریض مشین کے غلام بن گئے ہیں۔ لیکن رسوم کی بھرمار کا ایک مثبت پہلو بھی ہے خصوصاً ان معاشروں میں جہاں جمہوریت کی کمی ہوتی ہے۔ احکامات براہ راست اور زبانی دیے جاتے ہیں جن سے سرتابی کے امکان کو شہہ ملتی ہے لیکن اس کے برعکس رسوم زبانی نہیں ہوتیں چنانچہ ان کے متضادات نہیں ہوتے۔ وہ ہمدردی اور احساس اور دوسروں کے ساتھ مل کر چیزیں تجربہ کرنے کا وصف پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ بعض

allurdupdfnovels.blogspot.com

اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ حکمران قانون و مذاکرات کی بجائے رسوم کے ذریعے امن و ہم آہنگی پیدا کرتے اور بغاوت کی بیخ کنی کرتے ہیں۔(21)

جدید ریاست میں بصری حکایات ۔مناصب کی حکایات جو اس طرح سے پیش کی جاتی ہیں کہ پائیدار لگیں اور جوازوں کی حکایات۔ بھی کچھ اس طرح کے کردار ادا کرتی ہیں۔ لیڈروں کے ویڈیو کلپ اور ٹی وی پر چلنے والے ان کے مختصر خاکے ناظرین کے لاشعور میں سرایت کر کے لیڈر کو حب الوطنی کے گہرے جذبوں، کنبے کی فکر مندی اور ہمدردی سے منسوب کر دیتے ہیں۔

حکومت کے تمام عہدوں کا انحصار حکایات پر کس حد تک ہوتا ہے، نہ صرف اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ لیڈر اس قدر اکثر اپنے خدمتی فرائض سے کیوں بھٹک جاتے ہیں بلکہ اس چیز کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے کہ ان کی اتنی بڑی تعداد بے وجہ کے خوف کا شکار کیوں ہو جاتی ہے۔ ان کا روز مرہ کا تجربہ انہیں قوانین کی منظوری، فوجوں کو جنگ پر جانے کے احکام یا سزائے موت کی توثیق یا اس میں تخفیف کے ان کے حقیقی اختیار کی یاد دھانی کراتا ہے لیکن اس اختیار کا انحصار مادی حقیقت کی بجائے تناظرات پر زیادہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ امریکی یا فرانسیسی صدر بھی اپنے حقیقی اختیار کے لئے کانگریس یا قومی اسمبلی کی حمایت کا محتاج ہوتا ہے اور اس حمایت کی عدم دستیابی کی صورت میں غالب امکان اس امر کا ہوتا ہے کہ وہ عضو معطل بن کر رہ جائے گا۔ پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم اپنی پارٹیوں اور مخلوط حکومت کی صورت میں دوسری پارٹیوں کے سرتا پا محتاج ہوتے ہیں۔ سب کو علم ہوتا ہے کہ جواز کی مشروط اور غیر مادی نوعیت تشکیک کو چیزوں کی قدرتی شکل میں بدل دیتی ہے۔ کسی بھی لیڈر کیلئے یقینی چیز صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ دوسرے لوگ انتظار میں بیٹھے ہیں کہ انہیں موقع ملے اور وہ حکومت میں آ کر ثابت کریں کہ وہ ریاست کو بہتر طور پر چلا سکتے ہیں۔ ہر بادشاہ کو قاتلوں سے خوف رہا ہے، بھائی یا چچا زاد بھائی سے خطرہ رہا ہے کہ وہ اس کی کرسی غصب کرے گا اور امراء اور سرداروں سے یہ ڈر رہا ہے کہ وہ بغاوت کر دیں گے۔ ایک مورخ انتہائی مستحکم اور پائیدار قرار دیئے جانیوالی بازنطینی سلطنت کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

”395ء تا 1453ء جو 107 فرمانروا تخت نشین ہوئے، ان میں سے صرف 34 کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

انتقال بستر پر ہوا اور 9 جنگ یا حادثے میں مارے گئے، بقیہ کو یا تو مانے نہ مانے تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور یا پھر وہ زہر، مثلے، گل گھوٹو یا پھانسی کی پر تشدد موت مرے۔ (22)

اس کے انتباہ میں بھی یہی نکتہ مضمر ہے کہ طاقتور ترین کو کمزور ترین سے بھی محتاط ہو کر رہنا چاہیے اور پوری تاریخ انسانی میں جا بجا ایسے لمحات نظر آتے ہیں کہ جب تعمیل و اطاعت کی روش پر چلتے چلتے لوگوں نے اچانک اپنا رخ موڑ لیا اور اعتماد کرنے اور اعتماد کرتے ظاہر ہونے کی ڈگر ترک کر دی۔ یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جب فوجی جلوس پر گولی چلانے سے انکار کر دیتے ہیں اور وہ اپنی توپوں کی نالیوں میں گھسائے گئے پھول قبول کر لیتے ہیں (جیسا کہ 1975ء میں نزبن میں اس وقت ہوا تھا جب کیتانو کی فاشسٹ حکومت بالآخر اپنے انجام کو پہنچی تھی) اور یا پھر 1989ء کا وہ لمحہ جب نکولائی چاؤشسکو نے بخارسٹ میں واقع مرکزی مجلس کی عمارت کی بالکونی میں کھڑے تقریر کرتے ہوئے یہ محسوس کیا تھا کہ یہ مجمع اب اس کی تقریر کے اتار چڑھاؤ پر واہ واہ کرنے کیلئے جمع نہیں ہوا بلکہ اس کے خون کیلئے غرا رہا ہے۔ یہ سب بادشاہ سلامت کے نئے کپڑوں کی کہانی کی مختلف شکلیں ہیں۔ پاسکل لکھتا ہے کہ 'بادشاہوں کے اقتدار کی بنیادیں لوگوں کی عقل اور حماقت پر استوار ہوتی ہیں مگر خصوصاً ان کی حماقت پر۔ دنیا کی عظیم ترین اور اہم ترین چیز کمزوری کی بنیاد پر کھڑی کی جاتی ہے، لیکن ہوتا کیا ہے کہ بعض دفعہ یہ حماقت دھند کی طرح چھٹ جاتی ہے اور لوگوں کو یکا یک سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔

ہر منتخب لیڈر کو اس لمحے کا خوف ہوتا ہے کہ جب ووٹروں کا اس پر سے اعتماد جاتا رہتا ہے اور یا پھر اس سے بدتر لمحے کا کہ جب وہ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لمحوں میں ان کے اقتدار کی (اور بطور فاتح ان کے کردار کی) حکایت کھلنے لگتی ہے اور سارا سحر ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک مرتبہ جب ان کی کمزوری منظر عام پر آ جائے اور لوگوں کو پتہ چل جائے کہ شکاری ان کے پیچھے لگے ہیں تو پھر ان کے لئے فاتح کے ہالے کو دوبارہ سے وضع کرنا شاذ ہی ممکن رہتا ہے۔ اسی وجہ سے جب کسی لیڈر کو انتخابات میں پھر سے حصہ لینے پر پابندی کا سامنا ہوتا ہے یا جب ایسے انتخابات قریب ہوتے ہیں جس میں اس کے ہارنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کا اقتدار بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے اور جو شے بڑی ٹھوس اور مستحکم لگ رہی ہوتی ہے، ریت کی طرح فضا میں بکھر جاتی ہے۔ اقتدار کا یہ مشروط کردار اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

امر کی وضاحت کرتا ہے کہ حکمران اپنے اقتدار پر متاثر کن حکائیتوں اور علامتوں کے ذریعے زیادہ استحکام اور پائیداری کا لبادہ چڑھانے کیلئے تگ و دو کیوں کرتے ہیں۔ ایمیل ڈرخائم کا کہنا ہے کہ 'اجتماعی احساس کسی مادی شے پر نصب ہو کر ہی خود سے آگاہ ہوسکتا ہے'......اب یہ شے حاکم کا جسم بھی ہوسکتا ہے، کوئی عمارت، جگہ یا پتھر بھی ہوسکتا ہے اور صلیب بھی۔ چنانچہ ریاست، جو کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک غیر مرئی شے ہے کو نظر آنے سے قبل تجسیم دینا پڑتی ہے، چاہے جانے سے قبل علامتیں دینا پڑتی ہیں اور اسے سمجھنے سے قبل تصور کرنا پڑتا ہے'۔ (23)

جب شارلز نہم 1563ء میں تیرہ برس کی عمر میں فرانس کے تخت پر بیٹھا تو اس کی ماں کیتھرین ڈی میڈیچی نے اسے نصیحت کی کہ اپنے ملک کے طول و عرض میں دورہ کرے اور رعایا کو نئے بادشاہ کی شان و شوکت اور رعب و دبدبے سے مرعوب کرنے کیلئے دو سال کے عرصے میں ایک سو شہروں اور قصبوں میں جائے۔ اسی طرح کا رواج جاوا اور ہندوستان میں بھی رہا ہے جہاں نئے بادشاہ ہاتھیوں، گھوڑوں اور رتھوں کے بڑے بڑے کاروانوں کی معیت میں اپنی مملکتوں کا دورہ کیا کرتے تھے، بالکل ان جانوروں کی مانند جو اپنے علاقے کی حد بندی کیلئے گشت کر رہے ہوتے ہیں۔ آج کے دور کا امریکی صدر بھی ہزار ہزار افراد کے قافلے کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس کا مقصد بھی لوگوں پر رعب ڈالنا اور تاثر بنانا ہوتا ہے، فائدہ خواہ اس کا کوئی ہو یا نہ ہو۔

ماسکو کا سرخ چوک، بیجنگ کا تیانامن چوک اور چینی اور روسی سلطنتوں کے جغرافیائی مراکز میں پھیلے بڑے بڑے میدان بھی اپنی وسعت کے ذریعے ہمیں اسی طرح کی کہانی سناتے ہیں۔ ہٹلر کے محل میں بھی، کہ جو جنگ عظیم دوم چھڑنے سے ذرا قبل تعمیر کیا گیا تھا، بڑے بڑے خالی قطعات رکھے گئے تھے جنہیں اس کے دفتر میں پہنچنے سے قبل عبور کرنا پڑتا تھا۔ (24)

لینن، ماؤ اور ہوچی منہ کے مقبرے ایسی حکومتوں کی اس سے بھی زیادہ عمدہ مثالیں ہیں جو موت اور فنا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی اور اپنے دوام کا اعلان کرتی نظر آتی ہیں۔ انگلستان کے ہنری سوم نے دو سال کے شاہی محصولات ویسٹ منسٹر ایبی کی تعمیر و مرمت میں جھونک دیے تھے۔ حکمرانوں کو ہم موروں سے بھی شبیہ دے سکتے ہیں۔ جس طرح

allurdupdfnovels.blogspot.com

مور اپنی قوت باہ کا مظاہرہ کرنے کیلئے اپنے پر بڑھائے چلے جاتا ہے اور وہ اس کے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں پرانے ادوار کے بادشاہ بھی عالی شان محلات بنواتے بنواتے بڑے بڑے قرضوں کے نیچے دب جاتے تھے۔ آرزو ان کی بس یہ ہوتی تھی کہ دوسرے دیکھ کر کہیں کہ اگر وہ اتنی فضول خرچی کرسکتا ہے تو لازماً وہ بہت زیادہ طاقتور ہوگا۔

اس سے جو فن تعمیر منتج ہوتا ہے اس کا مطلب ہوتا ہے کہ بغاوت کو نفسیاتی نیز عملی اعتبار سے مشکل تر بنا دیا جائے۔ حکومت خود کو انسانی پیمانوں سے ماورا کر کے پیش کرتی ہے تاکہ دیکھنے والا سوچے کہ اس کی مزاحمت کرنا عام فانی انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اہرام لے لیں، عبادت گاہوں کی بات کر لیں اور یا پھر فتح کی محرابوں کی، ان سب کا مقصد حکومت کو زیادہ پائیدار اور مستحکم اور فوق البشری بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ فن تعمیر میں نصب العین یہ ہوتا تھا کہ ایسے شہر بنائے جائیں کہ جو مروجہ سیاسی نظام کے مکمل طور پر آئینہ دار ہوں اور اس طرح اسے دوام دیں۔ قدیم روم، قرون وسطیٰ کا بیجنگ، لکشر اور لاہور، استعماری دور کا نیا دہلی اور جدید برازیلیہ سب حکومت کی مختلف وژن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس منطق کی انتہائی صورتوں میں حکومت مکمل طور پر غیر ہو جاتی ہے اور انسانوں کی دنیا سے ماورا ایک خطرناک قوت کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس زمین کو جہاں پر جاپانی شہنشاہ کا سایہ پڑتا تھا، بہت خطرناک تصور کیا جاتا تھا او وہ جن برتنوں میں کھانا کھاتا تھا انہیں توڑ دیا جاتا تھا۔ کسی کو بھی اجازت نہیں تھی کہ وہ شہنشاہ کے چہرے کی طرف دیکھے۔ اسی سبب ایک دفعہ سپین کے بادشاہ نے ایک ایسے گھوڑے پر سواری کی تھی جس پر کوئی بھی شخص سواری نہ کرسکتا تھا۔ فرعون کو یا اس کی پوشاک کو مس کرنے سے سخت قسم کا خدشہ لاحق ہو جاتا تھا اور اس سلسلے میں خاص قسم کی رسومات کو پیش نظر رکھنا پڑتا تھا اور بیزنطین میں یہ کہنا کہ بادشاہ نے کھانے، سونے یا دھونے جیسا کوئی انسانی کام کیا ہے، ایک بڑا جرم خیال کیا جاتا تھا۔

حکمران اپنی تکریم میں مزید اضافہ کرنے کیلئے ماضی سے ملنے والے ورثے سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ مشہور ہے کہ نپولین نے خود کی شہنشاہ کے طور پر تاجپوشی کرتے ہوئے تصویر بنوائی (اگرچہ اس نے یہ بات بھی بڑے واضح انداز سے بتا دی تھی کہ اس کے دل میں ان روایات کیلئے کہ جن سے وہ استفادہ کرتا ہے کس قدر کم تعظیم ہے۔ 'میں نے کسی طور بھی تخت غصب نہیں کیا'، وہ کہا کرتا تھا 'میں نے اسے گٹر سے نکالا ہے') ذہین لیڈر سابقہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

حکومتوں سے جو کچھ بھی ممکن ہو لینے میں بہت طاق ہوتے ہیں۔ وہ اپنا رعب و دبدبہ قائم کرنے کیلئے مستعد علامتیں اور رسمیں بروئے کار لانے سے بھی نہیں چوکتے۔ سٹالن خود کو آئیوان دا ٹیریبل اور پیٹرا اعظم بنا کر پیش کیا کرتا تھا۔ کاسترو نے انیسویں صدی کے لاطینی امریکہ کے ایک کلاسیکی مرد آہن کی بعض صفات اختیار کر رکھی تھیں۔ ماؤ نے شعوری طور پر واٹر مارجن کے باغی ہیروؤں کے اوصاف اپنائے، پھر جنگجو شاعر چکو لیانگ کے طور طریقے اختیار کیے اور اقتدار میں آنے کے بعد خود کو پہلے چن شہنشاہ کے جانشین کے طور پر پیش کیا۔ مسولینی نے قوم سے رومۃ الکبریٰ کے احیاء کا وعدہ کیا، فرانکو نے یسوع بادشاہ کیلئے قرون وسطیٰ کی صلیبی جنگیں دہرانے کے عزم کا اظہار کیا، صدام حسین خود کو 637ء میں ایرانیوں کو شکست دینے والے عرب جرنیل سعد ابن ابی وقاصؓ اور بعد میں صلاح الدین ایوبی سے ملاتا رہا اور شام کے حافظ الاسد نے عرب خلافت کی طرف مراجعت کا عہد کیا تھا۔ طالبان قائدین نے 1996ء میں افغانستان میں اپنے جہاد کا آغاز قندھار کی ایک مسجد کی چھت سے حضور نبی کریم ا سے منسوب ایک عبا کو لہرا کر کیا تھا۔

جدید سامراجی حاکم بھی مفتوحہ علاقوں سے ملنے والے حکومت و اطاعت کے روایتی تصورات کو کام لاتے رہے۔ وہ خود کو سرداروں کے طور پر پیش کرتے رہے اور انہوں نے ہندوستان اور ملایا میں بے اختیار سرداروں اور سلطانوں کو تسلسل کی نشانی کے طور پر برقرار رکھا۔ اس کے بعد کیا ہوا کہ سامراجیت کے خلاف جو تحریکیں اٹھیں انہوں نے جواباً انہی غاصوں کی اقدار اختیار کر لیں ...... مثلاً روشن خیالی، آزادی اور جمہوریت کی اقدار ...... اور انہوں نے ان اقدار کو انہی لوگوں کو نکال باہر کرنے کیلئے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جو کہ یہ اقدار لے کر آئے تھے۔ اس سلسلے میں ایلن ہیوم جیسے ان استعماری محرفین کا کردار بھی اہم رہا جنہوں نے ان تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی۔ یاد رہے کہ ہیوم ایک سکاٹ تھا اور وہ ہندوستان کی کانگریس پارٹی کے بانیوں میں تھا۔

سرکاری زبان بھی حکومت کو مستحکم کرنے اور انحراف کو ناممکن بنانے میں مدد دے سکتی ہے۔ خواندگی کے پھیلاؤ کے ساتھ اس کی اہمیت میں خاص طور پر بہت اضافہ ہوا۔ تاریخ دان فرانسوا فورے کے بقول فرانسیسی انقلاب اپنے ساتھ ایک ایسی دنیا لے کر آیا، 'جس میں حکومت کی ذہنی نمائندگیاں افعال کی حاکم تھیں'۔ 1930ء کے عشرے کے سوویت یونین

allurdupdfnovels.blogspot.com

اور1960ء کے عشرے کے چین کے بارے میں بھی بہت حد تک یہی بات کہی جا سکتی ہے جس میں ریاستی اور جماعتی بڑے عہدیداروں میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو لفظوں اور علامتوں کے مقام اور مفہوم کو مسلسل بدلتے رہنے کے ماہر تھے اور ان میں ایک ایسا عالمی تناظر بھی شامل تھا جس میں عقیدہ یہ تھا کہ اگر فقط نظریاتی نمائندگیوں کو تکمیل دے دی جائے تو دنیا کسی نہ کسی طور خود ہی ان کے ساتھ مطابقت اختیار کر لے گی۔

سلطنت برطانیہ اس قدر واضح طور پر نظریاتی نہ تھی لیکن اسے متحد کیے رکھنے میں نظریات کا بھی اتنا ہی حصہ تھا جتنا کہ توپوں کا۔ سوویت سلطنت کی طرح یہ بھی ایک مادی اور عسکری بنیاد کی مرہون منت تھی لیکن اگر لاکھوں افراد خود کر سرکاری عقائد سے مشخص کر کے معانی پر یقین کرنے اور انہیں دریافت کرنے کے خواہاں نہ ہوتے تو یہ چل نہ پاتی۔ ان سامراجی نظریات کی بہت سی چیزیں امریکہ کے مدنی مذہب آئین کو ایک مقدس صحیفے کا درجہ دینا، پرچم کے سامنے کھڑے ہو کر سلام کرنا) اور انیسویں صدی کے یورپ کے ان قومی مدنی مذاہب سے ملتی جلتی تھیں جنہوں نے رسوم و تقریبات، پریڈوں اور عظیم ہیروؤں کے توسط سے مذاہب کی نقالی کرنے کی بڑی کوشش کی۔ ان مدنی مذاہب کی طرح اہل برطانیہ سے مضبوط اخلاقی دعاوی سے تقویت حاصل کی۔ ان بہت سے کار پردازوں اور فوجیوں کو کہ جو اس سلطنت کو قائم رکھے ہوئے تھے واقعی اس بات کا یقین تھا کہ وہ ان معاشروں میں تحفظ، بہبود، انصاف اور صداقت مہیا کر رہے ہیں جن میں کہ یہ اجناس نہیں ہیں۔ اسی طرح سوویت سلطنت کے بہت سے رہنما اور سپاہی بھی ان ترقی پسندانہ مساویانہ اور عقلی آدرشوں پر بڑے جوش و خروش سے یقین رکھتے تھے جن کی کہ انہیں حمایت کرنا پڑتی تھی۔ دونوں گروہوں کو تاریخی ارتقاء کی اس ناگز یریت پر یقین تھا کہ جس میں ان کی ریاست ایک بڑے کھلاڑی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ جزا اور سزا کے خوف کی مدد سے اطاعت کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ تاہم کسی بھی مخروط مراتب کو کارگر ہونے کیلئے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ اسے داخل میں لے جایا جائے اور یہ تحت الشعور کا جزو بن جائے (اور جو چیز ایک عادت اور ضرورت کے طور پر آغاز لیتی ہے وقت گزرنے کیساتھ عقلی و منطقی انتخاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے)۔[25]

دوام کی خواہش اس چیز کی صورت گری کرتی ہے کہ حکمران اپنے اقتدار کو کس طرح

allurdupdfnovels.blogspot.com

استعمال کرتے ہیں۔ اکثر وہ اسے ذخیرہ کرنے لگتے ہیں۔ انہیں اس کے کھو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، چنانچہ ان میں اس سے چمٹے رہنے اور حقیقی و خیالی مخالفین کی مزاحمت کا میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اقتدار کو جائیداد کے طور پر لیتے ہیں، ایک ایسی چیز کے طور پر کہ جسے ذخیرہ کیا جائے، جمع کیا جائے اور پھر اس پر سانپ بن کر بیٹھا جائے۔ بعض لیڈروں میں اس چیز کا جواز پیش کرنے کی لامتناہی صلاحیت ہوتی ہے کہ ان کا اقتدار میں رہنا کس قدر ضروری ہے اور عموماً ان میں اس بات کی دلیلیں دینے کی بھی بے انت صلاحیت ہوتی ہے کہ ان کے ذاتی مفاد میں ہی ساری قوم اور ان کی پارٹی کا مفاد ہے۔

اس کے اسباب کا کسی حد تک تعلق عادت اور تخیل کی کمی سے ہے لیکن اس کی ایک وجہ یہ خوف بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اقتدار گیا تو وہ باقی سب کچھ بھی چلا جائے گا کہ جو ان کیلئے اہم ہے۔ ماضی میں (اور بعض خطوں میں اب بھی) اقتدار چھوڑنے کا مطلب اپنی زندگی کو نئے آنے والے حکمرانوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے مترادف خیال کیا جاتا ہے جو کسی بھی لمحے آپ کو مقدموں میں پھنسا سکتے ہیں بلکہ غائب بھی کرا سکتے ہیں۔ چلی کے فوجی آمر جنرل پنوشے نے اقتدار جمہوری طور پر منتخب شدہ حکومت کے حوالے کیا تھا جس نے اقتدار میں آ کر ان مختلف آئینی شقوں کو ختم کرنا شروع کر دیا جو کہ جنرل موصوف نے مستقبل میں خود کو سزاؤں سے بچانے کیلئے ملکی دستور مین شامل کی تھیں۔ موروثی بادشاہت میں بھی کمزوری کی علامات سے بڑی بے دردی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض مغل فرمانرواؤں کو ان کے بے صبرے بیٹوں نے معزول کیا اور سترہویں صدی کے چین میں ملکہ وو نے اپنے چالیس سالہ اقتدار کو محفوظ رکھنے کیلئے اپنی کوکھ جنے کئی بچوں کو موت کی نیند سلایا۔ حتیٰ کہ اس سے بہت زیادہ باقاعدہ اور پر نظم جمہوری معاشروں میں بھی آپ جب ایک مرتبہ کرسی سے نیچے اتر جاتے ہیں تو آپ کا اپنے ورثے، شہرت اور نیک نامی پر اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے کردار کی سندیں عموماً دوسرے تحریر کرتے ہیں اور اقتدار کے وقت تو اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا تھا، اب گھٹا کر پیش کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار سمر سیٹ مام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کرسی چھوڑنے کے بعد وزیر اعظم بس ایک شاندار مقرر رہ جاتا ہے اور فوج کے بغیر جنرل کی حیثیت قصبے کے ایک مسکین سے ہیرو سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ (26)

اگرچہ مخالفانہ تبصرے دونوں صورتوں میں ممکن ہوتے ہیں خواہ آپ اقتدار میں ہوں یا نہیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

لیکن کرسی کی وجہ سے جو عزت و احترام، رعب و دبدبہ اور شان و شوکت میسر آتی ہے وہ برے سے برے تبصرے کی بھی تعدیل کر دیتی ہے۔

یہ معاملات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ کرسی پر بیٹھے کسی شخص کیلئے منتقلی اقتدار مشکل ترین کام کیوں ہوتا ہے اور وہ اپنی خدمتی ذمہ داریاں ٹھیک طور پر کیوں نبھا نہیں پاتا۔ موروثی جانشینی بادشاہوں اور سلطنتوں کی امنگوں اور خوفوں پر حاوی رہی ہے اور اس کی وجہ سے بیگمات اور بھائی ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے ہیں۔ سنگاپور کے لی کوان یو کی مثال قدرے مختلف ہے جو 2000ء کے عشرے میں اپنے (بہت لائق) فرزند کو بھی قیادت کے درجے تک لے آیا اور اس نے خود کو بھی ایک اعزازی لیڈر کے طور پر برقرار رکھا۔ انگلستان کے ہنری ہشتم کے پورے عہد کے اتار چڑھاؤ اور ایک نئے چرچ یعنی چرچ آف انگلینڈ کی ایجاد کے پیچھے صرف اس بادشاہ کی اپنا جانشین پیدا کرنے کی احتیاج کارفرما تھی۔ جنگ میں گرفتار ہونے والے مایا حکمرانوں کو مارنے سے پہلے طویل عرصے تک زندہ رکھا جاتا تھا تاکہ کہیں ان کے جانشین اقتدار نہ سنبھال لیں۔ یہ تکنیک لغو محسوس ہوتی ہے لیکن دشمن کو غیر مستحکم کرنے کیلئے یہ ایک بہت موثر تکنیک تھی۔ جمہوری طور پر اقتدار میں آئے ہوئے لیڈروں کے لئے بہترین بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیچھے کوئی ایسا جانشین چھوڑ کر جائیں جو انہیں ذلیل نہ کرے اور بعد میں عوام کے سامنے ان کے ورثے کی قدر افزائی کرے لیکن سب جمہوری لیڈروں کو یہ بھی پتہ ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر ان کے دشمنوں نے اقتدار میں آنا ہے اور آ کر ان کی مٹی پلید کرنے کی پوری کوشش کرنی ہے۔ بڑے لیڈروں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے کام ان کے مخالفین کے اقتدار میں آنے کے بعد بھی چلتے رہتے ہیں۔

چنانچہ بلا وجہ خوف (پیرانویہ) ایک فطری امر ہے بالکل ایسے ہی کہ جیسے اقتدار سے چمٹے رہنے اور اسے ذخیرہ کرنے کی کوشش کرنا ایک فطری بات ہے۔ تاہم اقتدار کوئی ایسی چیز نہیں جسے آسانی سے ذخیرہ کیا جا سکے۔ اقتدار کوئی جنس، سٹاک یا سرمایہ نہیں ہوتا۔ اس کا وجود روابط اور استعمال کے توسط ہوتا ہے۔ اسے ذخیرہ کرنا کمزوری کی نشانی ہوتی ہے۔

لیڈر اپنی بہت سی تدابیر میں دکھاوے کو بھی خاص طور پر پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ جو عارضی اور غیر مادی ہے، وہ مادی اور پائیدار دکھائی دے۔ لیکن وہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

اپنے اقتدار کو سہارا دینے کیلئے اس سے الٹ ایک حکمت عملی بھی استعمال کر سکتے ہیں۔وہ یہ کہ وہ معمولی چیزوں کو بڑی پراسرار نادر اور مقدس بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایلیاس کانیٹی لکھتا ہے کہ برسراقتدار شخص کو دوسرے کسی شخص کی نسبت زیادہ کم گو ہونا چاہیے، اس کے خیالات اور ارادوں کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔[27] میڈیا سلطنت کے بانی ڈیوسیز وہ قدیم ترین مثال ہے کہ جس نے پردہ داری کو حکمت عملی کے طور پر اپنایا۔ ڈیوسیز جو کہ پہلے ہی ایک بڑے عادل قاضی کے طور پر مشہور ہو چکا تھا، نے 701ق م میں بادشاہ کا عہدہ سنبھالنے کی ہامی صرف اس صورت میں بھری تھی کہ اس کی یہ سخت شرائط پوری کرنے کا عہد کیا جائے۔ شرائط یہ کہ ایکباتانہ کے مقام پر اس کیلئے ایک بہت بڑا محل تعمیر کیا جائے، اس سے بات صرف قاصدوں کے ذریعے کی جائے اور دربار کے کسی شخص کو بھی اجازت نہ دی جائے کہ وہ اس سے ہفتے میں ایک بار سے زائد ملنے کی کوشش کرے۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ اس سے ڈیوسیز کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو کسی اور نوع کا باشندہ دکھائی دے، ڈیوسیز کی اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا 53 سالہ دور اقتدار لوگوں کو تعظیم وتکریم سے شروع ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے پرستش کی شکل اختیار کر لی۔

طاقتور گروہ دکھاوے کا کام اکثر دوسروں کو تفویض کر دیتے ہیں تاکہ ان کا اقتدار اور عزت دونوں محفوظ رہیں۔ جاپان کے وگن شہنشاہوں کی معیت میں سرکاری طور پر مختار ریاست اور مشیروں کے طور پر حکومت کرتے تھے مگر حقیقت میں سارے فیصلے وہی کرتے تھے۔ جنگ کے بعد کے دنوں میں جاپان کی حکمران لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کے مختلف سیاسی دھڑوں کے قائدین بھی وزرائے اعظم کو اس طرح استعمال کرتے رہے۔ جدید آمریتی ریاستوں میں بانی فرمانرواؤں کے بیٹوں کو علامت کے طور پر مسند پر بٹھا دیا جاتا ہے جبکہ پیچھے سے ڈور اور لوگ ہلا رہے ہوتے ہیں۔ شام کے بشار الاسد اور شمالی کوریا کے کم جونگ ال کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں جنہیں حکمران ٹولوں کی پتلیاں خیال کیا جاتا ہے۔حجاب کے اپنے فائدے ہیں۔ اس سے ریاستوں کو سامنے سے آنے والے حملے کا مقابلہ کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ ایک مرتکز ومجتمع فوج کی بجائے ایک طویل جال کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔حجاب سے عوام کو وہ چیزیں دیکھنے سے بھی باز رکھا جا سکتا ہے جنہیں کہ لیڈروں کو خوف ہوتا ہے وہ سمجھ نہیں پائیں گے یا جن کی وہ حمائت نہیں کریں گے۔ بسمارک کہتا ہے کہ 'لوگوں

allurdupdfnovels.blogspot.com

کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ ان کے قانون کس طرح بنتے ہیں'۔

اب جبکہ لوگ ذرائع ابلاغ کے توسط سے اس قابل ہو گئے ہیں کہ پردے کے پیچھے جھانک سکیں اور انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے لیڈر کا عیاری و فریب پر کس حد تک انحصار ہے، وہ پہلے والی دبدبے والی اور عزت والی بات نہیں رہی ہے۔ جمہوری عمل سے منتخب شدہ لیڈروں کو مانوسیت سے پیدا ہونے والی نفرت کے درمیان بڑا نازک توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ ان میں سے بیشتر ایک حد تک اپنے ذاتی سحر کی بدولت کرسی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہوتے ہیں، ان کیلئے عموماً یہ تصور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ زیادہ دکھاوے سے بھی انہیں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

جدید جمہوریتوں میں اقتدار اور ذمہ داری، کم از کم اصولی اعتبار سے، واضح ہوتے ہیں۔ ایک خط تحکم جو عوام سے نکلتا ہے اور منتخب لیڈروں سے گزرتا ہوا سرکاری اہلکاروں اور اداروں تک چلا جاتا ہے۔ یہاں اس اسکیمو باشندے کی کہانی بڑی کارآمد محسوس ہوتی ہے کہ جو اوٹاوہ میں کنیڈین حکومت سے ملنے آیا تھا (یہ کہانی کسی بھی جدید حکومت کے متعلق بتائی جا سکتی ہے) لیکن ہوا کیا کہ تین روز تک وہ مختلف اجلاسوں میں ان اہلکاروں کے ساتھ بیٹھتا رہا کہ جو حکومت کے نمائندے ہونے کے دعویدار تھے۔ یہ اجلاس اراضی، تعلیم، تجارت اور قرضہ جات کے امور نمٹانے کیلئے منعقد کیے گئے تھے۔ لیکن کسی بھی موقع پر اس اسکیمو باشندے کی حکومت سے ملاقات نہ ہوسکی۔ بالآخر اس نے تھک ہار کر بدمزگی اور مایوسی کے عالم میں اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ حکومت تو ہر طرف موجود تھی لیکن کیا تھا کہ وہ حجاب میں تھی۔

لگتا ہے کہ استناد کے حیلے عوام کو قائل کرنے کیلئے اختراع کیے جاتے ہیں کہ ریاست اور اس کے حکمران ٹھیک ہیں۔ لیکن حکومتوں کی اصل زندگی ظاہر کرتی ہے کہ چیزیں اس قدر سادہ نہیں۔ اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ جدوجہد داخلی طور پر خود ریاست اور اس کے اپنے ذاتی اعتماد پر لگائی جاتی ہے۔ ہنہ ارینڈٹ نے لکھا ہے کہ 'ہمیں معلوم سب سے زیادہ آمرانہ تسلط یعنی آقا کی اپنے غلاموں پر حاکمیت، جن کی تعداد ہمیشہ اس سے زیادہ ہوتی ہے، بھی برتر جبری ذرائع پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ وہ بھی حکومت کی برتر تنظیم کاری یعنی آقاؤں کی منظم یکجہتی کی مرہون منت ہوتی ہے'۔(28) بعد میں وہ مزید لکھتی ہے کہ:

> اقتدار کبھی بھی کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہوتا، اس کا تعلق ایک گروہ سے ہوتا

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہے اور یہ اس وقت تک قائم رہتا ہے کہ جب تک گروہ متحد رہتا ہے۔ جب ہم کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اقتدار میں ہے تو حقیقت میں ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ لوگوں کی ایک خاص تعداد نے اسے اپنے نام پر حکومت کا اختیار دیا ہے۔ جونہی وہ گروہ کہ جس سے اقتدار جنم لیتا ہے، منتشر ہوتا ہے تو اس شخص کا اقتدار بھی ختم ہو جاتا ہے۔[29]

گروہ کو متحد رکھنے کیلیے مستقل توجہ درکار ہوتی ہے۔ عوامی رہنماؤں کی ڈائریاں پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ بڑے لوگوں کے ساتھ ضیافتوں، عشائیوں، تقریبوں اور اجلاسوں سے بھری ہوتی ہیں جس میں کبھی کبھار عوام کے ساتھ سوال و جواب کے سیشن بھی آ جاتے ہیں۔ ان کا زیادہ وقت نہ تو احکامات جاری کرنے میں گزرتا ہے اور نہ ہی ان لوگوں کے ساتھ مصروفیات میں کہ جن کی وہ ظاہراً خدمت کر رہے ہوتے ہیں بلکہ یہ ریاست کے مرکز اور نواح میں تعلقات اور روابط کو مضبوط کرنے پر صرف ہوتا ہے۔[30]

اطاعت اور شناخت :

ریاست کے فراہم کردہ زمرے لوگوں کو بے شمار پہلے سے موجود اور نئے حالات کا جواب دینے کے طریقے سمجھاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو قوانین کی شکل میں ہوتے ہیں، بعض اصولوں کی شکل میں اور بعض روایات کی شکل میں۔ اگرچہ ریاست کا انحصار جزوی طور پر ان علامتی تجریدات پر ہوتا ہے جن سے یہ اپنا جواز پیدا کرتی ہے، یہ تجریدت ان ہزاروں دفتروں، تھانوں، کلاس روموں جہاں کہ ریاستی کاروبار انجام پاتا ہے، میں اس کے روزمرہ افعال میں حقیقی شکل اختیار کر لیتی ہیں مثلاً سڑکوں پر نصب علامات اور شاہراہوں پر کشیدہ نشانات یا شہریوں کے طرز عمل کو منضبط کرنے والے شہری قوانین کی صورت میں۔ اس چیز کے تعین کیلیے بہت پختہ معیارات ارتقاء پا چکے ہیں کہ ہمیں کسی پولیس والے، استاد یا قاضی سے کس طرح پیش آنا ہے۔ ان صورتوں میں آزاد شہری تجریدی اخلاقی اصولوں کا اطلاق کرتے ہوئے بے لاگ استدلال کے توسط سے ریاستی اقتدار پر بہت کم غور کرتے ہیں اور اسے شاذ ہی مسترد کرتے ہیں۔ بلکہ اسے ان روزمرہ حالات میں بار بار بنایا جاتا ہے

allurdupdfnovels.blogspot.com

جن میں لوگ تفویض کردہ منصب اختیار کرتے ہیں، انہیں سر انجام دیتے ہیں اور بعض اوقات انہیں چیلنج کرتے ہیں ......مثلاً ریاست کے حقیقی وتیروں کے خلاف اس کی اپنی بیان کردہ اخلاقیات کو پکارتے ہوئے۔ اکثر اوقات پرورش اور عادت کے طفیل لوگوں کے عقائد اور طرزعمل آپ ہی آپ ریاست کے تقاضوں کے ساتھ مطابقت میں آ جاتے ہیں۔ دیگر اوقات میں جمود ہی کافی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سابق سوویت بلاک میں لاکھوں افراد پر امن زندگی کی خاطر جعلی انتخابات میں پرچیاں ڈالتے تھے، جعلی جلوسوں کے ساتھ سڑکوں پر نکلتے تھے اور اپنی کھڑکیوں سے جعلی پرچم لہراتے تھے اور لاکھوں ایسے بھی تھے جو چھوٹے موٹے انعامات کی خاطر اپنے پڑوسیوں کی مخبری کرتے تھے۔ بغاوت کرنے کے خطرات بہت زیادہ تھے اور اس کے فائدے بہت مبہم اور مشکوک۔

بعض اوقات یہ زمرے کام نہیں بھی کرتے اور جب ایسا ہوتا ہے تو لوگ بے چینی محسوس کرتے ہیں اور انہیں غصہ چڑھ جاتا ہے۔2005ء میں امریکی ریاست نیو اور لینز میں آنے والا سیلاب اس کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ یہ ایسا موقع تھا جب امریکہ کی وفاقی حکومت اپنا سر پرست، محافظ اور نجات دہندہ کا متوقع کردار ادا کرنے میں ناکام ہوگئی تھی۔ اس سے ہزاروں بے گھر افراد بہت ہی مختلف قسم کا ردعمل ظاہر کرنے پر مجبور ہوئے۔ کچھ نے ممنون متاثرین کے طور پر ردعمل ظاہر کیا، کچھ نے امدادی ہیلی کاپٹروں پر گولیاں چلاتے مشتعل شہری گوریلوں کے طور پر، کچھ نے ٹی وی کیمروں کے سامنے خوفزدہ مظاہرین کے طور پر اور کچھ نے متاثرین کے مال و اسباب پر ہاتھ صاف کرتے لٹیروں کے طور پر۔

لوگ ابتدائے عمر میں ہی حکومت سے معاملہ کرنے کیلئے مختلف قسم کے ردعمل سیکھ لیتے ہیں۔ پیئر بورڈیو بیان کرتا ہے کہ شمالی افریقہ کے قبائل میں عورتوں سے کس طرح توقع کی جاتی ہے کہ وہ شرم وحیا کے اطوار اختیار کریں گی اور اپنا سر زمین کی طرف جھکا کر چلیں گی۔ اس کے برعکس مرد سیدھا کھڑے ہوتے ہیں اور انکا سر اوپر کو اٹھا ہوتا ہے۔ ایوانز پچیا سوڈان کے لوئیر قبیلے کے ان باشندوں کے بارے میں بتاتا ہے کہ جو زمین پر آقاؤں کی مانند اکڑ کڑ کر چلتے ہیں جو کہ وہ دراصل خود کو سمجھتے بھی ہیں (کیونکہ) ان کے سماج میں نہ تو کوئی مالک ہے اور نہ ہی کوئی نوکر۔[31] معاشرتی مینار کی پھننگ پر بیٹھے افراد یعنی بالائی

allurdupdfnovels.blogspot.com

طبقے کے لوگوں کیلئے جسمانی وضع اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر آپ از منہ وسطی کی تصاویر ملاحظہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں بادشاہ بڑے نپے تلے انداز میں آپ کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کے چہرے سے نگہداشت اور سختی کا ملا جلا تاثر جھلک رہا ہوتا ہے۔ بہت سے معاشروں میں درباریوں کو رکوع اور کورنش کر کے خود کو پست کرنا پڑتا تھا۔ برطانوی پارلیمان کے ریاستی افتتاح کے موقع پر لارڈ چانسلر کو روایت کے مطابق بادشاہ کے آگے آگے پچھلے پاؤں چلنا پڑتا ہے۔ ابتدائی دور کے جمہوری قائدین اپنی جسمانی وضع بڑے مجمعوں کو پیش نظر رکھ کر اختیار کرتے تھے۔ عوام سے تقریر کرتے وقت ان کی کمر راست، تھوڑی اونچی اور بازو وا ہوتے تھے اور ان کی نگاہیں افق سے ذرا اوپر کسی نقطے پر مرکوز ہوتی تھیں (یعنی ایک تابناک مستقبل کی طرف جسے وہ دوسروں سے بہتر طور پر دیکھ سکتے تھے)۔ بعد میں جمہوری لیڈر بہت مختلف قسم کی بدنی وضع اختیار کرنے لگے جس میں خاص طور پر گھریلو تصرف کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ اس میں مانوسیت، اپنے پن لیکن تحکم کا رنگ جھلکتا نظر آتا تھا۔ آرتھر ملر انہیں ٹی وی کے دور کے دانستہ بے رس سوانگ قرار دیتا ہے جن میں دور خطابت کا کردار اور ڈرامہ مفقود ہوتا ہے، ایسے سوانگ جنہیں دیکھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا لیڈر ہماری بیٹھک میں ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہے۔

بیشتر شہری ابتدائے عمر سے وہ خاموش احترام سیکھ لیتے ہیں جو افسروں، استادوں اور پولیس والوں کے سامنے کام آتا ہے۔ ہمارا اندر یہ جانتا ہوتا ہے کہ ہمیں کون گزند پہنچا سکتا ہے، ہم پر حکم کون چلا سکتا ہے اور ہماری نگرانی کون کر سکتا ہے اور بعد میں یہ بھی کہ جواباً ہم کسے گزند پہنچا سکتے ہیں، کس پر حکم چلا سکتے ہیں اور کس کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ ہم بہت چھوٹی عمر میں یہ سب دیکھ دیکھ کر، سن سن کر اور نقالی کر کے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات بڑے واضح الفاظ میں بھی بچوں کو بتاتے ہیں کہ انہیں تحکم کا سامنا کیسے کرنا ہے۔ لارڈ چیسٹر فیلڈ اپنے بیٹے کو ان لطیف حربوں کی بابت کہ جنہیں وہ بروئے کار لا سکتا ہے، لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''بادشاہ سے بات کرتے وقت تمہیں ایسے ہی پرسکون اور پروقار ہونا چاہیے کہ جیسے تم اپنے نوکر سے بات کر رہے ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمہاری ایک ایک نگاہ، ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرکات وسکنات سے احترام ہی احترام جھلکنا چاہیے ...... طریقہ یہ ہے کہ اگر

allurdupdfnovels.blogspot.com

ممکن ہوتو گفتگو کا رخ کسی نہ کسی طرح خوشامد کی طرف لے آیا جائے مثلاً کسی دوسرے شخص میں موجود ایسے خصائل کی تعریف کرکے کہ جن کے بارے میں بادشاہ سمجھتا ہو کہ وہ بہت اچھا ہے یا کم ازکم دوسرے اس کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہوں۔

بڑے ہو کر تعظیم کی یہ صلاحیت بڑے فائدے پہنچا سکتی ہے۔ برٹولٹ بریخت 1947ء میں غیر امریکی سرگرمیوں پر تشکیل دی گئی ہاؤس کمیٹی کے ساتھ معاملات میں یہ تعظیمی رویہ دکھانے میں بہت بدنام ہوا تھا۔ وہ ان پر تمکن امریکی رفقائے کار کہ جن کے ساتھ وہ ہالی وڈ میں کام کرتا رہا تھا، کے بالکل برعکس ان کے سامنے مناسب ادب واحترام اور انکساری دکھانے میں کامیاب رہا۔ اس کے جوابات مبہم تھے مگر ان میں اکڑ نہیں تھی، لہٰذا اسے چھوڑ دیا گیا بلکہ امیگریشن افسروں سے کسی قسم کی مشکل پیش آنے پر اسے مدد کی پیشکش بھی کی گئی ۔ نابرابری کی جنگ لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اپنے غرور کو اس منطق کے آڑے کیوں آنے دیا جائے؟

لیکن تعظیم کہانی کا صرف ایک جزو ہے۔ لوگ ریاستوں کی خدمت کیوں کرتے ہیں اور دوسرے ریاستوں کے توسط سے قوم کی خدمت کیوں کرتے ہیں، اسے سمجھنے کی کلید تشخص ہے۔ لوگ اپنے بڑوں، جانوروں اور افسانوی ہیروؤں سے شناخت کے توسط سے اپنا اخلاقی تخیل پروان چڑھاتے ہیں اور اپنی خودی کے احساس کا تعین کرتے ہیں یعنی کب اپنا آپ منوانا ہے، کب سمجھوتہ کرنا ہے اور کب فرمانبرداری کرنی ہے۔ کسی بھی معاشرے میں زندگی گزارنے کے لئے ان سب مہارتوں کی ضرورت پڑتی ہے لیکن حقیقی معانی میں ملت کیساتھ رابطہ استوار کرنے کیلیئے خود کو دوسروں کی جگہ پر رکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے یا یہ کہ ہمارے خاندان یا قبیلے کے افراد نے ماضی میں کیا محسوس کیا۔ ماضی کی کارگزاریوں پر درد، شرم یا فخر محسوس کرنے سے ہی گروہ متحد ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ کرسکیں تو ہمیں اپنے سے بڑی کسی چیز کا جزو بننے میں بھی تحفظ مل جاتا ہے۔ بعد کی زندگی میں یہی شناخت اس بات کا تعین کرتی ہے کہ ہم کیا ہیں۔ ہم کون سے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارا پیشہ کیا ہے، ہمارا مذہب کیا ہے، ہم کون سی قوم میں رہتے ہیں نیز یہ اس بات کا تعین بھی کرتی ہے کہ ہم کیا نہیں ہیں۔

تشخص کی مشترکہ چھتری تلے دوسروں کی سیوا کرنا ایک فطری امر ہے۔ اکثر گروہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

باہمی خدمت کی رسومات کے ذریعے متحد ہوئے رہتے ہیں اور قومی شناختوں پر مبنی ریاستوں کیلئے اپنے لوگوں سے خدمت کا تقاضہ کرنا آسان ہوتا ہے۔ اس سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ چھتری سے باہر کھڑے شخص کا خدمت یا تعاون پر کوئی دعویٰ نہیں ہوتا۔ ابتداء میں انہیں مشکوک خیال کیا جاتا ہے اور وہ بڑی آسانی سے دشمنوں میں بدل جاتے ہیں۔ وہی عوام جو ہمارے لئے دوسروں کے ساتھ جڑنا آسان بناتے ہیں ہمارے لئے خود کو غیروں سے ممیّز کرنا بھی آسان بنا دیتے ہیں۔

جب شناختیں شکل دھارتی ہیں تو وہ جلد ہی اخلاقی اور عملی حدوں کا تعین بھی کرنے لگتی ہیں۔ کلوڈ لیوی سٹراؤس نے اس حدود کو بڑے عریاں انداز سے بیان کیا ہے:

> نوع انسانی قبیلے، لسانی گروہ، حتیٰ کہ بعض دفعہ کسی گاؤں کی حدود پر آ کر رک جاتی ہے اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بڑی تعداد میں نام نہاد قدیمی لوگ خود کو ایک نام دیتے ہیں جس کا مطلب ہے 'آدمی' (یا بعض اوقات، اچھے، ممتاز یا کامل) جو یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے قبیلے، گروہ یا گاؤں ان کی اچھی صفات، حتیٰ کہ فطرت انسانی میں حصے دار نہیں ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ بروں، برائی، بندروں یا جوؤں کے انڈوں پر مشتمل ہیں۔ بعض اوقات تو غیروں کو حقیقت میں پیر رکھنے کا یہ آخری موقع بھی نہیں دیا جاتا اور انہیں بھوت پریت قرار دے دیا جاتا ہے۔(33)

اس قسم کے تشخص کا منبع کیا ہے جو کہ اس قدر آسانی سے اتنے بہیمانہ افعال کو جواز مہیا کر دیتا ہے جن میں ریاستوں کے ارتکاب کردہ بدترین جرائم بھی شامل ہیں؟ رومانوی دور کے عروج کے دنوں میں جرمن شاعر یوہان گوٹفریڈ ہیرڈر نے قومی یکجہتی کو ایک قسم کی نرگسیت کے طور پر بیان کیا تھا جس کی وجہ سے اپنے سائنسدانوں، کھلاڑیوں، عورتوں اور فنکاروں کی اس قدر تعریف کرتے ہیں، ان کی عظمت سے مسرور ہوتے ہیں اور ایک ایسی پسندیدگی میں شریک ہو جاتے ہیں کہ جو کسی بھی اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرتی۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ شناختیں زمین سے پروان چڑھتی ہیں، وہ فطری ہوتی ہیں اور ان کی جڑیں تاریخ کے لینڈ سکیپ میں ہوتی ہیں مگر شناختوں کا قریب سے معائنہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ شناختیں ہمارے اندر سے نہیں نکلتیں اور نہ ہی وہ اس انتظار میں ہوتی ہیں کہ کوئی

allurdupdfnovels.blogspot.com

آئے اور انہیں چن لے۔ وہ فطری نہیں بلکہ سماجی ہوتی ہیں۔ گفتگو، مشاہدے اور سوچ سے بنتی ہیں اور عمل اور ردعمل سے وجود میں آتی ہیں جن میں اکثر ریاستوں اور امراء کے شعوری اعمال بھی ہوتے ہیں۔ غیروں کو 'جوؤں کے انڈے' اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انہیں ایسا کہنا بعض لوگوں کیلئے فائدہ مند ہوتا ہے۔ یہ انسانی معاشروں کا ایک بہت قبیح پہلو ہے کہ افراد کی نسبتاً ہلکی پھلکی ترجیحات یا ناپسندیدگیاں گروہوں میں بڑی بڑی نفرتوں اور ناچاقیوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ گروہ صرف افراد کا اجتماع ہی نہیں ہوتے، وہ ان کے خواص بھی بدل دیتے ہیں۔(34)

یہ بات قومی شناختوں کی تاریخ میں بہت جلد ظاہر ہو جاتی ہے۔ جدید دور کی آمد تک ریاستیں تشخص پر کوئی دعوے داری نہیں کرتی تھیں۔ لوگ ٹیکس ادا کر دینے اور جنگ کے وقت خدمات سرانجام دینے کو ہی کافی خیال کرتے تھے۔ بلا شبہ محبّ وطن اشوری، رومن اور چینی بھی تھے لیکن جدید دور کی آمد سے قبل اکثر افراد کیلئے تشخص بہت مقامی اور کسی گاؤں یا قبیلے سے خاص ہوتا تھا۔ عظیم کثیر القومی سلطنتیں عام طور پر اختلاف اور کثرت کے معاملے میں تحمل و رواداری سے کام لیتی تھیں اور ہر گروہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی تھیں کہ وہ خود ہی اپنے معاملات چلائے، مثلاً تیسری صدی کا روم سلطنت کے اندر بسنے والے تمام آزاد افراد کو شہریت کے حقوق دیتا تھا اور ایک مورخ کے مطابق 'مصر میں رومن ناظمین یا ہندوستان میں برطانوی حکام اپنے تمام تر تعصّبات اور اپنی حکومتوں کی وبائی بدعنوانیوں کے باوجود کسی مقامی سلطان یا بادشاہ کے مقابلے میں غالباً زیادہ منصفانہ انداز میں حکومت چلاتے تھے...... بلکہ سچ پوچھیں تو آج کل کی مقامی اکثریتوں سے زیادہ منصفانہ انداز سے'۔(35)

تشخص نے ریاستوں کیلئے اہمیت صرف اس وقت اختیار کی جب قومی ریاستوں کو جنگوں کیلئے پوری کی پوری آبادی کی لام بندی کرنا پڑی۔ بڑی فوجوں کو کومٹ منٹ بھی بڑے پیمانے پر درکار تھی اور پھر انہیں معاوضہ ادا کرنے کیلئے اتنے ہی زیادہ ٹیکس لگانے کی ضرورت بھی تھی۔ چنانچہ انیسویں اور بیسوی صدی میں عوام اور ریاستوں کے درمیان جذباتی اعتبار سے ایک بہت زیادہ کٹھن اور اخلاقی اعتبار سے بہت زیادہ خطرناک سودا طے پا گیا یعنی عوام کو تشخص، محبت اور خدمت کے صلے میں ریاست کی طرف سے تحفظ اور بہبود ملے گی۔ سودا یہ ہوا کہ قوم اور ریاست کا تشخص خاندان اور اپنے لوگوں کے کھوئے ہوئے انس

allurdupdfnovels.blogspot.com

کی جگہ لے گا اور ان کی باہمی کومٹ منٹ کے بندھنوں کو معاشرے کے بحیثیت مجموعی تعلق کی شکل دے گا۔

ریاستوں نے قوم کو زیادہ بامعنی بنا کر اپنے لئے سند حاصل کر لی اور خود کو زیادہ فطری بنا لیا۔ بعض نے پہلے سے موجود قومی تشخصات سے فائدہ اٹھایا (برطانیہ اور ہندوستان کے بشمول بہت سے لوگوں نے وہی نام اختیار کر لیا جو کہ انہیں غیر ملکی حملہ آوروں کی طرف سے ملا تھا)۔[36] لیکن اسی تواتر سے ریاستوں نے ثقافتوں، زبانوں، حتیٰ کہ جینوں کی صورت گری کر کے انہیں زیادہ متحد بنایا۔ دستیاب مواد سے متصورہ گروہ، بلکہ اگر زیادہ درست الفاظ استعمال کیے جائیں تو تصوراتی گروہ وجود میں آ گئے جن کی بڑے شہروں میں عموماً دانشوروں نے قیادت کی اور بعد میں انہیں لازمی تعلیم اور عوامی ذرائع ابلاغ سے تقویت دی گئی۔

اسی طرح داستانوی سے داستانوی ریاست بھی اور نہیں تو جزوی طور پر حقیقی بن گئی مثلاً جب لازمی ابتدائی تعلیم ملک کی بڑی زبان میں دے کر لسانی کثرت کو کم کیا گیا یا جب واضح تر سماجی ولسانی حدود نے علاقائی حدود سے مطابقت اختیار کی جہاں کہ پہلے وہ دھندلی چلی آتی تھیں۔ جس طرح فرانس نے اپنے شہریوں کو فرانسیسی بنایا، اسی طرح اطالیہ نے بھی اپنے شہریوں کو اتنا ہی اطالوی بنایا جتنا کہ شہریوں نے اپنے ملک کو اطالیہ بنایا۔ حالیہ دور میں ملیشیا نے اپنے قومی کردار کی تعریف زبان، مذہب اور بادشاہت کے تین ستونوں کے ذریعے کی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ چینیوں اور دوسری اقلیتوں کو باہر کرنا چاہتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ خود کو اپنے پڑوسیوں سے ممیّز کرنا چاہتا ہے۔ کروشیا کے 1990ء کے دستور نے اس قوم کو کروشی عوام کی ہزار سالہ خواب کا حاصل قرار دیا (اس میں سربوں کی اس کثیر تعداد کو بڑے آرام سے نظر انداز کر دیا گیا جو اب بھی اس کی سرحدوں کے اندر آباد تھے) اور اسرائیل ہمیشہ سے ہی یہودیوں کی ریاست رہی ہے اتنے عربوں کی نہیں کہ جو صدیوں سے وہاں رہتے چلے آئے ہیں۔ ان میں سے ہر صورت میں حکمرانوں کو امید تھی کہ اصلیت ان کے دعوؤں سے بہت جلد آ ملے گی۔[37]

اس کے باوجود تجریدی تشخص سے ہمیشہ ریاستوں کے خدمت کے فرائض میں کسی اخلاقی anchoring سے جدا ہونے کے خطرات ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے ابتدائی مراحل میں یہ خطرات

allurdupdfnovels.blogspot.com

شدید ترین ہوتے ہیں جب نئی نئی حرکت میں آئی عوامی توانائیوں کا رخ جپسیوں اور یہودیوں جیسی اقلیتوں کی طرف پھیرا جا سکتا ہے۔ منحرفین، ناموزوں افراد اور اقلیتوں کو صرف کج رؤوں کے زمرے میں ہی نہیں بلکہ ریاست اور عوام کے دشمنوں کے زمرے میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ ان بدنصیبوں کو ناخالص، گھناؤنے اور نیم انسانوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مثلاً روانڈا میں ٹٹسیوں کو لال بیگ کہا گیا۔ جیسے کہ جرمنی میں یہودی کیڑے مکوڑے کہلائے اور ہندوستان میں نچلی ذات کے ہندوؤں کو چوہے کہا گیا۔

یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ نسل کشی کے بہت سے بدترین واقعات کا ارتکاب ابھرتی ہوئی جمہوریتوں میں ہوا۔ یہ ریاست کی ناکامی یا انارکی کا نتیجہ نہیں تھے۔ ایسے بہت سے قتل عام بہت زیادہ منظّم ریاستوں نے کروائے اور بہت زیادہ معاشرتی قاتلوں نے انہیں سرانجام دیا۔ ایسے واقعات میں عموماً بہت زیادہ حرکت پذیری، شدید سیاست اور فعال سول تنظیمیں ملوث ہوتی ہیں (سول سوسائٹی ظلم وشقاوت کی مکمل صلاحیت کی حامل ہوتی ہے)۔

تشخص کا حد سے زیادہ احساس حکمرانوں کے دماغ میں فوجی مہم جوئیوں کا خمار بھی پیدا کر سکتا ہے (جیسا کہ افریقہ و یونان میں مسولینی کی بدنصیب مہم جوئیوں کی صورت میں سامنے آیا ہے) یا پھر ثقافتی جنگوں کی تند آکسیجن بھی ان کے سر چڑھ سکتی ہے (جیسا کہ ترکی نے ایک آزاد کردی ثقافت کو کچلنے کے لیے کیا) بہت سی کوششیں بڑھ جائیں تو اس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ضرور ہوتا ہے۔ جب2005ء میں صدر شراک نے فرانس کے بعض شہری علاقوں میں مسلم نوجوانوں کے بلووں کے ردعمل میں یہ کہا تھا کہ 'ہم سب اس جمہوریہ کے بچے ہیں' تو انہیں محسوس ہوا ہوگا کہ یہ حل نہیں بلکہ مسئلہ زیادہ ہے۔ اس کا یہ اعلان اس ریاست کی عین مطابقت میں تھا جس نے نہ صرف یہ کہ انہیں گندے مندے مکانوں میں گندی مندی زندگیاں گزارنے پر مجبور کر رکھا تھا بلکہ قومی تشخص کی آڑ میں ان کی ثقافتی آزادیوں پر بھی پابندی عائد کر رکھی تھی۔

تشخص کی جستجو بٹتی صفوں کو بھانپ لینے والے سیاست دانوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ خندقیں کھودنا شروع کریں۔ برطانیہ کے ایک بہت ہی قابل سیاستدان اوسوالڈ موسلے، جس نے خود کو ایک فاشسٹ میں تبدیل کر لیا تھا، کے بیٹے نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ 'جس وقت دایاں ہاتھ بڑے بڑے نظریات اور شان وشوکت کی بات کر رہا ہوتا تھا تو بایاں بدرو سے چوہا نکال رہا ہوتا تھا'۔ بڑے بڑے نظریوں کی بات کرنے والے سب

allurdupdfnovels.blogspot.com

لوگ اس قدر قصور وار نہیں ہوتے۔ تاہم تجریدات اکثر و بیشتر جل دے جاتی ہیں اور اکثر و بیشتر ان جذبات اور نظریات سے الگ ہو جاتی ہیں کہ جن کے ساتھ انہوں نے جنم لیا ہوتا ہے اور وہ اکثر و بیشتر گمراہ کرتی ہیں۔

اگر آپ اپنی شناخت ریاست یا قوم سے کرتے ہیں تو آپ اپنے پڑوسی کی پڑوسی کے طور پر نہیں بلکہ ایک زمرے کی مثال کے طور پر خدمت کر رہے ہوتے ہیں اور آپ ریاست کی خدمت کر رہے ہوتے ہیں، ریاست آپ کی کوئی خدمت نہیں کر رہی ہوتی۔ امریکی صدر کینیڈی کا وہ قول بڑا مشہور ہے کہ 'یہ مت پوچھیں کہ آپ کا ملک آپ کیلئے کیا کر سکتا ہے بلکہ یہ بات کریں کہ آپ اپنے ملک کیلئے کیا کر سکتے ہیں'۔ یہ قول اب ایسا زبان زد عوام ہوا ہے کہ لوگ اب اس کے اخلاقی ابہام پر غور ہی نہیں کرتے۔ نفرت و انسانیت سوزی کے جرائم کا ارتکاب کرنے والے جدید ریاست کے دشمن بھی تشخص سے ویسے ہی تحریک حاصل کرتے ہیں مثلاً چیچین گوریلوں کے روپ میں جو کہ ہسپتالوں کو اڑا کر جشن مناتے رہے یا خودکش حملہ آوروں کی شکل میں جو معصوم بچوں کی ہلاکت پر خوشیاں مناتے ہیں۔ کومٹ منٹ کے بندھن خدمت یا انسانیت کی سیدھی سادھی اخلاقیات پر غالب آ جاتے ہیں۔

قتل و غارت میں گھر کر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ 'دنیا کو قابل فہم بنا کر اسے قابل قبول بنایا جانا چاہیے'۔(39) لیکن اسی عمل کی کوئی چیز امن کے دنوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ جب جاپانی وزیر اعظم کوئی زومی 1930ء اور 1940ء کے عشروں میں جاپانی قوم پرستی کے روحانی مرکز کی حیثیت اختیار کر لینے والی درگاہ یا سوکولی کی سالانہ زیارت کے لئے گیا اور اس نے ان افراد کو اعزاز بخشا جنہیں کہ دوسرے ملکوں میں جنگی مجرم سمجھا جاتا ہے تو اس میں دراصل جاپانی عوام کو اپنی تاریخ کو سمجھنے اور شرم و دبدھا کو خاموش تعظیم سے بدلنے کا سلیقہ بتایا تھا۔ جب امریکی صدر نکسن نے واٹر گیٹ سکینڈل میں اپنے خلاف شہادتوں کے جمع ہوتے انبار کو دیکھ کر اپنے ایک مشیر کے کان میں (اور ٹیپ ریکارڈر میں) یہ سرگوشی کی تھی کہ 'وہ یقین کرنا چاہتے ہیں، بات دراصل یہ ہے، کہ نہیں؟' تو اس کا مطلب تھا کہ عوام یہ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ صدر اصل حقیقت بتائے گا اور اسے شک کا فائدہ ملے گا مگر کیا ہوا کہ اس کی بات غلط نکلی لیکن اس کی زیادہ وجہ یہ نہیں تھی کہ عوام نے اسے چھوڑ دیا تھا بلکہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

زیادہ وجہ یہ تھی کہ اس کے کانگریس کے ساتھی اب مزید یقین کرنے پر تیار نہیں تھے۔

زیادہ استبدادی جدید ریاستوں نے تجریدی تشخص کی پرستش کو انتہا تک پہنچا دیا۔ وہ کلی تشخص اور کلی خدمت کی متقاضی تھیں لیکن وہ تجرید جو انہوں نے تخلیق کی تھیں انہیں بھی اڑا لے گئیں۔ نیطشے کا یہ خیال کہ دیوانگی افراد میں کم کم ہوتی ہے لیکن گروہوں، جماعتوں، قوموں اور ادوار پر اس کا راج ہوتا ہے،(40) ان ریاستوں کے پاس آ کر ایک جیتی جاگتی حقیقت بن گیا اور سو فیصد درست لگنے لگا۔ ان انتہائی صورتوں میں بہت سے لوگ تشخص کے توسط سے مکمل بے کسی کا مقابلہ کرنے لگے۔ انہوں نے کیا کیا کہ فاتح کے عقائد کو اپنی زندگیوں اور اپنی صورت حال کی بے امیدی کو سمجھنے کے بہترین طریقے کے طور پر اپنے دل میں بٹھانا شروع کر دیا، برونو بیت الہائم نے اس کا تجزیہ کیا تھا کہ لوگ تجربے کے باوجود آمروں کو خوبیوں اور تقریباً ایک الوہی کردار کا حامل کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔ اس نے اس کا یہ نتیجہ نکالا کہ یہ اس خوف کا سبب ہوتا ہے کہ کہیں حکمران اپنی طاقت ان کے خلاف ہی استعمال کرنا نہ شروع کر دے۔ رسوم، جو کہ آمر کی ذاتی فطرت سے ماورا ہوتی ہیں، اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ اسے گمان اور انتقام جوئی سے بالا ہونا چاہیے۔ خطرہ جتنا بڑا ہوگا اس کی نیکی پر یقین اور اس کے ساتھ شناخت کے توسط سے اس کے انکار کی ضرورت بھی اسی قدر زیادہ ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ماؤ اور سٹالن اپنے محکوم لوگوں کی نظر میں ولایت کے درجے کے اس قدر قریب پہنچ گئے کہ جہاں تک بیسویں صدی کا کوئی بھی رہنما نہ پہنچ سکا۔ آرتھر ملر کا بھی یہی خیال تھا کہ 'ہم میں سے کوئی بھی اس عقیدے کو نہیں چھوڑ سکتا کہ معاشرے کے کسی نہ کسی طور کچھ معانی ہونے چاہئیں۔ یہ خیال کہ ریاست کا دماغ چل گیا ہے اور وہ اتنے معصوم لوگوں کو سزا دے رہی ہے، ناقابل برداشت ہے چنانچہ اس ثبوت سے داخلی طور پر انکار کرنا پڑتا ہے'۔

مغوی بعض اوقات سٹاک ہوم سنڈروم کا شکار ہو کر خود کو اغوا کاروں کے ساتھ بھی شناخت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس میں بھی وہی نفسیات کارفرما ہوتی ہے اور اس دوران بھی یہ عجیب احساس ہوتا ہے کہ ہمیں تقویت مل رہی ہے۔ یونانی ڈرامہ نگار یور پیڈیز کے کھیل 'افاجنائیا اولس' میں اسی طرز عمل کی پرانے زمانے کی ایک مثال پیش کی گئی ہے۔ اس کھیل میں ہوتا کیا ہے کہ ایگا میمنون کی بیٹی افاجنائیا کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانے کیلئے

allurdupdfnovels.blogspot.com

چن لیا جاتا ہے تا کہ وہ خوش ہو کر یونان کے بحری بیڑے کیلئے موافق ہوائیں چلائیں۔ کھیل کے مختلف مراحل میں افا جنائیا پہلے تو اپنے باپ کے ہاتھوں قتل ہونے کا سوچ سوچ کر خوف اور دہشت میں غرق ہوئی رہتی ہے لیکن آخر میں جا کر خوشی خوشی اس ہیروانہ فریضے کو گلے لگا لیتی ہے۔ نیطشے بھی یہی کہتا ہے کہ تمام اخلاقیات کے پیچھے یہی بزدلانہ اور فریبی اطاعت کارفرما ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقیات کسی ایسے آزاد آدمی کی خارجی تسخیر سے زیادہ کچھ نہیں کہ جو اپنے ارادے کی کمزوری کے طفیل جابر کو اپنے داخل میں لے جاتا ہے اور خود کو اس جابر سے متشخص کرنے لگتا ہے۔ تاہم ان دونوں کیفیات کے بین بین تشخص کی ایک زیادہ لطیف صورت بھی موجود ہے جس میں ہم اپنی خودیوں کا ایک حصہ ایک ایسے بڑے کل میں ضم کر دیتے ہیں جس کی نمائندگی بعض اوقات ریاست کر رہی ہوتی ہے، اور ہمارا علیحدگی کا احساس بھی برقرار رہتا ہے۔ ہم ریاست کی تعریف کرتے ہیں اور اس سے سیکھتے ہیں لیکن ہمیں اس پر انگلی اٹھانے کی قوت بھی حاصل ہو جاتی ہے ۔ لیڈر شپ کا تجزیہ کرنیوالے ایک دانشور کا کہنا ہے کہ "مستقبل کے بہت سے لیڈروں کی ایک دلفریب نشانی یہ ہوتی ہے کہ ان میں ایک زیادہ بعید حاکم سے متشخص کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا تشخص ہے جو خود کو اس لیڈر کی تقلید کرنے کی کوششوں اور اسے چیلنج کرنے کی خواہش دونوں سے آشکار ہوتا ہے۔ (41)

جوں جوں جمہوریت آگے بڑھ رہی ہے، ایک ایسا ہی وتیرہ سامنے آتا چلا جارہا ہے۔ شروع کے مراحل میں جمہوریت تجریدی تشخص (قومی، طبقاتی، نسلی) کے ساتھ مل کر چلتی رہی ۔ سیاستدانوں کو ان تجریدات پر بات کرنے اور اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں فائدہ نظر آتا ہے۔ بدترین صورت میں یہ تجریدات لوگوں کے خلاف ان بہیمانہ اقدامات کا جواز مہیا کرتی ہیں جن کے پاس ویسی پہچان کا فقدان ہوتا تھا۔ بہترین صورت میں یہ تنگ نظر مفاد پرستوں اور اقتدار کے پیچھے بھاگنے والوں کو حجاب مہیا کرتی تھیں۔ لیکن جمہوریت کے زیادہ پختہ مراحل میں تشخص کی وہ اہمیت نہیں رہتی، تجریدات جھڑتی محسوس ہوتی ہیں اور ہمارے پاس صرف خدمت کی نثر پڑھنے کو رہ جاتی ہے۔

عموماً شناختیں تیز رفتار تبدیلی کے وقتوں میں یا جب لوگوں کو خطرہ درپیش ہوتا ہے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہیں اور لوگوں کے پاس بہت سی شناختوں میں سے وہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

شناخت جو سب سے زیادہ خطرے میں ہوتی ہے، اہم ترین بن جاتی ہے، خواہ یہ1920ء کے عشرے میں جرمن تشخص ہو،1960ء کے عشرے میں ویتنامی تشخص ہو اور یا پھر2000ء کے عشرے میں مسلم تشخص۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب کے امن و خوشحالی کے بیچ شناختیں زیادہ مدہم کیوں پڑ گئی ہیں۔ یہ انداز ہر جگہ یکساں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ دنیا کے بعض خطوں میں تشخص کے یہ دعوے پہلے سے بھی زیادہ شدید ہوتے چلے جا رہے ہوں۔ امریکہ (یو ایس) میں لیڈر خود کو اس قومی جوش و جذبے کی بات کرنے پر مجبور محسوس کرتے ہیں جو کہ اب دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ چین میں ایک شدید قسم کا قومی تفاخر پیدا ہو رہا ہے جس کا رخ امریکہ اور جاپان کی طرف پھیرا جا رہا ہے اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے دور میں بھارت نے ایک ایسے قومی تشخص پر بڑے پر زور اور خطرناک اصرار کا تجربہ کیا تھا جس کی جڑیں ہندو منہائیت میں تھیں۔ یورپ کے بعض حصوں میں بھی انتہا پسند قوم پرست جماعتیں1930ء کے عشرے کی بد صورت سیاست کو اندر ہی اندر سلگاتی رہی ہیں۔ تاہم دنیا کے بیشتر حصے میں شناختوں کی شدت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہ اب پہلے کی طرح زندگی موت کا مسئلہ نہیں رہیں اور اب یہ اچھائی اور برائی کے دیگر کم جانبدار تصورات پر حاوی ہونے کی پہلے جتنی قصور وار بھی نہیں رہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 7

اخلاقی اہداف اور اخلاقی طریقے

''دیوتا کے نزدیک ہماری برائی، برائی نہیں بلکہ لاعلمی اور ناپختگی ہوتی ہے اور ہماری اچھائی نسبتاً ایک کم ناپختگی''۔ (سری اربندو)(1)

ابونصر الفارابی کا شمار اسلامی تاریخ کے سب سے بااثر سیاسی فلاسفہ میں ہوتا ہے۔ اس کا زمانہ دسویں صدی کی ابتداء کا زمانہ ہے اور اس نے وسطی ایشیا اور پھر بغداد، قسطنطنیہ، مصر اور شام میں زندگی بسر کی۔ الفارابی نے اپنی تصنیفات میں روبہ عروج اسلام کی غیر معمولی روحانی قوت اور افلاطون اور ارسطو کے فکری ورثے کو یکجا کرنے کا کام کیا اور الفارابی کے انفرادی عقل پر غیر معمولی اصرار کی وجہ سے اس کی گونج آج بھی سنی جا سکتی ہے۔

'مدینۃ الفاضلۃ' کا شمار اس کی عظیم ترین کتب میں ہوتا ہے۔ اس میں اس نے اس بات کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ اچھی حکومت کیسی ہوتی ہے۔ اس نے جو جوابات پیش کئے ہیں وہ قوانین اور ڈھانچوں کی اہمیت کو گھٹا کر پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ کسی حکومت کو اچھا صرف تبھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ علم، کردار اور سبھاؤ کی ان اقسام پر مبنی ہو جو کہ معاشرے کو حقیقی خوشی سے ہمکنار کرتی ہیں۔ طریقوں کو ان اہداف کے مطابق جانچا جانا چاہیے کہ جن کے حصول کیلئے انہیں بروئے کار لایا جاتا ہے اور بہترین اہداف وہ ہوتے ہیں جو روزمرہ زندگی کی حقیر حقیقتوں سے ماورا ہوتے ہیں،(2) اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے برعکس بری حکومتیں انسانی فطرت کے ناقص خصائل کی عکاس ہوتی ہیں۔

الفارابی نے اس قسم کی چھ حکومتیں گنوائی ہیں جنہیں ہزار سال سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی آسانی سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مطابق پہلی قسم کی حکومتیں وہ ہوتی ہیں جنہیں ضرورت کی حکومتیں کہا جا سکتا ہے۔ ایسی حکومتوں کے پیش نظر زندگی کی صرف روز مرہ ضروریات ہوتی ہیں۔ امراء کی 'بدمعاش' حکومتوں کی توجہ محض دولت اور خوشحالی پر ہوتی ہے اور 'گھٹیا' حکومتیں صرف حسی اور خیالاتی مسرتوں کو مدنظر رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ 'وقار' کی حکومتیں ہوتی ہیں جن کے شہری صرف اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ دوسرے ان کی تعریف وتوصیف کریں۔ غاصب حکومتوں کے شہری دوسروں پر غلبہ پانے اور انہیں محکوم بنانے کے چکر میں ہوتے ہیں اور آخر میں 'شراکتی حکومتیں' یا جمہورتیں آتی ہیں جن کے شہریوں کا بڑا مقصد آزادی ہوتا ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ آخر الذکر قسم کی حکومتوں کے بارے میں فارابی لکھتا ہے کہ ان میں اچھی اور بری دونوں قسم کی چیزوں کی سب سے زیادہ بہتات اور تنوع ہونے کا امکان ہوتا ہے۔

الفارابی کی یہ فہرست ہمیں دولت، شہرت اور لذت پرستی میں غلطاں اس دور کے معاشروں کے حکمرانوں کو جانچنے کا ایک بہت عمدہ سانچہ مہیا کرتی ہے۔ لیکن اس کا یہ فلسفہ اس سے بہت زیادہ بنیادی قسم کے سوالات کو جنم دیتا ہے۔ اگر کوئی حکومت محض اوہام، لالچ اور نفرتوں کے نقائص میں مبتلا لوگوں کی عکاسی کرتی ہے تو پھر وہ اچھی کس مفہوم میں ہوئی؟ اور کیا اس کے رہنما اصول اس کے اچھے ہونے کا تعین کرتے ہیں یا اس کے عمل یعنی اس کے اختیار کردہ طریقے یا کہ اس کے اہداف؟

اگر آپ کا اس بات پر یقین ہے کہ لوگ بنیادی طور پر اچھے ہوتے ہیں پھر تو یہ سوال اتنے مشکل نہیں۔ اس صورت میں ان کی خوبیوں کو صحیح سمت میں لگانے کیلئے تھوڑے بہت سیدھے سادھے قوانین اور ادارے ہی کافی ہوں گے۔ لیکن اگر لوگ جتنے اچھے ہیں اتنے برے بھی ہیں تو یہ سوال بہت مشکل ہو جاتے ہیں۔ فی الواقع اگر تو لوگ فطرتاً برے ہیں تو پھر الفارابی کی بیان کردہ نیک حکومت ایک سراب بن سکتی ہے۔

اہل مغرب کے بیشتر سیاسی فلسفے پر ٹامس ہابز کا فطرت انسانی کے تاریک پہلو پر مبنی سیاسی نظریہ ہی چھایا دکھائی دیتا ہے اور یہ نظریہ اس دور کے ذہن کیلئے بھی اتنا ہی پریشان کن

allurdupdfnovels.blogspot.com

تھا جتنا کہ یہ آج کے ذہن کیلئے ہے۔ ہابز کا موقف تھا کہ انسان میں طاقت و اقتدار کی خواہش باقی سب خواہشات سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ 'اقتدار در اقتدار کی ایک مستقل اور مضطرب خواہش ہمیں اس وقت تک دوڑائے لیے جاتی ہے جب تک کہ ہمیں موت نہیں آن لیتی'۔ یہ خواہش ہماری کمزوریوں اور لاچاریوں اور اس سفاک حقیقت سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کی حفاظت خود نہیں کر سکتے اور اپنی خوش حالی کو یقینی نہیں بنا سکتے اور 'مزید طاقت کے حصول کے بغیر' اس طاقت کی ضمانت بھی نہیں دے سکتے کہ جو پہلے سے ہماری پاس موجود ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے طاقت حاصل کرنے کی خواہش کو خطرات سے بچنے کی خواہش سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور یہ ہماری فطرت حیوانیہ کے اندر بہت گہرائی میں موجود ہوتی ہے۔

طاقت اور پہچان کی اس خواہش کے سب اثرات برے نہیں ہوتے۔ یہ خواہش انسان کو عظیم فنکار بھی بنا سکتی ہے اور اسے فیاضی و سخاوت کی طرف مائل بھی کر سکتی ہے۔ (ہابز لکھتا ہے کہ 'کسی طاقتور آدمی کیلئے یہ دلیل ہی سب سے قوی ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنی خواہشات کی تکمیل کے قابل ہوتا ہے بلکہ وہ دوسروں کو ان کی خواہشات کی تکمیل میں بھی مدد فراہم کر سکتا ہے')۔ فرائیڈ اور یونگ کے رفیق کار اور ہم عصر نفسیات دان الفریڈ ایڈلر نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ 'برتری کی خواہش، بنیادی انسانی محرک ہے جیسا کہ اس کا متضاد 'احساس کمتری' ہے جو کہ انسان کو ڈپریشن اور بے عملی کا شکار کر دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ 'ہم سب میں مشکلات پر غالب آنے کی خواہش ہوتی ہے اور ہم سب کسی ایسے ہدف تک پہنچنے کی جدوجہد میں لگے ہوتے ہیں کہ جس کے حصول سے ہم خود کو قوی، برتر اور مکمل محسوس کرنے لگیں'۔

ایڈلر کے بعد کی طبی تحقیق بھی جیتنے کی اس خواہش کے عالمگیر پن کی تصدیق کرتی نظر آتی ہے۔ بلند حیثیتی کا بہتر صحت سے بڑا مضبوط تعلق ہے (آسکر انعام جیتنے والے اس انعام کیلئے محض نامزد ہونے والوں کی نسبت اوسطاً چار سال زیادہ عمر پاتے ہیں)۔ معاشرتی علم سے ہمیں جو بھی معلوم ہوا ہے وہ سب اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ لوگ اپنی اضافی حیثیت کے بارے میں بہت زیادہ آگاہ ہوتے ہیں، پہچان نہ ملنے سے وہ افسردہ ہوتے ہیں اور پہچان ملنے پر وہ پھلتے پھولتے ہیں۔[3] اس لحاظ سے ہابز ٹھیک ہی تھا۔ دراصل ہمارا

allurdupdfnovels.blogspot.com

تعلق ایک ایسی نوع سے ہے جس میں سب سے طاقتور اور کامیاب فرد بھی خود کو کبھی مکمل طور پر محفوظ محسوس نہیں کرتا۔

تاہم ہابز کی انسانی فطرت کے بارے میں قنوطیت اس سے بہت زیادہ گہری تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اندر سے ہم سب ممکنہ قاتل ہوتے ہیں اور ہمارا باطن انتقام و کدورت کے خیالات سے بھرا رہتا ہے۔ اگر ہم قتل کر کے بچ سکتے ہوں تو کبھی بھی اس سے احتراز نہ کریں۔ یہ انسانی صورت حال کی ایک کٹھن حقیقت ہے۔ ہم ایسے معاشروں میں زندگی بسر کرتے ہیں جو جنگل سے زیادہ مختلف نہیں اور اس بظاہر انتہائی ترقی یافتہ تہذیب کے نیچے چوروں اور قاتلوں کا ایک جہان آباد ہے جو نظام میں ذرا سا خلل واقع ہونے پر جھٹ سے باہر آ جاتا ہے جیسا کہ 1970ء کے عشرے میں نیویارک میں بجلی فیل ہونے پر یا 2005ء میں نیو اورلینز میں ہوا تھا۔ سماجی نفسیات سے بھی اس حکایت کی تصدیق ہوتی ہے کہ لوگ حالات یا حکام کے کسی ایما کے بغیر کس قدر آسانی سے تشدد اور اذیت رسانی کے سفاک ہتھکنڈوں پر اتر سکتے ہیں۔

ہابز کے نزدیک اس کا منطقی مفہوم یہ ہے کہ ہمارے پاس کسی ایسے حاکم کی حاکمیت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں بچتا کہ جو ہمارا تحفظ کرے اور طاقت و اقتدار کی اس خوفناک تگ و دو کو قابو میں رکھے۔ سب کی سب کے خلاف جنگ کی انارکی اور ان مہلک خواہشات کی تباہ کاریوں سے کہ جو مہذب سے مہذب لوگوں کے اندر بھی گھات لگائے بیٹھی ہوتی ہیں ہمیں صرف اور صرف حاکمیت، قانون اور تعمیل کا ایک واضح نظام ہی بچا سکتا ہے (شاید ہمیں آج کل دوسرے لوگوں کی خواہشات کے ماحولیاتی اثرات سے تحفظ بھی درکار ہے)۔ اس بحث کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمیں الفارابی، ارسطو، لورینزیتی اور مل کے اخلاقی عزائم محض ناقابل برداشت تعیّشات دکھائی پڑتے ہیں۔ ہم ریاست سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ بہت زیادہ اچھی ہو۔ ہم تو بس زیادہ سے زیادہ اس سے یہ امید کر سکتے ہیں کہ یہ ہمیں ہمارے دشمنوں سے بچائے رکھے۔

انسانی نفسیات کے متعلق ہابز کے بیان میں مبالغے کا عنصر واضح طور پر موجود ہے لیکن اس میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ جس کی گونج آج بھی سنی جا سکتی ہے۔ اس میں اقتدار و سیاست میں غلطاں ایسے بہت سے لوگوں کو بہت ٹھیک انداز سے بیان کیا گیا ہے

allurdupdfnovels.blogspot.com

کہ جن کے افعال واقعی اس طرح ہوتے ہیں کہ جیسے وہ طاقت کو ہی حتمی منزل سمجھ کر زندگی گزا رر ہے ہوں۔ اس کا ردیف قافیہ جنگوں اور خونریزیوں کی ان رودادوں سے بھی بڑا ٹھیک ملتا ہے کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ بظاہر شائستہ اور مہذب لوگ یکا یک بھیڑیوں اور درندوں میں کیسے بدل جایا کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اس کا بیان اس بات کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے کہ تمام معاشروں میں دولت کی تقسیم اس قدر غیر یکساں کیوں ہوتی ہے ۔ اگر موقع ملے تو لوگ دوسروں سے جس قدر بھی زیادہ ممکن ہو طاقت ہتھیانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ مراعات اپنے جیسے لوگوں کو منتقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ وہ معاشرے جو بظاہر یکساں سلوک اور یکساں مواقع کے ضامن قوانین کے تحت چل رہے ہوتے ہیں وہ بھی بالآخر ناہمواریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تاہم یہ سب کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں میں رحم، سخاوت ، ہمدردی اور خیر کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ کیا عالمی جنگ میں سب سے پہلے مورچوں میں پہنچنے والے افسروں، متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے کمیونسٹ انقلابیوں کہ جنہوں نے جابر حکومتوں کو گرانے کیلئے اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال دیں اور ان مبلغوں کہ جنہوں نے کتاب مقدس اور طبی سہولیات کو دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچایا، کے دلوں میں ایسے جذبے اور آدرش موجز نہیں تھے کہ جنہوں نے انہیں اپنے ہی گروہ کے تنگ نظر مفادات کے خلاف صف آراء ہونے پر مجبور کر دیا۔[4] ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں رفاہی اور مذہبی تنظیمیں محض اس لئے سرگرم ہیں کہ کچھ لوگ غیروں اور اجنبیوں کے بارے میں اچھا سوچتے ہیں اور ان سے فیاضانہ برتاؤ کرتے ہیں اور ان سے منسلک حضرات یوں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ جیسے دوسرے بہت پیارے اور اچھی فطرت کے لوگ ہیں۔[5]

لیکن اگر کچھ لوگ طاقت کو صرف استعمال کرنے کی بجائے بنیادی طور پر اسے حاصل کرنے کے زیادہ خواہاں ہوتے ہیں تو اس کی اہمیت اقتدار کے گرد تشکیل پانے والے اداروں کے لئے لازماً بڑھ جاتی ہے۔ اگر صرف ایک چھوٹی سی اقلیت بھی استحصالی انداز اختیار کرتی ہے یا طاقت جمع کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اس سے بھی کسی معاشرے کی خاصیت میں بڑی گہری تبدیلی پیدا ہوسکتی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

اس سے کیا مطلب نکلتا ہے؟ ہابز کے نزدیک اس کا مطلب یہ تھا کہ سب کو اپنی حد میں رکھنے کیلئے ایک عظیم حکمران کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ دلیل کہ ہمیں اس وقت تک حاکم کی چپ چاپ اطاعت کرتے رہنا چاہیے کہ جب تک وہ ہماری حفاظت کرتا رہتا ہے، اس مقدمے سے منطقی طور پر ثابت نہیں کی جا سکتی۔ فی الواقع خاموش اطاعت تو حاکم کی فطرت کو کھل کھیلنے کا موقع دینے کی بہترین ضامن ہو سکتی ہے۔ زایرئے کے صدر مبوتو اور چلی کے جنرل پنوشے نے اپنی زندگی کا آغاز آمروں کے طور پر نہیں کیا تھا۔ وہ آمر اس لیے بنے کہ بہت زیادہ لوگ انہیں آمر بنانے پر راضی تھے اور بہت ہی کم لوگ ایسے تھے جو انہیں چیلنج کرنے پر آمادہ تھے۔

لیکن ہابز کی دلیل میں منطق کا فقدان کیوں ہے، اس کی ایک زیادہ بنیادی وجہ بھی ہے۔ اگر معاشرے کا مطلب واقعی سب کی سب کے خلاف جنگ ہے تو اس کا ایک امکانی نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طاقت اور دولت کی بانٹ بہت ناہموار ہو اور جیتنے والوں کے مقابلے میں ہارنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ جب کسی سماجی نظام میں خلل واقع ہوتا ہے تو یقیناً وہی کچھ ہوتا ہے جیسا کہ 1920ء کے عشرے میں جرمنی میں ہوا تھا یا 1990ء کے عشرے میں یوگوسلاویہ میں ہوا تھا۔ جہاں اس طرح کی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں تو اکثریت کی کسی ایسی تدبیر میں دلچسپی بہت بڑھ جاتی ہے کہ جو جیتنے والوں کے ظلم وحرص کو لگام دے سکے۔ اگر اہل اقتدار اس بات پر تل جائیں کہ ان سے جو ہو پائے گا وہ کریں گے تو دائرہ اقتدار کے باہر کے گروہ بھی یہ تہیہ کر سکتے ہیں کہ ان سے جو روکا گیا وہ روکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان اخلاقی قواعد اور سماجی اداروں میں لوگوں کی اس قدر قوی مشترکہ دلچسپی دیکھنے کو ملتی ہے جو کہ لوگوں کو تشدد، زیادتی اور ناانصافی سے بچاتے ہیں خواہ یہ زیادتی اور ناانصافی افراد کی طرف سے ہو یا خود ریاست کی طرف سے۔ انسانی فطرت کے بارے میں لا اخلاق تناظر ہمیں اس نتیجے کی طرف لے جاتا ہے کہ حکومت کو اخلاقیات اور معاشرے کے اصول و روایات کو مضبوط کرنے کیلئے بہت زیادہ فعال ہونا چاہیے۔

ہابز کی اس دلیل کی جھلک کہ انسان بنیادی طور پر خودغرض ہے اس تصور میں بھی نظر آتی ہے کہ صرف خودغرضانہ مادی مفادات ہی ایسے محرکات ہوتے ہیں جن کی کہ کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ ڈیوڈ ہیوم نے کہا تھا کہ 'کوئی بھی حکومتی نظام تشکیل دیتے وقت ہر شخص کو بدمعاش

allurdupdfnovels.blogspot.com

تصور کیا جانا چاہیے اور یہ سوچ لیا جانا چاہیے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا ذاتی مفاد کے علاوہ کوئی مقصد نہیں ہوتا' لیکن ان دونوں دلیلوں کو اس مشاہدے سے ضعف پہنچ سکتا ہے کہ اگر کوئی حکومت انہیں سنجیدگی سے لیتی ہے تو پھر اسے بہت زیادہ پولیس اور پیسے کی ضرورت ہو گی۔ (اکثر حکومتیں لوگوں کی خود کو منضبط رکھنے کی خواہش اور ان بہت سے مختلف محرکات سے فائدہ اٹھاتی چلی آتی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ نرسوں اور سپاہیوں کے فریضے سرانجام دینے لگتے ہیں)۔ لیکن اس حد تک کہ ہیوم کی دلیل درست تھی۔ یہ ہابز کی دلیل کی طرح ہمیں اس متناقض نتیجے پر بھی لاسکتی ہے کہ اگر انسانی فطرت واقعی حریص ہے تو پھر اس حرص کو حدوں میں رکھنے کیلئے قوانین وقواعد کا بہت زیادہ اخلاقی ہونا اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔

پھر ان دلائل کو کتنا وزن دیا جا سکتا ہے ۔جن کے مطابق ریاستوں کو ان دیگر محرکات پر مبنی ہونا چاہیے جن میں کہ دوسروں کے ساتھ تعلق کا مضبوط محرک بھی شامل ہوتا ہے؟[6] یہ بندھن اتنا ہی عالمگیر ہے ، بہت سی صورتوں میں اتنا ہی آشکار ہے (چھوٹے بچوں کے رویے کی صورت میں بھی) اور ہماری ذہنی توانائیوں کو اتنا ہی استعمال میں لاتا ہے جتنا کہ پہچان کی طاقت ورخواہش کرتی ہے اور اتنا ہی ثبوت اس امر کا بھی ملتا ہے کہ اس کی زیادتی بھی لوگوں کی صحت کیلئے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے اور اس چیز کے بھی اتنے ہی معقول بیانات ملتے ہیں کہ ارتقائی دباؤ اس کے حق میں کیوں رہے ہیں۔[7]

چنانچہ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ مفکرین کی ایک کثیر تعداد کا یہ موقف رہا ہے کہ ریاستوں کو بندھن کے اس ازلی محرک کا عکاس ہونا چاہیے۔ ان کے نقطہ نظر سے اعتماد، ہم آہنگی اور باہمی ہمدردی کے ساتھ ساتھ تعاون بھی معاشرے کی ایک قدرتی کیفیت ہے۔ مثالی حکومت وہ ہوتی ہے جو اس بنیادی انسانی فطرت کی عکاسی اور توثیق کرتی ہے جو کہ لوگوں کو سزا دینے کی سعی کرنے کی بجائے ان پر اعتماد کرتی ہے۔

انسانی فطرت اور اداراتی شکلوں کے درمیان کسی واضح منطقی ربط کا تصور گمراہ کن ہے۔ تعلق وتعاون پر مبنی ریاست کا انحصار صرف اسی پر نہیں کہ یہ بہت قوی محرکات ہیں۔ اگر ہم نہیں چاہتے کہ کچھ بے رحم مفت خورے ان کا استحصال کریں تو ان کا بہت زیادہ قوی ہونا از بس ضروری ہے۔ اگر تعاون کو حکومت کی بنیاد بننا ہے تو ضروری ہے کہ ہ حکومت اشتمالی طرز کی ہو۔ لیکن عملی اعتبار سے وابستگیاں بنانے کی یہ خواہش بڑے غیر یکساں انداز سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ظاہر ہوتی ہے۔ ہم بعض لوگوں کے ساتھ اور بعض کے خلاف بہت مضبوط تعلق بناتے ہیں جنہیں پھر ہم اجتماعی طور پر نفرت، ڈراؤ دھمکاؤ اور حملے کا نشانہ بناتے ہیں۔ اپنے گروہوں کے گرد حدیں کھینچنا اور پھر خارجیوں یعنی مقولاتی خطوط تقسیم کی دسری طرف موجود لوگوں کا استحصال کرنا ہماری فطرت ہے۔

یہ بعض وہ اسباب ہیں جو کہ ہمیں اس پر کشش تصور کے بارے میں تشکیک میں مبتلا کرتے ہیں کہ سیاسی زندگی کے ڈھانچوں کی جڑیں انسانی نفسیات میں ہوتی ہیں۔ جائزہ لیں تو پھر ان روابط کی منطق بکھر کر رہ جاتی ہے۔ بہر صورت انسانی نفسیات کے بارے میں ہماری سمجھ اتنی نہیں ہے کہ ہم اس بارے میں ٹھوس نتائج تک پہنچ سکیں کہ اداروں کو کس طرح تشکیل دیا جانا چاہیے۔ اس کیلئے ہمیں بہت سے متغیرات کو دیکھنا پڑتا ہے۔ انسانی فطرت خودغرض اور فیاض ہے، متشدد اور پر امن ہے، جامد اور متحرک ہے اور یہ کیا خصوصیت اختیار کرتی ہے، اس کا دارو مدار سیاق وسباق پر بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ کسی داخلی چیز پر۔ (8)

تو پھر اخلاق کے بارے میں کیا کہا جائے؟ حکومت کس طرح تشکیل دی جانی چاہیے، جب ہم اس کے متعلق نتائج کی بنیادیں بچھانے کا سوچتے ہیں تو اس کیلئے انسانی فطرت کے نسبتاً زیادہ دائمی اخلاقی اصول زیادہ پختہ زمین فراہم کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی معیارات کئی مختلف راستوں سے گزر کر جدید معاشروں تک پہنچے ہیں۔ صحیح اور غلط کے بارے میں ہمارے تصورات حتمی کم ہی ہوتے ہیں کیونکہ ان کے منبع ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تصورات حیاتیاتی طور پر تشکیل یافتہ میلانات پر مشتمل ہوتے ہیں جیسے کہ انصاف یا ہمدردی کے میلانات جو کہ بچپن میں اور بہت مختلف قسم کی تہذیبوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیں انسان بناتی ہیں اور جوں جوں نفسیات اور عمرانیات کے درمیان حد فاصل غائب ہو رہی ہے ہمارے ان کے بارے میں فہم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ان کی حیثیت میلانات سے زیادہ کی نہیں ہے اور ان پر غلبہ بھی پایا جا سکتا ہے۔ ہم کوئی ایسی سادہ جبلی مخلوقات بھی نہیں ہیں۔

صحیح اور غلط کے دوسرے احساسات روایت سے آتے ہیں۔ روایتی اخلاقی اصولوں مثلاً زنا کاری اور غذا سے متعلقہ اصول نے صریح سماجی ضروریات سے جنم لیا۔ ان میں سے بعض کو اب بھی بامعنی خیال کیا جاتا ہے، بعض ہمارے احساس تشخص سے جڑے ہیں اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

بعض اب غیر غیر سے محسوس ہونے لگے ہیں۔

عقل ان دیگر اخلاقی منابع کی صورت گری بھی کرتی ہے اور انہیں چیلنج بھی کرتی ہے۔ اخلاق سے متعلق عقلی دلائل صرف جدیدیت سے ہی خاص نہیں ہیں۔ بدھ نے تجربے کی نسبت عقل کو بہت زیادہ قابل اعتماد رہنما قرار دیا اور اس سے ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے کے بعد الفارابی نے بھی عقل کو ہی اپنی سیاسی فکر کی اساس بنایا۔ تمام معاشروں کے لوگ اپنے افعال کا جواز پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کرتے چلے آئے ہیں اور سب معاشروں نے لوگوں کا احتساب بھی کیا ہے۔ تاہم طاقتور لوگ خود کو حق پر ثابت کرنے کی حاجت کم محسوس کرتے رہے ہیں جبکہ غربا اور کمزور زیادہ محسوس کرتے رہے ہیں، (اسے اقتدار کی ایک اور عمدہ تعریف کہا جا سکتا ہے)۔

چونکہ یہ اخلاقی سرچشمے یعنی حیاتیات، روایت اور عقل اکثر مختلف سمتوں میں اشارہ کرتے ہیں، ہمیں اخلاقی سوالات کا بھی کوئی حتمی جواب نہیں مل پاتا۔ (9)

یہ بات کسی بھی ایسے شخص (خصوصاً فلسفیوں) کیلئے پریشان کن ہوسکتی ہے جسے کہ ایسے عالمگیر اخلاقی اصولوں کی تلاش ہو کہ جن کا اطلاق کسی بھی صورت حال میں کیا جا سکے۔ تاہم یہ دعویٰ کہ اخلاقی اصول عالمگیر اور ابدی ہوتے ہیں اس کام کے تجربی بیان کے طور پر درست نہیں ہے کہ جو اخلاق حقیقی معاشروں میں سرانجام دیتا ہے جہاں ان سرچشموں کے درمیان مسلسل تصادم ہوتا رہتا ہے۔

یہی مثال لیں کہ جب کوئی اجنبی ہمارے برابر میں ایک نیا مکان بنانا شروع کرتا ہے تو کیا کرتا ہے۔ ہمارے داخلی میلانات ہمیں اکساتے ہیں کہ ہم ہمارے علاقائی حس کیلئے خطرہ بننے والے اس اقدام کے خلاف مدافعانہ ردعمل ظاہر رکیں۔ دوسری طرف روایت ہمیں کہتی ہے کہ ہم اس نئے پڑوسی سے تواضع سے پیش آئیں۔ عقل ہوسکتا ہے کہ کہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ کے پیش نظر ہم سب کو سمجھوتے کی روش اختیار کرنی چاہیے۔ یا پھر سکول سے ملنے والے کام میں مدد کے سلسلے میں والدین کے کردار کی بات کر لیجئے۔ داخلی میلانات تو والدین کو یہی کہیں گے کہ وہ بچے کے لئے کچھ کریں، روایتی اخلاق کہے گا کہ زیادہ مدد بد دیانتی ہے اور اس سے ادارے اور اساتذہ کی اتھارٹی دونوں کی بے حرمتی ہوتی ہے اور عقل کہتی ہے کہ زیادہ مدد غیر اخلاقی ہے کیونکہ ایسا کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہے کہ جس

allurdupdfnovels.blogspot.com

کی تعمیم وسیع تر مفاد میں نہ کی جا سکے۔ اس قسم کی مثالیں ہم جتنی چاہیں دے سکتے ہیں۔ ہماری روز مرہ زندگی میں ایسے بہت سے مقامات آتے ہیں کہ جہاں اخلاق مختلف طرح کی آوازوں کی شکل اختیار کر رہا ہوتا ہے۔

ان تاملات کا ریاستوں پر اطلاق اس سے بھی زیادہ زور دار طریقے سے ہوتا ہے۔ بدیہی ابتدائی اصولوں سے اور بعض رویہ جاتی مفروضوں سے ڈھانچے اور وظائف اخذ کر کے ریاست کے بارے میں مکمل طور پر استخراجی انداز میں بات کرنا عین ممکن ہے۔ یہ اخذ کر کے کہ عقلی خاکے کے مطابق کسی صحیح معانوں میں نئی ابتداء سے کس قسم کی ریاست یا آئین پیدا ہو گا۔ زمانہ حال کے بہت سے دانشوروں نے بھی بعینہ یہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی ریاست کو صرف روایت اور مثال کے حوالے سے جائز ثابت کرنا بھی ممکن ہوتا ہے۔ (جیسا کہ کنفیوشس کے پیروکار دعویٰ کرتے ہیں)، بالکل اسی طرح کہ جیسے ارتقائی قوتوں کے نتائج کے طور پر ریاستوں کی حیاتیاتی اعتبار سے وضاحت کرنا ممکن ہے یا پھر ہابز کی طرح میلانات اور محرکات کا چشمہ پہن کر۔ تاہم حقیقی ریاستوں کے رویوں کی وضاحت اس طرح کے طریقوں سے ممکن نہیں۔ اس کی بجائے تمام کامیاب طریقے ایسی اخلاقی دلیلیں اور استعارے تلاش کرتے ہیں جو ان مختلف سرچشموں پر حاوی ہوتے ہیں اور تمام کامیاب طریقے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی اخلاقی کائنات اور ہماری روزمرہ زندگی میں اشتراکات موجود ہیں لیکن گاہے گاہے یہ ڈرامائی طور پر مختلف بھی ہو جاتی ہے۔

ریاستوں کی انوکھی اخلاقیات:

تمام ریاستیں ایک اخلاقی مرکزے کی حامل ہوتی ہیں لیکن وہ اپنے اخلاقی فرائض سے اس لیے بھٹک جاتی ہیں کہ ان پر مراعاتی مفادات تسلط جما لیتے ہیں اور وہ ایسی تنظیمی منطق کا شکار ہو جاتی ہیں جس سے وہ اپنی توانائیاں خود پر ہی وقف کرنے لگ پڑتی ہیں۔ اس بات کی روشنی میں دیکھا جائے تو لیڈروں کا، یا عوام کا بنیادی اخلاقی وظیفہ ریاستوں کی اپنے خادم ہونے کے امکان کے ہر ممکن حد تک قریب پہنچنے یعنی خود خدمتی اور تسلط کے رجحانات اور اس سے پیدا ہونے والی ریاکاریوں کی مزاحمت میں مدد کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ریاست جو طریقے استعمال کرتی ہے ان کے بارے میں کیا کہا جائے اور اگر برے طریقوں

allurdupdfnovels.blogspot.com

کی مدد سے نیک مقاصد حاصل کر لیے جائیں تو؟

پہلی نظر میں بہترین منطقی اصول جسے کہ ریاست کے رویے پر لاگو کیا جانا چاہیے اور جسے اس کے استعمال میں آنے والے طریقوں پر حدیں لگانے کیلئے بروئے کار لایا جانا چاہیے ربی ہل ایل کا اصول زریں یعنی، دوسروں سے ویسا ہی کرو کہ جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کریں' ہے۔ اس اصول کے مترادفات آپ کو ہر تہذیب میں ملتے ہیں مثلاً عیسائیت کہتی ہے کہ 'اپنے ہمسائے سے ایسے ہی محبت کرو جیسے کہ تم اپنے ساتھ کرتے ہو' اور ہندوؤں کی مقدس کتاب مہا بھارت میں آتا ہے کہ 'کسی بھی شخص کو دوسرے کے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے کہ جو خود اسے ناپسند ہو' ۔ خدمت پر مبنی جمہوری فلاحی سرمایہ داریت کی طرف پیش رفت نے سیاست دانوں اور سرکاری کار پردازوں کو ایک طرح کے اصول زریں' کی تعمیل پر مجبور کر دیا ہے یعنی کہ وہ اپنے شہریوں سے عزت و احترام کا برتاؤ کریں بلکہ ایسا برتاؤ کریں کہ جیسا وہ خود اپنے ساتھ پسند کرتے ہیں۔ بین الاقوامی امور میں اقوام متحدہ کے منشور کو ریاستوں کا اصول زریں قرار دیا جا سکتا ہے۔

تاہم ریاستی اختیارات کے استعمال کے اعتبار سے یہ اصول زریں بہت محدود حد تک قابل استعمال ثابت ہوا ہے۔ یہ اصول اس مسئلے پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالتا کہ ریاست کو مشکل معاملات کے بارے میں کیسا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے مثلاً کسی سربراہ کو فوجیوں کو جنگ پر کب بھیجنا چاہیے۔ کسی ایسی چیز کو موقوف کرنا چاہیے کہ جسے لوگ عزیز جانتے ہیں اور آیا اسے سنگین جرائم کو روکنے کے لئے سخت سزائیں نافذ کرنی چاہیں۔

اس بات میں کہ ریاستوں کی اخلاقیات افراد کی اخلاقیات سے بہت زیادہ مختلف ہوتی ہے، بہت زیادہ مبالغہ آرائی کی جاتی رہی ہے اور اسے طاقت کے غلط استعمال کا جواز پیش کرنے کے لئے بروئے کار لایا جاتا رہا ہے۔ تاہم ریاستوں اور افراد کو درپیش اخلاقی مسائل واقعی بہت مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ شجاعت، رحم، صبر اور دانائی جیسی بعض عالمگیر اخلاقی خوبیوں کو تمام جگہوں میں بڑی وقعت دی جاتی ہے، حکومت کی نسبت سے احکام عشرہ کی حیثیت زیادہ سے زیادہ شرطیہ ہے۔ بہت زیادہ اخلاقی حکومتیں بھی قتل و غارت کرتی ہیں (جنگوں میں) جھوٹ بولتی ہیں بقاء کیلئے) اور چوری چکاری کرتی ہیں (مثلاً تحفظ کی تلاش میں)۔ سب ریاستیں اپنی تراشی شبیہوں کو پوجتی ہیں (عموماً عمارتوں، نوٹو ں اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

پرچموں پر بنے اپنے بتوں کو) اور وہ سب حرام کاری کا ارتکاب کرتی ہیں (کم از کم بین الاقوامی امور کے سلسلے میں)۔

روزمرہ اخلاقیات اور ریاستوں کے اخلاقیات میں بعض فرق پیمانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ سٹالن کے بدنام زمانہ الفاظ کہ 'ایک شخص کی موت ایک المیہ ہوتا ہے اور ایک ملین افراد کی ہلاکت فقط اعداد وشمار ہوتے ہیں، کو سن کر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، تاہم ہر حکومت ظاہراً یا پوشیدہ طور پر وسیع پیمانے کی زندگی اور موت کے بارے میں اندازے لگاتی ہیں مثلاً یہ کہ طبی سہولیات کن شرائط پر مہیا کی جائیں یا پھر گاڑیوں یا منشیات کو ملک میں آنے کی اجازت دینے سے کیا خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ صرف جدید ریاستیں ایسے ادارے ہیں جو زندگی کو رسمی طور پر وقعت دیتے ہیں، ایک زندگی کے بدلے میں دوسری زندگی کا سودا کرتے ہیں اور ایک ریاضیاتی دیوتا کی طرح کام کرتے ہیں مثال کے طور پر وہ یہ سوچتی ہیں کہ ریلوے کی حفاظتی تدابیر یا علاج معالجے کی سہولیات سے بچنے والی جانوں کے بدلے میں کتنی سرمایہ کاری جائز ہے۔ تاہم وہ یہ تخمینے کھلے بندوں لگاتے وقت گھبراتی ہیں کیونکہ اس قسم کے تخمینے خدمت کے منصب سے مطابقت نہیں رکھتے۔ (خادم کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اندازے لگاتا پھرے کہ مالک جیتا ہے یا کہ مرتا ہے؟)۔ وہ ہمارے روزمرہ اخلاقیات سے بھی مطابقت نہیں رکھتے (جو ہر زندگی کو مقدس خیال کرتا ہے) اور وہ خدشے کی نفسیات کے بھی خلاف ہیں (جو کہ آشکار خطرات کا اس سے بہت زیادہ مستعدی سے جواب دیتے ہیں)۔

بارآوری کو فروغ دینے یا اس پر قدغنیں لگانے (مثلاً جبری نس بندی کے منصوبوں یا اسقاط حمل کے حقوق کے توسط سے) ہمارے جسموں میں جانے والی اشیاء (منشیات پر پابندی کے توسط سے) اور ہم کیسے لطف انداز ہوتے ہیں (شراب نوشی اور قمار بازی پر قواعد کے نفاذ کے توسط سے) اس کو کنٹرول کرنے کے ریاستی اختیار میں بھی یہی دبدھا جھلکتی نظر آتی ہے۔

ریاستوں کی اخلاقیات اور روزمرہ اخلاقیات کے مابین کچھ فرق احتیاج سے پیدا ہوتے ہیں۔ لبرل سے لبرل ریاست کو بھی بمباری اور جاسوسی جیسے ایسے متشدد اقدامات کرنا پڑتے ہیں جو کسی نجی شہری کیلئے کبھی بھی جائز قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ کسی بھی لیڈر کو ایسے کاموں کا حکم دینا پڑ سکتا ہے جو وہ خود کرنے پر کبھی بھی تیار نہ ہو(اور ایسے لیڈر رہونا بہتر ہی

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہے کہ جو خود اتنی آسانی سے متشدد کام سرانجام دینے کیلئے آمادہ نہ ہوں)۔ آرتھر ملر روز ویلٹ امریکہ کو دوسری عالمی جنگ میں لانے کے بارے میں لکھتا ہے کہ 'نوع انسانی اس کے جھوٹوں کی ممنون احسان ہے'۔ اگر قومی مفادات کے حوالے سے دیکھا جائے تو جنگ اور خطرے کی انتہائی صورتوں میں ذاتی اخلاق کے بارے میں بہت زیادہ محتاط اور پارسا رویے کو ایک ضرر رساں برائی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

بعض فرق انتخاب کے نتائج سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جنگ اس کی بہت سی مثالیں فراہم کرتی ہے۔ جولائی 1944ء میں لندن پر وی ون گولے بہت بڑی تعداد میں برس رہے تھے جن کا بڑا ہدف اس شہر کے وسط میں واقع چیرنگ کراس تھا۔ برطانوی انٹیلی جنس نے برطانیہ میں سرگرم تمام جرمن ایجنٹوں کو کنٹرول کر کے انہیں کہا کہ وہ جرمنی جو رپورٹیں بھیجیں ان میں کہیں کہ بم شمال میں ہدف سے بہت دور گر رہے ہیں۔ اس سے جرمن مزید جنوب کی طرف نشانے لے کر بم برسائیں گے جس سے حملے کا زور کینٹ اور سسیکس کے کم گنجان علاقوں کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ اس طرح اگر بمب مویشیوں اور گھاس سے بھرے کھیتوں اور کھلیانوں کا رخ کر لیتے تو ہلاکتوں میں کوئی دس ایک ہزار کی تخفیف ہو سکتی تھی لیکن ونسٹن چرچل اور ہربرٹ موریسن (اس وقت کے برطانوی وزیر داخلہ) نے اس دلیل کی افادی منطق کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس منصوبے کو ویٹو کر دیا۔ وہ دشمن کی بمباری کا رخ ایک مرتبہ پھر اپنے شہریوں کی طرف پھیرنے کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ تاہم فوجی سربراہ اپنے منصوبے پر قائم رہے اور چرچل کے باہر جانے کا انتظار کرتے رہے اور پھر انہوں نے یہ منصوبہ اٹیلی کی صدارت میں منعقد ہونے والے جنگی کابینہ کے اجلاس میں پیش کر دیا۔ چنانچہ منصوبہ منظور کر لیا گیا اور اس سے بہت سی جانیں تلف ہونے سے بچ گئیں لیکن اس سے کچھ ایسے برطانوی شہریوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے جو کہ بصورت دیگر بچ سکتے تھے۔

کچھ اختلافات راز داری سے پیدا ہوتے ہیں۔ کانٹ کا کہنا تھا کہ اگر کوئی شخص آپ کے دوست کی جان لینے کیلئے اسے ڈھونڈ رہا ہے اور وہ آپ سے پوچھتا ہے کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے تو آپ کو اس سے بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ آپ اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں کہ آیا وہ اچھا ہے یا برا' آپ کسی دوسرے کے طرز عمل کے ذمہ دار نہیں۔ ذاتی زندگی اس کلیے کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

مطابق بسر کرنا ایک مشکل امر ہے لیکن عوامی زندگی میں یہ بات بالکل ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔ حکومتوں کے پاس ایسی معلومات ہوتی ہیں جنہیں افشا کرنا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے مثلاً حیاتیاتی جنگ کے بارے میں معلومات یا پھر ایسی ٹھوس معلومات کہ جن کے پھیلانے میں خطرہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کی کسی حکومت کو کسی ایئرپورٹ پر ممکنہ دہشت گرد حملے کے بارے میں غیر مصدقہ اطلاعات موصول ہوتی ہیں تو یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا اسے اس اطلاع کو عوام تک پہنچا کر علاقے میں خوف و ہراس پیدا کرنا چاہیے یا کہ فی الحال خاموش رہنا چاہیے (یا کہ جیسے2002ء میں ایک ایسی ہی صورتحال میں برطانوی سرکار نے ایئرپورٹ کے علاقے میں بے تحاشا فوج اور پولیس بھیج کر کیا تھا تاکہ دہشت گردوں کو ڈرا کر بھگایا جا سکے)۔[12] ایسی بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ جب ادھوری سچائیاں آخر میں جا کر بہترین ثابت ہوتی ہیں۔ کیا فرانسیسی صدر ڈیگال کو الجیریا کی آزادی کے بارے میں اپنی حکمت عملی کو بے نقاب کر دینا چاہیے تھا؟ لیکن اگر ایسا کرنے سے اس کی کامیابی خطرے میں پڑ جاتی اور بہت سی مزید جانیں ضائع ہو جاتیں تو؟ کیا روسی صدر میخائل گورباچوف کو 1980ء کے عشرے کے وسط میں سوویت یونین کی اصلاحات کے بارے میں اپنے ارادے دیانت داری سے سب کو بتا دینے چاہیے تھے تاکہ اس کے سارے ساتھی اس کی مخالفت پر تل جاتے؟ چرچل نے ایک بار کہا تھا کہ سچائی اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ اسے ہر دم جھوٹوں کے باڈی گارڈ کے پہرے میں رکھنا پڑتا ہے۔

اس سے زیادہ پیمانے پر کھلا پن ہمیشہ اچھی سیاست کی دلیل ثابت نہیں ہوتا۔ انقلابی اصلاحات کیلئے کام کرنے والے کسی بھی شخص کو اس بارے میں کہ وہ کیا کہتا ہے اور کب کہتا ہے، بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ مصلحین کیلئے ایک سادہ اصول یہ ہے کہ ابتدائی مراحل میں اپنی حکمت عملیوں سے پردہ اٹھانے کا فائدہ صرف اسی صورت میں ہوتا ہے کہ اگر اس سے دشمنوں سے زیادہ دوست ہشیار ہوں۔ لیکن اکثر ہوتا کیا ہے کہ اس سے دشمنوں کو منظم ہونے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ فیصلے کرنے کے اعتبار سے بھی کھلا پن بذاتہ کوئی اچھی چیز نہیں۔ کوئی ادارہ بھی لوگوں کی تاڑ تلے مشکل فیصلے ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتا اور اگر کسی گروہ کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ ان کی اندرونی باتوں کا انٹرنیٹ پر چرچا ہو جائے گا تو وہ دیانت داری یا کھلے پن کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ان چیزوں کا اطلاق روزمرہ زندگی پر بھی ہوتا ہے لیکن لوگوں کا اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

بارے میں تجسس کہ ریاستیں کیا کرنا چاہ رہی ہیں ان کے نجی زندگیوں میں تجسس سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

بعض دیگر اختلافات جو کہ حکومتی معاملات کو دوسرے معاملات سے جدا کرتے ہیں ریاستوں کے مفادات کی اپنی نوعیت سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً ریاستیں دشمن کا دشمن اپنا دوست کے قاعدے کو اس قدر اہمیت دیتی ہیں کہ جتنی اہمیت شاید اسے عام زندگی میں نہیں دی جاتی۔ چرچل کی یہ بات بہت مشہور ہوئی تھی کہ اگر ہٹلر دوزخ پر حملہ کرتا ہے تو وہ ایوان عام سے شیطان کے حق میں تقریر ضرور کرے گا۔ ریاستوں کے مفادات کی ایک الگ بات یہ بھی ہے کہ کسی فتح کے نتیجے میں اس فتح کا باعث بننے والا اتحاد ٹوٹ جاتا ہے۔1918ء اور 1945ء میں عالمی جنگوں کے فاتح اتحادوں، چین ویتنام کے اتحاد اور چین اور سوویت یونین کے اتحاد کے ساتھ بھی یہی بات دیکھنے میں آئی۔ اس ساری صورت حال کا نقشہ آسٹریا کے چانسلر میٹرنخ کے تبصرے میں اس وقت ہی سامنے آ گیا تھا جب روسیوں نے آسٹریا ہنگیرین سلطنت کو اس کے خلاف1848ء میں بپا ہونے والی شورشوں کو دبانے میں مدد دی تھی۔ اس موقع پر میٹرنخ نے کہا تھا کہ 'ہماری ناشکری کی حد حیران کن ہوگی' (اس سے سے اس کی مراد یہ تھی کہ زندگی حسب معمول چلتی رہے گی)۔

ریاستوں کو وقت کے شدید دباؤ کے تحت کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہر دم سوچ بچار میں غلطاں یا اخلاقی گتھیوں کو سلجھانے میں منہمک نہیں رہ سکتیں۔ ان کا کام معاملات کو آگے بڑھانا ہوتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو انہیں اخلاقیاتی مباحث کو ایک طرف رکھ کر آگے پیش رفت بھی کرنا پڑتی ہے۔ اسے اور قبل ازیں بیان کردہ دیگر اختلافات کو طریق کار کی اس لچک کے جواز کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جو عام زندگی میں شاید اتنی جائز محسوس نہ ہو۔ لیکن ان اختلافات کی عجیب بات یہ ہے کہ مغربی جمہوریتیں لیڈروں سے ان سے کہیں زیادہ مشکل اصولوں کی بجا آوری کی توقع کرتی ہیں جن کی بجا آوری ہم زندگی کے دیگر شعبوں میں کرتے ہیں۔ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ غیر شخصی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ذاتی تاملات کو معطل کر دیں یعنی کسی کو خصوصی رعایتیں نہ دیں اور لوگوں سے محض اس لیے اچھا سلوک نہ کریں کہ وہ انہیں پسند کرتے ہیں۔ دوستوں اور چہیتوں پر نوازشوں کا ہر معاشرے میں رواج رہا ہے لیکن اسے ہمیشہ ناپسند کیا جاتا ہے، تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے

allurdupdfnovels.blogspot.com

اور اعتماد کے غلط استعمال کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح جمہورتیں لیڈروں کو یہ گنجائش بھی نہیں دیتیں کہ اپنے سرکاری اختیارات استعمال کر کے دولت جمع کر سکیں یا جنسی رنگ رلیاں منا سکیں (اس چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کی وجہ سے امریکی صدر کلنٹن کی کرسی چھن چلی تھی اور وہ باہر چند تقریریں کر کے شاید اس سے کہیں زیادہ رقم کما لیتا جتنی کہ اسے صدر کے طور پر خدمات سرانجام دینے پر ایک سال میں ملتی تھی)۔

آزادی ابلاغ کے قوانین کے اجراء سے سیاسی لیڈروں کے منصب اب اس قدر شفاف ہو چکے ہیں کہ جنہیں دیگر معاشرتی شعبوں کے لیڈر قطعاً قبول نہیں کرتے اور بعض ملکوں میں سیاسی لیڈروں سے انتہائی سخت اخلاقی معیارات کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ حالیہ برسوں میں فن لینڈ کے وزیراعظم جاٹین ماکی اور سویڈن کی ایک متوقع وزیراعظم مونا سالن دونوں کو کریڈٹ کارڈ اور اخراجات کے اتنے معمولی تجاوزات پر مستعفی ہونا پڑا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں شاید ان کا ذکر کرنا بھی مناسب محسوس نہ ہوتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم حکومتی سیاستدانوں سے یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ وہ ان ابہامات اور موقف کی تبدیلیوں سے بھی عہدہ برآ ہوں کہ جو ان کی کسی بد دیانتی یا بدنیتی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ان معاشروں کی سیال پیچیدگیوں سے برآمد ہوتی ہیں کہ جن کی وہ نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔

چنانچہ ہم ایک بہت نازک سا توازن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ صاحب کردار لیڈر عام زندگی کی اخلاقیات سے بعید مشکل فیصلے کریں، وہ ضروری ابہامات میں غرق نہ ہوں، یا سخت فیصلوں کو عادت نہ بننے دیں۔ (سنگاپور کے رہنما لی کوآن یو نے ایک بار...... انگریزوں کے بارے میں، اپنی حکومت کے بارے میں نہیں جو کہ تقریباً دس سال بعد بنی ...... کہا تھا کہ 'استبداد مباشرت کی طرح ہوتا ہے، دوسری مرتبہ یہ ہمیشہ آسان رہتی ہے')۔

ریاستوں کو ایسے دینوی اخلاقی جھنجٹ بھی درپیش ہوتے ہیں جو کہ صنفی اعتبار سے ان سے مختلف ہوتے ہیں جن کا سامنا افراد کو کرنا پڑتا ہے۔ ریاست کی ایک ذمہ داری سرپرست ہونے اور مستقبل کی امین ہونے کی بھی ہوتی ہے۔ اس سے بعض اوقات ریاستوں سے کیا جانے والا یہ تقاضہ مراد لیا جاتا ہے کہ وہ اپنے میزانیوں کو متوازن کریں۔ یقیناً ایسی بہت سی ریاستوں کی مثالیں موجود ہیں کہ جنہوں نے حال کی شان وشوکت کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

بدلے میں مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔

سکندر اعظم کی عسکری مہمات سے افراط زر میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ پیسے کی قیمت کم ہو کر آدھی رہ گئی تھی۔ ہٹلر جنگوں کے اخراجات زر کی پھیلتی ہوئی ترسیل سے پورے کرتا تھا اور اسے محصولات سے چڑ تھی۔ وہ بے حد و حساب نوٹ چھاپتا رہا اور مستقبل استعمال کر کے مال خریدتا رہا۔ رونالڈ ریگن جسے کہ مالی میزانیے کو متوازن کرنے کیلئے منتخب کیا گیا تھا، نے امریکہ کو دنیا کی تاریخ کے سب سے بڑے قرض خواہ سے دنیا کے سب بڑے قرض خوار میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

تاہم متوازن میزانیے کی اخلاقی صراحت کے حامیوں کی متصورہ مہارتوں سے تقریباً بالکل متضاد مالی مہارتوں نے مغربی ممالک کو خوب فائدہ دیا ہے۔ قرض اکٹھا کرنے کی صلاحیت نے برطانوی سلطنت کی فرانسیسی سلطنت کے خلاف کامیابی میں اور قرض چکانے کیلئے رقوم فراہم کرنے جیسی کینیتری پالیسیوں نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں انسانی فلاح میں بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔ ریگن کو امریکی تاریخ کی سب سے بڑی اقتصادی ترقی کا ذمہ دار مانا جاتا رہا۔

وفاداریوں کا تصادم

ریاستی اقتدار کے اخلاقی مخمصے وفاداریوں کے صدیوں پرانے سوالات پر آ کر اپنے عروج پر پہنچ جاتے ہیں اور یہاں آ کر ریاستی اخلاقیات اور ذاتی اخلاقیات کے باہم متصادم ہونے کا امکان سب سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ حکومت کو وفاداری سے تقویت ملتی ہے اور یہ غداری سے تباہ ہوتی ہے اور اس چیز کا دارومدار لیڈروں پر ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو اطاعت پر قائل کریں۔

وفاداری ہماری زندگی میں معنی رکھنے والے ہر تعلق میں اہم ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ مشترکہ تجربات، محبت اور دوستی کی کوئی اہمیت ہو خصوصاً مشکل وقت میں اور جب راستوں کا چناؤ دشوار ہو جاتا ہے۔

کسی گروہ سے تعلق کی کم از کم قیمت غداری نہ کرنے پر اتفاق ہے اور یہ قیمت ہر

allurdupdfnovels.blogspot.com

شہری یا ممبر کو ادا کرنا پڑتی ہے۔ وفاداری نہ کرنے کی سزا ملتی ہے، غداری کو ہمیشہ ایک نہایت سنگین جرم تصور کیا جاتا رہا ہے۔ وفاداری کا صلہ انعام واکرام کی شکل میں ملتا ہے اور اس کی تجدید حلف، عہد و پیمان اور پریڈوں جیسی رسوم سے کی جاتی ہے مثلاً سرکاری تعطیلات اکثر و بیشتر ریاست یا حاکم کی طرف سے وفادار عوام کو ایک انعام کے طور پر دی جاتی ہیں۔

تاہم وفاداریاں ایک دوسرے سے متصادم بھی ہو جاتی ہیں اور کوئی معاشرہ جس قدر زیادہ پیچیدہ ہوگا اس کے ارکان کے اس تصادم کا سامنا کرنے کا امکان بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔ جب لوگ مختلف وفاداریوں کے درمیان ہونے والے تصادم سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو اس سے جو صورتحال پیدا ہوتی ہے اس سے ایک بڑا دلفریب ڈرامہ جنم لیتا ہے۔ سوفوکلیز کے کھیل 'اینٹی گنی' میں کریون حاکمیت کی کلاسیکی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے 'کہ شہر جس شخص کو بھی مقرر کرے، اس شخص کی اطاعت کی جانی چاہیے، چھوٹے معاملات میں بھی اور بڑے معاملات میں بھی، حق چیزوں میں بھی اور ناحق چیزوں میں بھی، لیکن اینٹی گنی کے دل میں ایک اور وفاداری بھی ہے اور وہ ہے خاندان اور دیوتاؤں سے وفاداری۔ ہٹلر پر قاتلانہ حملہ کرنے والے فان سٹافنبرگ کے دل میں قوم کے ساتھ وفاداری فیوہرر کے ساتھ وفاداری سے بڑھ کر تھی اور غالباً جنگ کے اختتام پر جا کر رومیل کی بھی یہی سوچ تھی۔ برطانوی جاسوس کم فلبی نے اپنی قوم سے وفاداری کے مقابلے میں ایک سیاسی تحریک اور ایک غیر ملکی طاقت یعنی سوویت یونین سے وفاداری کو ترجیح دی۔ قانون میں غداری کی سزا موجود ہے مگر قانون اس چیز کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ وفاداریاں متصادم بھی ہوسکتی ہیں۔ شوہروں اور بیویوں کو عدالت میں جا کر ایک دوسرے کے خلاف بیان نہیں دینا پڑتے۔ ان کی ایک دوسرے سے وفاداری سچائی سے وفاداری کی نسبت زیادہ بڑی وفاداری ہوتی ہے۔

'جنگ اور امن' کے نویں باب 'شہزادہ آندرے درسّامین' میں ٹالسٹائی نے نپولین سے جنگوں کے دنوں میں روس کے حکمران طبقے کا عملی لینڈ سکیپ بیان کیا ہے۔ وہ صفحہ در صفحہ ہر نئے دھڑے اس کے اعتقادات، تعصّبات اور تجزیات کو بیان کرتا ہے جو کہ ایک دوسرے سے انتہائی غیر موافق ہیں۔ تمام حقیقی حکومتیں بھی اسی مانند ہوتی ہیں۔ بادی النظر میں جو چیز بڑی سیدھی سادھی محسوس ہوتی ہے قریب سے معائنہ کرنے پر اختلافات و تنازعات سے دریدہ نظر آنے لگتی ہے۔ سرپرستوں اور جماعتوں سے وابستہ وفاداریوں میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

مستقل جمع وتفریق اور قطع و برید ہوتی رہتی ہے۔ کیا ہمیں اپنے قریبی لوگوں سے وفادار ہونا چاہیے؟ یا کہ ہمیں فائدے کو مدنظر رکھ کر لمحہ بہ لمحہ جانچ کرتے رہنا چاہیے۔

کامیو کہا کرتا تھا کہ 'میں انصاف کو مانتا ہوں مگر دفاع انصاف سے پہلے میں اپنی ماں کا کروں گا'۔ لیکن لبرل روایت میں وفاداری عالمگیر اخلاقیات کے خلاف جاتی ہے۔ ولیم گوڈون کہتا ہے کہ اگر دو بچے ڈوب رہے ہوں تو بہتر ہے کہ جبلت وفاداری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس بچے کو بچا لیا جائے کہ جس سے امید ہو کہ وہ معاشرے کا کوئی بھلا کرے گا اور اپنے بچے کو چھوڑ دینا چاہیے۔ افادی اور کانٹی فلسفوں میں بھی ایک ایسے بے لاگ اخلاق کی بات کی گئی ہے جو تعلقات، مشترکہ تجربات اور تعہد سے قطع نظر ہر ایک سے ایک جیسا سلوک کرتا ہے۔ یہ فلسفے اقربا پروری اور رورعایت کو اخلاقی جرم اور پسماندگی کی نشانیاں قرار دیتے ہیں۔

زیادہ سخت اور بری حکومتیں زیادہ وفاداری کا تقاضا کرتی ہیں۔ جدید دور میں آمر حکومتیں زندگی کے وسیع مناطق کو وفاداری کی اپنی تعریفوں کے تحت لے آئیں۔ مشکوک وفاداریوں کے حامل ہر شخص کو امتیاز یا اس سے بھی سنگین سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1990ء کے عشرے میں تشکیل پانے والی جمہوری حکومتوں نے سب سے پہلے جو اقدامات کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انہوں نے غداری کے قوانین کو محدود کر دیا جس کا بڑا سبب ان قوانین کی آمریت سے نسبت تھی (اور امریکہ میں تو دوسری عالمی جنگ کے بعد آج تک کسی پر غداری کا مقدمہ تک درج نہیں کیا گیا)۔ جنگ کے دنوں کے علاوہ اگر ریاستیں وفاداری کا زیادہ شدومد سے تقاضہ شروع کریں تو سمجھ لیں کہ کوئی گڑ بڑ ہے۔

چنانچہ کیا ٹھیک ہے، اس کے متعلق دو بہت زیادہ مختلف نظریات باہم دگر متصادم نظر آتے ہیں۔ ایک نظریے کے مطابق مشترکہ کومٹ منٹ اور تجربات پر استوار کسی بھی تعلق کو وفاداری کا ایک ایسا احساس پیدا کرنا چاہیے جو کہ نہ صرف خودغرضانہ جبلتوں پر بلکہ کم از کم بعض عالمگیر اخلاقی اصولوں پر بھی حاوی ہو جائے۔ دوسرے نظریے کے مطابق ایک مرد اخلاقی کو یا تو غیرشخصی قوانین اور اصولوں کی بجا آوری کرنی چاہیے اور یا پھر جذبات سے غیر آلودہ سٹریٹیجک اہداف کے اتنے ہی غیرشخصی مجموعے کے مطابق چلنا چاہیے۔

زیادہ افراد اور ادارے ان دونوں انتہاؤں کے بین بین عمل کرتے ہیں۔ ہم جانتے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہیں کہ تمام انسانی تعلقات میں وفاداری مشترکہ تجربے اور کومٹ منٹ سے جنم لیتی ہے اور ان کی شدت سے تشکیل پاتی ہے، تصادموں سے اسے ضعف پہنچتا ہے اور ان کی شدت سے یہ تشکیل پاتی ہے، اور یہ اس چیز کے معنوی حساب کتاب سے زیادہ ہوتی ہے کہ اس میں کس قدر زیادہ جمع ہوا ہے اور کس قدر زیادہ نکالا گیا ہے۔ وفاداری کو اچھے کردار کی نشانی بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسا آجر جس کیلئے آپ نے بیس سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک کام کیا ہو آپ سے وفاداری کی توقع کرسکتا ہے مثلاً یہ کہ اس کے رازوں کو راز ہی رکھا جائے، اس کے بارے میں ادھر ادھر بیٹھ کر غلط سلط باتیں نہ پھیلائی جائیں اور اس کے کاروبار یا ادارے کے مفادات کی نگہداشت کی جائے۔ ایسی جماعت جس میں شامل ہوئے آپ کو بیس یا پچیس سال ہوگئے ہوں آپ سے توقع کرسکتی ہے کہ آپ اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں اور بات بے بات اسے چھوڑ کر کسی اور جماعت کے ساتھ نہ مل جائیں۔ کسی جمعیت کا قائد مشکل اوقات میں سرمائے کے کم از کم کچھ حصے سے فائدہ اٹھانے کی توقع رکھتا ہے۔ ان صورتوں میں وفاداری کی جڑیں ازلی زمانوں بلکہ ہمارے حیاتیاتی کردار سے جاملتی ہیں کیونکہ شروع کے زمانوں میں اگر کوئی گروہ اپنے ارکان کی ضروریات پوری کرتا اور اسے تحفظ فراہم کرتا تھا تو وہ وقت آنے پر ان سے کچھ مانگ بھی سکتا تھا۔ چونکہ یہ انتہائی ذاتی تعلقات وہ بیج ہیں جن سے دوسرے اخلاقی اصول نکلتے ہیں ہم کسی ایسے شخص پر اعتبار نہیں کرتے جو کہ ذاتی اور انسانی تعہدات و فرائض کو تج کر کسی تجریدی اصول کو ترجیح دینے لگتا ہے اور ایسے شخص پر ہمیں اعتماد کرنا بھی نہیں چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ کسی سرکاری ادارے کا ایک خاصہ یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ عادل اور غیر جانبدار ہو اور ذاتی تعلقات اور وفاداریوں کو نظر انداز کردے۔

راستوں کے انتخاب میں دشواری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی ایسی چیز کہ جس سے ہم وفادار ہوں، لا اخلاقی طرز عمل کا مظاہرہ کرنے لگے یا ایسے طرز عمل کا مظاہرہ کرنے لگے جسے ہم پسند نہ کرتے ہوں۔ لازمی نہیں کہ کسی حکومت یا کاروباری ادارے کیلئے کام کرنے والا کوئی ذی شعور شخص ہمیشہ اس کی بعض پالیسیوں اور وتیروں سے اتفاق کرے۔ وہ اختلاف بھی کرسکتا ہے اور تحفظات کا اظہار بھی۔ ایسے افراد کو سیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کہاں تک انحراف کریں مثلاً یہ کہ وہ کتنا بول سکتے ہیں اور کس سے اور کب بول سکتے ہیں، وہ اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

اختلافی موقف پر کب تک قائم رہ سکتے ہیں اور ان کے ساتھی ان کے اس موقف کو کب تک برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ ان کے اس ڈٹے رہنے سے اس پالیسی کے نقصانات میں کسی حد تک کمی ہوسکتی ہے کہ جس کی وہ مخالفت کر رہے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ وفاداری تقاضے کرتی ہے کہ تنقید کو آپس میں رکھا جائے، لوگوں تک بات نہ پھیلائی جائے اور ہر ممکن حد تک ضبط سے کام لیا جائے مثلاً ویت نام جنگ کے عروج کے دنوں میں ہو برٹ ہمفرے اور رابرٹ میکنا مارا دونوں نے اپنے احباب کو بتا دیا تھا کہ ان کے استعفیٰ نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جنگ کو مزید بڑھانے کے دباؤ کو روکنا چاہتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ لگانا بہت آسان ہے کہ انہیں اپنی یہ پالیسی اور اپنے عہدوں اور حیثیتوں پر قائم رہنے میں کیا بہتری نظر آتی تھی۔ تاہم اگر اب ہم ان حالات و واقعات کا تجزیہ کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ استعفیٰ دے دیتے تو یہ زیادہ دیانتداری کی بات ہوتی اور اس میں لوگوں کا زیادہ بھلا تھا۔

دانا لیڈر اپنے مشیروں میں مباحثے اور تنقید کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ وفاداری کی ترغیب دیتے ہیں، خوشامد یا چاپلوسی کی نہیں اور وفاداری کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ حقائق کے بارے میں دیانت داری کا مظاہرہ کیا جائے اور حق کی بات کی جائے۔ نویں اور دسویں صدی کے ابتدائی دور میں حکومت کرنے والے چینی شہنشاہ تائی ژونگ کا مشیر اعلیٰ وی ژینگ اس کی ایک بڑی عمدہ مثال ہے۔ وے ژینگ پہلے ولی عہد شہزادے کا چیف آف سٹاف تھا جس کا اس شہنشاہ نے غداری کے الزام میں سر قلم کر دیا تھا۔ جب شہنشاہ نے وے ژینگ کا انٹرویو کیا تو اس نے جواب میں صرف یہ عرض کیا: 'اگر شہزادہ حضور نے آپ کو ہٹانے کی میری بات مان لی ہوتی جو کہ میں نے بہت عرصہ پہلے کی تھی تو ان کے ساتھ جو ہوا وہ نہ ہوتا'۔ شہنشاہ نے اسے فوراً ملازمت میں لے لیا کیونکہ اسے اسی قسم کی صاف گوئی کی ہی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

یہ بات فوج اور کاروبار جیسے سادہ شعبوں کے سربراہوں میں تو اتنی نظر نہیں آتی لیکن محسوس ہوتا ہے کہ سیاسی لیڈر خود اپنے گرد مختلف افکار و آراء کے لوگ جمع کرتے ہیں تا کہ انہیں مختلف قسم کی آراء اور مشورے میسر آ سکیں اور وہ ان میں سے بہتر مشورے کا انتخاب کر کے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس قدر زیادہ داخلی پراگندگی و انتشار کی ضرورت کسی کو بھی

allurdupdfnovels.blogspot.com

نہیں ہوتی جتنی کہ نازیوں کے وقت جرمن ریاست کی بالائی صفوں میں پائی جاتی تھی اس میں مقابل اداروں، وزیروں اور ٹاسک فورسوں کی کھچڑی پچی ہوئی تھی، تاہم مخصوص قسم کے کاروباری اداروں میں مراتب کی جو ترتیب و تنظیم اور ذمہ داریوں کی سیدھی سیدھی حد بندیاں دیکھنے میں آتی ہیں، سیاست وحکومت میں ان پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں اتنی لچک اور قوت نہیں ہوتی کہ وہ ان غیر یقینی حالات اور تغیرات کا مقابلہ کر سکیں کہ جن کا سامنا حکومتوں کو پرآشوب وقتوں میں اکثر کرنا پڑتا ہے۔[13]

ہر شخص کیلئے ایک حتمی حد بندی ہوتی ہے جس سے آگے اس کیلئے وفا دار رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسا تب ہوتا ہے جب بلند تر مقاصد کی وفاداری سامنے آ جاتی ہے۔ ایک ایسے شخص میں کہ جس میں ایسے خطوط اور حدود کی کمی ہوتی ہے اس میں اخلاقی عامل ہونے والی بات ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ یہاں آ کر ہماری پرورش کرنے والے وسیع تر گروہ کا حق ہم پر غالب آ جاتا ہے۔

ذرائع کی دبدھا:

متصادم وفاداریوں کی دبدھا کے ساتھ یہ مخمصے بھی آ جاتے ہیں کہ کون سے طریقے جائز ہیں اور کون سے طریقوں سے کام نکالا جا سکتا ہے۔ صرف اچھے ارادوں کا ہونا یا اخلاقی اصولوں پر عمل کر لینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اگر قوم کی فلاح وتحفظ کا مقصد پورا نہ ہو سکے تو ایسے ارادوں اور اصولوں کا فائدہ؟ چنانچہ ایک اچھے خادم کو اپنے اہداف کی جستجو کرتے وقت ذرائع کے متعلق لچک دار طرز عمل اختیار کرنا پڑتا ہے۔

چین کے سالار اعلیٰ ہوسنگ شیان کے طرز عمل کو سوچ اور تکنیک کی اس لچک کی ایک عمدہ مثال کے طور پر پیش کیا سکتا ہے جس کی لیڈروں کو اکثر و بیشتر ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ہو نے 1550ء کے عشرے میں چین کے جنوبی ساحلوں پر قزاقوں کے خلاف لڑائیوں میں چینی لشکر کی قیادت کی تھی۔ اسے ایک عظیم فوجی سالار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایک مورخ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ فتح حاصل کرنے کیلئے کن کن چیزوں کو بروئے کار لاتا ہے:

شاہی وقار، معافی کی پیشکش، مربیانہ دوستی، جھوٹی گواہی، زہریلی شراب، اخلاقی

allurdupdfnovels.blogspot.com

اصول، غلط مخبری، لیت و لعل، حسین عورتیں، خوبصورت وعدے، رشوت، ضیافتیں، دھمکیاں، خوف و ہراس، جھوٹ، جھانسا، قتل اور دشمنوں کو تباہ کرنے کیلئے سپاہ کی صف بندی۔[14]

اس فہرست میں اخلاقی اصول، زہریلی شراب اور غلط مخبری کے درمیان آتے ہیں۔ زیادہ اہمیت نتائج کی ہوتی ہے اور ہوجن نتائج کیلئے جدوجہد کر رہا تھا وہ تھے قوم کی محافظت اور اس کی فلاح۔

طریقوں اور اہداف کے درمیان اور بے لچک اصولوں اور قاعدوں اور لچک کی احتیاج کے درمیان تناؤ سیاق و سباق، تناسب اور ممکنہ حرکی اثرات کو مدنظر رکھ کر ہی حل کیے جا سکتے ہیں۔ ہنگامی حالات میں اصولوں اور آزادیوں کو معطل بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی آئین میں ہنگامی حالات میں بلا وارنٹ گرفتاری اور مارشل لاء کی واضح گنجائش بھی موجود ملتی ہے۔ ریپبلکن پارٹی سے تعلق رکھنے والے کانگرس کے ایک بزرگ رکن ذیل ملر نے جب2004ء میں یہ کلمات کہے تھے تو اس نے درحقیقت خطرات کے ایک مشترک ردعمل کو آواز دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ درپیش عوامی خطرے نے ایک اعتبار سے تمام نجی منصوبوں اور تمام نجی زندگیوں کو منسوخ کر دیا ہے۔

ایسے کسی بھی دعوے سے تناسب اور تاریخی تناظر کے سوالات جنم لیتے ہیں، امریکہ ملر کی اس تقریر سے تین سال قبل ایک انتہائی کربناک دہشت گرد حملے کے تجربے سے گزرا تھا جس میں نیو یارک کا عالمی تجارتی مرکز جل کر خاکستر ہو گیا تھا لیکن دشمن توقع سے کمزور نکلے۔ اس کی قیادت، مراکز اور اطلاعاتی رابطے درہم برہم ہو چکے تھے اور امریکہ کو درپیش خطرہ تاریخی معیارات (1940ء کے عشرے میں جاپان اور1960ء کے عشرے میں سوویت یونین کی طرف سے درپیش خطرات کے مقابلے میں) اور بین الاقوامی معیارات (بہت سے دیگر ممالک حملے اور دہشت گردی کے اس سے کہیں زیادہ پریشان کن خطرات سے دوچار تھے) کے مطابق بہت معمولی تھا۔[15] معمولی حالات میں جو لیڈر آزادیوں پر قدغن لگانے کی سوچتے ہیں ان پر اشتباہ کی گنجائش زیادہ نکلتی ہے۔ اکثر و بیشتر اسے ایسے اقدامات کے جواز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو عوامی مفادات کے منافی ہوتے ہیں اور ان کی مضرت رسانی جلد یا بدیر ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اگر صورت حال واقعی بہت نازک ہو چکی ہو تو تقریباً کسی بھی اصول کی تعطلی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قدرتی آفات یا جنگ کی صورت

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں جب کوئی نہ کوئی مقاصد ایسے ضرور ہوتے ہیں جنہیں ذرائع کا جواز بنایا جا سکے۔

عقلمند معاشرے ایسے قوانین بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے وہ خود کو بچا سکیں اور لیڈروں کو بھی بار بار تجاوز کرنے سے باز رکھ سکیں۔ تشدد اس کی اچھی مثال ہے۔ بہت سی صورتیں ایسی ہیں جن میں لگتا ہے کہ تشدد جائز ہے۔ اس کی ایک کلاسیکی مثال ایک ایسے دہشت گرد کی ہے جس نے کہیں ایک بم لگا رکھا ہے جس کے پھٹنے میں کچھ دیر باقی ہے اور اس پر تشدد کرنے سے بہت سی جانیں بچائی جا سکتی ہیں۔ لیکن خطرہ اس میں ہوتا ہے کہ اگر ریاست کو ایسے طریقے استعمال کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو وہ بڑی آسانی سے عادت میں بدل سکتے ہیں اور جب وہ عادت بن جائے نہیں تو پھر انہیں ان افراد کے خلاف بھی استعمال میں لایا جا سکتا ہے کہ جن سے ریاست کو تو خطرہ ہوتا ہے لیکن عوام کو کوئی خاص خطرہ درپیش نہیں ہوتا۔ اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ عادتیں حکمرانوں کو مزید بگاڑتی چلی جاتی ہیں اور وہ قوم کے خادموں کے طور پر زیادہ قابل بھروسہ نہیں رہتے۔

یہ نتائجیت پسندانہ دلائل ہیں، بنیادی اصول کے دلائل نہیں۔ امریکہ کے معاملے میں اس بنیادی اصول کی کوئی دلیل نہیں کہ بم گرانا اور شہریوں کو مارنا کیوں قابل قبول ہے اور تشدد استعمال کرنا کیوں جائز نہیں۔ نو گیارہ کے بعد افغانستان اور دنیا کے دیگر حصوں سے گرفتار کیے گئے قیدیوں پر تشدد کو جن اسباب کی بنا پر ناجائز قرار دیا گیا وہ تناسب اور حرکی اثرات کے مباحث پر مبنی تھے مثلاً ایک خوف یہ بھی تھا کہ اختیار کردہ طریقے کہیں ان مقاصد کو نقصان نہ پہنچا دیں کہ جن کے حصول کیلئے انہیں استعمال کیا جا رہا ہے۔

سچائی کے معاملے میں لچک کے ضمن میں بھی اس طرح کے مسائل آ جاتے ہیں۔ حاکمیت وحکومت جہاں بھی ہو (بشمول والدین کی) اس میں کچھ نہ کچھ دھوکہ دہی آ ہی جاتی ہے اور صاف جھوٹ تو اکثر بولنے پڑتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر جھوٹ کا کسی نہ کسی قسم کی اخلاقی دلیل سے جواز پیش کیا جا سکتا ہے خواہ یہ کتنا ہی سچا کیوں نہ ہو، جواز کے بارے میں ضرورت سے زیادہ تحمل قوم کو صداقت اور جھوٹ کے درمیان امتیاز کی صلاحیت سے محروم کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اخلاقی پھسلن کے خلاف لنگر کے طور پر سچائی کی کچھ مطلق شرائط لاگو کر لیتے ہیں۔ مثلاً عدالتوں میں جہاں گواہوں کو حلفیہ اقرار کرنا پڑتا ہے اور یا پھر

allurdupdfnovels.blogspot.com

پارلیمانی تفتیش میں جہاں دھوکہ دہی کی افادیت یا نتائجیت پسندانہ جوازوں کو عموماً مسترد کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح کا توازن مستعدی بطور مقصد اور مستعدی بطور ذریعہ کے درمیان بھی قائم کرنا پڑتا ہے۔ برازیلی سیاست میں 'rouba mas faz' کا محاورہ ایسے سیاستدانوں کیلئے استعمال کیا جاتا ہے کہ جو ہوتے تو بدعنوان ہیں لیکن ہوتے کرنی والے ہیں۔ وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ اس چیز کہ جو اخلاقی اصولوں پر ٹھیک بیٹھتی ہے اور اس چیز کہ جو عملی طور پر کارگر ثابت ہوتی ہے کہ درمیان کوئی آٹو میٹک مطابقت نہیں ہوتی۔ بہت زیادہ اخلاقی کردار کے مالک سیاستدان غیر موثر اور ناکارہ بھی ثابت ہوا کرتے ہیں۔ پابند وقت گاڑیوں پر بدمعاش سوار ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ آپ کو اچھائی کے ایک دوسرے کے بین بین دو معانی ملیں گے۔ ایک کا تعلق اہلیت اور موثریت سے ہے اور دوسرے کا اخلاقی اصولوں سے ۔بعض اوقات دونوں میں ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے اور حکومت کی غلط کاریوں کے خلاف عمل میں لائی جانے والی بہت سی تحقیقات یہ آنکنیکی کوشش کرتی ہیں کہ آیا مناسب توازن کا خیال رکھا گیا تھا کہ نہیں مثلاً جب سرما2005ء میں لندن کے ایک زیر زمین ریلوے اسٹیشن پر پولیس نے ایک برازیلی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا تو کیا پولیس خودکش حملہ آوروں کے خلاف فیصلہ کن اقدام اور معصوم لوگوں کے حقوق زندگی کے متصادم واجبات کو صحیح طرح سے آنک رہی تھی؟ جب حکومت کو تیز رفتاری اور فیصلہ کن طریقے سے اقدامات کرنے پڑتے ہیں تو ان کے پاس سننے اور اس بات پر سوچ بچار کرنے کا بہت کم وقت ہوتا ہے کہ ان اقدامات کے اخلاقی مضمرات کیا ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ بعد میں عمل میں لائی جانے والی بہت سے تحقیقات میں عام طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اس موقع پر اخلاقیات کو بہت کم ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا۔

تاہم موثریت کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے۔ ولیم گلیڈ سٹون کا اپنے افسروں کو حکم تھا کہ وہ کاغذ کے دونوں طرف لکھا کریں اور اس کا عقیدہ تھا کہ پیسہ خواہ لوگوں کی جیبوں میں انڈے دیتا رہے، لیکن ریاست کو یہ پیسہ خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ حکومت جو دولت اور وسائل کو اللے تللوں میں ضائع کرتی ہے اور وہاں نہیں لگاتی کہ جہاں اس کی سخت احتیاج

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہوتی ہے اور وہ حکومت جو ضرورت مند شخص کی بجائے کسی دوسرے کی سیوا کی تحریص کا شکار ہوتی ہے اس کا طرزِ عمل صریحاً غیر اخلاقی ہوتا ہے خواہ وہ جتنی بھی اعلیٰ صفات کے حامل ہونے کی دعویدار ہو۔

تاہم مستعدی کی جستجو ایک اور طرح کا اخلاقی دام بھی پیدا کرتی ہے خصوصاً جب یہ ذرائع کی بجائے خود ایک مقصد بن جاتی ہے۔ امریکی محکمہ دفاع پنٹاگون کے جن منصوبہ سازوں نے bang for buck کا محاورہ ایجاد کیا تھا ان کی اس سے واقعی یہی مراد تھی۔ انسان شک میں پڑ جاتا ہے کہ آیا انہیں درست یا نادرست فرشی بمباری کے اخلاقی یا غیر اخلاقی پہلو کا بھی کوئی پاس تھا۔ اس بات کا خدشہ ہر وقت موجود ہوتا ہے کہ مستعدی و قابلیت میں اضافے کیلئے وضع کردہ نظام ان نظاموں سے وابستہ افراد کو اخلاقی طور پر خصی کر دیں گے کیونکہ ان سے اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے افراد اکثر و بیشتر مقاصد اور بیوپاروں کے چکر میں پڑے رہتے ہیں اور بقیہ سب افراد کمیرے بن جاتے ہیں جن کا م فقط احکامات کی تعمیل اور قواعد کی پیروی کرنا ہوتا ہے۔ یہ بات آج کے اس زمانے پر خاص طور پر صادق آتی ہے جس میں 'بہترین پریکٹس' کا مفصل نسخہ بیان کرنا اور کارکردگی کی فوری نگرانی اس قدر آسان ہوگئی ہے۔ مستعدی و قابلیت ایک اخلاقی عذر اور احتساب اور آنک سے فرار کا ایک طریقہ بھی بن سکتی ہے جیسا کہ یہ ان افسروں اور فوجیوں کے لئے بنی کہ جنہوں نے جنگ عظیم دوم میں اپنی کارستانیوں کا عذر یہ کہہ کر پیش کیا کہ جناب ہم تو صرف اوپر سے ملے احکامات کی تعمیل کر رہے تھے۔

شیطانی دلیلیں

اگر ہم حکومت اور اخلاقیات کی بحث کریں اور 'شیطانی دلائل' کا ذکر نہ کریں تو بات بنتی نہیں۔ یہ وہ تحریصات ہیں جو کسی بھی بڑے صاحب اقتدار خصوصاً انفرادی لیڈروں کی گھات میں بیٹھی ہوتی ہیں۔ یہ تحریصات اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ اہل اقتدار زیادہ کامیابی سے سب کچھ کر لیتے ہیں۔ ہمیں ادب میں ایسی تحریصات کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں لالچ، حرص، نفرت جیسی شخصی برائیوں اور نیرو اور گیئرنگ کی زندگی سے منسوب تکبر جیسی

allurdupdfnovels.blogspot.com

برائی کی تحریصات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں اکثر و بیشتر سٹالن اور ماوزے تنگ جیسے آمروں کی سرد شقاوت سے منسوب لا اخلاقی طریقوں کے استعمال کی تحریصات بھی شامل ہیں۔

وہ لیڈر جو واقعی کسی حاضر و ناظر اور عادل خدا پر یقین رکھتے ہیں ایسی تحریصات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں (اگرچہ اس بات کا ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا کہ کسی مذہب کو ماننے والے لیڈر منکرین کی نسبت زیادہ حدود و قیود کا خیال رکھتے ہیں) لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی ایسا شخص جو کسی مذہب پر ایمان نہیں رکھتا، وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں پر عمل کیونکر کرے گا؟ کرسی پر براجمان کوئی شخص کسی تصوراتی بالا تر ہستی یا کسی ان دیکھے خدا کے سامنے سر کیونکر جھکائے گا۔ کسی ایسی ہستی کے آگے کہ جس کے بارے میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ ہے بھی یا کہ نہیں، یا وہ کسی ایسی تاریخی تنقید کو خاطر میں کیوں لائے گا جو اس کی ہڈیاں خاک میں ملنے کے بعد کہیں جا کر ہو گی؟ اور جو بھی ہو تاریخ میں تو یقیناً فرض شناس اور رحمدل حکمرانوں کی بجائے سکندر، نپولین، سٹالن اور ماؤ جیسے کرشماتی، جری اور ہیبت ناک رجال کو ہی یاد رکھا جاتا ہے اور انہیں ہی عزت ملتا ہے؟

میکیاولی کے ان اثر آفرین فقرات کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے جس میں وہ بتاتا ہے کہ یہ توقع کرنا کیوں عبث ہے کہ حکومت اچھی ہو گی؟ وہ کہتا ہے ریاستیں دروغ گوئی، قتل و غارت اور دھوکہ دہی بھی کر سکتی ہیں اور انہیں اپنی بقاء کیلئے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو سیسرو کے بیان کردہ اس نظریہ بشریت کا سرے سے ہی منکر ہے کہ نیکی (سیسرو کی 'اخلاقی فرض' میں چار بڑی نیکیوں دانائی، بہادری، انصاف اور اعتدال کا ذکر ملتا ہے) کی پیاس سے فتح و کامرانی بھی حاصل ہو جاتی ہے اور مقدر ہم پر مہربان ہو جاتا ہے۔ میکیاولی کہتا ہے کہ فتح تو کیا یہ الٹا آپ کے زوال کا باعث بن سکتی ہیں۔ حکمران کو جن سبقوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ حقیقت سے حاصل ہوتے ہیں خیالی اصولوں سے نہیں، لوگوں کو یا تو خوب عیاشی کرانی چاہیے اور یا انہیں بے دردی سے کچل دینا چاہیے کیونکہ اگر تو انہیں معمولی گھاؤ لگاؤ گے تو وہ بدلہ لینے کی کوشش کریں گے لیکن اگر بڑا سا گھاؤ لگاؤ گے تو وہ اٹھ ہی نہیں سکیں گے۔ وہ کہتا

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہے کہ اگر ظلم ہو تو نظر بھی آنا چاہیے کہ ظلم کرنے والا کون ہے۔ اس سلسلے میں میکیا ولی چیزارے بورجا کے ایک وزیر کے قتل کی مثال دیتا ہے جس سے لوگ خوف و ہراس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس نے اسباق کو نتائجیت پسندی کے طور پر پیش کیا ہے: ضروری ایذا جلدی اور تیزی سے پہنچاؤ تاکہ ہر روز تکلیف نہ پہنچانا پڑے۔ ایسا طرزِ عمل اختیار کرو کہ لوگ آپ سے خوف کھائیں لیکن ایسے انداز سے کہ وہ نفرت نہ کریں۔ اگر کوئی وعدہ پورا کرنے سے آپ کا نقصان ہو تو کبھی بھی وہ وعدہ پورا نہ کرو اور اگر آپ کے اختیار میں ہو تو کوشش کرو کہ لوگ آپ سے محبت کرنے کی بجائے آپ سے ڈر محسوس کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی سے اصولوں یا قدروں کی پرواہ مت کرو۔ حالات کے ساتھ ساتھ خود بھی بدلتے جاؤ کیوں کہ قسمت ایک طوفانی دریا ہے۔

یہ ایک فرحت بخش فلسفہ ہے۔ اس میں تہذیب کی بندشوں سے آزاد ایک منہ زور شقاوت، احساس قوت اور زندگی کے جواہر سے ایک پر خطر ربط کی گنجائش موجود ہے۔ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ بعض حکمران طاقت کے اس برہنہ جواز سے گدگدی محسوس کرتے ہیں اور اس کی مدد سے ضمیر کے تقاضوں کو مسترد کرنے میں آسانی محسوس کرتے ہوں۔(16) اس میں بھی کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ بہت سے اخلاق پسند حکومتوں کی طرف دیکھ کر وہ تکلیف محسوس کرتے آئے ہیں کہ جو ملٹن کو یہ دیکھ کر ہوئی تھی کہ وہ شیطان کہ جس کی اس نے 'جنت گم گشتہ' میں تصویر کشی کی تھی وہ تو اس درشت، خشک اور غضبناک خدا کی نسبت بہت جاندار اور کامل شے نکلا کہ جس کے بارے میں وہ لکھتا چلا آیا تھا۔

حکمرانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں احسان مندی سے یاد رکھے جانے کا امکان نہیں ہے۔ جمہورتیوں میں یہ ایک بڑا چلن ہے کہ حکمران جماعتوں کو کامیابی کا صلہ کم ہی ملتا ہے۔ اہمیت صرف اس چیز کی ہوتی ہے کہ وہ مستقبل کیلئے کیا پیش کر رہی ہیں۔ ناشکری سیاست کے خمیر میں شامل ہے۔ ایک کرائے کے جرنیل کی ایک کہانی مشہور ہے نا کہ اس نے سائینا

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے شہر کو کیسے بچایا تھا۔ اس پر شہریوں نے کیا کیا کہ وہ کچھ دنوں تک تو سوچ بچار کرتے رہے کہ جرنیل کو کیا اعزاز دیں اور پھر وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اسے قتل کر کے ولی بنا دیتے ہیں۔ تمام حکمرانوں کو لاشعوری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کو ان کا مقدر بھی یہی ہونا ہے۔ چنانچہ خود کو طرح طرح کی غیر ضروری پابندیوں میں باندھنے کا فائدہ؟

لہٰذا اقتدار کی تحریصات کا جدید جواب انفرادی استقلال یا نامور مفکروں کی نصیحتوں میں نہیں بلکہ نظاموں کے استدلال یعنی ان ڈھانچوں، بندشوں اور عادتوں میں ہے جو شیطانی دلائل کی دھار کو کند کرتی ہیں، انہیں شرمسار کرتی ہیں، ان کو ایک حد میں رکھتی ہیں اور انجام کار انہیں ناقابل تصور بنا دیتی ہیں۔ یہ نظام ہی ہیں جن کی مدد سے ہم ابونصر الفارابی کے آدرشوں تک پہنچ سکتے ہیں اور اس قسم کے علم، کردار اور صفات پر مبنی حکومتیں بنا سکتے ہیں کہ جن سے ہمیں حقیقی خوشی مل سکے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 8

بغاوت اور انقلاب

’آزادی کیسے حاصل ہوتی ہے؟ یہ لی جاتی ہے، آزادی دیتا کوئی نہیں۔ آزاد ہونے کیلئے آپ کو پہلے آزادی کے حقوق جتانا پڑتے ہیں‘۔ (سلمان رشدی)

امریکی انقلاب کے کچھ ہی عرصہ بعد ڈینئل شہر اور میسا چوسٹس کے قریب کسانوں کے ایک گروہ نے نئی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ انہیں عدالتوں کی طرف سے کی جانے والی بدسلوکی کا غصہ تھا۔ انہیں سرکاری افسروں کو دی جانے والی بڑی بڑی تنخواہوں اور سزا کے طور پر کسانوں پر لگائے جانے والے لگان کا بھی رنج تھا۔ ستمبر 1786ء میں ہوا کیا کہ شییس اور چھ سو کے قریب مسلح کسانوں نے سپرنگ فیلڈ کی عدالت پر دھاوا بول دیا۔ اس واقعے کے چند ہی ماہ بعد انہوں نے ایک اسلحہ خانے پر حملہ کر کے اسے بھی لوٹ لیا لیکن حکومتی فوجوں نے انہیں جلد ہی زیر کر لیا اور انہیں حراست میں لے کر سزائے موت دے دی۔

انقلابی پریشانی سے اپنا سر کھجاتے رہے۔ جارج واشنگٹن نے بغاوت کے بارے میں کہا کہ یہ اس چیز کی تصدیق ہے کہ لوگوں کو جو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنا انتظام خود نہیں چلا سکتے۔ ٹامس جیفرسن کا نقطہ نظر بہت مختلف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گاہے گاہے چھوٹی موٹی بغاوت کا فائدہ ہوتا ہے اور آزادی کے درخت کو محبّ وطن افراد اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

آمروں کے خون سے گاہ بگاہ تر و تازہ کرتے رہنا چاہیے کیونکہ یہ اس کی قدرتی کھاد ہے۔[1]

اس کی بات کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ ریاستیں نظم و نسق کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ ان کا اخلاقی معیار بغاوت کا مرہون منت ہوتا ہے جو اسے اپنے فرائض یاد دلاتی رہتی ہے اور ٹھہراؤ، جمود اور بے حسی کا تدارک کرتی رہتی ہے۔ اس باب میں بغاوت و انقلاب کو اخلاقی وظائف کے طور پر لیا گیا ہے۔ اس میں اس حقیقت کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے کہ امریکہ، چین، روس اور فرانس کے بشمول دنیا کے بہت سے طاقتور ممالک پر ایسی حکومتیں کیوں حکمران ہیں جو انتہائی پر تشدد انقلابات کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔

بیشتر بشری تاریخ میں بغاوت کو بری حکومتوں کے خلاف واحد موثر ردعمل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بہت سی روایات میں اس امر کو مدتوں سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ حکمرانوں اور عوام کے مفادات میں اختلاف ہوتا ہے اور مفکرین کی ایک کثیر تعداد نے اس چیز کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ بغاوت بپا کرنا اور برے حاکموں کا تختہ الٹنا کس صورت میں جائز ہے۔ قدیم چین میں کنفیوشس مت کا ایک بنیادی اصول یہ رہا کہ شہنشاہ کا تاج و تخت اس کے اخلاقی خصائل کا مرہون منت ہوتا ہے۔ مینگزے سے چلنے والی ایک روایت کے مطابق اگر کسی اخلاق باختہ حاکم کے ہاتھ سے آسمانی مینڈیٹ جاتا رہے تو عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کا تختہ الٹ دیں۔ مینگزے بادشادہ کا ذکر ایک ایسے نمائندے کے طور پر کرتا ہے جسے آسمانوں سے لوگوں کی پر انصاف حکومت کے ذریعے خدمت کرنے کیلئے زمین پر بھیجا جاتا ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری میں ناکام ہو جائے اور رعایا پر ظلم کرنا شروع کر دے تو لوگوں کو حق حاصل ہے کہ وہ افلاک کی طرف سے اسے معزول کر دیں۔ تاہم کنفیوشس مت کے پیروؤں کے نظریے میں لحاظ کا عنصر زیادہ ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے حکمران کو اخلاق کی راہ دکھلائیں۔ قدیم ہندوستان میں 'مہا بھارت' نے ایسے حکمران کے خلاف بغاوت کو جائز قرار دیا ہے جو لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہو جائے یا ان پر ظلم کرنے لگے اور 'دھرم شاستر' نے بادشاہوں کو ایسے خادم قرار دیا جنہیں نا اہلی کی صورت میں ہٹایا جا سکتا ہے۔[2] بال گنگا دھر تلک (ہندوستان میں شورش کا بانی) نے بھی انہی رعایات سے استفادہ کرتے ہوئے انیسویں اور بیسویں صدی میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

سلطنت برطانیہ کے خلاف پر تشدد سیاسی عمل کی تبلیغ کی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب دھرم کے نظام میں لوگوں کو تحفظ دینے کی صلاحیت نہ رہے تو لوگوں کو تشدد اور جوش و جذبے لیکن بے لاگ انداز میں جدوجہد کرنی چاہیے تا کہ جب مسئلہ حل ہو جائے تو ان کا جوش و جذبہ بھی ٹھنڈا ہو جائے۔ یہ دلائل ہندوؤں کی مقدس ترین کتاب 'بھگوت گیتا' پر مبنی ہیں جس میں ایک ایسا خانوادہ دکھایا گیا ہے جس کا اخلاقی نظام (دھرم) ایک دفعہ درہم برہم ہو کر پھر تشکیل نو کے عمل سے گزرتا ہے۔

اسلامی روایت زیادہ قدامت پسندانہ ہے اور اس میں نسبتاً بہت کم روایات ہی ایسی ملتی ہیں جو کہ بغاوت کو جائز قرار دیتی ہیں کیونکہ اسلام میں جائز حکومت کا واحد ماڈل خلافت ہے جو نبیؐ کی جانشینی میں آگے چلتی ہے۔ بعض اوقات یہ تصور بہت ہی قدامت پسندانہ رنگ اختیار کر جاتا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کا ایک بارسوخ مسلمان مفکر الماوردی لکھتا ہے کہ 'ہزار سالہ جبر ایک رات کی انارکی سے بہتر ہے'۔[3] بغاوت صرف اسی صورت میں جائز ہے کہ اگر حکمران اسلامی اصولوں سے انحراف کرے۔[4] تاہم شیعہ اسلام میں واقعہ کربلا کے بعد سے باغیوں کی بہت مدح وتحسین کی جاتی رہی جب کوفہ میں چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ کے قتل ناحق کے چند ماہ بعد ان کے فرزند حسینؓ امویوں کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ شیعہ مسلک کے پیرو نسل درنسل حکمرانوں کے خلاف اپنی جد و جہد میں اس واقعے سے تحریک حاصل کرتے رہے ہیں۔ اس کی ایک حالیہ مثال 1978ء میں ایران میں بپا ہونیوالا اسلامی انقلاب ہے۔

قرون وسطیٰ کے بعض مسلم نظریہ دانوں نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ خلیفہ کے اردگرد کے صاحب اقتدار لوگوں اور ان علماء وفقہاء کے درمیان تناؤ پیدا ہوسکتا ہے جنہیں کہ شرعی قوانین کا سب سے زیادہ علم ہوتا ہے اور جو ان کی بہترین تاویل کر سکتے ہیں۔ لیکن عوامی حاکمیت کے تصور کو مناسب خیال نہیں کیا جاتا رہا کیونکہ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ خدا کے علاوہ بھی کوئی حاکمیت اعلیٰ کا حامل ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 2005ء کے برطانوی انتخابات کے موقع پر مشرقی لندن میں مسلم مظاہرین نے انتخابی امیدواروں پر حملہ کر دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ انتخابی عمل بذات خود اسلام کی خلاف ورزی ہے۔ کیتھولک عیسائیت کا رویہ بھی کچھ کم قدامت پسندانہ نہیں رہا۔ رومن چرچ اپنی پوری تاریخ کے دوران بغاوت کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

مقابلے میں نظم ونسق کی حمایت کرتا رہا ہے اور استدلال اور آزادانہ رائے کو شک کی نظر سے دیکھتا رہا ہے اور موجودہ دور تک بھی جمہوریت کی مخالفت کرتا چلا آ رہا ہے۔ ان حلقوں کے بارے میں تاہم ایک بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ ان کا موقف ہمیشہ ایک جیسا رہا ہے۔ اگر آپ ایک قادر مطلق خدا پر ایمان لے آتے ہیں تو پھر یہ سوچنے کا کیا تک بنتا ہے کہ وہ برے حکمرانوں کو نابود نہیں کرے گا۔

آج اکیسویں صدی میں آ کر جب ہم گذشتہ تمدنی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے زیادہ عجیب اور نا قابل فہم بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ لوگوں نے جابر حکمرانوں اور خادم کا کردار ادا نہ کرنے والی حکومتوں کے خلاف اتنی کم بغاوتیں کیوں کیں۔ ولیہم رائخ، جس نے کہ مارکس اور فرائیڈ، سیکس اور سیاست کے درمیانی ملگجے خطے کی بڑی چھان بین کی ہے، کہتا ہے کہ 'یہ امر اتنا وضاحت طلب نہیں کہ بھوکا چوری کیوں کرتا ہے یا استحصال کا شکار شخص سر کشی پر کیوں اتر آتا ہے بلکہ یہ امر زیادہ وضاحت طلب ہے کہ بھوکوں کی اکثریت چوری کیوں نہیں کرتی اور استحصال کے شکار افراد کی اکثریت سرکشی کا چلن اختیار کیوں نہیں کرتی'۔[5] جب ظالموں کی نسبت مظلوموں کی تعداد اس قدر زیادہ رہی ہے تو پھر وہ شورشیں برپا کیوں نہیں کرتے رہے اور ریاستوں کو خدمت کا شیوہ اختیار کرنے پر مجبور کیوں نہیں کرتے رہے؟

اس کا ایک جواب تو ذہین حکمرانوں کی وہ مہارت ہے جسے وہ عوام کو تقسیم کرنے کیلئے بروئے کار لاتے رہے ہیں تاکہ ان پر بہتر طور پر حکومت کی جا سکے (مثلاً سلطنت کے ایک حصے کی فوج کو دوسرے حصے میں بغاوت دبانے کیلئے استعمال کرنا جیسا کہ روم اور چین میں ہوتا رہا ہے)۔ اس کے ساتھ وہ طریقے بھی آ جاتے ہیں جن سے ریاستیں عوام کے ذہنوں پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہیں کہ وہ ظلم کو بھی فطری اور ناگزیر سمجھنا شروع کر دیتے بلکہ یہ بھی سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ اس کے مستحق ہیں۔ اس سے ایک تو ان کی مجہول تقدیر پرستی میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ خود کو ظالموں کے ساتھ مشخص کرنا شروع کر دیتے ہیں (اہل برطانیہ کی طرح جنہوں نے بہت جلد خود کو رومن تصور کرنا شروع کر دیا تھا)۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ لوگ بغاوتیں کرتے رہے ہیں اور ان میں وہ اکثر دوبدو مقابلے کی بجائے کمزوروں والے ہتھیار (مثلاً تاخیر، حیلے بازی، تخریب کاری، توڑ پھوڑ) استعمال کرتے

allurdupdfnovels.blogspot.com

رہے ہیں۔[6] لیکن صرف یہی بات نہیں وہ بڑے پیمانے کی خونریز بغاوتیں بھی برپا کرتے رہے ہیں جن کی انہیں انتہائی خوفناک قیمت بھی ادا کرنا پڑتی رہی ہے۔ بڑوں کی جنگوں کی نسبت کسان بغاوتوں کے آثار کم ملتے ہیں لیکن یہ بغاوتیں جس تعداد اور تواتر سے برپا ہوتی رہی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ بے کسی کی زندگی کا دباؤ ناقابل برداشت بھی بن سکتا ہے اور یہ کہ کم از کم زرعی معاشروں میں طاقت کے نظام باقاعدگی سے ایک ایسے نازک مقام تک پہنچتے رہے ہیں جس میں سب عناصر اس قدر تناؤ، میں آجاتے تھے کہ ایک واحد دھچکا، انہیں سرتابی پر مجبور کر دیتا تھا۔

اس بات کے شواہد بھی واضح ہیں کہ اگرچہ چنگاریاں سلگتی رہیں اور انہیں الاؤ جلانے کے لئے ایندھن بھی میسر آتا رہا، باغی عوام کے پاس اپنے شعلوں کو بھڑکتا رکھنے اور اپنے غصے کو مستقل اداروں میں ڈھالنے کیلئے درکار ذرائع کا عمومی طور پر فقدان رہا۔ چند ایک عمارتوں کو نذر آتش کرنے اور بڑے بڑے ظالموں کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد عموماً وہ اپنی فصلوں کی کٹائی کیلئے گھر لوٹ جاتے رہے۔ وہ ملک بانی کے ماہر چالاک مذاکرات کاروں کے پھندے میں آجاتے تھے اور پھر ان کیلئے اور کوئی چارہ باقی نہ رہ جاتا تھا۔

انگلستان کی 1381ء کی کسان بغاوت کو اس کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر جنوبی انگلستان کے کسان لندن پر حملہ آور ہوئے اور انہوں نے اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو روند ڈالا جس کے بعد انہوں نے حکام کو اپنے مطالبات کی ایک تفصیلی فہرست پیش کی۔ ابتدائی مذاکرات میں انہوں نے کرائے کی ادائیگی کے حق، جنگلات کے آزادانہ استعمال اور ان قوانین کے خاتمے کا مطالبہ رکھا جو ان کے شکار پر پابندی کیلئے عائد کیے گئے تھے۔ ان کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے گئے اور بادشاہ رچرڈ دوم نے تمام معاہدوں پر دستخط اور مہر ثبت کردی۔ لیکن اگلے دن کیا ہوا کہ باغیوں نے کامیابی کے جوش میں آ کر مطالبات میں مزید اضافہ کر دیا۔ باغی رہنما واٹ ٹائلر نے شاہی دربار کے تحت تمام عہدوں اور خطابات کو ختم کرنے مطالبہ کر دیا۔ چرچ کی املاک کے بارے میں کہا گیا کہ وہ عوام میں تقسیم کر دی جائیں اور کلیسائی عہدے ختم کر دیئے جائیں۔

یہ مطالبے بھی مان لئے گئے لیکن اس اقدام کا مطلب صرف باغیوں کو چکمہ دینا تھا

allurdupdfnovels.blogspot.com

جنہیں یقین تھا کہ بادشاہ ان کا طرفدار ہے۔ پھر ایک لڑائی میں ٹائلر مارا گیا اور اس کے سر کو ایک نیزے میں پروکر بادشاہ کے حضور پیش کر دیا گیا۔ اس پر باغی منتشر ہو گئے، پارلیمان نے تمام رعائتیں واپس لے لیں اور سینکڑوں افراد کو غداری کے الزام میں سزائے موت دے دی گئی۔

اس وقت انگریز سرکار کو اپنے کسانوں کی خدمت کی کوئی پرواہ نہ رہی۔ اسے بس ایک ہی چیز کی فکر تھی اور وہ تھی اس کی اپنی بقاء۔ اس سے آئندہ نسلوں کے باغیوں کا یہ وہم دور ہو گیا کہ جو اخلاقی بگاڑ نیچے نظر آتا ہے وہ اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز لوگوں میں نہیں ہوتا۔ 1880ء کے عشرے میں روس میں بپا ہونے والی نارودنکی تحریک کا مقصد حکومت کے مقتدر ترین شخص (زارا لیگزینڈر دوم) کو ہلاک کرنا تھا تاکہ لوگوں کے انقلابی جذبے کو گرمایا جا سکے۔ نراجیوں کا خیال تھا کہ جمود کے شکار عوام اس چیز کے منتظر ہیں کہ کسی بڑے واقعے یا متشدانہ سرگرمیوں کی قوت ان میں تحریک پیدا کر دے۔1881ء میں بدنام زمانہ بین الاقوامی نراجی کانگرس نے اپنے ارکان پر زور دیا کہ وہ تمام حکمرانوں وزیروں، شرفا، امراء، مذہبی رہنماؤں، بڑے سرمایہ داروں اور دیگر استحصالیوں، کا نام و نشان مٹا دیں اور آئندہ عشروں میں نراجیوں نے بہت سے سربراہوں کو قتل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی جن میں فرانس کا صدر، سپین کا وزیراعظم، آسٹریا کی ملکہ، اٹلی کا بادشاہ اور امریکی صدر بھی شامل تھا (اس وقت سے لے کر آج تک کسی بھی تحریک کو اس قدر کامیابی حاصل نہیں ہو سکی)۔ یہ تصور کہ بری حکومت کا زبردستی صفایا کر دینا چاہیے اور اسے شعلوں میں ڈال کر پاک کیا جانا چاہیے، موثر ثابت ہوا ہے۔ مختلف اور باہم متوازن دائروں کے حامل امریکی آئین کی طبیعات کے مقابلے میں، روس کے انقلابیوں نے اپنے اخبار کا نام 'اسکرا' یعنی 'چنگاری' رکھا تھا اور بیسویں صدی کے بیشتر انقلابی پرتشدد جدوجہد کو افہام وتفہیم اور مذاکرات سے اخلاقی طور پر بالاتر تصور کرتے رہے۔ وہ بھی قوم پرستوں کی طرح تخلیص کا اخلاقی استعارہ اختیار کر کے جس طرح بھی ان سے بن پایا ظالموں اور بدعنوان عناصر کا صفایا کرنے پر تلے رہے۔

زیادہ کامیاب انقلابیوں کا ذہن بتدریج اس بات تک پہنچا کہ احتراق پذیر معاشرے کا استعارہ بعض اوقات کچھ زیادہ ہی صحیح ثابت ہوتا ہے۔ بغاوتوں میں بھی وہی جنگوں والی حرکیات در آتی ہیں۔ جذبات آگے سے آگے بھڑکتے چلے جاتے ہیں۔ مقاصد کے حصول

allurdupdfnovels.blogspot.com

کیلئے زیادہ سے زیادہ شدید طریقوں کو جائز تصور کیا جانے لگتا ہے اور اخلاقیات جنگ کے الجھاؤ میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور پھر اسے ویسے ہی پرے پھینک دیا جاتا ہے۔ بعض باغی تو ایک وقت میں آ کر ان افراد کو ہی موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیتے ہیں جن کی کہ وہ خدمت کرنے کا دعویٰ کر رہے ہوتے ہیں اور دیگر متشدد موت کے سحر اور مصفٰی آگ کے استعاروں میں بدمست ہو جاتے ہیں۔

انقلابی حکومت کے غلط استعمال اور اس کی ناکامیوں سے توانائی حاصل کرتے ہیں، لیکن صرف بھوک، جنگ، نا انصافی یا جھوٹ کی معروضی خرابی کی وجہ سے انقلابات نہیں آتے۔ قحط اور آفات کی صورت میں بغاوت تو کیا لوگوں کے پاس اپنی بقاء کیلئے بھی توانائی نہیں ہوتی۔ 1920ء اور 1930ء کے عشروں میں جرمن کمیونسٹ یہ نفرت انگیز نعرہ لگاتے رہے کہ 'ہٹلر کے بعد ہماری باری ہے'۔ اس سے ان کی مراد یہ ہوا کرتی تھی کہ نازیوں کی درندگیاں ہماری راہ ہموار کریں گی اور اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا۔ انیسویں صدی کے وسط میں انارکی پسند رہنما بکونین نے بھی یہی روش اختیار کیے رکھی۔ اس کا خیال تھا کہ بدمعاشوں اور ظالموں کو جو وہ کرتے ہیں کرنے دیا جانا چاہیے کیونکہ ان کے 'بہیمانہ اقدامات لوگوں کو خود ہی بغاوت پر مجبور کر دیں گے'۔ دہشت پسند اکثر ایسی کارروائیاں جان بوجھ کر کرتے ہیں جس سے حکومت کو جابرانہ اقدامات کرنے پڑیں۔ اس سے حکومت کا 'حقیقی' کردار سامنے آ جاتا ہے اور لوگوں کا غم و غصہ بھڑک اٹھتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ اکثر ریاستیں بڑی آسانی سے اس پھندے میں آ جاتی ہیں۔

لیکن بیشتر ایسی تدابیر جو تبدیلی کو تیز تر کرنے کیلئے حالات کو مزید بگاڑنے یا معروضی تضادات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتی ہیں واپس ان تدابیر کو استعمال کرنیوالوں کے سر ہی پڑتی رہی ہیں (جرمن کمیونسٹوں کو ہی دیکھ لیں جنہیں اپنی سیاسی حماقت کی اس قدر بھاری قیمت چکانا پڑی)۔ (8) یا پھر یہ تدابیر معاشرے کو متشدانہ کارروائیوں اور متشددانہ ردعمل کے ایسے دھیمے توازن میں مبتلا کر دیتی ہیں جس میں کسی فریق کو بھی واضح غلبہ حاصل نہیں ہو پاتا۔ 1990ء کے عشرے کا الجیریا ایسے مہلک توازن کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ جب حکومت نے 1992ء کے انتخابات میں ایف آئی ایس کی اسلامی تحریک کی فتح تسلیم کرنے سے انکار کیا تو دونوں فریق ایک انتہائی سفاک لیکن بے فائدہ تشدد و فساد میں الجھ کر رہ گئے

allurdupdfnovels.blogspot.com

تھے۔

گذشتہ صدی کی کامیاب ترین بغاوتوں اور انقلابات نے بر سر اقتدار افراد کے اخلاقی جواز کو چیلنج کیا اور لوگوں کو قائل کیا کہ ان افراد کا متبادل ممکن ہے۔ ان میں سے کوئی انقلاب بھی دہشت سے برپا نہیں ہوا (دہشت کے ایک نتیجے کے طور پر تو سامنے آئی لیکن سبب کے طور پر نہیں)[9] اس کی بجائے بیشتر انقلابات ان وقتوں میں آئے جب روبہ اضافہ ترقی کو دبایا گیا یا اس کا رخ عارضی طور پر پیچھے کی طرف موڑنے کی کوشش کی گئی جیسا کہ سولہویں صدی کے یورپ،1917ء کے روس یا1978ء کے ایران میں ہوا۔ لوگ بے امیدی کی وجہ سے نہیں بلکہ امید محصور ہونے کے سبب سڑکوں پر نکلتے ہیں (یہی وجہ ہے کہ طلباء کے جتھے جمود کا شکار حکومتوں کیلئے اس قدر خطرے کا نشان بن جاتے ہیں) اور جب اس میں بین الاقوامی دباؤ یا حکمران طبقے کا داخلی نفاق بھی شامل ہو جاتا ہے تو ریاستیں اتنی کمزور پڑ جاتی ہیں کہ انقلابیوں کو اپنا کام دکھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ زیادہ گہری انقلابی تبدیلیاں معاشرے کی بالائی اور زیریں دونوں اطراف سے پڑنے والے دباؤ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ مارکسی عقیدہ کہ معاشرے کا صرف زیریں طبقہ یعنی مزدور اور کسان ہی انقلابی دیانت کا حامل ہوتا ہے محض ایک واہمہ ہے جسے کامیاب مارکسسٹ،لیننسٹ انقلابات کی اصل تاریخ کئی بار غلط ثابت کر چکی ہے۔ غریب اور محروم طبقوں کے افراد میں تنظیم اور نظریے کی وہ خصوصی مہارات نہیں ہوتیں جو کہ کسی بڑی حکومت کو گرانے کے لئے درکار ہوتی ہیں اور ہر حقیقی انقلاب پیشے ور طبقے کے افراد منحرف شرفا نیز مزدوروں اور کسانوں کے باہمی اتحاد کے طفیل کامیابی کی منزل تک پہنچتا ہے۔ لینن اور ماؤ کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ کاسترو ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوا۔ پال پاٹ نے ابتدائے شباب کے دن شہزادوں کی صحبت میں گزارے۔ نچلے طبقے کے افراد کیلئے ذاتی مفاد ایک کافی محرک ہوتا ہے اور اوپر والوں کو عموماً فرض کی اخلاقی حس اور ذاتی آزردگیوں کا مرکب تحریک دیتا ہے۔

انقلابات پہلے ریاست کی متوفر طاقت کو برہنہ کرتے ہیں اور اسے اکساتے ہیں کہ وہ اپنے اصل جابرانہ چہرے پر سے نقاب الٹ دے۔ پھر انہیں اس کی صحیح کمزوری دکھانی پڑتی ہے۔1968ء کے ویت نام کی ٹیٹ یلغار جیسی کارروائیاں عسکری اعتبار سے کوئی معانی نہیں رکھتیں۔ اس میں کم از کم35000 افراد مارے گئے تھے اور کوئی علاقہ بھی حاصل نہیں ہوا

allurdupdfnovels.blogspot.com

تھا۔لیکن وہ ریاست کے تحفظ اور امن و امان کی فراہمی کے اخلاقی دعوے کیلئے ایک چیلنج کے اعتبار سے معانی ضرور رکھتی ہیں۔ اسی لئے باغی خواہ تخریب کاری سے کریں یا ہڑتالوں سے، بنیادی انفراسٹرکچر پر حملہ آور ہوتے ہیں تا کہ ثابت کیا جا سکے کہ معاملات ریاست کے قابو سے باہر ہو چکے ہیں(اور ان حربوں کا رخ، جنہیں کہ عموماً بائیں بازو سے منسوب کیا جاتا ہے، ان کی اپنی طرف بھی پھیرا جا سکتا ہے جیسا کہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب امریکہ کی خفیہ ایجنسی نے1970ء کے عشرے کے اوائل میں آئندے کے چلی کے خلاف ہڑتالوں اور تخریب کاری کی پشت پناہی کی تھی) بڑے بڑے مارچ یہ دکھانے کیلئے کیے جاتے ہیں کہ ریاست متحد عوام سے دور ہو چکی ہے۔ ان سے باغیوں کو اپنی باتیں لوگوں تک پہنچانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

اس کی ایک کلاسیکی مثال ایران میں ہونے والے وہ مظاہرے ہیں جنہوں نے 1978ء میں رضا شاہ پہلوی سے حکومت چھینی تھی۔ شیعہ لوگ مردے کو سوگ کے بعد دفن کرتے ہیں۔ رضا شاہ کی پولیس مظاہرین پر جب بھی گولی چلاتی تھی، اس سے سوگ اور شورش کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔18 فروری،29 مارچ اور10 مئی کو ایک سے ایک بڑا مظاہرہ ہوتا رہا جس نے غم اور غصے کو باہم یکجا کر دیا، یہاں تک کہ1978ء کے آخری دنوں میں ماہ محرم کے دوران جلوسوں پر بلا ناغہ گولیاں برسائی جاتی رہیں جس سے 12 دسمبر کو بیس لاکھ افراد تہران کی سڑکوں پر نکل آئے اور مرگ بر شاہ کے نعرے بلند کرنے لگے۔

چونکہ بے کسی لوگوں کیلئے تکلیف دہ ہوتی ہے، بغاوت اندر ہی اندر مسلسل پکتی رہتی ہے لیکن بھڑکتی اس وقت ہے جب اسے خاص حالات میسر آتے ہیں۔ اس کیلئے موقع سے فائدہ اٹھانے والے لیڈروں کا ہونا ضروری ہوتا ہے جیسا کہ آیت اللہ خمینی تھا جس نے رضا شاہ کے خلاف بغاوت کی قیادت کی۔ اس کے لئے استبداد میں جھول واقع ہونا بھی ضروری ہے جو غالباً حکمران طبقے میں داخلی نفاق کے باعث پیدا ہوتا ہے یا جیسا کہ دسمبر1978ء میں تہران میں ہوا تھا جب شاہ کی فوج نے اپنے ہم وطنوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ بغاوت کا امکان اس وقت بھی بہت بڑھ جاتا ہے جب ریاستی جبر کے باعث عوام کے ایک بڑے حصے مثلاً دکانداروں یا تاجروں کی بہبود کیلئے اہم سرگرمیاں خطرے میں پڑ جائیں (یہ آخری نقطہ اہم گروہوں کو ریاست کے خلاف کرنے میں اکثراوقات فیصلہ کن ثابت ہوا

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہے)۔

بغاوت اور سرکشی کے اخلاقی پہلو پر کیا کہا جا سکتا ہے؟ تمام بغاوتیں نا انصافی، جبر اور استحصال کے خلاف سرکشی سے شروع ہوتی ہیں۔ آزاد پوتوں کے خوابوں کی نسبت غلام آباؤ اجداد کی یادیں لوگوں کو سرکشی پر زیادہ مائل کرتی ہیں لیکن حقیقی انقلابات اخلاقی جوش و جذبے کے ساتھ اس حساب کتاب کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ ریاست میں کیا تبدیلی آنی چاہیے اور بعض اوقات واضح، بعض اوقات دھندلی اس وژن کو بھی کہ ریاست خادم کیسے بن سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام انقلابات کا منشار یاستی خدمت کے یہی چار اہداف ہوتے ہیں۔ تحفظ (امن و امان کا مطالبہ) بہبود (مزید روٹی) انصاف (اکثر ناروا قید و بند یا ہلاکتیں بلوے بھڑکاتی ہیں) اور سچائی۔ ابتدائی انقلابات پر پہلے دو اہداف کا غلبہ رہا ..... 89 17ء کے انقلاب فرانس کی ابتداء روٹی کیلئے بغاوت سے ہوئی اور1917ء کا روسی انقلاب بھی روٹی اور امن عامہ کی صورتحال کی وجہ سے برپا ہوا۔ اس کے بعد کے بیشتر انقلابات نسبتاً امن اور خوشحالی کے پس منظر میں واقع ہوئے۔1989ء میں پراگ میں جلوسوں کے شرکاء نے 'انصاف' اور 'سچائی' والے بینر اٹھا رکھے تھے اور آج کل کے بہت سے انقلابات سچائی اور مصالحتی کمیشنوں پر منتج ہوتے ہیں جو ان دونوں اہداف کو یکجا کر کے ایک واحد عمل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

تمام انقلابات میں سچائی ہی وہ سب سے اعلیٰ و ارفع بلندی ہے جس کیلئے لوگ سب سے زیادہ زورشور سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ یقیناً کسی بھی انقلابی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی ریاست کو ویسا ظاہر ہونے پر مجبور کرنا ہے کہ جیسی وہ بیشتر اوقات ہوتی ہے ایک خود ساختہ افسانہ اکثر و بیشتر جس کی جڑیں نہیں ہوتیں اور ایک ایسا افسانہ جو غیر اخلاقی بھی ہوتا ہے اور جھوٹا بھی۔1970ء کے عشرے میں شہنشاہ ایران اور1980ء کی دھائی میں سوویت حکومت کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا (اگرچہ وہاں فیصلہ کن اقدام ایک ایسے افسانے کیلئے کیا گیا جسے کہ ٹینکوں کی مدد حاصل نہ تھی) سماجی صداقت میں اس وقت تبدیلی پیدا ہوتی ہے جب روایات کا ایک مجموعہ ختم ہوتا ہے اور اس کی جگہ کوئی اور مجموعہ لے لیتا ہے۔

انقلابی لمحات میں اہل اقتدار کی بے اقتدار لوگوں کیلئے خاموش حقارت عریاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے اور صداقتوں کی اس تبدیلی میں اپنا کردار ادا کرنے لگتی ہے۔ میری

allurdupdfnovels.blogspot.com

اینٹوائیٹ کے ان کلمات کا کہ ''اگر لوگوں کے پاس روٹی نہیں تو انہیں کیک کھانے چاہئیں' کا بڑا چرچا ہوا تھا۔ لیکن شاید جاپانی شہنشاہ ہیرو ہیٹو کی اس عرضداشت کو اتنا چرچا نہیں مل سکا جو اس نے امریکی سپریم کمانڈر میکارتھر کو لکھی اور جس میں اس نے جنرل سے کہا تھا کہ جاپان پر قبضہ زیادہ مختصر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کی رعایا کو سخت کنٹرول میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ لوگوں کے رویے بچکانہ ہیں اور ان کی 'پست ثقافتی سطح' کے سبب ان کے ذہنوں میں حقوق کے بارے میں خطرناک تصورات گھس آتے ہیں۔ تقریباً انہی ایام میں ولی عہد شہزادہ آ کی ہیٹو نے کہ جو اس وقت ایک لڑکا تھا اور بعد میں شہنشاہ بنا، نے کہا تھا کہ ہم جنگ لوگوں کے 'خود غرضانہ طرز عمل' کی وجہ سے ہارے ہیں۔ مشرقی یورپ کے اپراچک حکمران اپنے عوام کی خود کو منظم کرنے کی صلاحیت کا ہمیشہ غلط اندازہ لگاتے رہے۔ لگتا ہے انہوں نے واقعی یقین کر لیا تھا کہ وہ ناگزیر ہیں۔

انقلابات کے مواقع پر جب حکومتی گروہوں پر سے پردہ اٹھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ خود اپنے ہی افسانوں کے قیدی تھے اور خطرات کا جواب خود کو سخت بنا کر دے رہے تھے اور وہی روش اختیار کر رہے تھے جو کہ تاریخ دان ٹے او ڈور موسن نے پہلی صدی قبل مسیح کے روم کے عظیم قدامت پسند کیٹو سے منسوب کی تھی۔ کیٹو وہ شخص تھا جس نے 'جمہوریہ کو بچا بچا کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا'۔ پسپائی کی سیاست سے عہدہ برآ ہونا مشکل کام ہے: اس کا مطلب ہے لہروں سے آگے رہنے کیلئے اخلاقی پشیمانی کی عین مناسب مقدار میں عین درست رفتار سے رعائتیں دینا۔

الغرض انقلابات کے وقت ایسے وقت ہوتے ہیں جب ریاست کی علامتی دنیا دباؤ میں آ کر منہدم ہو جاتی ہے اور اس کے اخلاقی عہد و پیمان کی قلعی کھل جاتی جس سے وہ کھوکھلی نظر آنے لگتی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو ریاست اور ان لوگوں کے درمیان کہ جن کی خدمت کا یہ دعویٰ کرتی ہے، مفادات کی حقیقی خلیجیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس خلاء کو پر کرنے کیلئے کوئی شے بھی دستیاب نہیں ہوتی، کسی متبادل پروگرام کی حامل کوئی تنظیم یا اقتدار سنبھالنے کیلئے ضروری مہارات کے حامل حکمران، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ حکومت کے خاتمے کا پہلا نتیجہ انارکی اور بدنظمی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ایسے میں پرانے حاکم خلا کو پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ظاہر ہو کہ وہ ناگزیر ہیں۔ انقلابی خود بھی

allurdupdfnovels.blogspot.com

اپنے ڈھانچوں میں ریاست کی نقالی کی کوشش کر سکتے ہیں تا کہ متلاطم لہروں کو تھاما جا سکے، توانائیوں کو رام کر کے انہیں مصرف میں لایا جا سکے اور حاکمیت قائم کی جا سکے۔ لیکن اگر کسی انقلابی پروگرام کی حامل کوئی جماعت حکومت سنبھالنے کیلئے تیار بھی بیٹھی ہو تو اس میں ان پیچیدہ مہارتوں کا لازمی طور پر فقدان ہوتا ہے جو کہ موثر طریقے سے حکومت چلانے کیلئے درکار ہوتی ہیں۔ اس بات کے پیش نظر آرول کی اس بات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے کہ 'تمام انقلابات ناقص ہوتے ہیں'۔ انقلابات ہمیشہ انقلابیوں کے ذہنوں میں پلنے والی وژن کو حقیقت کا روپ دینے سے قاصر رہتے ہیں جو زیادہ تر تو مایوس ہو جاتے ہیں لیکن یہ بہترین صورت کی بات ہو رہی ہے، بدترین صورت میں وہ ویسے ہی تلف ہو جاتے ہیں، اینگلز لکھتا ہے کہ 'حقیقت میں سامنے آنے والے انقلاب کی شکل و شباہت اس انقلاب سے ذرا برابر بھی نہیں ملتی ہوتی جو کہ وہ لانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں' پولینڈ کی سالیڈریٹی موومنٹ پہلی عوامی تحریک تھی جس نے ایک انقلابی جماعت کی شکل اختیار کی۔ اس تحریک سے منسلک ایک سرکردہ دانشور ایڈم مچنک کا کہنا ہے کہ ''وہ لوگ بیسٹیلوں پر حملے سے اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں لیکن آخر میں خود نئے بیسٹیل بنانا شروع کر دیتے ہیں (اور وقت گزرنے کے ساتھ، جیسا کہ ہکسلی نے کہا تھا 'شروع میں جو چیز بدعت کا نام پاتی ہے آخر میں جا کر تو ہم کی شکل اختیار کر لیتی ہے')۔

مطلق العنانیت کے اثرات یقیناً برے برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن مستحکم حکمرانی کے کسی عہد کیلئے پریشان کن حقیقت یہ ہے کہ انقلاب اکثر کارگر ثابت ہوا ہے۔ یہ اس محدود مفہوم میں کارگر ثابت ہوا ہے کہ آج کل کی دنیا میں انقلابی حکومتوں کا غلبہ ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں شامل پانچ ممالک میں سے چار یعنی امریکہ، چین، روس اور فرانس میں یہ غیر معمولی چیز قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ نفرت انگیز پرانے نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا کر وجود میں آئے ہیں۔ صرف برطانیہ رہ جاتا ہے جو اب بھی اس کرامویل کی یادیں مناتا ہے جس نے اس کے بادشاہ کا پارلیمان کے دروازے پر کام تمام کیا تھا۔ ان تمام ریاستوں کی بنیادیں شدید اخلاقی مقصد کی حامل عبارتوں پر استوار ہیں۔ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ انہوں نے اچھی حکومت کا ایک نادر راز دریافت کر لیا ہے اور ان سب میں انقلابیوں کا وہ خاص رویہ موجود رہا ہے...... ان اصولوں کو عالمگیر بنانے کی شدید تڑپ جو کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ان عبارتوں میں شامل ہیں (حتیٰ کہ برطانیہ بھی جسے کہ دو انقلابات اور بادشاہت کی ایک بحالی کی عجیب پیداوار قرار دیا جاتا ہے، اپنی امتیازی اقدار اور ادارے برآمد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے)۔ ان سب کا خیال ہے کہ انہوں نے تاریخ کو ایک نیا آغاز دیا ہے۔ فرانسیسی انقلابیوں نے عیسائی عہد کی جگہ وہ جمہوری عہد لانے کی کوشش کی جس کی ابتداء ستمبر1792ء میں ہوئی تھی۔ پول پاٹ نے1975ء کو عام الصفر قرار دے دیا (کسی حد تک جیسے جرمن لبرل حلقوں نے1945ء کو Stund null یا زیرو آور قرار دیا تھا)۔ آیت اللہ خمینی نے بھی ایرانی جمہوریہ کے قیام کو 'خدائی حاکمیت کا روز اول' کہا تھا۔(10)

ایک موقع پر سوویت یونین انقلاب برآمد کرنے کے بڑے جارحانہ عزائم کا حامل محسوس ہوتا تھا، اگرچہ جب1943ء میں کومنٹرن کو ختم کیا گیا تو اس کے پلے ایک بھی کامیاب انقلاب نہیں تھا۔ بعد میں سرخ فوج نے برآمد کے سلسلے کی نسبت کہیں زیادہ کامیابی حاصل کر لی۔

تاہم اگرچہ کسی کو اس بات سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے، گذشتہ صدی کی عظیم ترین انقلابی قوت روس، کیوبا یا ایران کو نہیں بلکہ امریکہ کو قرار دیا جانا چاہیے۔ اپنے واضح مقدر اور اپنے نظام کی برتری کے بارے میں پر یقین یہ ملک پچاس برس سے زائد عرصے سے اپنے نظام کی پوری دنیا میں ترویج کیلئے کوشاں چلا آ رہا ہے۔ اس ملک کو انقلابی ریاستوں کی سچائی کے فروغ کی تڑپ کی سب سے بڑی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایسی سچائی کہ جو ان کے دم سے آشکارہ ہوئی اور دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہی۔ ایسی سچائی کہ جو اگر دوسروں کو بھی مل جائے تو ان کی زندگیوں کو زیادہ خوشحال، مطمئن اور اخلاقی بنا سکتی ہے۔

انقلاب اس اعتبار سے کارگر رہا کہ اس سے دنیا کی تشکیل نو ہوئی اور انقلابی مما لک نے اپنے دشمنوں کو چت کر ڈالا۔ لیکن انقلاب اس بالواسطہ مفہوم میں بھی کارگر ثابت ہوا کہ انقلاب کے خطرے نے حکمران طبقوں کو تقسیم اقتدار اور اپنے عوام کو اہمیت و احترام دینے پر بھی مجبور کر دیا۔ اگر انقلاب کی یہ لٹکتی تلوار نہ ہوتی تو آج معمولی دکھائی دینے والی چیزیں یعنی جمہوریت، بہبود اور سرمایہ داریت کا سدھار بھی ممکن نہ ہوتا۔ (ایک ممتاز ماہر سیاسیات کے بقول جمہوریت وہ نظام ہے جو بے انصاف حاکمیت کی مزاحمت کے حق کے تصور کو اس کے منطقی انجام تک لے آیا)۔ ہم اس مفروضے کو سیاست کے محفوظ ترین اور معقول ترین

allurdupdfnovels.blogspot.com

نقطہ آغاز کے طور پر لے سکتے ہیں کہ طاقتور گروہ جبر و استحصال کی اس آخری حد تک جاتے ہیں کہ جہاں تک وہ جا سکیں اور صرف خوف ہی ایک ایسی شے ہے جو ان کی باگیں کھینچ سکتی ہے۔

بلا شبہ انقلابات اپنے عوارض بھی پیدا کرتے ہیں۔ اگر تاریخ خود کو پہلے المیے اور پھر ایک بھانڈ تماشے کے طور پر دہراتی ہے تو انقلابات بھی پہلے ٹیکٹونک پرتوں کی ایسی عظیم تبدیلیوں کے طور پر کہ جن سے لاکھوں افراد مرے جاتے ہیں اور پھر تھیٹر کے طور پر خود کو دہراتے رہتے ہیں۔

قرن انقلاب کے پس منظر میں Baader Meinhof gang اور Symbionese Liberation Army ایسا سکرپٹ پڑھتے بچوں کی طرح دکھائی پڑتے تھے کہ جو ان کی سمجھ سے باہر ہو اور جیسے ان کی انگلیاں تاریخ کے عظیم دھرے میں پھنس گئی ہوں۔ ریڈ بریگیڈوں کی سب سے ڈرامائی واردات یعنی 1978ء میں آلڈو مورو کا اغوار اور قتل محض ان کا سیاسی دیوالیہ پن ثابت ہوا۔ دوسروں نے مخالفت کو بطور موقف اختیار کرنے پر ہی اکتفا کرنا شروع کر دیا۔1969ء میں اٹلی کے انقلابیوں نے سب 'کچھ اور ابھی' کا نعرہ لگایا۔ یہ ایک ایسا موقف تھا کہ جس نے تیس برس بعد عالمگیریت مخالف تحریک کیلئے ایک نظریاتی موقف کی شکل اختیار کر لی۔ مائیکل ہارٹ اور آنتونیو نگری نے اپنی کتاب 'سلطنت' میں 'مخالف ہونے' کی حمایت کی ہے اور اسے 'دنیا میں ہر فعال سیاسی موقف کی ایسی کلید لازم قرار دیا ہے کہ جو 'سب سے بنیادی اور ابتدائی سطح پر عالمی ہجوم کے تجربۓ میں جان پیدا کرتی ہے۔ یہ مستقل آزردگی اور بد مزاجی کا ایک ایسا موقف ہے جسے حقیقی تبدیلی کی سخت مشقت کا تقریباً متضاد قرار دیا جا سکتا ہے (اور غالباً اسے گراوچو مارکسیت بہترین طور پر بیان کرتی ہے 'یہ جو کچھ بھی ہے، میں اس کے خلاف ہوں!')

جدید جمہوری معاشرے انقلاب کی مزاحمت کیلئے تشکیل دیئے گئے ہیں۔ ان میں فیصلہ سازی کے طریقے وسیع تناظر میں جائز ہوتے ہیں اور دبنے والے مفادات اور آوازیں اکثریت کے خلاف کم ہی حرکت میں آتی ہیں۔ اکثر جدید ریاستوں نے ساجھے دار ترغیب سے تخلیق کئے ہیں۔ جدید صنعتی معاشروں کا باہمی انحصار اور پیچیدگی اقتدار کے محدود اجارے بہت زیادہ نا اہل اور ناجائز بنا دیتے ہیں، چنانچہ ان میں اقتدار بہت سارے ہاتھوں میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

بٹ جاتا ہے اور چونکہ حکومت اس قدر زیادہ شعبوں اور اداروں کے توسط سے عمل میں آتی ہے۔ آبادی کے ایک بڑے حصے کو معاشرے کے اس پیچیدہ نظام میں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے اور انہیں اس بات کا بھی خدشہ ہوتا ہے کہ اگر یہ نظام بکھرا تو ان کے ہاتھ میں جو ہے وہ جاتا رہے گا۔

ایسے حالات میں انقلابیوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آج کے دور میں حکومتوں کو ویسے قانون کی مزید کوئی احتیاج نہیں رہی جو امریکی کانگریس نے آج سے ایک صدی قبل منظور کیا تھا اور جس میں یہ پابندی عائد کی گئی تھی کوئی بھی شخص لوگوں کو حکومت کی مخالفت یا اس پر بداعتمادی کی تعلیم نہ دے۔ آج کے دور میں صرف وہی انقلابات کامیاب ہوتے ہیں جو معاشرے کو بدنظمی کا شکار کرنے کی بجائے کم از کم فساد کی مدد سے اسے نظم و ضبط کی طرف لے جائیں۔ یہاں 1989ء کے مشرقی یورپ کے مخملی انقلابات کی مثال دی جاسکتی ہے جن کے دوران لوگوں سے یہ عہد کیا تھا کہ کمیونسٹ راج کی نااہلیوں کی جگہ خوشحالی کے اس نظم و ضبط کو فروغ دیں گے جس سے سرحدوں کے پار بسنے والے مغربی یورپ کے باشندے بہرہ یاب ہو رہے ہیں۔ ایشیاء کی بات کریں تو مارکوس اور سوہارتو کی حکومتوں کو گرانے والے انقلابات بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ بظاہر فرانس میں مئی 1968ء جیسے لمحے طویل المدتی سماجی تبدیلی کے بیج بو سکتے ہیں لیکن وہ ریاستوں کی حاکمیت اعلیٰ کیلئے خطرہ نہیں بنتے۔

جو شے حکومت کو اخلاقی روش پر قائم رکھتی ہے، بغاوت اب بھی اس کا ایک جزو ہے۔ جب 2005ء میں فرانس کے مسلم نوجوانوں نے بلوے کیے تھے تو ان کا مقصد حکومت تبدیل کرنا نہیں تھا لیکن ان کی کارروائیوں نے ایک غفلت کی شکار حکومت کو ردعمل پر مجبور کیا۔ یہ کام کوئی اور چیز نہیں کر سکتی تھی اور اس سے یہ گروہ وہ شناخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا جو اسے انتخابی سیاست سے کبھی بھی نہ ملی تھی۔ جب تقریباً اسی دوران بولیویا کے بلوائیوں نے ایک غیر موثر حکومت کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کیا تھا تو وہ بھی یہ بتا رہے تھے کہ جمہوریت صرف پارلیمان میں بیٹھ کر شائستہ گفت و شنید کرنے کا نام ہی نہیں، اسے متواتر سیراب کرنا پڑتا ہے، اگر 'جاں نثاروں کے خون' سے نہیں تو کم از کم عریاں جذبوں، غصے اور آدرشوں سے۔

بڑی سیاسی جماعتیں چیلنجوں کا جواب اپنے عقائد اور اپنی ہئیتیں تبدیل کر کے دیتی ہیں اور ریاستیں سماجی تحریکوں کے ردعمل میں ان سے گفت و شنید کرتی ہیں بلکہ انہیں اداراتی

allurdupdfnovels.blogspot.com

شکل وصورت اختیار کرنے میں مدد بھی دیتی ہیں۔[12] اسے ایک بہت بڑی پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے بغاوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے اور اداراتی شکل دی جا سکتی ہے تاکہ سیاسی جنگوں میں گروہوں کی انا تو بھلے مجروح ہو، لاشیں نہ بچھیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 9

گرم اور سرد جمہوریت

''جمہوریت حکومت کی وہ شکل ہے جس کے بڑے بڑے اصولوں کا مقصد باہم دست و گریباں ہوئے بغیر سماجی تنازعات کو حل کرنا ہوتا ہے (یعنی اس میں سر گنے ضرور جاتے ہیں کاٹے نہیں جاتے)''۔ (نابرٹو بوبیو) (1)

پہلے وقتوں میں اکثر حاکموں کا دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ ان کی حاکمیت خدا یا فطرت کی عطا کردہ ہے۔ ان کا کام حکمرانی کرنا ہوتا تھا اور رعایا کا اطاعت کرنا، جمہوریت نے یہ سب تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ جمہوریت نے حاکمیت عوام کے ہاتھوں میں تھما دی ہے۔ وہ انتخابات یا اپنے نمائندوں کے توسط سے جو بھی کہتے ہیں اسے وہی عزت دی جاتی ہے جو کہ کبھی بادشاہوں کو دی جاتی تھی۔ جمہوریت نے اس اصول کو رسمی شکل دے دی ہے کہ جس کسی پر بھی فیصلے اثر انداز ہوتے ہیں اسے ان فیصلوں پر اثر انداز ہونے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ جمہوریت نے جس رفتار سے ایک عالمی معیار اور ایک ایسے پیمانے کی حیثیت حاصل کی ہے کہ جس سے حکومتوں کو آنکا جاتا ہے، وہ حیران کن ہے۔ جمہوریت اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو ملیا میٹ کرتی چلی گئی ہے۔ اب اسے کافی زیادہ حد تک معاشی نمو اور امن و امان کی نشوونما سے منسوب کیا جانے لگا ہے۔ اس کا پھیلاؤ اس بات کی تصدیق ہے، اگر تصدیق ضروری ہے، کہ خود مختاری کسی ایک خاص قسم کے معاشرے یا ثقافت کی بات نہیں۔ اگر بقیہ سب چیزیں برابر ہوں تو تو لوگ حکومت ماننے کی بجائے حکومت چلانے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جمہوریت کا عروج ناگزیر تھا یا کہ یہ پہلے سے معین تھا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں اس سے قبل جان ایڈم کی دوصدی قبل کہی ہوئی بات آپ کو بتا چکا ہوں کہ 'ابھی تک کوئی بھی ایسی جمہوریت نہیں دیکھی گئی جس نے کہ خودکشی نہ کی ہو'۔ مزید جدید تاریخ نے بھی اس کی اس قنوطیت کی تائید کی ہے۔1930ء کے عشرے کے سپین اور جرمنی جمہوری خودکشی کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ارجنٹائن کی مثال اس سے بھی چار ہاتھ آگے ہے جس نے1912ء میں تمام مرد شہریوں کو حق رائے دہی تفویض کیا۔ پھر یہ1930ء میں ایک بغاوت سے گزر کر 1946ء میں جمہوریت تک پہنچا۔1955ء میں پھر ایک بغاوت سے گزر کر1973ء میں جمہوریت تک پہنچا اور1976ء میں پھر ایک بغاوت سے گزر کر1983ء میں ایک بار پھر جمہوریت تک پہنچا۔

جمہوریت عروج تک بھی کسی سیدھے راستے پر چل کر نہیں پہنچی۔ جمہوریت جہاں بھی کامیاب ہوئی پرسکون رضا مندی کی بجائے تشدد کے نتیجے کے طور پر ہوئی۔ انگلستان میں جمہوری عمل کا آغاز (بالتاخیر) اس خانہ جنگی کے بعد ہوا جس میں دو لاکھ سے زیادہ افراد مارے گئے تھے۔(3) سوئٹزرلینڈ میں مکمل جمہوریت کا ظہور1847ء کی سوندر بند سول وار کے بعد ہوا۔ امریکی خانہ جنگی کی ہلاکتیں (تین سے چھ لاکھ کے درمیان) پہلی عالمی جنگ کے صنعتی خونریزی کا پیش خیمہ بنیں اور جرمنی اور جاپان نے جدید جمہوریتوں کی شکل تب جا کر اختیار کی جب دوسری عالمی جنگ میں خونیں شکست کے بعد یہ ان پر مسلط کی گئی۔1990ء کے عشرے میں نظر آنے والا جمہوریتی پھیلاؤ ترغیب کا نتیجہ تو تھا لیکن یہ عسکری قوت کے توازن میں تبدیلی کا نتیجہ بھی تھا۔ یہ تصور کہ حکمران رضا کارانہ طور پر اقتدار تقسیم کرنا پسند کرتے ہیں ایک سکون آور حکایت ہے جو معاشروں کو تنازعے سے نکلنے میں مدد دیتی ہے لیکن اس کا حقیقت سے تعلق بہت ہی کم ہے۔ فلسفے اور الٰہیات کے ماہر میکیل دے او نا مونو نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ 'ہمیشہ یہی بات سامنے آتی ہے کہ دانائی کی ابتداء خوف سے ہوئی ہے'۔ جب تقسیم اقتدار کی بات آتی ہے تو اس کی ابتداء بھی اسی خوف سے ہوتی ہے کہ دوسری صورت میں معاملہ کہیں اور بھی زیادہ خراب نہ ہو جائے۔

جمہوریت کو دنیا بھر میں اچھی حکومت کیلئے ضروری شرط کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن جمہوریت کہتے کسے ہیں، یہ بات کوئی اتنی واضح نہیں۔ امریکی ماہر سیاسیات سیمل ہنٹنگڈن لکھتا ہے کہ 'صاف، شفاف اور آزادانہ انتخابات جمہوریت کی روح ہیں'۔ یقیناً اگر حکمرانوں

allurdupdfnovels.blogspot.com

کو اتارا نہ جا سکے تو پھر جمہوریت بھی نہ ہو۔لیکن جمہوریت کی زیادہ بہتر تعریف آلات و ادارہ جات کے ایسے مجموعے کے طور پر کی جا سکتی ہے، جن میں سے بعض کا رخ متضاد سمتوں میں ہوتا ہے اور جو سب کے سب ارتقاء پذیر ہوتے ہیں۔ جمہوریت کی ظاہری فتح اور اس کے یہ دعوے کہ وہ دیگر تمام نظاموں کی نسبت اخلاقی نیز اقتصادی اعتبار سے ایک زیادہ بہتر نظام کی نمائندگی کرتی ہے، ان آلات اور ان کی کشیدگیوں پر بہت زیادہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اس باب میں میں یہ بحث کروں گا کہ یہ آلات کون سے ہیں اور وہ کس طرح کام کرتے ہیں اور یہ سوال اٹھاؤں گا کہ جمہوریت میں آخر ایسی کون سی بات ہے جو جمہوری حکومتوں کے اچھے پن کا باعث بنتی ہے۔

اس سوال کے جواب کیلئے ہمیں ان مختلف سمتوں کو کھوجنا پڑے گا جن کی طرف جمہوریت ہمیں کھینچتی ہے۔ جمہوریت قدیم ایتھنز میں پیدا ہوئی جہاں اس سے 'خود انتظامی' مراد لی جاتی تھی۔ تاہم اس کی فی زمانہ کشیدگیوں کے کھرے اس انگریزی خانہ جنگی سے جا ملتے ہیں جسے ریاست کو خادم بنانے کی پہلی بڑی جمہوری جدوجہد قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بہت تہہ دار جنگ تھی جس نے آئندہ چار سو سال کیلئے بیشتر مغربی دنیا کی سیاسی تاریخ کے ادا بھاو کا تعین کر دیا تھا اور یہ جنگ جمہوریت کے مستقبل میں متوقع ارتقاء کے بارے میں آج بھی ہمیں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

جمہوریت مخالف دلیلیں

اس بحث کی ابتداء انگلستان کے زخم خوردہ اور خوفزدہ دانشور ٹامس ہابز نے کی جس نے 1651ء میں افراتفری کو روکنے کیلئے طاقتور ریاست، لیویاثان کی بات کی۔ پیدائشی یا الوہی حکمرانوں کی بجائے حکمرانوں کو منتخب بھی کیا جا سکتا ہے بلکہ انہیں انتخابات کے ذریعے بھی منتخب کیا جا سکتا ہے۔لیکن اقتدار میں آنے کے بعد انہیں بے روک ٹوک طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ضرورت سے زیادہ احتساب اور جمہوریت سے ان کے اختیارات کمزور پڑ جاتے ہیں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں سے نبرد آزما قوم کی بقاء خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اکثر بادشاہوں کا یہی نظریہ رہا جو خود کو خدا کے خادم تو سمجھتے تھے انسان کے نہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

کلیسا کے نزدیک لوگوں کے اختیار بڑھانے کا مطلب زمین پر خدا کے اختیار میں تخفیف تھا اور اس تصور کی بازگشت جمہوریت کے خلاف اسلامی دلائل میں بھی سنی جا سکتی ہے۔ تاہم ہابز کی دلیل زیادہ عمومی تھی اور بعض اعتبار سے زیادہ سادہ بھی اور یہ دلیل اس بارے میں تھی کہ انسانیت کی اخلاقی خرابیوں کو روکنے کیلئے نظام کو ہمیشہ بدنظمی پر فتح کیوں حاصل کرنا پڑتی ہے۔

انیسویں صدی تک جمہوریت وملوکیت کے مباحث میں ملوکیت پسند ہی واضح برتری حاصل کرتے رہے۔ ایک سند تو افلاطون کی فراہم کردہ تھی۔ اس کے دو چچا ایتھنز میں جمہوریت کی واپسی کو روکنے کی کوششوں میں مارے گئے تھے اور اس کا گرو سقراط بھی جمہوری عدم رواداری کا شکار بنا تھا۔ جمہوریت کے اکثر ناقدین نے جمہوری حکمرانوں کے کردار اور ان کے طریقہ حکومت دونوں کو نشانہ بنایا۔ عوامی اسمبلی کا ناقص ہونا لازم تھا، اسے جذبات اور خوش بیانی سے بڑی آسانی سے متاثر کیا جا سکتا تھا اور یہ اجتماعی ارادے کے راستے میں حائل جماعتوں کے قبضے میں جا سکتی تھی۔ اس میں یہ خدشہ بھی تھا کہ غریبوں اور بھوکوں کے مسائل حل کرنے کیلئے درکار اختیارات کے استعمال میں بدعنوانی کا عنصر زیادہ ہوگا، جب خاص مفادات کے حامل افراد میں وسائل تقسیم ہوں گے تو عدم تحفظ میں اضافہ ہوگا اور اس چیز کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی کہ جمہوریت سے آزادی کو فروغ ملے گا کیونکہ عوام کے جذبات سے کھیلنے والے لیڈروں کے غلبے کا خدشہ تھا۔(4)

مونٹیکو، ہیگل اور جدید سیاسی فلسفے کی دیگر عظیم شخصیات کیلئے جمہوریت ایک ماضی کی چیز تھی اور حکومت کی ایک ایسی صنف تھی جسے آزمایا جا چکا تھا اور جو کامیاب نہیں رہی تھی۔

ڈینگ ژیاؤ پنگ، حسنی مبارک اور لی کوآن یو جیسے جدید دور کے آمرین بھی جواز کے طور پر اسی طرح کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بنیادی سیاسی مسئلہ نظام اور بدنظمی کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے موقف کے جواز کے طور پر اقدار (ایشیائی، کیتھولک یا افریقی) کے کسی ایک مجموعے، عوام میں گروہ بندیوں یا سیاسی جماعتوں کی غیر ذمہ داری کا حوالہ دیتے ہیں۔ بعض آمروں نے ایسی ریاست تشکیل دینے کی کوشش کی جس میں سیاسی جماعتوں بلکہ پیشہ ور سیاستدانوں کا بھی کوئی وجود نہ تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ سیاسی محاذ آرائی ان کا نازک نظام تباہ کر دے گی (مثلاً نائیجیریا کے فوجی حکمرانوں نے 1980ء کے عشرے کے اواخر میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

منظور شدہ ایسی سیاسی جماعتوں کا ایک مجموعہ تیار کیا جن کے منشور تقریباً مکمل طور پر ایک جیسے تھے اور شناختیں مزاحیہ حد تک مشابہ تھیں۔ دوسری طرف یوگنڈا کے یووری موسونی نے بغیر کسی جماعتوں کے دو عشروں سے زائد عرصے تک اپنے ملک کی سیاست پر راج کیا اور یوگنڈا کو امداد دینے والے مغربی ممالک اسے سراہتے بھی رہے۔[5] یہ لیڈر یہ جواب پیش کرتے رہے کہ آزادانہ اور حریفانہ جماعتی سیاست سے ملک میں نسلی منافرتوں میں اضافہ ہو تا ہے اور یہ کہ نظم ونسق کو اولیت دی جانی چاہیے۔

دنیا کے بیشتر حصوں میں اب اس طرح کے دلائل کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن وسیع پیمانے پر عدم تحفظ اور بدامنی کی صورت میں، یا اگر قوموں کی عزت نفس کو بہت زیادہ مجروح کیا جاتا ہے یا اگر جمہوری ملکوں کی غالب تعداد بدعنوان اور نا اہل ثابت ہوتی ہے تو یہ دلائل پھر سر اٹھا سکتے ہیں۔

طاقت کو روکنے کی تدابیر

دوسری دلیل یہ ہے کہ لیویا ثان خطرہ بن سکتا ہے۔ اس کی برائیاں اسکی اچھائیوں کو پیچھے چھوڑ سکتی ہیں۔ چنانچہ سیاسی ترقی ریاست کے اختیارات کو کم کرتی ہے، اس میں اضافہ نہیں کرتی۔ اس دلیل کو جان لاک نے بہترین طور پر بیان کیا ہے۔ 'سول حکومت پر دوسرا مقالہ' میں جو کہ انگلستان کی خانہ جنگی کے کوئی تیس ایک سال بعد اس کے نام کے بغیر شائع ہوا تھا۔ اس نے جمہوریت کا ملکیت پر مبنی تصور دیا جس میں آئین اور قانون کا بنیادی کام ریاستی طاقت کو غلط استعمالات سے باز رکھنا تھا۔ اس تصور میں مونٹیکو کے ان الفاظ کی گونج صاف سنی جا سکتی ہے کہ 'اختیار کو اختیار پر بندش کا فریضہ ادا کرنا چاہیے'۔

یہ تصور کوئی ایسا بالکل نیا بھی نہ تھا۔ قدیم روم کی بیشتر تاریخ کو سیاسی مناصب کی غیر معمولی طور پر پیچیدہ تقسیم کے توسط سے بادشاہت کے خلاف اختیارات کا توازن قائم کرنے کی اس کی کوشش کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے جو کہ انجام کار ناکام رہی۔ یہ تصور کہ طاقت کا توازن ضروری ہوتا ہے بدھ عہد کے شمالی ہندوستان کی اشرافیہ جمہوریاؤں اور اوائل قرون وسطٰی کے اٹلی کی جمہوریاؤں میں کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ ان ریاستوں کو جن میں کہ اختیارات کو دانستہ تقسیم کیا جاتا تھا اور ریاستی امور میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شراکت کو یقینی بنایا جاتا تھا،

allurdupdfnovels.blogspot.com

حکمرانی کے نمونوں کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ مہاتما بدھ نے، مقامی باشندوں کو 'با قاعدہ اور لگاتار جرگوں' کی تلقین کی تھی۔ پہلے ہزاریے کے وسط میں جنوب مغربی ایران کی ریاست سوس میں ایک منتخب کونسل کام کرتی تھی اور ایک عوامی اسمبلی ہوتی تھی جو مجسٹریٹوں کو منتخب کرتی تھی۔ جاپان کا ساتویں صدی کے اوائل کا دستور (کیمپو) جو کہ بدھ شہزادے شوتو کو نے متعارف کروایا تھا، کہتا ہے کہ 'فیصلے کسی واحد شخص کو اکیلے نہیں کرنے چاہئیں۔ فیصلے کرتے وقت بہت سے افراد سے مشاورت کی جانی چاہیے'۔

ماضی میں بہت سے معاشرے ایسے مراحل سے گزرے جب ان کے بادشاہ کی حاکمیت کمزور ہو کر خاتمے کو جا پہنچی۔ کولمبس کے براعظم امریکہ دریافت کرنے سے قبل اس خطے کے ایک مایہ مرکز چیچن اتزا میں شرفاء کی ایک مشترکہ حکومت قائم تھی۔ قرون وسطیٰ کے جرمن قصبات میں 'شہریوں کی مجلس' انتظامی فرائض سرانجام دیتی تھی جبکہ سوئٹزرلینڈ کے دیہی علاقوں نے زیادہ براہ راست قسم کی جمہوریت کی بنیاد رکھی۔ ان میں سے بہت سے علاقوں میں پبلک ٹرسٹ کام کرتے تھے جنہیں اپنا انتظام چلانے کے اختیارات حاصل تھے اور جو عوامی احتیاج اور عوامی خدمت کے تصورات کی رہنمائی میں کام کرتے تھے۔ (6)

انگلستان کی خانہ جنگی نے سوچ کی اس لہر میں تیزی پیدا کی اور اسے ایک روبہ عروج قوم کے قلب تک پہنچا دیا۔ دیگر متعدد انقلابات کی طرح یہ خانہ جنگی بھی کسی منصوبے کے مطابق عمل میں نہیں آئی تھی۔ ضرورت کی نسبت یہ قسمت اور اتفاق کا نتیجہ زیادہ تھی اور جب انگلستان کو جمہوریہ بنانے کا اعلان کیا گیا تو اس ملک کی صرف ایک چھوٹی سی اقلیت جمہوریت پسند لوگوں پر مشتمل تھی۔ (7) جب چارلز اول نے اپنے دشمنوں کو جمہوریت کے حامی قرار دیا تھا تو جمہوریت کے دفاع کیلئے کوئی بھی نہیں اٹھا تھا۔ (8) لیکن جب عدالتی مقدمے کے بعد بادشاہ کو سزائے موت دے دی گئی تو پھر اس کے بعد پہلے جیسی بادشاہت مڑ کر دوبارہ نہ آ سکی۔ چارلز دوم (جس نے بہت حد تک اپنے باپ کی طرح مطلق العنان بننے کی کوشش کی) کی بحالی کے باوجود اس وقت سے آگے حکومت کو مشروط اور محدود ہونا پڑا۔

چنانچہ آج ہم جسے جدید جمہوریت کہتے ہیں اس کا تعین طاقت پر رسمی پابندیوں کے ذریعے ہوا ہے (جن میں سے بہت کم ہی قدیم ایتھنز میں موجود تھیں)۔ (9) ان نقوش کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

ارتقاء جان لاک اور اس کے جانشینوں کی سیاسی فکر کا عظیم ورثہ ہے اور یہ معاشرتی اختراع اور مسابقت کی ایک عجیب غریب کہانی کی نمائندگی کرتا ہے۔ کوئی درجن کے لگ بھگ آلات جو کہ سب کے سب اس تصور پر مبنی ہیں کہ اہل اختیار پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اسی روایت سے پیدا ہوتے ہیں اور اب یہ جدید جمہورتیوں کا مرکزی دھارا ہیں۔ یہ آلات لیڈروں کو 'ٹھنڈا کرنے' اور انہیں جذبات اور جرائم میں بدمست ہونے سے روکنے کیلئے اختراع کیے گئے ہیں۔

مقابلہ

ان میں سے اہم ترین آلات وہ ہیں جن کے سبب سیاستدانوں کو اقتدار میں رہنے یا اسے حاصل کرنے کیلئے دوسرے امیدواروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مقابلے کو نیکی کا نوکر کہا جاتا ہے۔ لیڈروں کو براہ راست انتخابات اور انہیں معین وقفوں سے معزول کرنے کا اختیار اس بات کی سادہ ترین ضمانت ہے کہ ریاستیں تحفظ، بہبود، انصاف اور سچائی کو عملی جامہ پہنانے کیلئے جدوجہد کریں گی۔ (انگلستان کی خانہ جنگی کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ پارلیمانی جمہوریت کیلئے لڑی جانے والی جنگ نے پارلیمان کے ہی کپڑے اتار کر رکھ دیئے۔ انتخابات کو بار بار ملتوی کیا گیا۔ پارلیمان ایک دکھاوا بن کر رہ گئی اور آخر میں کرامویل نے جمہوریت کا دکھاوا بھی بند کر دیا)۔ لیڈروں کا انتخاب بذاتہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ ماضی کے بہت سے معاشرے اپنے لیڈروں اور بادشاہوں کا انتخاب کرتے رہے ہیں اور پولینڈ میں اٹھارہویں صدی میں اس ملک کے تقسیم ہونے تک شرفاء بادشاہ کا انتخاب کرتے رہے۔ جمہوریہ روم میں ہر وقت مباحث، تقاریب اور انتخابی مہمات کا دور دورہ رہتا تھا۔

اہم جدید جمہورتیوں کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اب حق رائے دہی آبادی کے نسبتاً بہت بڑے حصے تک پہنچ چکا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز پر صرف ایک ملک (نیوزی لینڈ) ایسا تھا جس میں جمہوریت اس کے جدید مفہوم میں رائج تھی ...... اس کے حکمران تمام بالغ شہریوں کی رائے سے منتخب ہوتے تھے۔ ایتھنز اور قرون وسطیٰ کی زیادہ جمہوری اطالوی ریاستوں

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں پانچ فیصد سے بھی کم آبادی کو حق رائے دہی حاصل تھا۔ حتیٰ کہ 1832ء کے اصلاحی ایکٹ کے بعد بھی برطانیہ میں صرف تین فیصد کے لگ بھگ آبادی کو حق رائے دہی مل سکا۔ لیکن انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں حق رائے دہی 100 فیصد بالغ آبادی تک پہنچ چکا تھا۔ ایسا سب سے پہلے نیوزی لینڈ میں دیکھنے میں آیا جس نے 1867ء میں تمام مرد موری باشندوں کو حق رائے دہی دیا اور 1879 ء میں بقیہ مردانہ آبادی کو یہ حق دے دیا اور 1893ء میں مکمل بالغ حق رائے دہندگی متعارف کرانے والا پہلا ملک بن گیا۔[10] اس کے بعد درجہ بہ درجہ دوسرے جمہوری ملکوں نے بھی یہ شیوہ اختیار کیا اور اب یہ دنیا کے 120 ممالک میں ایک بنیادی اصول کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

حکومت کو باقاعدہ وقفوں سے ووٹ کے ذریعے ختم کرنا جمہوریت کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن پھر بھی جمہوری ممالک میں اس اعتبار سے بہت اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ حکومتی عہدوں کیلئے افراد چننے کیلئے انتخابات کو بہترین طریقہ کس حد تک تصور کرتی ہیں۔ بعض ممالک میں محکمہ پولیس کے سربراہوں، ججوں اور سکول بورڈوں کو چننے کیلئے انتخابات کرائے جاتے ہیں جبکہ دیگر ممالک نے انتخابی عمل کو صرف سیاسی عہدوں تک محدود رکھا ہوا ہے۔ بعض عہدوں کی دانستہ گردش سے انتخابات کی طاقت کو محدود کر دیتے ہیں تاکہ کوئی عوامی رہنما انتخابی جواز کو اقتدار کی بنیاد بنانے کیلئے استعمال نہ کر سکے۔ روم میں کوئی کونسل اپنے عہدے پر صرف ایک سال کی مدت تک فائز رہ سکتا تھا۔ اطالوی جمہوریاؤں نے بھی اسی قاعدے کی پیروی کی اور انہوں نے عہدوں کی مدت کو بہت محدود کر دیا۔ آج کل کے یورپ میں سوئٹزرلینڈ وزیراعظم کے عہدے کو گردش دے کر اپنے وفاقی نظام کو قائم رکھے ہوئے ہے (اور عالمی بینک نے اسے دنیا کی موثر ترین حکومت قرار دیا ہے)۔ امریکہ میں بہت سے دیگر ایسے ممالک کی طرح جہاں صدارتی نظام رائج ہے کوئی شخص صدر کے عہدے کیلئے صرف دو مرتبہ منتخب ہوسکتا ہے اور اسے الیکٹورل کالج (عوام کی بد اعتمادی کی ایک علامت) کے ایک عجیب وغریب نظام کی مدد سے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اچھوتا ماڈل وہ ہے جس میں بعض مقاصد قرعہ اندازی سے حاصل کئے جاتے ہیں اور قرعہ اندازی کو اسمبلیوں اور بعض اوقات لیڈروں کی تقرری کیلئے انتخابات کے متبادل کے طور پر

allurdupdfnovels.blogspot.com

استعمال کیا جاتا ہے۔ جمہوریہ وینس کے ڈوج چننے کیلئے قرعہ اندازی پر مبنی پیچیدہ نظام کو اس کی ایک کلاسیکی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اکثریتی جمہوریت بذات خود اپنے کچھ شہریوں سے غلط سلوک کرنے والی ریاستوں سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ بد اعتمادی کے شکار معاشروں میں 'ایک شخص ایک ووٹ' کا فارمولہ جواز کی کوئی اچھی بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ ایسے معاشروں میں حکومتی اقتدار کو گروہوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ شمالی آئرلینڈ اور لبنان کی اقلیتوں کو ایک دوسرے سے بچانے اور نسلی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کیلئے بہت پیچیدہ فارمولے وضع کرنے پڑے۔ نائیجیریا میں اقلیتوں کو اقتدار میں شریک کرنے کیلئے کنفیڈریشن کا نظام رائج ہے جبکہ بعض جگہ 'کنسوسی ایشنل' نظام کام کر رہا ہے جو اقلیتوں کو مرکز میں نمائندگی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ ایسے معاشروں میں کہ جو دیگر ناہمواریوں کی وجہ سے منقسم ہیں بے کس لوگوں کیلئے بھی خاص دفعہ کا ہونا ضروری ہے (مثلاً بھارت میں قبائلیوں کیلئے رائج کوٹہ سسٹم جو کسی حد تک پارلیمان میں موجود عدم توازن کی درستی کرتا ہے جس کے اراکین کی نصف تعداد برہمن ذات کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو کہ آبادی کا صرف تین فیصد ہیں)۔ بہت زیادہ طاقتور سیاسی جماعتوں کے حامل معاشروں میں بھی حکمرانوں کی تبدیلی اور مضبوط حزب اختلاف کو فروغ دینے کیلئے خصوصی دفعات کی ضرورت پڑ سکتی ہے تاکہ اہل اقتدار کے ذہن میں یہ بات رہے کہ وہ اقتدار سے باہر بھی ہو سکتے ہیں۔ جرمنی کی کسی وقت کی کمیونسٹ جماعت پی ڈی ایس کے قائد گریگر گیزی نے 1994ء کے انتخابات کے دوران اپنی پارٹی کے نعرے میں یہ بات بڑی اچھی طرح بیان کر دی تھی: 'اچھی حکومت کی ابتداء اچھی حزب اختلاف سے ہوتی ہے'۔

تاہم وہی عوامل جو کسی مقابلہ جاتی نظام کو کارگر بناتے ہیں، اسے نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ اگر سرکردہ سیاستدان اپنا زیادہ وقت دوسرے سیاستدانوں پر کیچڑ اچھالنے میں صرف کرنا شروع کر دیں تو لوگوں کے لیڈروں پر بحیثیت مجموعی اعتماد میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ ایسے نظاموں میں اتفاق رائے کا ہونا مشکل امر ہے کہ جن میں سیاسی جماعتوں کو اپنی پہچان صرف ایک دوسرے کی مخالفت کی بنیاد پر بنانا پڑے۔ تاہم اس اصول سے کہ اقتدار میں آنے کے متمنی امیدواروں کو ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا چاہیے اور یہ کہ فتح کا ثمر لازماً

allurdupdfnovels.blogspot.com

عارضی ہونا چاہیے، اچھی حکمرانی کوفروغ ملا ہے اور مقابلے کا تصور اس سے بھی گہرا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر جیت عارضی ہوتی ہے اور ہر ظاہری اتفاق رائے کو چیلنج کیا جا سکتا ہے اور جمہورتیں تصورات کے ٹکراؤ سے بھی اتنا ہی سیکھتی اور ترقی کرتی ہیں جتنا کہ لوگوں اور جماعتوں کے ٹکراؤ سے۔ (11)

اصول وضوابط

1990ء کے عشرے میں اطالوی مجسٹریٹوں کے 'صاف ہاتھ' نامی ایک گروہ نے قانون کی مدد سے رشوت خوری کے ایک سکینڈل میں بدعنوان حکمران جماعتوں کے ایک گروپ کی گوشمالی کی تھی۔ ان کے اقدامات جنہیں عوام سے بہت پذیرائی ملی، لاک اور اس کے جانشینوں کے ان دعوؤں کا ایک بین ثبوت ہیں کہ قوانین، اصولوں اور دساتیر کو انفرادی حکمرانوں پر بالا دستی حاصل ہونی چاہیے۔ جیسا کہ یونان میں ارسطو اور ہندوستان میں کوٹلیہنے پرچار کیا صرف انفرادی عقل کی بجائے عالمگیر اور غیر شخصی اصول نیکی اور اچھے فیصلوں کی بہتر ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ چین کے مشہور سیاسی مفکر چین لیانگ نے بارہویں صدی میں لکھا تھا کہ قلب انسانی 'زیادہ تر صرف اپنا ہی خیال رکھتا ہے لیکن قوانین اور ضوابط اس میں عوامی سوچ پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت دنیا میں غالب رجحان قوانین اور اداروں کی طرف ہے۔ (12) اس سے کوئی نصف ایک صدی بعد انگریز قانون دان ہیری ڈی بریکٹن نے لکھا کہ 'بادشاہ کو خدا اور قانون کے تحت ہونا چاہیے'۔ (13)

یہ فقرات لکھنے والوں کی امیدوں سے زیادہ حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ میں بہت سی شہری ریاستوں نے حکمرانوں کی تحدید اور رہنمائی کیلئے آئین مرتب کئے جن سے اس انگریزی دستور کا راستہ ہموار ہوا جو 1654ء میں اولیور کرامویل نے تشکیل دیا۔ اسے ہم بجا طور پر ایک بڑی قومی سطح پر اختیارات وفرائض کا پہلا رسمی بیان قرار دے سکتے ہیں۔ آئین حکمرانوں کے اختیارات کی تحدید اور قانون کا پابند کر کے ہی نہیں بلکہ اس چیز کا ٹھیک ٹھیک تعین کر کے بھی کرتے ہیں کہ ان کی حاکمیت اور اختیارات کی حدود کیا ہیں اور وہ ان کا استعمال کیسے کر سکتے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

کوئی بادشادہ بلکہ شہنشاہ بھی قانون سے مکمل طور پر بالا تر نہیں تھا۔ اس کے برعکس جدید دور کے بہت سے رہنما اس قانونی تحفظ کی مدد لیتے ہیں جو انہیں ان کے عہدے کے ساتھ حاصل ہوتا ہے اورانہیں عدالتوں سے محفوظ رکھتا ہے (ژاک شیراک اور سلویو برسکونی جیسے متعدد یورپی لیڈر اگر صدارتی محل میں نہ ہوتے تو شاید کسی جیل میں ہوتے) تاہم یہ تصور کہ انتظامی حکومت قانون کے ماتحت ہوتی ہے علامتی طور پر بھی اہم ہے اور عملی طور پر بھی۔ مستقل آئین جنہیں آسانی سے تبدیل کرنا آسان نہیں ہوتا کسی معاشرے کی بنیادی اقدار کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ امریکہ میں آئین کو سارے نظام کا عکس اور مقنّنہ سے بالا تر خیال کیا جاتا ہے، اگرچہ عدالت عظمیٰ کے ارکان کا تقرر مقنّنہ کی منظوری سے انتظامیہ ہی کرتی ہے۔ یورپ میں حقوق انسانی سے متعلقہ قوانین قومی اور یورپی عدلیہ کو یہ اختیار فراہم کرتے ہیں کہ وہ ان قوانین کی تشکیل و نفاذ کا راستہ روک سکے کہ جنہیں یہ درست خیال نہیں کرتی اور یقیناً اس طرح اس نے بعض شہریوں کو من مانی اور غلط پالیسیوں کی زد سے بچانے میں موثر کردار ادا کیا ہے۔

اگر محض نمائندوں کی بجائے قانون کے تحت چلنے والی ریاست کے تصور کا حقیقی روپ دیکھنا ہو تو وہ سب سے بھر پور طور پر Rochstaat کے جرمن نظریے اور عمل مین دیکھا جا سکتا ہے۔ ہیگل نے ایسی ریاست کی حمایت کی تھی اور اسے عقل کا حتمی اظہار قرار دیا تھااور پھر یہ 150 برس بعد یہ انتہا درجے کی انتظامی خودمختاری اور ایک ایسی آبادی کے خلاف حقیقت کی شکل اختیار کر گئی جو اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ Rechstaat کے خالص نظریے کو دیکھا جائے تو اس میں قانون عوام سے بھی بالا تر نظر آتا ہے۔ 1946ء میں ایک موقع پر جدید جمہوریہ مغربی جرمنی کے دستور میں شامل کیا جا رہا تھا کہ 'تمام طاقت کا سر چشمہ عوام ہیں' لیکن دستور مرتب کرنے والے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر عوامی حاکمیت کو اس قدر مطلق العنانیت حاصل ہوگئی تو لوگ جمہوریت کی جگہ ایک مرتبہ پھر آمریت لے آئیں گے۔[14] عوام نیز ریاست کو حدود میں رکھنے کے لئے قوانین اور حقوق لازم تھے اور جمہوریت کو اس کے دشمنوں کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے آپ سے بچانا بھی ضروری تھا۔ جرمن آئین کی شق نمبر 20 جرمنوں کو 'آئین کو ختم کرنے کی کوشش کرنے والی کسی بھی قوت کے خلاف مزاحمت کا حق بھی مہیا کرتی ہے اور یقیناً اس میں اکثریت کی منتخب کردہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

قانونی حکومت کے خلاف مزاحمت کا حق بھی آ جاتا ہے۔

قوانین عوام کو بھی قابو میں رکھ سکتے ہیں اور مستقبل کے حکمرانوں کے غلط رویوں کو بھی کنٹرول کر سکتے ہیں۔ جاپان میں جنگ کے بعد مرتب کیا جانے والا آئین صرف سات دن میں جنرل میکارتھر کے حکم پر تیار کیا گیا تھا جو جاپانی حکومت کی ایسا آئین بنانے میں نا اہلی پر جزبز تھا کہ جس میں جمہوری حقوق بھی شامل ہوں اور جو اس بات کی ضمانت بھی فراہم کرے کہ جاپان1930ء کے عشرے کی عسکریت کی طرف نہیں لوٹے گا۔ مالیاتیدرستی اور حقوق انسانی جیسی چیزوں پر معاہداتی تعہدات بھی ایسے ہی کام کر سکتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اواخر تک ان کا کوئی وجود نہ تھا مگر اب یہ بہت عام ہو چکے ہیں جو کہ رہنماؤں اور شہریوں کی خود اعتمادی کی کمی کے نتائج ہیں(اگرچہ بڑے ممالک بین الاقوامی معاہدوں کے عائد کردہ اصولوں کو بڑی آسانی سے توڑ دیتے ہیں، چنانچہ یہ چھوٹے ممالک کیلئے بہت اچھی طرح کام کرتے ہیں)۔ بعض دساتیر (جن میں جاپان اور جرمنی کے دساتیر بھی شامل ہیں) کو ایک ناخوشگوار ماضی کے خلاف لنگر کے طور پر بری اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ان دساتیر کو یونانی دیو مالا کے کردار اوڈیئیس سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس نے اپنے سفینے کو بحری دیویوں سے بچانے کیلئے خود کو مستول سے باندھ لیا تھا۔ دیگر دساتیر کو ایک ناپسندیدہ مستقبل کی کشش کے خلاف لنگر کے طور پر بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے (جیسے کہ کینیڈا کا آئین جو ملک ٹوٹنے کے خطرے میں تخفیف کو مدنظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے)

جہاں تک دساتیر کی اپنی بات ہے وہ لیڈروں کے بد اندیش ارادوں کو راہ راست پر لانے کیلئے کچھ نہیں کر سکتے۔ سٹالن کا1936ء کا آئین ترقی پسند جمہوریت کا ایک نمونہ تھا (اگرچہ سٹالن نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ 'ووٹ ڈالنے والے کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے بلکہ ووٹ گننے والے ہر بات کا فیصلہ کرتے ہیں') لاطینی امریکہ کے کئی ممالک نے انیسویں صدی میں جمہوریت کی اذیت ناک بے یقینیوں کو قبول کیے بغیر امریکہ (یو ایس) کے آئین کی طرح کے دساتیر اختیار کیے۔ دیگر کئی ملکوں کے آئین مسلسل ارتقائی مراحل طے کرتے رہتے ہیں اور ان میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں جیسے کہ عمارتوں میں توسیع ہوتی ہے، نئے کمرے بنتے ہیں، دیواریں گرتی ہیں یا جیسے افراد خانہ کے درمیان جھگڑا ہونے پر مکان کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ لفظوں اور سچائی کے درمیان کا تعلق ہمیشہ دھندلا ہوتا ہے۔ وہی آئین جو

allurdupdfnovels.blogspot.com

کہ ایک زمانے میں ایک اشتمالی ، شفاف اور ترقی پسند ریاست کی ضمانت دے رہا ہوتا ہے بعد میں عوام کو زبانی جمع خرچ سے دھوکہ دینے والے سخت دل امراء کی پشت پناہی کرنے لگتا ہے، مثلاً چین کے موجودہ دستور میں حقوق انسان اور مزدوروں کے حقوق کیلئے بہت گنجائش رکھی گئی ہے لیکن اس ملک میں ان حقوق کیلئے جدوجہد کرنے والی بہت سی تحریکوں کی آواز بھی ہم تک پہنچتی رہتی ہے۔

اصل آئین، آئینی تھیوری میں نظر آنے والے آئینوں سے زیادہ دھندلے ہوتے ہیں کیونکہ ان میں حاکمیت کے متحارب اظہارات شامل ہوتے ہیں: ایک طرف قانون کے زیادہ گہرے اور پائیدار تعہدات اور دوسری طرف انتخابات پر مبنی حاکمیت کے زیادہ عارضی اظہارات۔ چونکہ قانون اور سیاست دان دونوں ہی ایسا جواز عوام سے اخذ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اس قسم کے نظاموں میں تنازعات کا خدشہ موجود ہوتا ہے۔ تاہم، چونکہ حتمی قانونی اتھارٹی سیاسی طاقت سے ماخوذ ہوتی ہے، جیت عموماً سیاسی قوت کی ہی ہوتی ہے۔ 1990ء کے عشرے میں اطالوی مجسٹریٹوں کی بدعنوان انتظامیہ کے خلاف تحریک کو سلویو برلسکونی کے ہاتھوں اس وقت منہ کی کھانی پڑی جب اس نے اقتدار میں آ کر مجسٹریٹوں کو انا پسندوں کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا گیا۔ 1960ء اور 1970ء کے عشروں میں امریکی عدالت عظمیٰ نے شہری حقوق اور اسقاط حمل کے معاملے کو منتخب کانگرس سے بہت پہلے آگے بڑھا دیا تھا مگر پھر نتیجے کے طور پر اسے پتہ چلا کہ اس کی اپنی تقریاں اس سے بھی زیادہ سیاسی ہیں۔ یہی ابہامات ان بنیادی حقوق پر لاگو ہوتے ہیں جن کی ضمانت خودمختار عدالتیں دیتی ہیں۔ 1215ء میں انگلستان میں منظور کیا جانے والا میگنا کارٹا درحقیقت بادشاہ اور اس کے باغی امراء کے درمیان بنیادی طور پر ایک ڈیل تھی لیکن اس میں حقوق اور قانون کی بات ضرور کی گئی تھی ...... 'کسی شخص کو ہم انصاف اور حقوق بیچیں گے نہ ہی کسی شخص کو اس سے محروم رکھیں گے اور نہ ہی ان کی فراہمی میں تاخیر کریں گے' یہ میگنا کارٹا قانون کی بالادستی اور اس خالص جمہوریت کی طرف پہلا قدم ثابت ہوا جس کے بارے میں ٹامس پین نے کہا تھا کہ شاہی تاج کی دھجیاں بکھیر دے گی اور ہر شہری کو نگینے سمیت ایک ایک دھجی ملے گی۔ یقیناً یہ مساوی حقوق بڑی ریاستوں کو لگام دے سکتے ہیں لیکن ان سے تنازعات بھی پیدا ہوتے ہیں کیونکہ بیشتر حقوق دیگر حقوق سے متصادم ہوتے ہیں اور آخر میں سیاست کو اس بات کا تعین

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرنا پڑتا ہے کہ کون سے حقوق کو اولیت دی جانی چاہیے۔[15]

تقسیمیں

اگر اقتدار پر اعتماد نہیں بیٹھتا تو اسے تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ منقسم ریاست ٹھنڈی اور سوچی سمجھی ہونی چاہیے، گرم اور طوفانی نہیں۔ یورپی روایت میں جو امتیاز نظر آتا ہے بیشتر طور پر کثرت پسندی کا مرہون منت ہے جس میں کلیساء ریاست سے آزاد تھا اور قصبات اور شہروں کو ملکوں اور سلطنتوں سے کسی نہ کسی حد تک خود مختاری حاصل تھی۔ تقسیم کی اچھائیوں کا سرا مونٹیسکو سے ٹامس ایکو ییناس اور پھر افلاطون تک جا ملتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات تو طاقتور ترین باشاہوں سے بھی اس بات پر صاد کیا کہ تقسیم سے ان کا نظام بہتر طور پر چل سکتا ہے، مثلاً نویں صدی کے قسطنطنیہ مین بیزل اول ججوں کو خود مختار کرنے کیلئے انہیں لمبی چوڑی تنخواہیں دیا کرتا تھا اور امراء اور افسروں کے خلاف مقدمے چلانے کیلئے غریب مدعیوں کی مالی امداد کیا کرتا تھا۔ تقسیم اقتدار کو اچھا قرار دینے میں امریکی دستور تشکیل دینے والوں نے سب سے زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے غیر منقسم اقتدار کے زیادہ موثر پن کو منقسم اقتدار کی اچھائی سے متوازن کرنے کی کوشش کی۔ ان کے پیش نظر یہ مفروضہ تھا کہ اقتدار میں کرپشن پیدا ہو جاتی ہے یا کم از کم اس میں بد دیانت لوگوں کو راغب کرنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ جیمز میڈیسن نے اس کا جواب یوں دیا کہ عزم کو عزم اور مفاد کو مفاد کے مقابل لا کھڑا کیا۔ 'اگر انسان فرشتے ہوتے تو کوئی حکومت بھی ضروری نہ تھی'۔ حکومت کے بطور کریہہ ضرورت اور کمینہ انسانی فطرتوں کے درمیان ثالث کے اس تصور سے یہ چیزیں ضروری ہو جاتی ہیں۔

اقتدار کی مختلف محکموں میں باقاعدہ تقسیم، پوچھ گچھ اور کنٹرول کیلئے قوانین کی توضیح، اچھے کردار کے حامل ججوں پر مشتمل عدالتوں کا قیام، مقنّنہ میں منتخب نمائندوں کے توسط سے عوام کی نمائندگی، یہ یا تو مکمل طور پر نئی دریافتیں ہیں یا انہوں نے تکمیل کی طرف اپنی بیشتر پیشرفت جدید وقتوں میں کی ہے۔[16]

یہ تصور امریکہ میں ایک ایسے نظام میں منتج ہوا جس میں نظام کے مختلف اعضاء اولیت

allurdupdfnovels.blogspot.com

کیلئے ایک دوسرے سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ گاہے گاہے صدر بھی رفتار مقرر کر سکتا ہے...... جیسا کہ جب لنڈن جانسن نے غربت کے خاتمے کیلئے یا رونالڈ ریگن نے ٹیکسوں میں کمی کیلئے اقدامات کیے تھے۔ دیگر اوقات میں کانگرس تحریک فراہم کرتی رہی۔ تدریجی تبدیلی کی تحریک اکثر ان دونوں کی بجائے عدالتوں کی طرف سے ملتی رہی: شہری حقوق کی ترقی سے لے کر تمباکو پر محکمہ صحت کی ترقی، عارضی طور پر معطل سیاسی نظام کے متبادل کے طور پر طبقاتی اقدامات اور عدالتی فیصلوں کے استعمال تک۔

اگر مقصد حکومت کو حد میں رکھنا اور بدعنوانی کو روکنا ہو تو دیگر اقسام کی تقسیمیں بھی لازم ہو جاتی ہیں۔ اگر قوانین کا ڈھانچہ انتظامیہ سے الگ کر دیا جائے تو غالب امکان ہوتا ہے کہ وہ جائز اور ایماندارانہ نہ ہوں گے۔ اس سے مختلف النوع گروہوں کو قانون سازی کے عمل میں شمولیت کا موقع ملتا ہے لیکن کیا ہوتا ہے کہ اس سے وہ ترغیبات کم ہو جاتی ہیں جو قانون سازوں کو اپنی پسند اور مفاد کے قوانین وضع کرنے پر مائل کرتی ہیں۔ محاسبے کو پڑتال (آڈٹ) کے توسط سے نفاذ سے الگ کرنا پڑتا ہے۔ آڈٹ میں قومی اعداد و شمار اور کاروباری اداروں کے کھاتوں جیسے وہ خارجی آلات آ جاتے ہیں جو گوشواروں اور فردوں کی توثیق کرتے ہیں۔ بعض ذمہ داریاں خصوصاً وہ کہ جو اقدار کا تحفظ کرتی ہیں، انتظامی فیصلہ سازوں سے لے کر بلا تامل امانت داروں (ٹرسٹیز) کے حوالے کرنا پڑتی ہیں۔ یہ وظیفہ اکثر سینٹر اور صدر سر انجام دیتے ہیں اور اس کے پیچھے مفروضہ یہ کارفرما ہوتا ہے کہ بزرگوں میں زر پرستی، حرص، طمع اور بدعنوانی کم ہوتی ہے۔

یہ سب انتظامات اس اصول کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ فیصلے زیادہ سے زیادہ غیر شخصی ہونے چاہئیں۔ ایسی ریاستوں میں کہ جہاں حکمرانوں کی ذاتی پسند و ناپسند کو فیصلہ سازی میں اولیت دی جاتی ہے، ایوان اقتدار تک رسائی رکھنے والے خاص افراد بے حد طاقت حاصل کر لیتے ہیں (خواہ ان کے عہدے اتنے بڑے نہ بھی ہوں مثلاً قرون وسطیٰ میں بادشاہ کا معتمد، فارس کا امیر حاجب یا سلطنت حبشہ کا وزیر قلم)۔[17] جدید دور کے دساتیر نے ایسے بہت سے وظائف میں شخصی عنصر منہا کر دیا ہے اور اب ان کیلئے معین اور صاف شفاف معیارات کے مطابق ایسے افراد کی تقرریاں کی جاتی ہیں جو کہ غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ذاتی مشیروں کے اختیارات بھی بہت محدود ہو گئے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

انیسوی صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں ریاست کے ارتقاء کے ساتھ اختیارات بھی بہت زیادہ مرتکز ہو کر رہ گئے جن کا جواز جنگی ساز و سامان کی ضروریات اور اس قابلیت کو بنایا جانے لگا جو مشترکہ قومی تعلیمی معیارات اور زبان سے لے کر ریلوے کی پیمائشوں تک ہر چیز کے انضباط سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یورپ اور شمالی اور جنوبی امریکہ میں ریاستوں کے درمیان جنگوں کی صورتحال اب پہلے جیسی نہیں رہی، ارتکاز اختیارات میں بھی کمی دیکھنے میں آ رہی ہے اور اس کی جگہ وفاقیت اور تقسیم اقتدار کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، اب اس تصور کا اطلاق کہ اچھی حکومت کیلئے اقتدار و اختیارات کو تقسیم کرنا اور اس کی حدیں متعین کرنا ضروری ہوتا ہے، حکومت کے تقریباً ہر پہلو پر کیا جا رہا ہے۔

تقسیم اقتدار کا سب سے بنیادی طریقہ وفاقیت ہے جس کی ابتداء پہلی یورپی جمہوری ریاست سوئٹزرلینڈ سے ہوئی۔ اصول وفاقیت شہری اسمبلیوں اور دیہی بنیادی جمہورتیوں کو باقاعدہ انتقال اختیارات پر مبنی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں حکومت کے خط و خال بہت نرالے ہیں۔ یہاں حکومت ایک سات رکنی مجلس چلاتی ہے جس میں بڑی جماعتوں کو ایک مقررہ فارمولے کے مطابق نمائندگی دی جاتی ہے لیکن حکومت میں آنے والی ہر جماعت کو پوری پارلیمان منتخب کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ریاستوں کا ایک اپنا کردار ہے اور قوانین منظور کرنے اور محصولات جمع کرنے کے بہت سے اختیارات ان کے پاس ہی رہتے ہیں۔ گذشتہ چند عشروں سے بہت سے دیگر ممالک بھی سوئٹزرلینڈ کے نقش قدم پر چلنے لگے ہیں۔[18] بہت سے ممالک نے مرکز کے اختیارات میں کمی کر دی ہے۔ فرانس کبھی مرکزی حاکمیت کی مثال ہوا کرتا تھا۔ تمام سرکاری ملازمین کا تقرر ریاست کرتی تھی اور ریاست کے گماشتے (Prefects) ہی مختار کل ہوتے تھے لیکن 1982ء میں منظور ہونے والی Loi Deferre کے بعد اختیارات مختلف محکموں اور 36000 کمیونوں کو منتقل کر دیئے گئے۔ 1970ء کے عشرے میں سویڈن میں مقامی علاقوں کو فلاحی ریاست کو جزوی طور پر اختیار کرنے، خود کو آزاد کمیونوں کی حیثیت دینے اور مختلف شہری خدمات کا انتظام خود کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ یہاں تک کہ اب چین میں بھی محصولات کا مرکزی نظام Tongshou Tongzhi ختم کر دیا گیا ہے۔ یہاں بھی پہلے مرکزی حکومت ہی مقامی انتظامی اداروں کیلئے بجٹ مختص کیا کرتی تھی لیکن اب مقامی صوابدید کو زیادہ وقعت دی جانے لگی ہے (اگرچہ تقرریوں اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

برطرفیوں کا اختیار اب بھی مرکز کے پاس ہے)۔[19] بولیویا اور چلی میں بھی تقسیم اقتدار کے عمل سے عوام کی کاروبار حکومت میں شراکت کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور وسائل کو غرباء کی تعلیم، صحت و صفائی اور پانی کی ضروریات پوری کرنے کیلئے بروئے کار لایا جانے لگا ہے۔1990ء کے عشرے میں بھارت میں نہ صرف دیہی پنچائتوں کو اختیارات منتقل کرنے کا عمل شروع ہوا بلکہ خواتین، نچلی ذاتوں اور قبائلی گروہوں کیلئے لازمی نمائندگی کے اصول پر بھی عمل کیا جانے لگا اور تمام اسمبلیوں میں کل نشستوں کا ایک تہائی عورتوں کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔ اختیارات کی تقسیم و منتقلی کا اصول جن جگہوں پر بھی اپنایا گیا ہے اس نے وہاں قومی حکومتوں کے غاصبانہ کردار کی تحدید کا کام سرانجام دیا ہے جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ مقامی آبادیوں کو سہولیات بہم پہنچانے کیلئے مختص رقوم کو اللے تللوں پر اڑا دیں (1990ء کے عشرے میں یوگنڈا میں ہونے والی ایک تحقیق سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ وہاں سکولوں کیلئے مختص گرانٹ کا صرف 13 فیصد حصہ ہی سکولوں تک پہنچ پاتا ہے)۔[20]

اس جمہوری روایت کہ جس کے ڈانڈے قدیم ایتھنز سے ملائے جاتے ہیں کا اصول یہ ہے کہ حکومت اپنے فرائض بہترین طور پر اس وقت سرانجام دیتی ہے جب یہ عوام سے قریب ہو۔لیکن تقسیم اختیارات کے نظام میں کئی اور مخفی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ ایک خوبی یہ ہے کہ اس سے اعلیٰ حکومتی عہدوں کیلئے امکانی لیڈروں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور انہیں ایک ایسی تربیت گاہ میسر آتی ہے جہاں وہ اپنی قابلیت ثابت کر سکیں۔[21] جمہوریت کی طرف گامزن ملکوں کیلئے یہ بات خاص طور پر بہت اہمیت کی حامل ہے۔اس سے نئے لیڈروں کی پرورش ہوتی ہے اور انہیں موثر اور دیانتدارانہ طریقے سے حکمرانی کرنے کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ اس عمل سے استبدادی حکومتوں کے تحت زندگی گزارنے والے لوگوں میں عام یہ خطرناک مفروضے کا خاتمہ ہوسکتا ہے کہ سب لیڈر چور ہوتے ہیں اور وہ صرف اپنا پیٹ بھرنے کیلئے ہی حکومت میں آتے ہیں (بد اعتمادی کے خاتمے کیلئے تشکیل دیا جانے والا کوئی بھی نظام اعتماد کی فضا پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے)۔[22]

یہ انتقال اقتدار کے جمہوری عمل کی ایک واضح علامت ہے کہ ابھی تک حقیقی جمہوریت کا حامل کوئی بھی ملک تقسیم نہیں ہوا ۔ ملک جنگوں اور انقلابات کے نتیجے میں ٹوٹے ہیں یا ایسے ملک ٹوٹے ہیں جہاں کے عوام کو حق رائے دہی نہیں دیا جاتا اور بہت سی قومیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

آمریتوں سے علیحدگی کیلئے برسر پیکار رہی ہیں۔ تاہم جمہوریت کے حامل کئی ایسے ملکوں کی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں علیحدگی کی تحریکیں کامیاب رہیں، مثلاً چیک اور سلو ویک ریاستوں کی چیکوسلویکیہ سے باہمی علیحدگی اور گرین لینڈ کی یورپی اتحاد سے علیحدگی (گویہ ڈنمارک سے الگ نہیں ہوا) لیکن ان کے برعکس کیٹالونیا، کیوبک، سکاٹ لینڈ اور بھارت جیسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں علیحدگی پسندانہ رجحانات کو بڑی کامیابی سے زائل کر دیا گیا۔ ایسے ممالک علیحدگی پسند گروہوں کو مراعات ہی اتنی دے دیتے ہیں کہ ان کے دل سے الگ ہونے کا خیال جاتا رہتا ہے۔ اگر سپین کی بات کریں تو فرانکو کے آمرانہ اقتدار کے بمشکل ایک ہی پشت بعد وہاں یہ صورتحال ہے کہ اس کے تمام مختلف حصوں کو مکمل خود مختاری حاصل ہو چکی ہے اور بجائے اس کے کہ مرکزی حکومت انہیں ٹھیکے دے، وہ مرکزی حکومت کو ٹھیکے دینے لگے ہیں۔ اٹلی میں ناردرن لیگ اور برازیل کی ریوگرانڈے ڈوسل کی علیحدگی پسندانہ تحریکیں بھی اسی طرح تحلیل ہوئی ہیں۔

تقسیم اقتدار کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ اس سے مرکزی ریاست کمزور پڑ جاتی ہے۔ گزشتہ صدی میں بہت زیادہ وفاقیت کے حامل بعض نظاموں میں بھی مرکز کی طاقت میں اضافہ دیکھنے میں آتا رہا ہے۔ جیسا کہ ہینہ ایرنتکا کہنا ہے سیاسی اقتدار کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ 'یہ تقسیم کرنے سے کم نہیں ہوتا'۔[23] اور نہ ہی انتقال اقتدار اچھی حکومت کی کوئی حتمی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس کے باوجود بھی ناہمواریاں ہو سکتی ہیں اور یہ کم ازکم معیارات کی جڑیں کاٹ سکتا ہے۔ یہ ایسی حکومتوں کیلئے ایک آلہ کار کا کام دے سکتا ہے کہ جو ذمہ داریوں سے تو کنی کترانا چاہیں مگر اختیارات و اقتدار سے نہیں۔ 1980ء کے عشرے میں امریکی حکومت نے وفاقیت کیلئے جو اقدام کیے وہ دراصل صدر ریگن کی حکومت کو دبلا کرنے کی حکمت عملی کا ایک حصہ تھے اور اس کے بعد روس، قزاقستان اور تنزانیہ میں اختیارات کی جو منتقلی دیکھنے میں آئی ہے اس سے ذمہ داریوں کا بوجھ ایسی مقامی حکومتوں کے کندھوں پر آن پڑا کہ جن کے پاس اتنے محصولاتی وسائل ہی نہیں تھے کہ وہ ان ذمہ داریوں سے عہد برآ ہو سکیں۔ اختیارات کی مناسب حد سے زیادہ تقسیم سے معاشروں کیلئے غیر مساوی قربانیوں سے متعلق مشکل فیصلے کرنا ایک امر دشوار بھی بن سکتا ہے (مثلاً موسمی تبدیلی کے خطرے کا سامنا کرنا)۔ تاہم گزشتہ بیس برسوں کے دوران فیصلہ سازی کی نیچے کی طرف منتقلی بلا شبہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایک ایسی بہتر حکومت پر منتج ہوئی ہے جو ان چیزوں کی دھیان دیتی ہے جو عوام کی فلاح کیلئے واقعی اہم ہوتی ہیں۔

جہاں وفاقیت اور تقسیم اقتدار مرکز کے غاصبانہ رجحانات کو زائل کرتی ہے، دیگر بعض آلات ایسے بھی ہیں جو مختلف اقسام کی حکومت کے باہمی ربط میں آڑے آتے ہیں۔ بہت سے معاشروں میں سیاستدانوں اور حکومتی عہدیداروں کیلئے اپنی خدمات کا عوضانہ لینے کی ممانعت ہے (مثلاً 2005ء میں بھارتی پارلیمنٹ لوک سبھا سے گیارہ ایسے ارکان کو خارج کیا گیا جو ایک ایسے خفیہ آپریشن کا شکار ہوئے جس نے انہیں بعض پارلیمانی سوالات اٹھانے کے عوض پیسوں کی پیشکش کی تھی) اور سیاسی جماعتوں کو ملنے والی رقوم پر روک اس لئے لگائی جاتی ہے تاکہ مالدار لوگ ریاست پر غلبہ حاصل نہ کر سکیں (اور اٹلی اور برازیل جیسے ملک جہاں ایسی پابندیاں موجود نہیں، مالدار طبقہ ریاست پر حاوی نظر آتا ہے)۔ بیسویں صدی کے آغاز میں امریکی صدر ٹیوڈور روز ویلٹ نے ایسے قواعد وضوابط متعارف کرائے تھے کہ جن سے تاجر طبقے کو مجبور کیا جا سکے کہ وہ حکومت سے مراعات اور تحفظات کے حصول کیلئے ساز باز میں مصروف رہنے کی بجائے اپنی توجہ مقابلہ واختراع پر مرکوز کر سکے۔ تیس برس بعد 'معاشی شاہ پرستوں' پر فرینکلن روز ویلٹ کے حملوں نے ان اقدامات کو اور بھی تقویت پہنچائی۔ لیکن اس طرح کی چیزیں دیگر بہت سے ملکوں میں نظر نہیں آتیں۔ اس کا نتیجہ ایک ایسے مریضانہ شارٹ سرکٹ کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے جو امیر تاجر طبقے کو امیر ریاست سے تو جوڑ دیتا ہے لیکن دونوں کو جمود کا شکار کر دیتا ہے (اس سلسلے میں ارجنٹائن کی مثال خاص طور پر اہم ہے)۔ برک ہارٹ نے قدیم روم کے بارے میں لکھا تھا کہ اس کے سیاسی اور مدنی نظام ایک ہی چیز تھے جس سے دونوں خستگی کے شکار ہوئے کیونکہ سیاسی نظام خود کو خود سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ اس طرح کا مسئلہ ایسے معاشروں کو بھی لاحق ہوتا ہے جن میں تجارت وسیاست باہم بہت زیادہ شیر وشکر ہوتے ہیں۔

دیگر معاشروں میں فیصلہ کن علیحدگیاں مختلف ہو جاتی ہیں۔ اولیت اس بات کو دی جاتی ہے کہ فوج (جیسا مثال کے طور پر ترکی میں ہے) یا چرچ (مثلاً سپین میں) کو حکومت سے دور رکھا جائے اور یا پھر ریاست کو عسکری قوت پر اجارہ داری سے روکا جائے۔ 1689ء میں انگلستان میں جاری کیے جانے والے قانون حقیقت میں اس بات کو تسلیم کیا گیا تھا کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

پروٹسٹنٹ مسلک سے تعلق رکھنے والی شہری بھی اسلحہ رکھ سکتے ہیں جبکہ اس سے کیتھولک مسلک کے پیرو انگریز بادشاہ نے انہیں غیر مسلح کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ عقیدہ کہ لوگوں کو اپنے دفاع کیلئے اسلحہ خریدنے اور لے کر چلنے کی آزادی ہونی چاہیے، سوئٹزرلینڈ، امریکہ، لبنان اور البانیہ سمیت بہت سے ملکوں میں آج بھی قائم و دائم ہے۔

ایک قدرے مختلف قسم کی علیحدگی بھی ہے جو فیصلہ سازوں کو بہت زیادہ قلیل المدتی احتساب سے اس بنا پر محفوظ کر دیتی ہے کہ اس سے فیصلے ٹھیک نہیں ہو پاتے۔ اس کی ایک مثال مرکزی بینک ہیں لیکن بہت سے دیگر شعبے ایسے بھی ہیں جہاں اس نوع کا تحفظ اداروں کی بہتر کارکردگی کا ضامن بنتا ہے مثلاً نصاب تعلیم کی تیاری، علاج معالجے کی سہولیات سے متعلقہ ترجیحات کا تعین اور سائنس کی ترویج کی نگرانی وغیرہ۔ ان تمام شعبوں کو خانہ بندیوں اور بفروں سے فائدہ پہنچتا ہے جو کہ عوامی حاکمیت کے خالص نظریے کے خلاف جاتی ہیں۔ یہ چیزیں زیادہ اساسی عوامی مفاد کے نام پر عوامی حاکمیت اور نمائندوں کی حاکمیت کو کمزور کرتی ہیں۔

اب جدید جمہوریتوں میں عام تصور کی جانے والی تقسیموں اور خانہ بندیوں کی اس حیران کن حد تک متنوع فہرست سے کیا بات اخذ ہوتی ہے؟1791ء کے فرانسیسی دستور میں یہ بات درج تھی کہ 'حاکمیت واحد' نا قابل تقسیم' نا قابل انتقال اور نا قابل یقین ہے' اور اس سے تقریباً ایک صدی بعد انگلستان کے عظیم ترین آئینی ماہر تصور کیے جانے والے البرٹ وین ڈائیسی نے کہا تھا کہ منقسم اختیارات، عدلیہ کی بالادستی قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بے کشش سا منظر تھا کہ اس نے پارلیمان کی مطلق برتری کا جواز پیدا کر دیا۔ تاہم جدید جمہوریت کی تاریخ جو کہانی سناتی ہے وہ ان دونوں نظریات کے برعکس ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں حاکمیت کو قابل تقسیم، قابل انتقال، قابل تعین قرار دیا گیا ہے اس کی طاقت کو فیصلوں اور خندقوں سے محصور کیا گیا ہے اور اسے ایک ایسے جنگلی جانور کی طرح لگامیں دی گئی ہیں جس سے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں وہ سواری کرنے والے پر نہ پل پڑے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

نمودداری (Visibility)

بد اعتمادی کے زیر اثر تشکیل پانے والی ان رسمی پابندیوں کے ساتھ اب روز بروز حکومت کو ظاہر کرنے اور صریح بنانے والے قواعد بھی شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ جو چیز ظاہر نہیں اسے مشکوک خیال کیا جاتا ہے۔ بہت سی پارلیمانوں میں وزیروں سے جواب طلبی کی جانے لگی ہے۔ برطانوی وزیر اعظم کو ہر ہفتے تیس منٹ تک دارالعوام میں سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور لچک دار قواعد سے کسی بھی موضوع کو چھپایا جا سکتا ہے۔ بہت سے وزراء عوام کے سامنے 'سوال و جواب' کی مجالس منعقد کرنے لگے ہیں۔ بڑے سرکاری عہدیداروں کو تقرری سے قبل اور عہدے پر فائز ہونے کے بعد عوام کے سوالات کا جواب دینا پڑتا ہے۔ احتساب کا بیشتر عمل اب ایک پیشہ وارانہ وظیفے کی شکل اختیار کر گیا ہے کہ پسپائی اختیار کیے یا غلطی کیے بغیر شفاف اور پر اعتماد کیسے لگا جا سکتا ہے۔ جدید لیڈروں کو جارحانہ سوالات کی حرکیات کا مقابلہ کرنے کی بڑی احتیاط سے تربیت دی جاتی ہے مثلاً مشکل سوالات کی منطق سے انکار کیسے کیا جاتا ہے، بہت تھوڑے الفاظ ادا کر کے خود کو شائستہ اور مہذب کیسے محسوس کرایا جا سکتا ہے اور انکشافات کس وقت منظر عام پر لائے جاتے ہیں۔ کسی مجلس یا اسمبلی کی منتشر طاقت انتظامیہ کے مرتکز نظم و ضبط کے خلاف شاذ ہی کارگر ثابت ہوتی ہے (یہی وجہ ہے کہ ذرائع ابلاغ جھوٹ کو بے نقاب کرنے میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں) تاہم ظاہر ذمہ داری کو اب بھی حاکم اور محکوموں کے درمیان برابری کی واحد بہترین علامت تسلیم کیا جاتا ہے۔

احتساب کی مختلف آئینی ضمانتیں اس رویئے کو مزید تقویت بخشتی ہیں، مثلاً چھان بین کیلئے آزاد ذرائع ابلاغ کی قانونی ضمانتیں، سنسر کی آزادی (سوائے فحش نگاری یا پورنوگرافی جیسی چیزوں کے جن کا ریاستی مفاد سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا) اور شہریوں کا حکومت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حق وغیرہ۔ ایک دفعہ ایک صنعتی ملک کی سول سروس کے سربراہ نے آزادی اطلاعات کی بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے آپ صبح کپڑے بدل رہے ہوں اور کوئی پردے اٹھا دے ...... اور یقین جانیے یہ کوئی اچھا منظر نہیں ہوتا (اگرچہ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ سورج کا اجالا گھپلوں کے خلاف بہترین

allurdupdfnovels.blogspot.com

تحفظ کی ضمانت ہوتا ہے)۔ کئی معاشروں میں ریاستیں اس سے بھی ایک ہاتھ آگے چلی جاتی ہیں اور تنقید کی براہ راست حوصلہ افزائی کرنے لگتی ہیں اور ان غیر حکومتی تنظیموں اور یونیورسٹیوں کو مالی اعانت فراہم کرتی ہیں جو سرکاری پالیسیوں کے نقائص کے بارے میں رپورٹیں شائع کرتی ہیں۔ جدید ذرائع ابلاغ اس آزادی کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور مسلسل شور وغوغا مچائے رکھتا ہے۔ اس سے شیلی کی اپنی دادی اماں کے بارے میں کہی وہ بات یاد آ جاتی ہے کہ قدرت نے اسے بات چیت کی صلاحیت سے تو محروم کر دیا ہے لیکن افسوس کہ اسے گویائی سے محروم نہیں کیا۔ تاہم اس مفروضے کو کہ روئیت سے اخلاقی معیارات میں بہتری پیدا ہوتی ہے، بہت تائید ملی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جن ممالک (مثلاً سکنڈے نیویا کی ریاستیں) میں شفاف معلومات کی قانونی ضمانتوں کی روایات زیادہ مضبوط ہے وہاں کھپلوں اور لوٹ کھسوٹ کی سطح بھی دیگر ممالک کی نسبت کم ہے۔(24)

لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خوش انتظامی کیلئے رازداری کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ شفافیت (ٹرانسپیرنسی) کی۔ اگر معاملات کے افشا ہونے کا زیادہ اندیشہ ہو تو دشوار مراحل میں مشکل امور پر دیانتدارانہ مذاکرات بھی مشکل ہو جاتے ہیں (ہماری روزمرہ زندگی کے بہت سے امور پر بھی یہ بات صادق آتی ہے) مثلاً 1980ء کے عشرے کے اوائل میں پنشن پالیسی سے متعلقہ ایک دستاویز کے افشا ہونے پر برطانوی حکومت کے ادارے سنٹرل پالیسی ریویو سٹاف کو بند کر دیا گیا تھا۔ اس ادارے کو طویل المیعادی اہداف کو سامنے رکھ کر بنیادی تبدیلیوں کے بارے میں غور وخوض کرنے کا کام سونپا گیا تھا لیکن جب اس کی باتیں افشا ہو کر عوام تک پہنچیں اس وقت کی برطانوی وزیر اعظم نے محسوس کیا اب اس کے پاس اس ادارے کی مذمت کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ باقی نہیں بچا۔ اس طرح سے اعتماد تباہ ہو جاتا ہے اور فیصلہ سازی کا کام چھوٹی اور مخفی ٹیموں کو سونپنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی محدود ٹیموں کی باخبری اور معلومات بھی محدود ہوتی ہیں، لہٰذا وہ جو فیصلے مہیا کرتی ہیں وہ بھی بودے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک ایسی حکومت کہ جس میں ہر دوسرا شخص روزنامے مرتب کرنے میں لگا ہو، وہ بھی ایک چوراہے یا نائی کے حمام کی شکل اختیار کر جاتی ہے، کسی قسم کی سنجیدہ سوچ بچار کے قابل ادارہ نہیں رہتی۔ اگر لیڈروں کا وقت اور ان کی ذہنی توانائیاں ان کی بڑی ذمہ داریوں سے ہٹ کر عوام اور ان کے نمائندوں کی خدمت

allurdupdfnovels.blogspot.com

پر صرف ہونا شروع ہو جائیں تو ضرورت سے زیادہ احتساب بھی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ جمہوریت کے دیگر تمام پہلوؤں کی طرح اس معاملے میں بھی زیادہ اہم بات تناسب کی ہے مطلقات کی نہیں۔[25]

چنانچہ لب لباب اس ساری بحث کا یہ ہے کہ حکومت صرف اسی صورت میں اچھی ہو سکتی ہے کہ اگر اس کے اردگرد مقابلے، قوانین، تقسیم اختیارات اور رویئت کی پابندیاں کھڑی کر دی جائیں۔[26] ان تدابیر کا فائدہ یہ ہے کہ یہ دیانت کے فروغ میں مدد دیتی ہیں اور ان سے حکمرانوں کیلئے ظلم، من مانی اور بے ایمانی کی روش اختیار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خرابی ان میں یہ ہے کہ وہ اکثر ریاست کے بطور خادم کام کرنے کی صلاحیت میں حائل ہو جاتی ہیں۔ ان کی گرفت سے حکومت غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہے اور ان کی مداخلت اس حد تک جا سکتی ہے کہ شریف لوگ سیاست میں آنے سے ہی توبہ کرنے لگیں۔ یہ انتظامیہ کو اس حد تک لے جا سکتی ہیں کہ وہ بحرانی حالات میں مفلوج ہو کر رہ جائے۔

ہنگامی اختیارات

آخر میں بیان کردہ یہ خامی حکومت کی گرفت کرنے والی تمام تدابیر میں پائی جاتی ہے اور سب صورتوں میں یہ ایک ہی جیسے سلسلے کو جنم دیتی ہے۔ ہوتا کیا ہے کہ اگر کسی قوم کو کوئی بڑا خارجی خطرہ یا کوئی اور خطرناک مسئلہ درپیش آتا ہے تو حکومتی اقدام کی راہ میں حائل یہ دیواریں رکاوٹیں پیدا کرنے والے سرخ فیتے کی شکل اختیار کر جاتی ہیں جو بہت زیادہ ضرر وضیاع کا باعث بنتا ہے۔ اور پھر جب بحران عروج پر پہنچ جاتا ہے تو یہ دیواریں ہٹنا شروع ہو جاتی ہیں، حکومت آزاد ہو جاتی ہے اور مرکز پھر طاقتور ہو جاتا ہے اور ایسا بیشتر اوقات مضطرب اور عدم تحفظ میں مبتلا عوام کے دباؤ کے باعث ہوتا ہے مثلاً 1861ء میں امریکی خانہ جنگی کے آغاز پر ابراہام لنکن نے اپنے 'خواہ قانون کے عین مطابق خواہ لاقانونی' اقدامات کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ اس نے تو صرف 'عوامی مطالبے اور عوامی احتیاج' کے پیش نظر یہ سب کچھ کیا ہے۔ امریکہ نے جب افغانستان پر یلغار کے بعد گوانٹا ناموبے کی بدنام زمانہ جیل میں اسیر افراد پر تمام اصول وضوابط کو بالائے طاق رکھ کر مظالم ڈھانے کا سلسلہ شروع کیا تھا تو اس نے بھی احتیاج اور عوامی تائید کو ہی جواز بنایا تھا۔ اس سلسلے کے اگلے مرحلے

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں جب خطرات چھٹنا شروع ہوتے ہیں اور اس چیز کا اندیشہ بڑھنا شروع ہوتا ہے کہ اہل اقتدار اپنے عہدوں کا ناجائز استعمال کریں گے تو ان کی گرفت کیلئے اصول وضوابط کے دوبارہ نفاذ کیلئے دباؤ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امن و خوشحالی کے طویل دورانیوں میں حکومت کی چال پھر متوازن ہونے لگتی ہے، اس کے طورطریقے صحیح ڈگر پر آجاتے ہیں اور وہ اصول وضوابط کا پاس کرنے لگتی ہے۔

قدیم مفکرین قانونی حدیں پھلانگنے کو ریاستوں کا ایک ناگزیر خاصہ گردانتے تھے۔ ریاستوں کا اصل کردار ہنگامی حالات میں سامنے آتا ہے اور یہ ایک ایسی حکومت کا کردار ہوتا ہے جو نہ تو ذمہ دار ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کو جوابدہ۔ یونانی مفکر ڈائیو جنیس لکھتا ہے کہ 'چونکہ بادشاہ غیر ذمہ دار اقتدار کا حامل ہوتا ہے اور اس کی ذات ہی سب طرح کا قانون ہوتی ہے، اس کو باقی افراد میں ایک دیوتا کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے'۔[27] دوسرے لفظوں میں چونکہ بادشاہ قوانین بناتے ہیں، ان پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر بظاہر یہ لگے بھی کہ وہ قوانین کے پابند ہیں تو ان کے پاس اس بات کا اختیار بہرصورت موجود ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو معطل کر دیں یا پھر انہیں نظر انداز کر دیں۔ آج کل کے آئینوں میں آکر یہ اختیار بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اسے صرف ایسے انتہائی حالات میں ہی استعمال کیا جاسکتا ہے جب محافظت کے فریضے کو اولیت دینا ہوتی ہے۔ تاہم ہر ریاست کے پاس اپنے قوانین کو معطل کرنے کا حق محفوظ ہوتا ہے اور شاید اسے محافظت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کیلئے یہ حق محفوظ رکھنا بھی پڑتا ہے۔[28]

میکیاولی کا کہنا تھا کہ مضبوط ترین اور کامیاب ترین ریاستوں کو بھی اپنے آئین میں ہنگامی حالات سے نمٹنے کیلئے عارضی آمریتوں کیلئے گنجائش رکھنی چاہیے۔ اس کا موقف تھا کہ واضح حدود کا تعین ضروری ہوتا ہے ۔ اس پرانے نظریے کو کہ 'ضرورت کے آگے کوئی بھی قانون نہیں ہوتا' کو حدوں میں رکھا جانا چاہیے۔ عارضی آمریت صرف اسی صورت میں قابل قبول ہو سکتی ہے کہ خطرہ واقعی موجود ہو لیکن پھر بھی حدود کے نفاذ و نگرانی کا ایک نظام ہونا ضروری ہے اور یہ نظام آمر کے اثر سے آزاد ہونا چاہیے (روم پر آمر کو چھ ماہ تک حکومت کرنے کی اجازت تھی اور اگر وہ تجاوز کرنے کی کوشش کرتا تو اسے مجرم قرار دے دیا جاتا تھا) ایسے ہنگامی حالات کے نفاذ کی گنجائش رکھنے سے کہ جس میں جمہوریت کو معطل کیا جا

allurdupdfnovels.blogspot.com

سکے، نظام میں زیادہ لچک اور پائیداری آ جاتی ہے۔

اس قسم کی تدابیر ان تمام بندشوں کے اس تناقضی کردار کو تقویت دیتی ہیں جن کا ذکر میں نے بالائی سطور میں کیا تھا۔ وہ سب ایک ایسے نظام کی جہتیں ہیں جو بندشوں کے تحت چلتا ہے لیکن یہ نظام یہ بندشیں خود وضع کرتا ہے اور یہ ایک ایسا نظام ہوتا ہے کہ جو پھر ہنگامی حالات کی صورت میں خود کو معطل بھی کر دیتا ہے۔

نمائندگی

اگر حکومت پر حدیں لگانے کا مطلب یہ ہے کہ ریاست غلط روش اختیار نہ کر لے، نمائندگی کے طریقہ کار کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اچھا کردار بھی ادا کر سکتی ہے اور عوام نمائندوں کے انتخاب کے ذریعے خادم ریاست کے آقا کا درجہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ نمائندگی عوام کے بطور فرمانروا اور ریاست کے بطور کارندہ منصب کو ایک رسمی شکل عطا کرتی ہے اور عوامی نمائندے درمیانی فریق کا کردار ادا کرتے ہیں جنہیں عوام اختیارات تفویض کر کے ریاست کو اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔

نمائندگی نسبتاً ایک نیا تصور ہے۔ قدیم ایتھنز میں لوگ خود اپنی نمائندگی کرتے تھے۔ قرون وسطیٰ کے اواخر تک منتخب ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ منتخب ہونیوالا منتخب کرنے والے لوگوں کی جدید مفہوم میں نمائندگی کرنے والا یا ان کے گماشتے کے طور پر کام کرنے والا نمائندہ بن گیا ہے، نمائندگی کا یہ تصور جو آج کل اس قدر سیدھا محسوس ہوتا ہے قدیم یونان، روم، چین یا ہندوستان میں نہیں پایا جاتا تھا بلکہ اس نے پولینڈ کی سیم، سویڈن کی رکسڈاگ اور جرمن کی لانٹ تاخ جیسے اداروں کے توسط سے قرون وسطیٰ کی اسمبلیوں کے تجربے سے آہستہ آہستہ نمو پائی اور انگلش پارلیمان کی ممیز شکل اختیار کی جس نے انیسوی صدی کے بعد بیشتر دیگر قومی ریاستوں کیلئے ایک نمونہ تقلید کی حیثیت اختیار کر لی اور انہوں نے بھی پارلیمانیں اور اسمبلیاں بنانا شروع کر دیں (اور نمائندوں اور ماتحتوں کے درمیان اس امتیاز کو وقعت دینا شروع کی جس کی نشاندہی مشہور دانشور برک نے کی تھی)۔ (29)

عوام کی بڑے ممالک کے امور میں براہ راست شرکت کے ناممکن ہونے کا مطلب

allurdupdfnovels.blogspot.com

یہ تھا کہ جمہوریت نے ترقی پا کر یہ کام درمیان کے افراد یعنی جماعتوں کی صورت میں منظم پیشہ ور سیاستدانوں کے ذریعے کیا جو اسمبلیوں اور پارلیمانوں میں بیٹھ کر عوام کے سامنے جوابدہ ہوئے اور عوام نے نگرانوں کا منصب سنبھال لیا۔[30] اہل یونان کا خیال تھا کہ جمہوریت اور کسی بھی قسم کی اچھی حکومت بہت چھوٹے پیمانے کی ہونی چاہیے اور ایتھنز میں ہم جانتے ہیں کہ یہ چند ہزار سے زیادہ پر مشتمل نہ تھی۔ جدید جمہوریت کے حامیوں کا خیال تھا کہ اس کا فطری پیمانہ یکساں وخود آگاہ لوگوں پر مبنی قومی ریاست ہے۔

دوسو سال سے زائد عرصے تک معترضین یہ سوالات اٹھاتے رہے ہیں کہ آیا نمائندگی کا کوئی نظام واقعی ریاست کو خادم کا روپ دے سکتا ہے۔ روسو کہتا ہے کہ 'یہ بات ویسے ہی فطری اصولوں کے خلاف ہے کہ زیادہ لوگ حکومت کریں اور کم لوگ حکومت کی اطاعت کریں...... جب کوئی قوم اپنے نمائندے بنانا شروع کر دیتی ہے تو اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے'۔ جمہوریت کی عجب بات یہ ہے کہ تصوراتی اعتبار سے تو عوام حکمران ہوتے ہیں۔ لیکن عملاً عملداری حکومتوں کی چلتی ہے۔ واحد حل یہ سجھائی دیتا ہے کہ 'ہر شخص اس قانون کی اطاعت کرے کہ جسے اس نے خود تشکیل دیا ہے'۔ تاہم روسو کوئی ایسا موزوں طریقہ نہیں بتا سکا کہ یہ کیسے ہو۔ لوگ مل کر اکٹھے سوچ بچار نہیں کر سکتے اور ایک واحد گماشتے کے طور پر کام نہیں کر سکتے۔ روسو نے دوری عوامی اسمبلیوں کا تصور پیش کیا ہے کیونکہ 'حاکمیت کی نمائندگی نہیں کی جا سکتی'، وہ ویسٹ منسٹر میں پائی جانے والی جمہوریت کے خاص طور پر بہت خلاف تھا، انگریز سمجھتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں لیکن وہ سراسر غلط ہیں۔ آزاد وہ فقط تب ہوتے ہیں جب پارلیمانی انتخابات نزدیک آ رہے ہوتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ سیاستدان منتخب ہو جاتے ہیں تو وہ غلام بن جاتے ہیں اور ان کی کوئی حیثیت یا وقعت نہیں رہ جاتی، بہرصورت اگر حاکمیت کی نمائندگی کرنا ممکن بھی ہے تو ایک وقت پر آ کر نمائندے خود اپنی حاکمیت کا دعویٰ بھی کر سکتے ہیں (نپولین اپنی اسمبلی کے اراکین پر کیوں گرجا تھا کہ 'صرف تنہا میں عوام کا نمائندہ ہوں')۔

یہ تصور کہ ریاست صرف عوام کی خواہشوں کی ترجمان ہوتی ہے ایک فریب نظر ثابت ہوا ہے۔ ووٹنگ کے متعلق تجزیات نے بہت عرصہ قبل ہی یہ بات ثابت کر دی تھی کہ رائے دہی کا کوئی ایسا نظام وضع کرنا ممکن نہیں کہ جو ہر رائے دہندہ کی ترجیحات کو کسی مربوط اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

یکساں طریقے سے باہم ایک کر سکے۔[31] رائے دہی کا کوئی بھی نظام ایک حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگ اپنے حق رائے دہی کا استعمال فقط اپنی ترجیحات کے اظہار کیلئے نہیں کرتے بلکہ اپنے من پسند نتائج کے حصول کیلئے بھی کرتے ہیں (مثلاً لوگ استصواب رائے میں 'نا' کا ووٹ کسی حکومت کو کمزور کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ سوال خواہ کچھ بھی پوچھا جا رہا ہو)۔ اگر رائے دہی کے خواہ اس سے زیادہ کامل نظام بھی ممکن ہوں، اور ایسے بہت سے نظاموں کی تجاویز سامنے آتی رہتی ہیں، تو بھی نمائندوں کیلئے عوام کے حقیقی گماشتوں کے طور پر کام کرنا مشکل ہے چہ جائیکہ عوام خود بہت زیادہ منظّم ہوں، اپنے مطالبات اور حقوق کو آواز دینے کے قابل ہوں اور اس کی چھان بین کر سکیں کہ ان کے نمائندے کیا کر رہے ہیں۔ اس مسئلے کی ایک مثال وہ ہے جسے ماہرین سیاسیات 'گماشتی لاگت' کہتے ہیں۔ یہ وہ لاگت ہے جو کسی دوسرے سے گماشتے کے طور پر اپنا کام کروانے کیلئے دینی پڑتی ہے۔[32] چنانچہ نمائندگی کو عوام کی عکاسی کی کوشش سے کچھ زیادہ کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کسی نہ کسی قسم کا ایک ایسا مکالمہ بھی آ جاتا ہے جس میں مختلف طرح کے خیالات باہم مل کر ایک مرکب کی شکل اختیار کر سکیں۔

ایک دوسرا خوف جو ہمیشہ منڈلاتا رہتا ہے یہ ہے کہ کہیں منتخب لیڈر فطرت انسانی کے بہترین حصے کی بجائے بدترین حصے کی نمائندگی نہ کرنے لگ جائیں کیونکہ عین ممکن ہے کہ انہیں لوگوں کی فیاضی کی بجائے ان کے اندیشوں اور آزردگیوں کی دلالی کرنا زیادہ آسان لگے۔ عوام کی نمائندگی کے خواہاں لیڈر انہیں ایک تشخص دینے کی کوشش کرتے ہیں ...... اطالویوں، امریکیوں، مزدوروں یا کالوں کے طور پر ...... کیونکہ نمائندگی کیلئے کسی 'ہم' کے بغیر نمائندگی کا تصور ہی بے میل ہو جاتا ہے۔ لیکن تشخص کے اس احساس کیلئے ایسے دشمنوں اور خارجیوں کا ہونا بھی ضروری ہے کہ معاملات خراب ہونے کی صورت میں جن کے سر الزام دھرا جا سکے۔ قدیم دانشوروں نے اسی لیے کہا تھا کہ جمہوریت کا فطری تعلق مشترکہ مفاد کی بجائے دھڑوں اور خانہ بندیوں، حریف شناختوں اور دعوؤں سے ہے۔ یہ محض حسن اتفاق نہیں کہ قوم پرستی اور نمائندہ جمہوریت نے ایک ساتھ نمو پائی اور اس نے توانائیوں کا رخ بیرونی جانب حقیقی یا تصوراتی دشمنوں کی طرف موڑنا شروع کر دیا خواہ برطانوی استعماریت کا جنگی جنون ہو، فرانس کا انقلابی جوش وخروش اور یا پھر امریکہ کی مثال لے لیں جس نے

allurdupdfnovels.blogspot.com

توسیع پسندانہ قوم پرستی کی ضد کے طور پر اپنی زندگی کی ابتداء کی لیکن بعد میں دنیا کا سب سے زیادہ قوم پرست ملک بن گیا (2000ء کے عشرے میں جارج ڈبلیو بش وہ واحد ایسا سربراہ مملکت تھا جو ہر وقت اپنے کوٹ کے کالر پر قومی پرچم والا بیج لگائے پھرتا تھا اور یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس کے ماتحت قوم کو خدائی تائید حاصل ہے)۔

شروع کے بہت سے جمہوریت پسند افراد کی سوچ پر یہ اندیشہ سوار رہا کہ عوامی حکومت سے، خواہ یہ براہ راست تشکیل پائے یا منتخب نمائندوں کے توسط سے اقلیتوں پر جبر یا امیروں پر غریبوں کی آمریت جیسے عوارض پیدا ہو سکتے ہیں۔ انہی اندیشوں کے پیش نظر دستور ساز اپنے مسودوں میں اس عوامی طاقت کے خلاف شقیں اور تحفظات رکھنے پر مائل ہوئے کہ جو عوامی نمائندوں کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ امریکی آئین بنانے والے اسی وجہ سے جمہوریت کی بجائے 'امتزاجی حکومت' کے حق میں تھے اور انہوں نے امریکی دستور میں ملوکیتی عنصر صدر، اشرافی عنصر الیکٹورل کالج اور سینٹ اور جمہوری عنصر ایوان نمائندگان کی شکل میں شامل کر دیا۔

اس دور میں مونٹیسکو نے امریکی سوچ پر بہت اثر ڈالا۔ اس کا خیال تھا کہ انگریزی حکومت اس لیے ٹھیک کام کرتی ہے کہ وہاں لندن انتظامیہ کی مرکزی حکومت کے توڑ کے لئے ایوان امراء کی مقامی اشرافیہ حکومت اور ایوان عوام کے تعلیم یافتہ افراد کی حکومت موجود ہے۔ ایسے توڑ کے بغیر نمائندگی پر مبنی حکومت لازماً بیورو کریٹک آمریت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں خواہ وہ بادشاہ کی خدمت میں لگی ہو یا عوام کی۔ اچھی حکومت صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اگر اہم سماجی مفادات کو اقتدار کی وسیع تقسیم سے منسلک کیا جائے اور اس کے ساتھ اقتدار کے ایسے مضبوط برج بھی موجود ہوں کہ جن تک ریاست کی رسائی نہ ہو سکے۔ توڑ کیلئے موجود کسی غیر نمائندہ قوت کی عدم موجودگی میں نمائندہ جمہوریت بڑی آسانی سے آمریت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

مونٹسکیو جس اشرافیہ سے امیدیں وابستہ کیے بیٹھا تھا اس میں سے تو یہ منصب نبھانے کی صلاحیت ویسے ہی جاتی رہی لیکن انیسویں صدی میں آ کر محنت کی نئی صنعتی تقسیم سے یہ مقاصد بہت حد تک حاصل ہونے لگے، اس وقت تک تجارتی شعبہ، کارکنوں کی نمائندہ ٹریڈ یونینیں اور آدرشوں کی نمائندگی کرنے والی شہری تنظیمیں بہت نمو پا چکی تھیں اور ان کی موجودگی

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں کسی ایک اکثریت کیلئے آمرانہ ادا بھاؤ اختیار کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نئے سماجی ڈھانچے نے مختلف مفادات کو امریکی ریپبلکنز یا جرمن ایس پی ڈی جیسی چند حریف جماعتوں میں سمونا ممکن بنا دیا۔ نمائندہ جمہوریت تب جا کر کارگر ہوئی جب لوگوں نے خود کو ان وسیع تر سماجی دھڑوں ......طبقوں، قومیتوں، مفادات ...... کے جزو کے طور پر مشخص کرنا شروع کیا جو کم و بیش ان معاشروں کے برابر تھے کہ جن میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن ان عوامل کی عدم موجودگی یا ان کے غائب ہونے پر اسے مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ مغربی جمہوریت کو آج کے دور میں درپیش بہت سے مسائل اس طبقاتی تانے بانے کی شکست و ریخت کی عکاسی کرتے ہیں جس نے کہ سیاسی جماعتوں کو سہارا دیا ہوا تھا۔ بعض ملکوں میں سیاست انشقاق پذیر سماجی حقیقتوں کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے، مثلاً بھارت میں ہم ایسی جماعتیں دیکھتے ہیں جن کی بنیاد ذات برادری اور طبقات ہیں، اس کے علاوہ وہاں علاقائی اور مقامی جماعتیں بھی کام کر رہی ہیں اور جہاں تک اس کی بڑی سیاسی جماعت کانگرس کا تعلق ہے وہ ابھی تک اس عزت و وقار کے بل بوتے پر چل رہی ہے جو اسے ساٹھ برس قبل آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش ہونے کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا۔ اس طرح کے حالات میں جمہوری سیاست مسلسل دباؤ کا شکار ہو سکتی ہے (بھارت میں اس کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ دور رس وفاقیت کو ریاستوں کو سونپ دیا گیا ہے اور اس سطح سے نیچے اختیارات کو مزید تقسیم کر دیا گیا ہے)۔

اگر نظریاتی حد بندیاں زیادہ عریاں ہوں تو بھی نمائندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر معاشرہ متحارب عالمی تناظرات میں بٹا ہو تو کویل کے بقول 'یا تو اس میں انقلاب آ کر رہتا ہے اور یا پھر یہ انارکی کا شکار ہو جاتا ہے'۔[33] 1990ء کے عشرے کا الجیریا اس کی ایک بہت عمدہ مثال ہے۔ صدر شاذلی بن جدید اسلامی محاذ آزادی (ایف آئی ایس) پر سے پابندیاں اٹھا کر اسے 1992ء تک اسے ایوان اقتدار کے بہت قریب تک لے آئے تھے لیکن پھر کیا ہوا کہ فوج نے ایف آئی ایس کی امکانی فتح سے خوفزدہ ہو کر انتخابات کا دوسرا مرحلہ منسوخ کر دیا۔ شاذلی کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا اور الجیریا ایک خوفناک قسم کی خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس دور میں مغربی ممالک نے الجیریا کے ان دھڑوں کی خوب پشت پناہی کی کہ جو جمہوری عمل میں اپنے نظریات کے مطابق ہیر پھیر کر رہے تھے جس سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

سیدھی سادھی جمہوریت پر ایمان رکھنے والے حلقوں کو بہت صدمہ محسوس ہوا۔ بعض دیگر حلقے ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ الجیریا کے ان اسلامی عسکریت پسندوں کو اقتدار میں آنے کا موقع دیا جانا چاہیے تھا کیونکہ ان کے خیال میں یہ اس خطے کے بقیہ حصوں میں اسلام پسندی کے آگے بند باندھنے کا بہترین طریقہ ثابت ہوسکتا تھا۔

اگر عوام کی نظر سے دیکھا جائے تو نمائندوں کا کام ہے نمائندگی کرنا۔ لیکن اگر ریاست کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کا کام جواز مہیا کرنا ہوتا ہے۔ اب کسی نہ کسی طرح کے انتخابات کے توسط سے ملنے والے جواز کے بغیر قانونی طور پر حکومت کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے اگرچہ آل سعود اور میانمار کے ان فوجی جرنیلوں جیسی چند ایک مثالیں ایسی بھی ہیں جن پر یہ بات صادق نہیں آتی کہ جو محدود اور نمائشی قسم کے انتخابات کا ڈھونگ رچاتے رہتے ہیں۔ اور تو اور صدام حسین جیسے جابر حکمران کو بھی امریکی حملے سے چند ماہ پیشتر عام انتخابات کروانا پڑے تھے جن میں انتہائی کانٹے دار مقابلے کا اہتمام کیا گیا تھا (اور ان میں صدام کو 99 فیصد سے زائد ووٹوں سے کامیابی حاصل ہوئی تھی)۔

قدیم دانشوروں کا عمومی تصور یہ تھا کہ جمہوریت بہت پر جوش، گرما گرم اور بے قابو قسم کی شے ہوتی ہے۔ لیکن اگر نمائندہ جمہوریت کو دیکھیں تو لگتا ہے کہ اس نے سیاست میں مسکینی پیدا کر دی ہے اور اب سیاست ریاست کیلئے بھی اتنا ہی کام کرنے لگی ہے جتنا کہ ریاست سیاست کیلئے کرتی ہے۔ اگرچہ پارلیمان کو تقریری کلچر کا فورم کہا جاسکتا ہے لیکن یہ اپنا کام تحریری قوانین کے توسط سے سرانجام دیتی ہے جو نفرتوں اور سرکش جذبات کو رفع کر دیتے ہیں۔ اکثریت کی طالب جماعتوں کو اپنی انتہا پسندیوں کو لگام دینا پڑتی ہے۔ اقتدار کے مزوں سے بہرہ یاب ہونے کے خواہاں سیاستدانوں کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دولت پیدا کرنے والے نظاموں میں توڑ پھوڑ نہ کریں۔

انیسویں صدی کے بیشتر انقلابیوں کی سوچ یہ تھی کہ ان کے ارگرد پھیلی ریاستیں ناقابل علاج حد تک ناقص ہیں۔ آقائیت کا عنصر ان کی رگوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ چنانچہ یا تو ان کا تختہ الٹ دینا چاہیے اور یا پھر انہیں نئے سرے سے تعمیر کرنا ہوگا۔ جمہوریت کی تحکم اور درجہ بندی پر مبنی ریاست سے کوئی مطابقت نہیں ہوسکتی۔ تاہم اس کے باوجود انقلابیوں کے مطالبات کی کبھی بھی تشفی نہ ہوسکی۔ اس کی بجائے جمہوریت پسندوں کو تسلیم کی خو اختیار

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرنا پڑی، آر ایچ ثانی کے بقول ریاست کو 'خدمت گزار چاکری' میں تبدیل کرنا پڑا اور اس کی پرانی افسر شاہیوں کو صحت عامہ، ابتدائی تعلیم اور فلاح و بہبود کے کاموں پر لگانا پڑا۔[34]
انیسویں صدی کے برطانوی دانشور افسر شاہی کو ایک ایسا 'یورپی وبال' قرار دیتے تھے جن سے ان کی جمہوریت بچی ہوئی تھی۔ تاہم اس سے اگلی صدی کے ابتدائی برسوں میں افسر شاہی اس قدر عام ہو چکی تھی کہ برنرڈ شا کے پاس بھی اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ بچا کہ اس کے جواز میں دلیلیں دیں۔ اس نے کہا کہ 'لیموں کی تیزابیت کی طرح' بدعنوانی اور نا اہلیت جیسے عارضے پہلے ریاست کی سرشت میں شامل تھے لیکن اب ریاست اتنی لائق، ایماندار اور بیبی ہوگئی ہے کہ ترقی پسندوں کو 'ساری قوم کو ریاست کے پرچم تلے جمع کرنے کیلئے، جدوجہد کرنی چاہیے۔[35] جلد ہی جمہوریت ریاست کی اتنی ہی خدمت میں جت گئی کہ جتنی خدمت ریاست جمہوریت کی کر رہی تھیں اور بہت سے انقلابیوں کے بارے میں جنہوں نے کہ منتخب ہو کر کرسیاں سنبھالیں (مثلاً 1920ء کے عشرے کی برطانوی لیبر پارٹی اور جرمن سوشل ڈیموکریٹ) یہ پتا چلا کہ وہ تو بہت بڑے مقلد اور فرمانبردار بن گئے ہیں، ایسی باتوں سے بہت گریز کرنے لگے ہیں کہ جو دوسروں کو ناگوار گزرنے کا اندیشہ ہو اور اپنے ماتحت کار پردازوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی جستجو کرنے لگے ہیں۔

زیادہ پر اعتماد منتخب ہونے والے رہنماؤں نے کہا کہ جناب ہمارا کام عوام کی ترجمانی نہیں بلکہ ان کی رہنمائی کرنا ہے، ہم لوگوں کی بہترین خدمت صرف انہیں چیلنج کر کے کر سکتے ہیں، ان کی خواہشات کی ترجمانی کر کے نہیں اور سب سے زیادہ اخلاقی قیادت وہ ہوتی ہے جو قوم یا اداروں کو وہ کچھ دیتی ہے جس کی اسے ضرورت ہوتی ہے نا کہ جو وہ مانگ رہی ہوتی ہے یا جس کی وہ امیدیں لگائے بیٹھی ہوتی ہے۔[36] چنانچہ بات یہ ہوئی کہ لازماً وہی اقدام اچھے نہیں ہوتے کہ جنہیں عوام پسند کریں یا کہ جن کا فیصلہ جمہوری طریقے سے کیا جائے اور عوامی نمائندوں کی مشقیں کسنے والی تدابیر کا نتیجہ الٹ بھی نکل سکتا ہے مثلاً برطانوی وزیر اعظم سر رابرٹ پیل نے منشوروں کے بارے میں ایک مرتبہ کہا تھا کہ وہ 'معاہدوں کی تمام بندشوں کے موجب بنتے ہیں جو حکومت کے وسیع تر امکانات اور وسوسوں سے اور بھی زیادہ جسیم ہو جاتے ہیں'۔

نمائندگی ایک امر عام بن چکی ہے لیکن اس سے متعلق مباحث ابھی ماند نہیں پڑے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

جمہوریت کو جس قدر زیادہ کامیاب طریقے سے قابو کیا گیا ہے اس وسوسے میں بھی اسی قدر اضافہ ہوا ہے کہ عوامی مفادات کا خیال نہیں رکھا جائے گا۔ کانٹ نے بجا کہا تھا کہ 'پارلیمان میں اپنے نمائندے بھیجنے والی قوم کے سامنے بات یہ آتی ہے کہ ان کی آزادی اور حقوق کے یہ پاسبانوں کو تو صرف اپنے اور اپنے اقرباء کی پڑی ہوئی ہے'۔ بد اعتمادی کی مضبوط روایات اس مفروضے کو تقویت دیتی ہیں کہ نمائندوں کے بدلنے اور ان کے بدعنوانی میں پڑنے کا اندیشہ موجود ہوتا ہے۔ بعض ملکوں میں لوگ لیڈروں کو اساساً اس لئے منتخب کرتے رہے ہیں کہ انہوں نے ان کے بارے میں کبھی سنا ہی نہیں تھا (مثلاً 1989ء میں برازیل کے صدر منتخب ہونے والے فرنانڈو کالر میں بس یہی خوبی تھی) اور حالیہ دور میں کینیڈا کی قدامت پسند، فرانس کی اشتراکی اور اٹلی کی مسیحی جمہوری جماعت پر دفعتہً اس وقت تائید و حمایت کی برسات برسنے لگی جب لوگوں کا ان کے خدمت کے عہد و پیمان پر بھروسہ جاتا رہا۔ ان مسائل کے حل کیلئے مینڈیٹوں اور منشوروں کے ذریعے زیادہ رسمی تفویض اختیارات کی تجویزیں بھی سامنے آتی رہتی ہیں لیکن ان تدابیر سے تو محض پیشہ ور سیاستدانوں کے ایک حلقے کو ہی دوسرے کی نسبت زیادہ با اختیار بنایا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں کلیدی عہدوں کی مدت مقرر کرنے اور ان کے لئے دوبارہ منتخب ہونے پر حد لگانے کے حق میں دیئے جانے والے دلائل (جنہیں کیلی فورنیا میں گرے ڈیوس کی جگہ آرنلڈ شواز نیگر کو گورنر بنانے کیلئے کامیابی سے استعمال کیا گیا) نے منتخب اداروں کے خلاف عوامی غصے میں اضافہ کیا ہے (گذشتہ صدی کے آخر تک دس میں سے صرف ایک امریکی ایسا تھا کہ جسے کانگریس پر اعتماد تھا)۔ ریفرنڈم کا رواج پہلے کی نسبت تقریباً ہر جگہ زیادہ ہوا ہے اور یہ ریفرنڈم لیڈروں کی توثیق کیلئے استصواب رائے کے طور پر نہیں بلکہ نمائندہ جمہوریت کے ایسے تکملوں کے طور کروائے جاتے ہیں تاکہ ان سے اضافی جواز حاصل کیا جا سکے۔ اور بہت سے ملکوں میں عام افراد کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی ہے کہ وہ اراکین جیوری، مجسٹریٹوں اور کونسلروں کے طور پر سیاسی حکومتی ایوانوں میں داخل ہوں تاکہ نمائندگی اور صدارت کے عہدوں کو بہت زیادہ پیشہ وارانہ رنگ دینے کے رجحانات کو روکا جا سکے۔

ان وسوسوں کے رفع ہونے کے امکانات کم ہی نظر آتے ہیں کہ لوگوں کی خدمت کے دعویدار نمائندوں کو لوگوں سے بے تعلقی کے رویے پر اترنا ہی ہوتا ہے۔ اکثر جمہوری

allurdupdfnovels.blogspot.com

ریاستیں نمائندگی کے صارفی نمونے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں جس میں شہری دو یا تین ایسی حریف جماعتوں میں سے ایک کا انتخاب کرتے ہیں جو اراکین کی بجائے پیشہ ور افراد کی وضع کردہ پالیسیاں پیش کر رہی ہوتی ہیں۔ نمائندگی کی بجائے یہ سانچہ محدود بیوپار کے متبادل کے تعلق کا کام کرتا ہے جس میں جماعت یا حکومت میں مضمر اس جذباتی وابستگی یا تشخص جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی جو کہ عوام کی احتیاجات کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے بھی بری بات یہ کہ اس میں سیاست کو منجمد کرنے کا میلان بھی پایا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کی اس اختراعی بہار کے بعد کہ جس نے پارلیمان، جماعتوں، منشوروں اور پیشہ ور سیاستدانوں سمیت حکومت کی جدید شکلوں کو عروج دیا، جمہوریت کے نظاموں میں کم ہی کوئی اختراع دیکھنے کو ملی ہے۔ پولوں، شہریوں پر مشتمل جیوریوں، مواصلات کے اوپن سورس طریقوں اور شراکتی فیصلہ سازی سے متعلق منتشر تجربات کے باوجود جڑیں پکڑنے والی کامیاب اختراعات میں صرف تحقیقی آلات (پول اور فوکس گروپ) اور مواصلاتی آلات (پارلیمان کی بجائے ٹیلیوژن پر وزارتی بیانات اور انٹرنیٹ اور ٹی وی سپاٹ کی زیادہ ماہرانہ مارکیٹنگ) کو ہی شمار کیا جا سکتا ہے۔ مختصراً سیاسی طبقہ کی اپنی مراعات پر گرفت اب بھی مضبوط ہے اور خارجیوں کا اس میں داخلہ روکنے کیلئے وہی اس کھیل کے اصول متعین کرتا ہے۔[37]

مساوات اور جمہوریت کا مخلوط ارتقاء

عوام کیلئے بے اختیاری ایک بری چیز ہے۔ جب آپ بے اختیار ہوتے ہیں تو اس چیز کا امکان ہوتا ہے کہ آپ اپنے ساتھ بری باتیں کروائیں گے۔ یہ کم بلا واسطہ اعتبارات سے بھی بری ہوتی ہے کیونکہ کم حیثیتی سے لوگوں کی جسمیات ہی کمزور پڑ جاتی ہے[38] اور جب ان کے تشخص اور عزت نفس کو خطرہ پیش آتا ہے تو ان کے کام کرنے کی صلاحیت بھی ماند پڑ جاتی ہے (بے اختیار ہونا واقعی لوگوں کو کم درجے کے لوگ بنا دیتا ہے)۔[39] انہی وجوہات کی بناء پر اپنے اراکین کی ترقی میں مدد دینے کی فکر رکھنے والے معاشرے کو اختیارات نسبتاً زیادہ برابری کی بنیاد پر تقسیم کرنا پڑتے ہیں تاکہ بڑے پیمانے کی خلیجیں اور عدم توازن باقی نہ رہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

جمہوریت نے ریاست کو ایک خادم میں تبدیل کر دیا ہے اور یہ اس دعوے پر اساس کرتی ہے کہ لوگ بنیادی طور پر برابر ہیں۔ لیکن اگر دولت اور آمدن کی اونچ نیچ زیادہ ہو تو بظاہر جمہوری نظر آنے والی ریاستوں کے بارے میں بھی یہ امکان زیادہ ہو جاتا ہے کہ امراء ان پر تسلط جما لیں گے۔ انگلستان کی خانہ جنگی کے زمانے میں کیے جانے والے سب سے انقلابی مباحث میں اس مسئلے کو بہت سنجیدگی سے لیا گیا تھا۔ اگر حکومت کے داخلی ڈھانچوں کا میلان غریبوں کے بہت زیادہ خلاف ہو تو پھر آزادی اور حتیٰ کہ انتخابات کے رسمی آلات سے بات نہیں بنتی۔ انقلابیوں کو بادشاہت کو ہٹا کر اس کی جگہ تاجروں اور زمینداروں کی چند سری حکومت لانے میں کوئی زیادہ منطق نظر نہیں آتی تھی۔

جیرڈ ونسٹینلی کی 'قانون آزادی' 1651ء میں اسی برس شائع ہوئی جب ہابز کی 'لیویا ثان' منظر عام پر آئی تھی۔ وہ جدید مفکرین میں سے اس بات کی تہہ میں پہنچنے والا پہلا شخص تھا کہ سیاسی آزادی کیلئے معاشی مساوات ایک لازمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہابز کا نظریہ تھا کہ لگ بھگ ایک جیسی جسمانی طاقت کے حامل افراد کی تحریکات کو دبانے کیلئے ایک مضبوط ریاست درکار ہوتی ہے۔

امید تھی کہ ایک گروہی اور غیر حریفانہ مساوات سے یہی چیز حاصل کی جا سکتی ہے۔ حریفانہ ماحول میں اقتدار کا بھوکا لیڈر 'کوئی اندیشہ نہ ہونے پر بھی اندیشوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، وہ دوسروں کو تباہ کرنے کے درپے ہو جاتا ہے کہ کہیں دوسرے اسے تباہ نہ کر دیں، وہ دوسروں پر ظلم کرتا ہے کہ کہیں دوسرے اس پر ظلم نہ کرنے لگیں، دولت اور اقتدار کی وسیع خلیجوں کے بغیر ایک متعاون ماحول میں کسی کو بھی اس طرح کا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ونسٹینلی نے اپنا فلسفہ کسانوں کی بغاوت کے زمانے سے چلے آتے اس قدیم ردیف قافیے پر استوار کیا تھا جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ 'جب آدمؑ زمین کھودا کرتے تھے اور بی بی حوا ناپا کرتی تھیں تو پھر اس وقت معزز کون تھا؟' اس میں اس قدیم ازلی مساوات کی طرف لوٹنے کی امید تھی کہ جب نہ تو کوئی بڑا چھوٹا تھا اور نہ کسی کی کوئی جائیداد تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ 'شاہی اقتدار گھنے سایہ دار درخت کی مانند ہوتا ہے' اگر آپ اس کی چوٹی یا اس کی بالائی شاخ کاٹ بھی ڈالیں اور اس کی بقیہ شاخوں اور جڑ کو ویسے ہی رہنے دیں تو یہ پھر سے ہرا بھرا ہو جاتا ہے اور اس میں نئی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انقلاب کا دور

allurdupdfnovels.blogspot.com

رس ہونا ضروری تھا۔

ونسٹینلی حکومت کے کوئی ایسا بھی خلاف نہیں تھا لیکن وہ ایسی حکومت کے خلاف ضرور تھا جو 'بڑے لوگوں کو تو مال و دولت جمع کرنے کی کھلی چھٹی دے دیتی ہے اور غریبوں پر زمین کے خزانے بند کر دیتی ہے...... اگر وہ بیچارے مانگنا شروع کر دیں تو آوارہ گردی کے قانون کے تحت انہیں درے مارتی ہے اور اگر وہ کوئی چیز چرا لیں تو انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ شاہی حکومت کا مطلب طبقاتی حکمرانی تھی۔ اس کی نسل کا فرض تھا کہ وہ اس زمین کی بازیابی کرے کہ جو فتوحات کے بل پر عام لوگوں سے چھین لی گئی ہے اور اس پر تسلط جما لیا گیا ہے۔ (40)

ونسٹینلی کے نظریات کو کراموویل خاندان کے اور اس کے بعد کے دور کی آب و ہوا میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کراموویل نے نیو ماڈل آرمی کا رخ مساوات پسندوں اور انقلابیوں کی طرف پھیر دیا تھا۔ مساوات پسندوں کے قائد کرنل رچرڈ رمبولڈ کو کوئی دو عشرے بعد چارلز دوم کے خلاف رائی ہاؤس سازش میں حصہ لینے کے الزام میں پھانسی دے دی گئی، اس کی انتڑیاں نکالی گئیں اور اس کا مثلہ کیا گیا لیکن مرتے مرتے وہ اتنا ضرور کہہ گیا تھا کہ 'خدا کسی بھی شخص کو یہ نشانی لگا کر پیدا نہیں کرتا کہ وہ کسی دوسرے سے بالا ہے اور کوئی بھی دنیا میں پشت پر کاٹھی لگائے نہیں آتا اور نہ ہی کوئی سواری کے بوٹ پہن کر آتا ہے کہ اس پر چڑھے'۔ تاہم بعد کی صدیوں میں یہ نظریات بار بار پھر سے سامنے آتے رہے اور ترقی پسند بائیں بازو اور اس کے ان دلائل کی بنیاد بنے کہ جمہوریت کے مفہوم کو مساوی حقوق اور مساوی ووٹوں سے آگے محنت اور دولت کی مساوات تک لے جایا جانا چاہیے۔

خانہ جنگی پر ایک دوسری عظیم کتاب 'اوشنا' کے لکھاری جیمز ہیرنگٹن نے بھی کچھ اس سے ملتے جلتے دلائل پیش کیے۔ اس کا خیال تھا کہ خانہ جنگی کی آگ ملکیت کی ناجائز تبدیلیوں کی وجہ سے بھڑکی تھی اور اچھے آئین کا ایک خاصہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں جائیداد کی بالائی حد مقرر کی جاتی ہے۔ اس کا دوسرا دل پسند نظریہ یہ تھا کہ ریاستی عہدوں پر کسی کو مستقلاً براجمان نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا پیش کردہ مثالی دستور کہتا ہے کہ انتظامیہ اور سینٹ کے ایک تہائی اراکین کو ہر سال بعد بذریعہ ووٹ فارغ کر دیا جانا چاہیے اور فارغ ہونے والے ان اراکین کو تین سال تک دوبارہ انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہونی

allurdupdfnovels.blogspot.com

چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ہی ہاتھوں میں مرتکز حد سے زیادہ اختیارات آمریت اور بد عنوانی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ہیرنگٹن اور ونسٹینلی دونوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ دساتیر کے رسمی دعوے خواہ کچھ بھی ہوں جہاں دولت اور مواقع کی وسیع خلیجیں موجود ہوں وہاں اہل اقتدار اور ان لوگوں کے مفادات میں مطابقت ہونا ایک امر محال ہے کہ جن کی وہ خدمت کرتے ہیں۔ انہیں یہ باور ہو گیا تھا کہ ریاستیں جواز کا سب سے زیادہ خیال اس وقت کرتی ہیں جب حکومت کی تہہ میں کارفرما حقائق انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں ...... جب انہیں لوگوں کی اطاعت یا حمایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس عینک سے دیکھا جائے تو تاریخ کو حاکموں اور محکوموں کے درمیان اختیارات کے بدلتے توازن کی ایک حکایت کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ زراعت کی آمد سے قبل کے معاشروں میں ان کے درمیان ایک اضافی مساوات موجود تھی (اگرچہ پھر بھی مراعات یافتہ اشرافیہ موجود تھی) اور ایسے زمانوں کی یادیں ان لیڈروں کی روایات میں آج بھی باقی ہیں کہ جنہیں خود دیوتاؤں کے حضور قربان کیا جاتا تھا۔ دنیا کے بیشتر خطوں میں زراعتی کلچر وافر وسائل اور ذخیرہ شدہ دولت کے طفیل ان تناسبات کو اوپر لے گیا۔ چنانچہ طاقت اور دولت کے بھاری ارتکازات کی حامل سلطنتیں ظاہر ہونے لگیں اور ریاست کے گرد ایسی ثقافتیں پنپنے لگیں کہ جن سے حاکموں اور محکوموں کے درمیان خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

جب تک پیداوار کے بڑے ذرائع تک رسائی کے سلسلے میں اضافی مساوات موجود رہی، کاشت کاری پر مبنی معاشروں میں ایک معقول درجے کی مساوات پھر بھی موجود رہی۔ زرعی معاشروں میں اس کا مطلب زمین تھا اور انگلستان میں اس امر نے کہ بیشتر اراضی خود مختار کسانوں کی ملکیت میں تھی، حاکم سے آزاد ایک قانون عامہ اور اس کے ساتھ حقوق کی زبان کی نشوونما میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا۔[41] میگنا کارٹا محض اپنے مندرجات کی وجہ سے ہی اہم نہیں (اس کا شمار جمہوری تاریخ کی عجیب ترین دستاویزات میں کیا جا سکتا ہے اور اسے لائسنسوں، جرمانوں اور نوابی مراعات سے متعلقہ تفصیلات کا ایک گورکھ دھندا قرار دیا جا سکتا ہے) بلکہ اس لیے کہ اس میں اختیارات کی برابری کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے (کم از کم بادشاہ اور شرفاء کے درمیان کے اختیارات کی برابری کو) اور یہ ان انگریز بادشاہوں

allurdupdfnovels.blogspot.com

کیلئے بندشیں فراہم کرتا ہے کہ جنہیں بعد کی صدیوں میں اس کی کم از کم چالیس مرتبہ توثیق کرنا پڑی۔ جب ایک مرتبہ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ بادشاہ برابر انسانوں میں سے صرف ایک پہلا انسان ہے تو پھر یہ تصور کرنا بھی آسان ہو گیا کہ دوسرے لوگوں کو حقوق و مراعات کی دنیا میں کیسے شامل کیا جا سکتا ہے۔

اختیارات کے پست متناسبات کا انحصار کمزور فوجوں پر تھا۔ آئس لینڈ، انگلستان، امریکہ، آسٹریلیا اور سوئٹزرلینڈ سے شروع کریں تو تمام ابتدائی جمہورتیوں کو سمندروں اور کہساروں کے طفیل دوسری ریاستوں کی جارحیت سے امان ملی رہی۔ وہ اس براہ راست خطرے سے نسبتاً آزاد رہیں جو کہ ایک استبدادی مرکزی حکومت کا جواز مہیا کر سکتا تھا اور پھر ان کے دارالحکومتوں میں مال و متاع کے وہ بڑے بڑے انبار بھی نہیں تھے جو اشرافیہ میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس براعظم یورپ کے بیشتر خطوں میں جہاں یہ عوامل موجود نہیں تھے (اور جہاں ذرائع پیداوار پر کنٹرول اتنا منقسم نہیں تھا) اقوام کے درمیان مستقبل محاذ آرائی نے آمریت، بڑی بڑی افواج، افسر شاہیوں اور کمزور شہری حقوق کو پروان چڑھایا۔ یہ محض حسن اتفاق ہی نہیں کہ وسٹیلی کے سرگرم ترین مقلدین ابتدائی جدید یورپ کے اسی کمیاب مظہر سے آئے یعنی وہ عوامی فوج جو کہ حکمران کے اختیارات میں کمی کیلئے وجود میں آئی تھی۔

بعد میں جب صنعتی انقلاب کے طفیل شہری علاقے غریب اور محنت سے چور مزدوروں سے بھر گئے تو طاقت کے توازن ایک دفعہ پھر تبدیل ہو گئے اور بہت سی ریاستوں پر یہ حقیقت آشکارہ ہوئی کہ انقلاب کو روکنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ سیاسی و سماجی حقوق کو پھیلایا جائے اور نئے مزدور طبقے کو بھی سیاسی مکالمے میں شامل کیا جائے۔ جرمنی، برطانیہ، فرانس اور سکنڈے نیویا میں بہبود عامہ کے سلسلے میں ہونے والی ترقی کو صرف مختلف طبقوں کے درمیان طے پانے والے ایک اہم سمجھوتے اور اس کے استحکام کو صرف جمہوریت نے نتیجے کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔(42) مساوات اور جمہوریت کے ساتھ ساتھ ترقی کی۔ مرتکز اور منظّم مزدوروں کی طاقت نے حق رائے دہی اور مزدور تنظیموں کے حقوق کو آگے بڑھایا۔ بڑی افواج کی ضرورت نے بھی اسی عمل کو تقویت دی اور ریاستوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنا قانونی جواز مہیا کریں اور بندوقوں سے لیس انبوہوں کی قوت نے حرفتی اعتبار سے ترقی یافتہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ریاستوں کی مراعات کا چکتا کر دیا۔

جمہوریت اور مساوات ایک ساتھ جوں جوں آگے بڑھتے رہے، غریب عوام نے بھی جمہوریت کو اپنی ضرورت کی اشیاء کے حصول کیلئے استعمال کرنا شروع کر دیا اور انہیں پنشنیں، سکول، رہائشیں اور نوکری ملنے لگیں۔ عین اسی وجہ سے مراعات یافتہ طبقوں کے افراد جمہوریت کے آگے رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ برازیل کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں 1945ء میں فوج نے اقتدار پر صرف اس لئے قبضہ کیا تھا کہ عظیم ترقی پسند قائد جیٹو لیو وارگس کے جانشینوں کو اراضی کی اصلاحات اور جمہوری عمل کو تیز کرنے سے روکا جا سکے۔ یہ جنگیں کیسے لڑی جاتی ہیں اس کا دارومدار بنیادی اختیاراتی تناسبات پر اور حربوں پر ہوتا ہے۔ اشرافی طبقے اپنی کمزوری بھانپ کر انقلاب کو روکنے کیلئے رعایتیں بھی دے سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ کم سطح کی عوامی بہبود بھی سرکشی فرو کر سکتی ہے (بسمارک کی فلاحی ریاست کو اوپر سے کئے گئے اس نوع کے پیشگی اقدامات کی واضح ترین مثال قرار دیا جا سکتا ہے) انتہائی ناہموار معاشروں میں مراعات یافتہ طبقوں کے افراد کو جمہوریت کی مزاحمت میں بہت کچھ نظر آ رہا ہوتا ہے جبکہ دوسری طرف غریبوں کو بھی دکھائی دے رہا ہوتا ہے کہ اگر ریاست ان کے تسلط میں آ جائے انہیں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک قبیح قسم کے طویل المعیادی عدم استحکام کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے۔ (جیسا کہ ارجنٹائن میں ہوا جسے کہ صرف سو سال قبل دنیا کے امیر ترین ملکوں میں شمار کیا جاتا تھا)۔ بغاوتوں کا خوف تقسیم نو کرنے والی حکومتوں کے مقابل آ سکتا ہے (2000ء کے عشرے کے اوائل میں برسر اقتدار برازیلی صدر لولا جمہوری طریقے سے منتخب ہونیوالے بائیں بازو کے ایک اور رہنما یعنی تیس برس قبل کے چلی کے سالوا دور آئندے کے ساتھ پیش آنے والے احوال سے بخوبی واقف تھا) اور عوامی انقلاب کا خوف اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ جیسے کہ جیمز میڈیسن بھی کہتا ہے اگر ریاستی کنٹرول کے معاشی فوائد زیادہ ہوں تو سیاست کے متلون ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نسبتاً مساویانہ معاشروں میں اشرافی طبقوں کو تقسیم نو کی بجائے استبداد کی قیمت زیادہ چکانا پڑتی ہے۔[43] دانا مصلحین اس بات کو پا چکے ہیں کہ اراضی اور تعلیم کی تقسیم نو غریبوں کو تسلسل و نظام میں حصہ دار بناتی ہے جس کے نتیجے میں جمہوریت شرفاء کے لئے اتنی مہنگی نہیں رہتی، مثلاً دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکیوں نے جاپان، تائیوان

allurdupdfnovels.blogspot.com

اور جنوبی کوریا پر اراضی سے متعلقہ جو اصلاحات نافذ کی تھیں وہ ان معاشروں کیلئے بہت اچھا شگون ثابت ہوئیں۔ صرف اس لیے نہیں کہ ان سے ان ملکوں کی معیشت کی نشوونما میں مدد ملی بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان اصلاحات کی بدولت وہاں کی حکومتوں کو زیادہ بہتر خادم بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ تاہم جنوبی امریکہ والوں کا مقدر ایسا نہ تھا۔ یہاں امریکہ نے قدامت پسند حکومتوں کی پشت پناہی کی، جس سے زمینیں بدستور شرفاء کے قبضے میں ہی رہیں۔

چنانچہ زیادہ مساوات ، جمہوریت کیلئے راستہ ہموار کرتی ہے اور جمہوریت پھر مساوات کو فروغ دیتی ہے جس سے ریاستوں کو مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ اپنی توجہ شان و شوکت کی بجائے دال روٹی ، دوائیوں اور پانی کی فراہمی جیسی لوگوں کی روز مرہ ضروریات پر مرکوز کریں۔ آمر حکومتوں کی نسبت جمہوری حکومتیں عوامی سہولیات اور خدمات پر 25 سے 50 فیصد تک زیادہ رقم خرچ کرتی ہیں اور آمریت کے حامل ملکوں کی نسبت جمہوری ملکوں میں آلودگی پر کنٹرول کی صورت حال دوگنا زیادہ بہتر ہے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بہتر ماحولیاتی پالیسیاں زیادہ مدنی ہوی ہے لیکن حقائق وشواہد سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایسی پالیسیوں کی حوصلہ افزائی میں سب سے زیادہ کردار جمہوریت اور نسبتاً غریب طبقوں کی طرف سے صاف پانی اور ہوا کی مانگ ادا کرتی ہے۔[44] افریقہ سے ملنے والے شواہد بھی یہی کہانی سناتے ہیں۔ جوں جوں جمہوریت ترقی کرتی ہے، حکومتیں ابتدائی تعلیم پر نسبتاً زیادہ پیسہ خرچ کرنے لگتی ہیں اور وہ اعلیٰ تعلیم (جس سے اشرافیہ طبقے زیادہ مستفید ہوتے ہیں) پر کم و بیش اتنا ہی پیسہ لگاتی ہیں جتنا کہ غیر جمہوری ملکوں میں لگایا جاتا ہے۔[45] جمہوریت مردوں اور عورتوں کے مابین تعلق اور ان کی اضافی حیثیت کے معاملے میں بھی برابری کو فروغ دیتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں عورتوں کی متوقع عمر مردوں سے پانچ سال کم تھی۔ 1900ء کے بعد یہ نقشہ الٹ چکا ہے اور اب مرد اس معاملے میں پیچھے کی طرف جاتے نظر آتے ہیں۔

ان میں سے کوئی رجحان بھی ضروری نہیں کہ وہی آگے چلتا رہے۔ مساوی حقوق کے بیشتر لبرل حامی اب بھی محنت کے مسائل کو اپنے مباحث میں شامل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی جمہوریت دفتر کے دروازے اور کارخانے کے پھاٹک تک آ کر رک جاتی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

چونکہ کئی مختلف عوامل ناہمواریوں کا باعث بنتے ہیں، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ معاملات ایک جیسے رہتے ہیں یا ایک جیسے رہیں گے اور نہ ہی ہم قبل از وقت ان کی چال کا تعین کر سکتے ہیں۔ خواندگی کے پیہم فروغ اور اعلیٰ تعلیم کے ڈرامائی اضافے سے اختیارات کی مزید تقسیم اور ریاستوں اور شہریوں کے درمیان دوطرفہ تعلقات اور لین دین میں بڑھوتری پیدا ہو سکتی ہے۔ (ترقی یافتہ ممالک میں1960ء میں اعلیٰ تعلیم کی شرح آبادی کا 5 فیصد تھی جو اب بڑھ کر 50 فیصد تک پہنچ چکی ہے)۔ چین کی حکومت نے1978ء میں اراضی سے متعلقہ پالیسی کی اصلاح کی اور حقوق کو آبادی کے تناسب سے منسلک کر دیا۔ مساوات کے ضمن میں اسے تاریخی اعتبار سے دنیا کے اہم ترین اقدامات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف اس کے بالکل ساتھ والے ملک بھارت میں معاملہ اب بھی اس سے بالکل الٹ ہے اور وہاں اراضی کی تقسیم اب بھی بہت زیادہ غیر مساوی ہے۔ تاہم اگر چین کی بات کریں تو اس کی راضی کی اصلاحات کے پچیس سال بعد غیر متوازن منڈیوں کی ترویج اور رجعتی ٹیکسوں کے نفاذ کی بدولت چین کا شمار اب دنیا کے سب سے زیادہ ناہموار معاشروں میں ہونے لگا ہے۔ منڈی پر مبنی دیگر معیشتوں میں شرح وسعت کی بے مثل معیشتوں اور علم پر مبنی معیشتوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے بے مثل سطح کے منڈی کے تسلط (انٹیل اور مائیکرو سافٹ کو ہی دیکھ لیں) کے طفیل دولت کے وہ ارتکازات دیکھنے میں آ رہے ہیں جن کی مثالیں صرف ماضی بعید کی غاصب سلطنتوں میں ہی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ان ملکوں میں محنت کی منڈی میں بھی بہت زیادہ ناہمواری پیدا ہو چکی ہے اور ان معدودے چند وکیلوں، ماہروں، ڈیزائنروں اور ناظمین کی آمدنیاں جو کہ اپنا فن عالمی سطح پر فروخت کرتے ہیں اوسط سے بہت اوپر جا چکی ہیں۔ اور اگر دنیا کے امیر ترین معاشروں میں اضافی معاشرتی حرکت پذیری اور اشرافیہ کی روبہ تخفیف گردش دیکھنے میں آ رہی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ (امریکہ کی بہترین یونیورسٹیوں میں گریجوایشن لیول کی تعلیم حاصل کرنے والے صرف 10 فیصد طلباء و طالبات کا تعلق آمدنی کے اعتبار سے نچلے 50 فیصد گروہوں سے ہی ہوتا ہے)۔

چند سری نظام حکومت

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایسے رجحانات کا حکومتوں کے اخلاقی کردار پر اثر انداز ہونا ایک لازمی امر ہے اور یہ معاشرے کو اوپر بیان کیے گئے مساویانہ ڈھانچوں سے الٹ سمت میں لے جا سکتے ہیں۔ ایک صدی قبل رابرٹ نے چندسری نظام کی بات کرتے ہوئے 'آہنی قانون' کے لفظ استعمال کیے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جمہوری ریاستیں اکثریت کی بجائے صرف مٹھی بھر افراد کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیں گی۔ اس کا بڑا نشانہ یورپ کی اشتراکی جماعتیں تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ عوام کی نمائندگی کے بارے میں ان جماعتوں کے دعوے خواہ کچھ بھی ہوں، حقیقت میں ان سے فائدہ صرف اشرافیہ کے حریف گروہوں میں سے کسی ایک یا دوسرے کو پہنچے گا۔[47] اس کی بات میں مبالغہ شامل تھا اور اس نے جن جماعتوں کو نشانہ تنقید بنایا ان میں سے بیشتر کو نسبتاً غریب اور کمزور لوگوں تک اقتدار کی منتقلی میں کسی نہ کسی حد تک کامیابی حاصل ہوئی لیکن وہ اس بات کا اندازہ لگانے میں کامیاب رہا کہ اگر سیاسی جماعتیں حمایت وسرپرستی کے اپنے اصلی نیٹ ورکوں کو منجمد کر لیں تو اس سے اختیارات حریفانہ جمہوریت کی سطح تلے کیسے جمع ہو کر رہ سکتے ہیں۔ اس کا یہ اندازہ بھی ٹھیک تھا کہ بعض جمہوری ریاستوں میں لوگوں کے ذریعے، لوگوں کے لیے اور لوگوں کی حکومت کے نتیجے میں نئے اشرافیہ خاندان کو بھی عروج حاصل ہو سکتا ہے (اگرچہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ برصغیر کے چاروں بڑے ملک بڑے سیاسی خانوادوں کے تسلط میں آ جائیں گے اور بش اور کینیڈی خاندان کے افراد امریکی سیاست پر اس قدر حاوی ہو جائیں گے)۔

جمہوریت کے اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں میں چندسری حکومت کی جانب میلانات کی نسبت تجارت و ذرائع ابلاغ کی طاقت کے ارتکاز کے ساتھ خاص طور پر دیکھنے میں آتی رہی ہے۔ تجارتی حلقے طاقت نفع کوشی کی ضمنی پیداوار کے طور پر بالواسطہ اور ان صنعتوں سے بلا واسطہ طور پر حاصل کرتے ہیں جن کا انحصار ٹھیکوں، ضابطوں اور مراعات کے معاملے میں حکومتوں پر ہوتا ہے (ہالی برٹن نامی امریکی کمپنی جس کا مالک ڈک چینی2000ء میں امریکی نائب صدر کے عہدے پر فائز ہوا، اس کی ایک بڑی اچھی مثال ہے)۔ ذرائع ابلاغ میں وہ ادارے آ جاتے ہیں جن کے پاس طاقت صرف اس لیے چلی آتی ہے کہ وہ اپنی تحریروں اور پروگراموں کے توسط سے لوگوں کی توجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں وہ ادارے بھی شامل ہیں جو دانستہ طاقت کے حصول میں لگے رہتے ہیں (مثلاً روپٹ مرڈاک

allurdupdfnovels.blogspot.com

کا نیوز گروپ جو اس کے مقاصد کو آگے بڑھانے کیلئے اپنی طاقت بڑی شدو مد سے استعمال کرتا رہا ہے۔

اقتدار کے چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کا رجحان کسی بھی جگہ ممکن ہے (اگر کسی وڈیرے کو اپنی نسل آگے بڑھانے کا موقع ملتا ہے تو وہ اس موقع کو کبھی بھی نہیں چھوڑتا) لیکن اس کے لیے حالات کا ساز گار اور موافق ہونا ضروری ہے۔ ایسے معاشروں میں اس کے امکانات کم ہو جاتے ہیں کہ جہاں لوٹ کھسوٹ سے مال و دولت جمع کرنا اور اسے اپنے عزیز و اقارب میں بانٹنا سہل نہیں ہوتا' واقعی حقداروں کو ترجیح دی جاتی ہے یا جہاں کے سخت قوانین وڈیروں کیلئے یہ بات مشکل بنا دیتے ہیں کہ وہ ایک قسم کی طاقت (مثلاً دولت) کو کسی دوسری قسم کی طاقت مثلاً اقتدار) میں تبدیل کر سکیں۔ زیادہ عوامی سہولیات اور کم اشرافیہ اداروں کے حامل معاشروں میں یہ رجحان کم پایا جاتا ہے (یہی وجہ ہے کہ کینیڈا امریکہ کی نسبت ایک شفاف اور تحریک پذیر معاشرہ ہے اور سویڈن میں یہ رجحان برطانیہ کی نسبت بہت کم ہے)۔

جن معاشروں میں اقتدار کے چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کے رجحانات زیادہ قوی ہوتے ہیں یہ سماجی منافرت اور سیاسی منافرت کے درمیان تعلقات کو بھی تقویت دیتے ہیں اور دستاویزی شواہد بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں۔ نسبتاً نادار اور شراکت سے محروم کئے گئے لوگوں کا رجحان امریکہ اور برطانیہ میں انتخابات دلچسپی لینے اور نہ لینے والے افراد کے اعدادوشمار سے بخوبی واضح ہو جاتے ہیں اور مختلف عزائم اور اہداف کی حامل ان تحریکوں اور تنظیموں سے بھی جنہیں آج کل یورپی مغربی دنیا میں سرگرم عمل دیکھا جاتا ہے۔ پہلے کی جماعت اور شہری تحریکیں کچھ اور طرح کی ہوا کرتی تھیں لیکن آج کل کی سماجی تحریکوں پر دولت مند حلقوں کے غالب آنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ مثلاً محسوس ہوتا ہے کہ شہری تحریکوں میں انٹرنیٹ کے بڑھتے ہوئے استعمال سے جمہوریت کو بہت زیادہ فروغ ملے گا اور سول سوسائٹی کیلئے خود کو منظم کرنے میں آسانی رہے گی۔ تاہم آپ کسی بھی عالمی تناظر میں دیکھیں تو یہ امیر اور غریب طبقوں کے درمیان اتحاد اور تعلقات کو فروغ دینے کی بجائے نسبتاً زیادہ امیر افراد کے باہمی ربط و تعاون کو زیادہ تقویت دیتا ہے۔[48] دوسرے لفظوں میں جمہوری عمل اور تقسیم اختیارات کی بنیادی حرکیات کے بارے میں کچھ بھی یقین

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وہ سب وجوہات ہیں کہ انسانی اور سماجی سرمائے تک رسائی کے ضمن میں ناہمواریوں کے ازالے کیلئے وضع کی جانے والی معاشرتی پالیسیوں کو خود انتظامی اور بہتر حکمرانی کے سوال سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی چیز جو خود اپنے افعال پر حکومت کرتی ہے:

اس باب کے مطالعہ سے آپ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ جمہوریت کوئی اکیلی یا مجرد چیز نہیں ہے۔ اسے ایسے آلات اور اصولوں کا ایک ارتقاء پذیر ملغوبہ قرار دیا جا سکتا ہے جو بیشتر اوقات باہم متصادم اور متضاد ہوتے ہیں۔ اس کا نصب العین تو خدمت کا آدرش ہوتا ہے لیکن یہ اس تک کبھی مکمل رسائی حاصل نہیں کر پاتی۔ ہم اپنے دساتیر میں حکومتی اختیارات کو تقسیم اور متوازن کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ متوازن ہو کر بے اثر اور ناکارہ بھی ہو سکتے ہیں۔ حکومتی امور و معاملات کو بین اور آشکارہ بنایا جاتا ہے لیکن ان کے زیادہ عیاں ہونے سے اس اخفا اور رازداری کا بھی ناس ہوسکتا ہے کہ جو مشکل اور اہم فیصلے کرنے کیلئے ضروری ہوتی ہے اور اس سے لیڈروں کی زندگیاں بھی عوام کے سامنے اس قدر عیاں ہوسکتی ہیں کہ پھر کوئی ذمہ داریاں اٹھانے کی طرف آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ ریاست ٹوٹ سکتی ہے، بکھر سکتی ہے اور کمزور ہوسکتی ہے لیکن جب دشمن سامنے آتے ہیں تو ہم میں کسی ایسی مضبوط طاقت کی طلب پیدا ہونے لگتی ہے کہ جو ہمیں بچا سکے۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ریاست صاف گو، شفاف اور باخبر ہو لیکن پھر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو بہت زیادہ رجعتی، بہت زیادہ جذباتی ہے اور اس میں ذمہ داری اور علم کی بہت کمی ہے۔ جمہوریت مساوات کی محتاج ہوتی ہے لیکن یہ مسلسل اشرافیت کی نئی نئی شکلیں بھی جنتی رہتی ہے۔

جدید جمہوری سیاست کی زیر سطح محسوس ہونے والی کشیدگیوں کے قلب میں خود انتظامی کا مبہم تصور موجود ہے۔ ٹامس ایکو نیاس کا کہنا تھا کہ 'زندگی کی سب سے اعلیٰ صورت یہ ہے کہ کوئی سی بھی چیز اپنے معاملات پر خود حکومت کرے۔ وہ شے جسے ہر دم دوسروں کے احکام کے مطابق چلنا پڑتا ہے اسے کسی حد تک ایک مردہ شے کہا جا سکتا ہے'۔ بابا جی کے اس قول کو جمہوری جذبے کی اتنی ہی عمدہ تعریف قرار دیا جا سکتا ہے جتنی کہ کوئی اور' اور اس چیز کی بھی کہ جس کیلئے لوگوں کے بغاوت پر آمادہ ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ بے کسی دباؤ اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

کھچاوٹ کا باعث بنتی ہے اور زندگی کی رگوں میں دوڑنے والے گرم خون کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔

تاہم کھچا کھچ بھرے شہروں کے سیارے کے اس ٹھسا ٹھس سماج میں اس آدرش تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اپنی بقاء کی خاطر ہمیں خود مختاری کو دبانا ہی پڑتا ہے اور قومیں صرف اسی صورت میں زندہ رہتی ہیں کہ اگر وہ لوگوں اور مفادات کے درمیان کسی پائیدار سمجھوتے پر متفق ہو سکیں اور اس سمجھوتے کو نافذ کر سکیں۔ اگر اس لفظ کے صحیح مفہوم کو دیکھا جائے تو خود انتظامی کہیں بھی ممکن نہیں ، ماسوائے کسی صحرائی جزیرے کے فرد کیلئے۔ خود انتظامی ناممکن ہے کیونکہ ہم زندگی کی بہت سی ضروریات کیلئے دوسروں کے محتاج ہیں۔ چھوٹے گروہوں کیلئے بھی یہ ناممکن ہے کیونکہ ایک چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی لوگوں کے مفادات تو آپس میں متصادم ہوں گے ہی اور لفظ 'خود' بہت جلد بے معنی ہو کر رہ جائے گا اور اگر قوم کی سطح پر آ کر یا کسی براعظم کی بات کریں جہاں مختلف احتیاجات کی جستجو کرتے کروڑوں بلکہ اربوں ذہن زندگی گزار رہے ہوتے ہیں تو پھر ان کا یہ تصور بہت ہی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

ہمیں حقیقی معانوں میں جس چیز کی طلب ہوتی ہے وہ غالباً خود انتظامی سے کوئی مختلف قسم کی چیز ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دوسروں کی طرح ہمارے پاس بھی کچھ نہ کچھ طاقت و اختیار ہو، ہم بھی فیصلوں میں شامل ہوں اور اگر سب میں نہیں تو کچھ نہ کچھ فیصلہ کن مکالموں میں تو ہمیں شریک کیا جائے خواہ ہمارے فریق کو شکست ہی کیوں نہ چکھنا پڑے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم پر ایسے نظاموں کی حکمرانی ہو جو حکمرانوں کی خوبیوں کے محتاج نہ ہوں۔ اس کی بجائے ہم ایسے نظاموں کے آرزومند ہیں کہ جو اقتدار کی حرص و ہوس لے کر بے لوثی اور انسان کی اچھائی پر ایمان تک انسانی تحریکات کی پوری سرگم کو بروئے کار لا کر انہیں عوامی مفاد پر لگا سکیں اور ان کی داخلی منطق لیڈروں کو مجبور کر دے کہ وہ خادموں کی طرح پیش آئیں خواہ ان کی سوچ چوروں جیسی ہی کیوں نہ ہو۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 10

بیگانگی اور چکر

''چیزیں کب تک چلتی ہیں؟ جب تک کہ وہ مکمل نہیں ہو جاتیں کیونکہ جب تک ان پر کام ہوتا رہتا ہے وہ خراب نہیں ہوتیں''۔ (بیرٹولٹ بریخت)

بہت سے پیغمبروں، انقلابیوں اور فلسفیوں نے حتمی منزل کے خواب دیکھے، ایک مستحکم اور مہربان نظام کے خواب جسے کسی کے تخیل نے تو پہاڑی پر واقع کسی شہر کی شکل دی تو کسی تخیل نے ایک ایسی خیالی ریاست کی جہاں آ کر تاریخ ختم ہو جاتی ہے اور معاشرہ ایک ایسی ازلی کیفیت کی طرف لوٹ جاتا ہے کہ جہاں نہ تو حرص ہوتی ہے نہ ہوس اور نہ ہی کوئی اونچ نیچ۔

جمہوریت کو بھی اکثر اسی رنگ میں پیش کیا جاتا رہا ہے یعنی ایک ایسے کامل و اکمل نظام کے طور پر جو کہ خود ہی خود کو متوازن رکھتا ہے اور مفاد عامہ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ یہاں میں زوال کے اس عمل کی چال ڈھال کا تجزیہ کروں گا جو کہ اچھی سے اچھی نیتوں کی حامل حکومتوں کو بھی لاحق ہوسکتا ہے اور یہ سوال پوچھوں گا کہ وہ زوال پذیر کیوں ہوتی ہیں اور انہیں پھر سے زندہ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟

عرب دنیا کے عظیم ترین مورخین میں سے ایک کا نام الیوسی ہے جس نے سترہویں صدی میں حکمرانی، فریب اور دغا جیسے کئی ایسے موضوعات پر بحث کی جن پر میکیا ولی بھی لکھ چکا تھا۔ وہ بہت خوبصورتی سے تراشی ایک ایسی کہانی سناتا ہے جس کی مماثلتیں ہر معاشرے میں ملتی ہیں اور جو ہمیں جمہوریت کے نظریے کی بجائے اس کے اصل تجربے کے بارے

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں آگاہی فراہم کرتی ہے:

جب ابن ابی مہلی نے مراکش پر قبضہ کیا تو اس کے کچھ پرانے ساتھی اسے مبارکباد دینے اور خراج تحسین پیش کرنے کیلئے اس کے پاس پہنچے۔ لیکن جب وہ اس کے پاس کھڑے اسے ایک نئی سرزمین فتح کرنے پر مبارکباد دے رہے تھے تو ان میں شامل ایک شخص کچھ بھی نہ بولا بلکہ چپ سادھے کھڑا رہا۔ جب سلطان نے اسے پوچھا کہ بھائی کیا بات ہے، آپ کیوں اتنے چپ چاپ کھڑے ہیں؟ تو وہ بولا: 'جہاں پناہ آپ بادشاہ وقت ہیں۔ اگر جان کی امان بخشیں تو عرض کروں گا'۔ 'بخشی' ابن ابی مہلی نے کہا۔ 'بولو کیا بولتے ہو'۔ 'کھیل کی بازی میں' فقیر بولا 'کوئی دو سو افراد ایک گیند کے پیچھے بھاگتے ہیں اور اسے ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں یہ بھی خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں چوٹ نہ لگ جائے یا زخم نہ آ جائے۔ موت بھی ہو سکتی ہے اور یہ سب ایک گیند کی خاطر۔ اور اس ساری دھینگا مشتی کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ کچھ بھی نہیں، سوائے پریشانی کے اور تکلیف کے۔ اور اگر آپ گیند کو ہاتھ میں پکڑ کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اس میں چیتھڑوں اور لیروں کے سوا کچھ بھی نہیں'۔ جب ابن ابی مہلی نے اس کی تمثیل سنی تو وہ فوراً اس کے معانی بھانپ گیا اور زار و قطار رونے لگا 'ہم دین پھیلانے کی نیت سے نکلے تھے' وہ بولا 'مگر حیف! ہم تو گمراہی میں جا پڑے'۔

یہ تصور کہ اہل اقتدار کے ذہن سے ہمیشہ یہ بات نکل جاتی ہے کہ وہ کس مقصد کیلئے جدوجہد کر رہے تھے، آپ کو ہر خطے میں ملے گا۔ اخلاقی اصول ثابت کم ہی رہتے ہیں۔ اچھی چیز کیلئے بار بار لڑنا پڑتا ہے اور حکومتوں کا چلن ترقی وارتقاء کے تصورات کی بجائے پیدائش، بلوغت اور زوال پر مشتمل انسانی زندگی کے سلسلوں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ حکومتیں جن کا آغاز جوش و جذبے اور اعلیٰ آدرشوں سے ہوتا ہے، ان کی بس جا کر ناکامی اور لوٹ کھسوٹ میں ہوتی ہے۔ بڑے بڑے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور سارے عہد اور وعدے بھلا دیے جاتے ہیں۔

یہ زیر و بم فطری محسوس ہوتے ہیں۔ ان کا اولین ذکر، ہمیں عمرانیات پر ابن خلدون کی شہرہ آفاق تصنیف 'مقدمہ' میں ملتا ہے جو 1377ء میں لکھی گئی۔ معاشرتی علوم پر دنیا کی پہلی عظیم کتاب قرار دی جانے والی اس تحریر میں شمالی افریقہ کی حکومت کے اخلاقی دوروں کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

حال بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ابن خلدون لکھتا ہے کہ حکومتی حرکیات کی بیشتر وضاحت بیرونی افراد کی اخلاقی قوت کے حوالے سے کی جا سکتی ہے۔ چند پشتوں کے فرق سے خانہ بدوشوں کی ایک نئی لہر شہروں میں آ گھستی ہے اور تھکے ماندے حکمران خانوادوں کو وہاں سے بھگا دیتی ہے جس سے ریاستی زندگی میں ایک نئی توانائی اور عینیت عود کر آتی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ان میں بھی بگاڑ پیدا ہونے لگتا ہے اور بغاوت وتجدید کی ایک نئی لہر ان کی جگہ لینے کیلئے حرکت میں آ جاتی ہے۔ 'عقل اور روایت' وہ لکھتا ہے 'دونوں اس پر دال ہیں کہ چالیس کے سن تک پہنچ کر انسان کی نشو ونما اور قوتوں میں اضافہ ہونا بند ہو جاتا ہے...... یہ بات بے عملی کی شکار تہذیبوں اور معاشروں پر بھی ایسے ہی صادق آتی ہے...... جب داخلی معیشت کا جوبن اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کے بعد خواہشات کی علم برداری شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سب رسوم و رواج روح انسان میں گونا گونی پیدا کرتے ہیں جس سے اس کے مذہب اور دنیوی خوشحالی کو نقصان پہنچتا ہے۔

ابن خلدون کے مطابق گڈریے اور مردان کوہ یعنی ایسے لوگ کہ جو ریاست کی رسمی عملداری سے باہر کے علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اچھی صفات کے حامل ہوتے ہیں اور ان میں بہادری ، توانائی ، متانت، حیا اور دیانت داری جیسے خصائل بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ ان میں یہ خصائل خانہ بدوشانہ زندگی کی جفاکشی براہ راست پیدا کرتی ہے جو ان میں ایک بہت قوی قسم کی یکجہتی اور یگانگت کی افزائش بھی کرتی ہے۔ تاہم یہ قبائل متواتر حضری علاقوں کا رخ کرتے رہتے ہیں ار بعض اوقات وہ وہاں سکونت اختیار کر کے نئے حکمران خانوادوں کی بنیاد رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں حاصل ہونے والے نئے مال و متاع کی قیمت یہ چکانا پڑتی ہے کہ ان میں وہ پہلے والی یگانگت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بجائے یہ حضران میں ناہمواریوں کو جنم دینے لگتا ہے۔ ان کی یکجہتی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک قصہ پارینہ بن کر رہ جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے کہ یکجہتی حقیقت کی بجائے حکایت کا روپ دھار لیتی ہے اور وقت کے ساتھ حکومت کا تجربہ ان کی اسی صفت کا ناس مار دیتا ہے جس کے بل پر انہوں نے ابتداء میں یہ حکومت حاصل کی ہوتی ہے۔

ابن خلدون اس صفت کیلئے 'عصبیت' کا لفظ استعمال کرتا ہے اور یہ تصور اس کے معاشرتی فلسفے میں ایک مرکزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ قسم کی قوت ہے جو قبیلے

allurdupdfnovels.blogspot.com

کی مساویانہ اقدار سے پیدا ہوتی ہے لیکن انجام کار انہی مساویانہ اقدار کے خاتمے کا باعث بنتی ہے۔ ایک اعتبار سے 'عصبیت' ایک قسم کا فریب ہے۔ ایک گروہ ہونے کا احساس در حقیقت ایک خاندان یا لیڈر کے غلبے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہ صحرائی علاقوں میں تو ایک سادہ تر اخلاقی اتھارٹی کی معاونت کرتا ہے لیکن قصبات میں آ کر اس میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ قصبات 'لا اخلاقیت، ہیرا پھیری، منافقت، دھوکے، دروغ، جوئے، فریب، جعل سازی، چوری، جھوٹ اور سود خوری' سے اٹے ہوتے ہیں۔ قصبوں اور شہروں میں حاکموں کا اپنے حرص پر قابو نہیں رہتا اور سرکاری کارندے لٹیرے بن جاتے ہیں۔ بے تحاشا محصولات معیشت کو نقصان پہنچاتے ہیں، معاشرتی نظام کو تباہ کرتے ہیں اور حکومت کے زوال کے بیج بوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس طرح ایک دور یا چکر حرکت میں آ جاتا ہے: وحشی خانہ بدوش آبادیوں اور قصبوں کو متواتر تاراج کرتے رہتے ہیں، انہیں نئی توانائی دیتے ہیں لیکن پھر کیا ہوتا ہے کہ ان کی توانائیاں صرف ہو جاتی ہیں اور پھر یہ چکر نئے سرے سے دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔[1]

ابن خلدون کی یہ تحریر قرون وسطیٰ کے شمالی افریقہ کے مخصوص حالات سے متعلق ہے لیکن اس کے افکار کی گونج بہت دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ کسی بھی ایسی حکومت کے کہ جسے کوئی براہ راست خطرے کا سامنا نہیں ہوتا، جمود اور ٹھہراؤ کے شکار ہونے کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ یہ خود غرضی اور بے حسی کا شکار ہو سکتی ہے اور اس میں خود کو یہ تسلی دینے کا میلان پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کے اہداف پورے ہو گئے ہیں اور پھر وہ اس سطح تک اتر سکتی ہے کہ اپنے شروع کے آدرشوں کی محض زبانی کلامی تو بات کرے عملاً ان کے لیے کچھ بھی نہ کرے۔ 'عصبیت' میں جھلکنے والے مساواتی نظریات جنہوں نے کہ مختلف ادوار میں کئی انقلابی اصلاحات کو تحریک بہم پہنچائی، جذبات سرد ہونے پر ریا کاری اور منافقت میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور نئی اقسام کے اقتدار کیلئے ان کی حیثیت محض زینت و نمائش کی رہ جاتی ہے۔ یہ سب شاید مارک ٹوین کے اس فلسفے کی مثالیں ہیں جس میں وہ کہتا ہے کہ 'تاریخ اپنے آپ کو دہراتی نہیں بلکہ قافیے پر قافیے لگاتی چلی جاتی ہے'۔

یہ چلن اس قدر عام کیوں ہے؟ اس کی وجہ خوف میں تخفیف ہو سکتی ہے۔ حکمران تساہل کا شکار ہو سکتے ہیں۔ شاید وہ زیادہ پر اعتماد ہو جاتے ہیں کہ ان کے بڑے بڑے

allurdupdfnovels.blogspot.com

مفادات ان کی جیب میں آ چکے ہیں اور اب انہیں مزید تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن شاید اس کی ایک زیادہ بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حضری حکمرانوں کا اپنی اخلاقی صفات کے سرچشموں سے ناتہ باقی نہیں رہتا یعنی وہ اس احساس اور ہمدردی سے محروم ہو جاتے ہیں جو شروع میں انہیں توانائیاں بہم پہنچاتی ہے۔ سیاست اپنی توانائیاں بے تسکینی، خفگی اور نا انصافی سے اخذ کرتی ہے۔ لامحالہ جب اقتدار سے محروم لوگ اقتدار تک پہنچتے ہیں تو یہ محرک قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ وہ اخلاقی تصورات کہ جو روز مرہ زندگی کی قربت میں جنم لیتے ہیں اور جن کی بنیاد خاندان یا قبیلے کی محبت پر ہوتی ہے، زیادہ فاصلہ اختیار کر لیتے ہیں اور ان میں میکانیت آ جاتی ہے اور نئے حکمران ایک ریاست کی طرح دیکھنا شروع کر دیتے ہیں، انہیں اپنی بقاء زیادہ عزیز ہو جاتی ہے اور وہ اپنی حکومت کی عملداری کو ذرائع کی بجائے منزل سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔

انسانوں اور حکمران گروہوں کے دورِ حیات میں بڑی واضح مماثلتیں مشاہدے میں آتی ہیں۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ بڑوں کی نسبت بچے اپنے دماغ کے داہنے حصے کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ وہ زیادہ کشادہ ذہن اور تخلیقی ہوتے ہیں اور ان میں نئے نئے تجربات کرنے کا اشتیاق زیادہ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ بڑے ہوتے ہیں تو مزید تصورات اور اعمال جن کی ابتداء داہنے دماغ میں ہوتی ہے، دماغ کے بائیں حصے کی جانب منتقل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور وہاں پہنچ کر وہ سختی اختیار کر کے عادات، مفروضات اور معمولات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ زندگی کو سہل بنانے میں مدد دیتے ہیں کیونکہ ہمیں جب بھی کسی نئی صورتحال کا سامنا ہوتا ہے تو یہ فورا پکے اور ٹھوس اصولوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن وہ لچک اور اختراع کے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے عمل حکومتوں اور سیاسی جماعتوں میں بھی واقع ہوتے ہیں۔ جب وہ کم سنی میں ہوتی ہیں اور انہیں چیلنج درپیش ہوتے ہیں تو ان کی تخلیقی صلاحتیں بہت زیادہ اور قوی ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بعض دفعہ چند ماہ یا سالوں بعد اور بعض اوقات بہت سے عشروں بعد ان میں جمود پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اہل اقتدار اپنے مقام اور عہدے اور اس کے ساتھ ملنے والی عزت اور آن بان پر قانع ہو جاتے ہیں اور ان میں آسان پسندی پیدا ہو جاتی ہے۔ بے ساختہ محبت کی جگہ رسمیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ شریانیں سخت ہو جاتی ہیں۔ تقریر میں تصنع اور میکانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ رحم کی جگہ ظلم

allurdupdfnovels.blogspot.com

آ جاتا ہے۔ آن بان سے غرور تکبر پیدا ہوتا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے کہ دولت کے ایک اور چکر کے بیج پنپنا شروع کر دیتے ہیں۔

بعض مفکر انحطاط وزوال کی ان حرکیات کو یک سمتی قرار دیتے ہیں۔ بالکل اس طرح کہ جیسے انسانی جسم کے بڑھاپے کو روکا تو جا سکتا ہے لیکن اسے پیچھے کی طرف نہیں لے جایا جا سکتا، تمام حکومتوں کا نیچے کی طرف جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ سیاست کی جگہ اس ابدی اقلیم میں نہیں ہوتی کہ جس تک عقل پہنچ سکتی ہے بلکہ سیاست حسوں کی ادنیٰ اقلیم میں پائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں زوال و انحطاط اور تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے۔ اس بارے میں ارسطو کے خیالات بھی افلاطون سے مشابہ ہیں۔ ان تصورات کی گونج ہمیں بیسویں صدی کے پترم سوروکن کے خیالات میں بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام معاشروں میں کڑی عینیت کے مراحل کہ جب لوگ سماجی مفاد کو اہمیت دیتے ہیں، کے بعد انفرادیت اور تنزلی کے مراحل آتے ہیں جن میں وہ ان آدرشوں کو بھلا دیتے ہیں کہ جنہوں نے انہیں عظمت سے ہمکنار کیا ہوتا ہے۔[2]

یہ بیانات شاید کچھ زیادہ دور تک چلے جاتے ہیں لیکن یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ ریاستی اقتدار میں جمود اپنے ابتدائی آدرشوں سے بیگانگی اور اعلیٰ نصب العین چھوڑ کر اپنا پیٹ بھرنے کی طرف متوجہ ہونے کا میلان موجود ہوتا ہے اور اس زوال کا ایک اخلاقی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ مونٹسکو کے الفاظ میں 'کسی حکومت کے زوال کی ابتداء تقریباً ہمیشہ اس کے اصولوں کے زوال سے ہوتی ہے'۔[3] یہ سب چیزیں اس بات کی توجیہہ کرتی ہیں کہ انسانی خوشحالی کیلئے نہایت اہم ہونے کے باوجود استحکام بذات خود کبھی بھی کوئی اچھی چیز کیوں نہیں ہوتی۔ اکیسویں صدی کے آغاز پر آٹھ ملک یعنی کانگو، عراق، میانمار، سوڈان، انڈونیشیا، شام، پاکستان اور برونڈی کرپٹ ملکوں میں ہمیشہ سرفہرست آتے رہے۔ ان آٹھ کا شمار ان ملکوں میں بھی ہوتا ہے جہاں سیاسی قیادت طوالت کے اعتبار سے سب سے زیادہ محفوظ تھی (یہاں شمالی کوریا کی مثال بھی دی جا سکتی ہے)۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں میں دنیا کے وسیع خطے، خصوصاً مشرق وسطیٰ، استحکام وتسلسل کی ابتلا برداشت کرتے رہے۔ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جاری سرد جنگ نے بیشتر دنیا کو جمود کی شکار اشتمالیت دشمن آمریتوں کے خلاف برسرپیکار سٹالنیت کی مردہ نقلوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ اس سے قبل اور اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے بھی قبل برطانیہ بہادر زوال پذیر عثمانیہ سلطنت کی علاقائی استحکام کے نام پر پشت پناہی کرتا رہا۔ان تمام مواقع پر عدم استحکام ترقی کی اولین شرط تھی۔ لیکن تجدید واحیاء کیسے ہو؟ جمود سے کیونکر بچا جائے؟

کسی ریاست کی تجدید و احیاء کے کم از کم تین تقاضے دکھائی پڑتے ہیں۔ اول یہ کہ سب کو یہ بات اجتماعی طور پر تسلیم کر لینی چاہیے کہ حالات غلط سمت میں جا رہے ہیں اور عموماً اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اخلاقی اور عملی ناکامی (مثلاً قومی زوال، ذلت یا شکست) کا اعتراف کیا جائے۔ دوم یہ کہ ان خیالات کا ہونا بھی ضروری ہے کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیالات دانشوروں، انقلابی سوچ کے حامل سرکاری افسروں، علماء یا کاروباری حلقوں سے مل سکتے ہیں۔ سوم ایسے لیڈر ہونے چاہئیں کہ جو ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کیلئے پرعزم ہوں۔

امریکہ میں 1930ء کے عشرے میں روز ویلٹ یا 1980ء کے عشرے میں ریگن، برطانیہ میں1940ء کے عشرے میں ایٹلی یا اس سے تیس سال بعد مسز تھیچر کے دور اقتدار میں یہ تینوں شرطیں موجود تھیں۔ لیکن اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ سیاست تجدید کی انتہائی احتیاج کے باوجود بھی پھنس کر رہ جاتی ہے۔1930ء کے عشرے میں برطانیہ نے یہ بات ثابت کر دکھائی کہ مذکورہ تین میں سے دو کا ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اس دور میں برطانیہ کو کساد بازاری اور شدید بیروزگاری جیسے بڑے مسائل کا سامنا تھا اور پھر جرمنی کی طرف سے عسکری خطرے میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کینز سمیت بہت سے عظیم برطانوی مفکرین نے معیشت کے سدھار کے بڑے جامع منصوبے بھی پیش کیے اور ان کے بعض منصوبوں کو اس سے قبل سکنڈے نیویا سے لے کر نیوزی لینڈ تک پوری دنیا میں عملی جامہ بھی پہنایا جا چکا تھا لیکن ہوا کیا کہ سابق لبرل قائد لائیڈ جارج جیسے سیاسی رہنما جو کہ اس چیز کا فہم رکھتے تھے کہ کیا کیا جانا چاہیے ایوان اقتدار سے باہر تھے اور جو سیاسی قائدین اندر تھے اور جن کی سرکردگی رمزے میکڈونلڈ اور بالڈون کر رہے تھے، انہیں اس بات کا پتہ ہی نہ تھا کہ حالات بہتر کرنے کیلئے کون سے اقدامات درکار ہیں۔ ان کے ذہن روایتی اقتصادی تقلید اور بے حس عالمی نقطہ نظر میں گرفتار تھے۔1960ء کے عشرے کا امریکہ (اور بیشتر مغربی دنیا) اس مسئلے کی کہ تین میں سے دو کا ہونا کافی کیوں نہیں ہوتا، ایک بہت مختلف مثال فراہم

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت گہری سماجی و ثقافتی تبدیلی کا دور تھا۔ کروڑوں افراد کو یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ خواتین اور سیاہ فام اقلیت کی امنگوں کے ساتھ چلنے کیلئے پرانے طور طریقوں کو بدلنا ہوگا اور انقلابی اصلاحات عمل میں لانا ضروری ہیں اور اس موقع پر بہت اعلیٰ دانشور اور ان کے پیش کردہ حل بھی موجود تھے لیکن ان کے خیالات کو سیاست کے اس مرکزی دھارے کے بنیادی دھارے کے ابتدائی رنگوں میں تبدیل نہ کیا جا سکا کہ جس پر لنڈن جانسن، رچرڈ نکسن، ہیرالڈ ولسن اور ڈیگال جیسے رہنماؤں کا غلبہ تھا جنہیں درپیش حالات یا تو ناقابل فہم لگتے تھے اور یا پھر ناگوار۔

لوگ امید کے عضلے کو بہت کم استعمال میں لاتے ہیں لیکن جب اصلاحی تحریکیں کامیابی حاصل کرتی ہیں تو اس عضلے میں نئی جان پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ جس ہوا میں سانس لیتے ہیں وہ بھی ہلکی پھلکی لگنے لگتی ہے۔ جب بادشاہوں کی تاجپوشی ہوتی تھی یا نئے خاندان اقتدار میں آتے تھے تو تجدید کے اسی معیار جیسی کوئی چیز فضا میں شامل ہو جاتی تھی۔ قدیم مصر میں تجدید کو باقاعدہ ایک ادارے کی شکل دے دی گئی تھی۔ جب فرعونوں کو تخت پر بیٹھے بتیس سال ہو جاتے تھے تو وہ باقاعدہ رسوم منعقد کرتے تھے اور اس موقع پر وہ علامتی طور پر پہلے مرتے اور پھر دوبارہ پیدا ہوتے تھے۔ سرما کی ایک طویل مدت کے بعد بہار کی فضاء کا احساس1789ء ،1917ء،1978ء، یا1989ء جیسے انقلابات کے فوری بعد بہت زیادہ قوی ہو جاتا ہے اور دفعتہً محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب تو ہر چیز ممکن ہے۔ پرانے برج گرانے والی انتخابی فتوحات کے موقع پر بھی یہ فضا اور احساس عود کرنے لگتا ہے۔1928ء میں جرمنی کے نامور افراد کے بارے میں شائع ہونے والی کتاب میں شامل15000 ناموں میں پانچ برس بعد آنے والے کسی بھی نازی رہنما کا نام شامل نہیں تھا اگرچہ افسر شاہی کے بیشتر اراکین انتقال اقتدار کے دوران اپنے عہدوں پر کام کرتے رہے، بالکل ایسے ہی کہ جیسے جنگ عظیم کے بعد مغربی جرمنی نے نازی نظام کے ساتھ اپنا تسلسل برقرار رکھا تھا۔ نظام آتے جاتے رہتے ہیں لیکن حکومتیں ان کی پرواہ کیے بغیر چلتی رہتی ہیں۔

نیا آنے والا نظام ہمیشہ کچھ اُکھڑا سا محسوس ہوتا ہے ۔ زمانوں سے چلے آتے چلنوں، منصوبوں اور اداروں کا جن کے بارے میں لوگ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ شاید یہ تا ابد چلیں گے، صفایا کر دیا جاتا ہے۔ نئی حکومتوں کے پاس اہداف کم ہوتے ہیں لیکن وہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ترجیحات متعین کرنے کے معاملے میں بہت تیز ہوتی ہیں۔ متبادلات کی آس لگائے ریاست سے باہر بیٹھے افراد کو یکا یک طلب کر لیا جاتا ہے کہ وہ نئی حکومت کے ساتھ مل کر کام کریں اور جب انہیں احساس ملتا ہے کہ ان کے ذہنوں میں پلنے والے نظریات حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں تو وہ خود کو ساتویں آسمان پر تیرتا محسوس کرتے ہیں اور ایوان اقتدار کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان خارجیوں کا کردار فیصلہ کن ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ 'خواہ (یہ) کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو اس کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگوں کو اپنی دیانت محفوظ رکھنے' بدعنوانی سے بچنے اور شباب کی صاف دلی اور اعلیٰ توقعات کو برقرار رکھنے کے قابل بناتا ہے[4] بیرونی لوگ ایک کھردرا کھر اپن بھی بروئے کار لا سکتے ہیں۔ فعال ترین تہذیبوں کی ابتداء اکثر جنگجوؤں (رومن، فرینک، منگول، مغل) کے تاخت و تاراج سے ہوئی۔ ممکن ہے کہ ان کے اقدامات ظالمانہ بھی محسوس ہوتے ہوں (جیسے کہ خلیفہ ثانی عمرؓ نے سکندریہ کے کتب خانے کو تباہ کر دیا تھا یا کہ جیسے روس کے انقلابیوں نے ریڈ سکوائر میں ایستادہ سینٹ بیزل کے گرجا گھر کو مسمار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا)۔ لیکن اگر پیچھے مڑ کر دیکھیں تو حضری تہذیبوں کو وحشیانہ توانائی کے انجکشنوں سے بہت فائدہ پہنچا جنہوں نے ان کی افزونی کو چھیل کر رکھ دیا اور اس سے کم سطح پر دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تمام معاشرے اور ریاستیں متواتر ایسے کھردرے چیلنجوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

اچھی سیاسی جماعتیں تاریخ کے کھردرے انصاف سے بچنے کیلئے اپنی تجدید کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ بعض تو اپنی کایا بدلنے کیلئے بہت محنت کرتی ہیں مثلاً 2005ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے اقتدار چھوڑنے کے ایک سال بعد اپنی سلور جوبلی منائی تو ایک فلمی ہدایتکار نے ایک بہت بڑے جشن کا انعقاد کیا تھا:

یہ جشن ...... بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ طاقتور سپیکروں کے پاس بجتے ڈھولوں کی آواز بمبئی کے تاریخی شیوا جی پارک کے کونے کونے سے گونج رہی تھی۔ آتشبازی کے مظاہرے سے سارا آسمان جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ ہر جا کنول کے پھول کھلے تھے اور کنول کا ایک بہت بڑا پھول بھی بنایا گیا تھا جس کے کھلنے پر اس میں بی جے پی کے چودہ کے چودہ لیڈر بیٹھے نظر آتے تھے۔

بدقسمتی سے اس سارے تماشے کے باوجود بی جے پی لوگوں سے یہ نہ چھپا سکی کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

اس کے پاس کوئی جامع اور معقول حکمت عملی نہیں ہے اور یہ کہ پارٹی کی قیادت بار بار کیوں بدلتی رہتی ہے۔ تاہم برطانیہ کے قدامت پسندوں، جاپان کے لبرل ڈیموکریٹوں، چین کے کمیونسٹوں اور سویڈن کے سوشل ڈیموکریٹوں کے بشمول بہت سی جماعتیں علامتی اور حقیقی دونوں اعتبار سے اپنی تجدید میں کامیاب رہی ہیں، اور بیشتر اوقات اقتدار میں رہتے ہوئے بھی ...... اور ان کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ ان سب نے تجدید کی تینوں شرطوں یعنی بڑے مسائل کے اعتراف، نئے نظریات کی حوصلہ افزائی اور لیڈروں کی طرف سے ان نظریات کو بروئے کار لانے کی کوشش کو تسلیم کیا۔ عموماً تجدید کا انحصار عوام کی امیدوں اور اندیشوں پر توجہ اور اگر پرانے اعتقادات اور نعرے کام نہ کر رہے ہوں تو ان کو خیر باد کہنے کی نیت پر ہوتا ہے۔ دیگر اہم چیزیں یہ ہیں کہ نئے خون کو آگے لایا جائے، مستقبل کے ممکنہ لیڈروں کے درمیان بھرپور داخلی مقابلے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ناراض حلقوں کو دوبارہ ساتھ لے کر چلنے کی سعی کی جائے۔ ان سب چیزوں کیلئے اکثر حکمران جماعتوں کو ضرر پذیر بھی بنانا پڑتا ہے۔ جاپان میں مثال کے طور پر یوشی کوئی زومی کو 2000ء کے عشرے میں خود اپنی پارٹی کی مخالفت کر کے لبرل ڈیموکریٹس کی تجدید کرنا پڑی۔ مارگریٹ تھیچر نے یہی چیز برطانوی پارٹی سے کی۔ ٹونی بلیئر نے اس کیلئے اذیت کوشی اختیار کی اور اپنے لئے ایسے حالات پیدا کیے جہاں لوگ اس پر اپنا غصہ نکال سکیں۔ ان سب صورتوں میں بھی اخلاقی عہد کی تجدید کا عمل کارفرما تھا یعنی جماعتیں خود کو یاد دلاتی رہیں کہ ان کا مقصد اور نصب العین کیا ہے۔

پیدائش نو کے یہ چکر لیڈروں کے انفرادی کیریئر میں بھی ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ بہت سے لیڈر اپنی خوبیوں کی وجہ سے بھی مارے جاتے ہیں۔ ان کا شدید یقین غرور میں بدل جاتا ہے۔ ان کی نرم خوئی کمزوری اور بے یقینی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے بڑے بول گھمنڈ میں بدل جاتے ہیں اور پھر اکثر کیا ہوتا ہے کہ بیس یا چالیس سال بعد بالکل ویسا ہی کوئی اور شخص اس لیڈر کی جگہ لے لیتا ہے۔

بعض لیڈروں کو اپنے ہی کیریئر کے دوران تجدید کے گہرے چکروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ماؤ تمیس کے پیٹے میں بیشتر حمایت سے محروم ہو چکا تھا۔ چرچل اور ڈیگال 1939ء میں ہیروانہ ناکامیوں کی تصویر بنے بیٹھے تھے (اور چرچل کا کیریئر تو گیلی پولی اور گولڈ سٹینڈرڈ

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے لے کر آزادی ہند کی پاگلانہ مخالفت تک کی خوفناک غلطیوں اور کوتاہ اندیشیوں کا مرقع تھا) ۔بعض کو بہت بڑی بڑی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا اور محسوس ہوتا ہے کہ انہیں مقدر کو اشتعال دلانے کی لت پڑ چکی تھی۔ سیاسی معاشیات دان ژاں مونے کو یورپی اتحاد کا معمار تصور کیا جاتا ہے لیکن اس مرتبے تک پہنچنے سے قبل اسے اپنے حصے سے بہت زیادہ ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں 'ہر شکست کو خوش قسمتی' تصور کرتا ہوں۔ ایک ایسا چکر بھی ہے جو کئی جنموں تک چلتا ہے اور یہ نسبتاً زیادہ عام ہے۔بعض دفعہ دیکھنے میں آتا ہے کہ انقلابی رہنماؤں کے گزرنے کے بعد محتاط بیوروکریٹوں کی ایک پود آتی ہے جنہیں خطروں اور اندیشوں کا سامنا کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ وہ نظام کی ابتدائی مار دھاڑ اور کارناموں کو تذبذب کے عالم میں سراہتے چلے جاتے ہیں جبکہ وہ اس بات سے بھی بہت زیادہ آگاہ ہوتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ فاصلہ طے کر آئے ہیں اور پچھلے وقت بہت دور رہ گئے ہیں۔ گذشتہ کامیابیوں کی وجہ سے بعد میں آنے والی نسلوں کیلئے چیزوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنا دشوار ہو جاتا ہے مثلاً برطانوی بحریہ کے رسالے کواٹرلی ریویؤ کے 1847ء کے شمارے میں 'ٹرفلگر کے دھوئیں میں ٹھنڈے پڑے ذہنوں' کی بات کی گئی ہے اور سرمایہ داریت کی تاریخ دیکھیں تو بھی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شروع کے ان بربروں کی جگہ کہ جنہوں نے انیسویں صدی میں پرانے نظام کے بخیے ادھیڑے تھے' بعد میں مشینی لوگوں نے لے لی۔ 1930ء کے عشرے میں جب کینز سے سوال کیا گیا کہ مورگن اور کارنیگی جیسے صنعتی سرمایہ داریت کے نئے دور کے عظیم بانیوں کا کیا ہوا تو اس نے جواب دیا تھا کہ ان کے آفس بوائے ان کے مقبروں میں حکومتیں کر رہے ہیں۔

سیاست کے ان چکروں میں سے بہت سے چکروں کے پیچھے یکساں چلن کارفرما نظر آتے ہیں جن میں بیگانگی فیصلہ کن کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ کارل مارکس کا کہنا تھا کہ سرمایہ داری نظام میں کارکنوں کو ان کی اپنی ہی محنت کی پیداوار سے بیگانہ کر دیا جاتا ہے اور انجام کار یہ بیگانگی اس قدر شدید شکل اختیار کر لیتی ہے کہ کارکن ایک انقلابی قوت میں بدل جاتے ہیں جو سماجی نظام کی کایا کلپ کر دیتی ہے اور ایک نیا اور بلند تر توازن قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی حرکیات سیاست کے شعبے میں بھی مشاہدے میں آتی ہیں ۔ اس میں بھی ایسے افرا دکو ان جماعتوں اور حکومتوں سے دور کر دیا جاتا ہے کہ جنہوں نے ابتداء

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں ان کی امنگوں اور احتیاجات سے توانائی اخذ کی ہوتی ہے۔ فاتح مراکش ابن ابی مہلی جیسے لیڈروں کو ان کے منصب تبدیل کر دیتے ہیں اور جب وہ اقتدار کی بیماریوں کا شکار ہو نے لگتے ہیں تو آدرشوں اور حقیقت کے درمیان پاٹ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ عوام میں بے چینی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ نئے حاکموں کو مسند اقتدار پر بٹھا دیتے ہیں۔

اگر کوئی معاشرہ کسی بھی مدت کیلئے اچھی حکومت سے مستفید ہونے کا آرزومند ہو تو اس کیلئے آزاد جمہوریت کی ضروری شرائط کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ان سے تحرک پیدا ہوتا ہے اور وہ لیڈروں کے لئے عوام کی مرضی کے برخلاف بہت زیادہ مدت تک برسر اقتدار رہنا مشکل بنا دیتی ہیں۔لیکن یہ شرطیں ہی کافی نہیں۔ چنانچہ میں آئندہ چار ابواب میں اچھی حکومت کے دیگر اہم عوامل کی طرف آؤں گا اور علم، اخلاقیات ، اور سازگار عالمی نظام کی بات کروں گا اور یہ ثابت کروں گا کہ وہ جنگ اور انقلاب کی تباہ کاری کے بغیر جمود کے شکار نظاموں کو کیسے بدلتے ہیں اور ان میں توانائی کیسے پیدا کرتے ہیں۔

باب 11

allurdupdfnovels.blogspot.com

عادات بنانے والی اخلاقیات

''کسی شخص کے لئے دنیا کا آقا بننا یقیناً بہت خوشی کی بات ہے اگر ہر کوئی اس شخص کو چاہتا بھی ہو،لیکن ایسے شخص کو اس کے ساتھ ساتھ ساری انسانیت کا غلام بھی بننا پڑتا ہے''۔ (شری آر بندو)

جب میں سترہ برس کا تھا اور سکول سے فارغ ہو کر یونیورسٹی کے داخلے کا انتظار کر رہا تھا تو میں ایک ہسپتال میں بوتلیں صاف کرنے کا کام کیا کرتا تھا۔ اس نوکری سے جب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہوئے تو میں نے جنوبی ایشیاء کی سیر کا ارادہ بنا لیا۔ کچھ ہفتوں بعد سری لنکا کے ایک جنگل میں آوارہ گردی کے دوران جب میں نے تھوڑی تھکن محسوس کی تو میں تھوڑی دیر ستانے کیلئے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ بھکشوؤں کے لباس میں ملبوس ایک بزرگ جو ادھر سے گزر رہے تھے میرے پاس آئے اور سلام دعا کر کے مجھ سے سوال کرنے لگے کہ میں کس ملک سے ہوں، کیا کام کرتا ہوں اور کس چیز کی تلاش میں ہوں؟ انہوں نے اپنا نام نائنا پونکا تھیرا بتایا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ تھیرا وادا بدھ مت کے ایک بہت بڑے مفکر تھے، وہ عالمی شہرت یافتہ نفسیات دان یونگ کے شاگرد رہے تھے اور انہوں نے1930ء کے عشرے میں جرمنی کو خیر باد کہا تھا۔[1] وہ مجھے ایک خانقاہ میں لے گئے اور میرا بدھ مت کی پالی تحریروں سے تعارف کرانے لگے۔ آج کے دور کا کوئی شخص ان تحریروں میں موجود تکرار سے تنگ بھی آ سکتا ہے اور بوریت بھی محسوس کر سکتا ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان تحریروں کا صفحہ صفحہ بصیرت و حکمت سے لبریز ہے۔

اس کے بعد میں جتنا عرصہ وہاں رہا میری اس بزرگ سے روزانہ ملاقات رہی جس کے دوران ہم پرانی گتھیاں سلجھانے میں لگے رہتے تھے۔ کیا دنیا کو بدلنے کیلئے پہلے ہمارا اپنے آپ کو بدلنا ضروری ہوتا ہے یا کہ جو مجھے سکھایا گیا تھا، زندگی بہت مختصر ہے اور وسائل بہت گمبھیر، چنانچہ ہمیں پہلے سیاست پر توجہ دینی چاہیے۔ ان مباحث کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکل

allurdupdfnovels.blogspot.com

سکا لیکن ان سے میرا ذہن بدلنا شروع ہو گیا تھا اور میں دنیا کو مختلف زاویے سے دیکھنے لگا تھا۔ میں نے اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ اقتدار میں بیٹھے افراد خود بھی کس طرح اس کے چنگل میں آ جاتے ہیں اور دوام اور آن بان کے سراب کا شکار ہو کر اپنی زندگیوں کو تلخی اور مایوسی کی بھینٹ کیوں چڑھا دیتے ہیں۔ میرے ذہن میں یہ مغربی مفروضے رچے بسے ہوئے تھے کہ سیاست میں ڈھانچے ہی سب کچھ ہوتے ہیں لیکن نائنا پونیکا صاحب سے ملنے کے بعد مجھ پر یہ بات کھلی کہ نہیں صاحبان اقتدار کی شخصیت و کردار کا بھی اس میں بڑا عمل دخل ہے اور ان کی ذاتی صفات و خصائل کی بھی اتنی ہی اہمیت ہوتی ہے۔

تاریخ دان لارڈ ایکٹن کا یہ مقولہ بہت مشہور ہے کہ 'طاقت بگاڑ پیدا کرتی ہے اور مطلق طاقت مطلق بگاڑ پیدا کرتی ہے'۔ لیکن ایکٹن نے اس سے پہلے بھی ایک جملہ لکھا تھا جو میرے خیال میں اس مقام پر آپ کو مرقومہ بالا مشہور فقرے کی نسبت زیادہ دل چسپ محسوس ہو گا۔ حاکمیت اعلیٰ کی بات کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ 'قانونی ذمہ داری کی کمی تاریخی ذمہ داری کو پوری کرنا پڑتی ہے'۔ لیکن اس تاریخی ذمہ داری سے کیا مراد ہے؟ اہل اقتدار کو کون سی اخلاقیات اور اصولوں کی پیروی کرنی چاہیے اور ان کی ترویج اور نفاذ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

بعض جوابات تو پہلے ہی واضح ہیں مثلاً ہم ایسے لیڈروں کے متلاشی ہوتے ہیں جو اولاً ان لوگوں کے مفادات کو سامنے رکھیں کہ جن کی خدمت کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اور جو خود غرضی، ہیرا پھیری، ظلم اور غداری سے احتراز کرتے ہیں۔ غالباً وہ سب سے اہم خوبی جس کا کسی مہذب معاشرے میں پروان چڑھانا ضروری ہے وہ ضبط نفس یا خود پر قابو رکھنا ہے اور اس کی اہمیت سب سے زیادہ ان افراد کیلئے ہے جو حکومت چلاتے ہیں۔ بری حکومت کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ایسی حکومت جو ضبط نفس سے عاری لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔(2)

ایک بات تو ہوتی ہے کہ ٹھیک کیا ہے اور غلط کیا لیکن حکومتیں بہت سے ایسے مقامات میں سے بھی گزرتی ہیں جہاں سوال یہ نہیں بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اخلاقیات کی باہم مخالف راہوں میں سے کس راہ کو اختیار کیا جائے۔ ایسے شش و پنج سے کسی بھی اہم عہدے یا ذمہ داری کے حامل شخص کو گزرنا پڑتا ہے خواہ وہ کوئی چھوٹی سی فرم یا کنبہ ہی کیوں نہ چلاتا ہو: کب کسی بات کو راز داری میں رکھا جائے اور کب نہ رکھا جائے، طاقت استعمال کی جائے یا نہ، اپنے

allurdupdfnovels.blogspot.com

اردگرد کے لوگوں سے وفا کا خیال رکھا جائے یا اعلیٰ اصولوں اور اداروں سے وفا کا ، رحم اور انصاف ، سخاوت اور احتیاط کے درمیان تناؤ کو کیسے متوازن کیا جائے۔ بڑے مخمصوں کا سامنا صحیح اور غلط کے درمیان چناؤ کرتے وقت نہیں بلکہ صحیح اور صحیح کے درمیان چناؤ کرتے وقت کرنا پڑتا ہے۔

قدیم دنیا میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ لیڈروں کو راہ راست پر رکھنے کے معاملے میں ان کی شخصی خوبیاں بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہیں جتنے کہ قوانین اور ڈھانچے۔ افلاطون نے 'جمہوریہ' کوٹلیہ نے 'ارتھ شاستر' اور کنفیوشس نے اپنے اقوال میں ان خوبیوں کو کسی نظام میں لانے اور یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ لیڈروں کو اخلاقیات کیسے سیکھنی چاہیے۔ اچھے قوانین کے ساتھ داخلی ضبط بھی ضروری ہے۔ کوٹلیہ لکھتا ہے کہ 'صرف قانون کے مطابق چلنے والی حکومت ہی زندگی کے تحفظ اور لوگون کی بہتری کی ضمانت دے سکتی ہے لیکن ایسی حکومت کا دارومدار بھی بادشاہ کے ضبط نفس پر ہوتا ہے۔ یہ ضبط ، دوطرح کا ہوتا ہے...... خلقی اور اختیار کردہ......خود پر قابو، جو کہ علم اور ضبط کی بنیاد ہے ہوس ، غصے ، لالچ ، گھمنڈ ، غرور اور حماقت سے چھٹکارا پا کر حاصل کیا جاتا ہے'۔ دوسرے لفظوں میں لیڈروں کو خود میں اچھے خصائل کوشش کرکے پیدا کرنے چاہئیں اور بدھ اور کنفیوشس مت کی روایات میں انہیں گناہ کی کشش ، لوبھ اور وابستگی کے خلاف پیہم برسرپیکار زندگی گزارتے پیش کیا جاتا ہے (گاندھی سوراج یعنی خود انتظامی کو سیاست کا مقصد قرار دیتا ہے جس سے اس کی مراد آزادی بھی ہے، 'داخل سے منضبط حکومت'، بھی اور اس کے تصور میں بھی انہی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے جنہیں کہ ہم گذشتہ سطور میں بیان کرتے چلے آ رہے ہیں)۔

اقتدار کی تحریصات اور برائیاں

تانگ عہد کا ایک چینی وزیراعظم بادشاہوں کی برائیاں یوں گنواتا ہے: جیتنے کی ترجیح' اپنی غلطیوں کا سن کر خجالت، اپنے اختیار میں اضافہ اور اپنی مضبوط خواہش پر قابو پانے میں ناکامی۔ وہ بتاتا ہے کہ جب انہیں یہ جراثیم لگ جائیں تو پھر وہ لوگوں کی باتوں پر کان دھرنا بند کردیتے ہیں اور انتشار و افراتفری کے بیج پنپنا شروع کردیتے ہیں[3] اور لیڈر ان بیماریوں

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے کوشش کیے بغیر نہیں بچ سکتے۔

یہ عقیدہ بہت قدیم زمانوں سے چلا آتا ہے کہ سیاست کے پیشے کا انتخاب کرنے والے افراد ان عہدوں کیلئے ناموزوں ہوتے ہیں کہ جن کے حصول کی انہیں جستجو ہوتی ہے۔ افلاطون کی 'جمہوریہ' میں سقراط کہتا ہے کہ یہ بات بڑی سیدھی سادھی ہے کہ ان افراد میں کہ جو اقتدار حاصل کرنے کے سب سے زیادہ خواہاں ہوتے ہیں اس پر فائز رہنے کی صلاحیتیں ہونے کے امکانات سب سے کم ہوتے ہیں۔ 'اچھے لوگ پیسے یا عزت کی خاطر حکومت میں آنے کا نہیں سوچتے' وہ کہتا ہے۔ وہ حکمرانی کے بارے میں یہ نہیں سوچتے کہ یہ کوئی اچھی چیز ہے یا اس میں کوئی مزہ آتا ہے بلکہ وہ حکومت میں آنے کو محض ایک مجبوری خیال کرتے ہیں کیونکہ اسے ان سے کسی بہتر یا ان جیسے ہی کسی اور شخص کو سونپنا ممکن نہیں۔ اچھے لوگوں کے شہر میں، اگر یہ کبھی معرض وجود میں آتا ہے، شہری آپس میں اس بات پر لڑا کریں گے کہ مجھے حکومت نہیں کرنی، عین اس طرح کہ جیسے وہ آج کل حکومت کرنے کیلئے لڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص جو واقعی ایک سچا لیڈر ہوتا ہے فطری طوری پر اپنے مفاد کیلئے نہیں بلکہ اپنی رعایا کے مفاد کے لئے کام کرتا ہے اور ہر وہ شخص جسے اس بات کا شعور ہے وہ چاہے گا کہ وہ دوسروں سے مستفید ہو بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی مصیبت میں پڑا رہے۔ دوسرے لفظوں میں حکمرانی ایک ایسا بوجھ ہے جو اچھے لوگوں پر لادا جاتا ہے اور جسے برے لوگوں کے عزائم سے بچایا جاتا ہے۔ سقراط کے نزدیک سیاستدانوں کی زندگی علم کی جستجو سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ علم کی زندگی کیلئے سماجی زندگی سے کٹنا پڑتا ہے جیسا کہ ہمیں اپی کیورس کے مقلدین اور رواقیوں کے طرز حیات میں نظر آتا ہے۔

عموماً ہوتا یہ ہے کہ بہت سے سیاستدانوں کی نفسیات اچھی حکمرانی کیلئے موزوں نہیں ہوتی۔ بعض سیاستدانوں کی طرف دیکھ کر تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تگ و دو کے پیچھے صرف وہ مجنونانہ مسرت کارفرما ہے جو وہ مسند اقتدار پر بیٹھ کر محسوس کرتے ہیں (اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اقتدار جانے پر بکھر جاتے ہیں)۔ بعض لوگ لگتا ہے کہ بچپن کی کسی محرومی کو پورا کرنے کیلئے لیڈر بنتے ہیں۔ بہت سے لیڈر ایسے ہوتے ہیں جن کی والدہ یا والد ان کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے ہوتے ہیں (مثلاً ٹونی بلیئر اور بل کلنٹن) اور وہ اپنے سیاسی کیریئر میں محبت اور پہچان ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ بعض نامساعد حالات کی وجہ سے لیڈر بنتے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہیں۔ فرینکلن روز ویلٹ انتیس کی عمر میں ایک خوش قامت، خوبرو، پرعزم لیکن ایک سطحی قسم کا آدمی تھا۔ جب ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ اسے پولیو ہے تو وہ حزن و یاس میں ڈوب گیا لیکن بعد ازاں اس نے تکلیفوں اور محرومیوں کے شکار لوگوں کی حمایت کی ٹھان لی اور عظمت کی بلندیوں تک جا پہنچا۔

بعض اشخاص ایسے بھی اس میدان میں آ ٹپکتے ہیں کہ بظاہر جس میں قیادت کی کوئی قابلیت یا خوبی دکھائی نہیں دے رہی ہوتی۔ عالمی شہرت حاصل کرنا تو دور کی بات ٹھہری تیس کی عمر تک سٹالن یا ہٹلر کی طرف دیکھ کر کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان میں کسی قسم کی کوئی بات ہے۔ کیپٹن میئر جس کی ان ایام میں ہٹلر سے ملاقات رہی، بتاتا ہے کہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی 'تھکا ماندہ آوارہ کتا ہے جو اپنے مالک کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور جو شفقت کا اظہار کرنے والے کسی بھی شخص کے ساتھ ہو لے گا' (اقتدار میں آنے کے بعد ہٹلر کہا کرتا تھا کہ 'میرا پروردگار جہاں مجھے کہتا ہے میں نیند میں چلنے والے کسی شخص کی طرح ادھر کو ہو جاتا ہوں')۔ اب یہ باتیں سامنے آ چکی ہیں کہ اس کا والد اس کی دھلائی کیا کرتا تھا اور ہٹلر یہی سلوک اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ کرتا تھا۔ زمانہ طالب علمی کے دوران فیدل کاسترو کا لوگوں سے لڑائیاں لڑنا ایک مشغلہ تھا اور وہ اس عمر میں بھی پستول پاس رکھا کرتا تھا۔ 'کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے' وہ ہمیشہ کہتے 'یہ عزت کا سوال ہوتا ہے' (اور جب سوویت یونین والے میزائلوں کی تنصیب کے معاملے میں پیچھے ہٹے تو اس میں ان کی رضا شامل نہ تھی)۔ بہت سے لیڈر خارجی ہوتے ہیں اور پہچان بنانے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ ہٹلر آسٹریا سے تھا، ملوسووچ مونٹے نیگرو سے اور نپولین کورسیکا سے۔ بعض اقتدار کو قوت باہ اور جنسی طاقت سے جوڑ دیتے ہیں۔ ماؤ کا معالج بتاتا ہے اس کے سیاسی کیریئر کے اتار چڑھاؤ کا اس کی جنسی قوت پر بھی اثر پڑتا تھا۔

ایسے لیڈروں کی مثالیں بھی موجود ہیں جو اپنے کردار کی خوبیوں کی وجہ سے اقتدار میں آئے۔ ایتھوپیا کے ہیل سلاسی کا تعلق ایک نچلے اشرافیہ خانوادے سے تھا اور اس کا شاہ مینک دوم کے جانشینوں کی فہرست میں کہیں دور دور تک کبھی کوئی نام و نشان موجود نہیں تھا لیکن اس سے جو بھی ملتا تھا وہ اس کی تمکنت، حلم، اعتماد اور وضع داری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا اور پھر جب اقتدار کی رسہ کشی کی بات آتی ہے تو اس میں اپنے ان باقی حریفوں

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے مقابلے میں عیاری اور کائیاں پن بھی انتہا درجے کا تھا کہ جو اس کی ظاہری بھلی مانسی اور رکھ رکھاؤ سے اکثر دھوکہ کھا جاتے تھے۔ لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد اس نے بھی ایک مجنون آمر کا روپ اختیار کر لیا۔

رائے دہندگان اپنے مشہور لیڈروں کے کردار کے بارے میں ایک جٹکا سا تخمینہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ لیڈر بھی عموماً خود کو عوامی معاشرے کے ایک عام چلتے پھرتے انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں (اگرچہ ان کی کرسی کیلئے دوڑ دھوپ سے ہی پتہ چل جانا چاہیے کہ وہ عام سے لوگ نہیں ہوتے) اور لگتا ہے کہ وہ بڑے بیبے، معزز اور بھلے مانس انسان ہیں جو اپنے کنبے کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے ہیں اور انہیں کسی کرسی تک پہنچنے کی کوئی ہوس نہیں۔ جیسا کہ میکیا ولی نے بھی ''سلطان''، میں لکھا ہے کہ حکمران کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ جب اس کی طرف دیکھیں تو انہیں لگے کہ وہ ایک نہایت نیک، حلیم، بھلا مانس، رحمدل اور قابل اعتماد انسان ہے۔ صحافی چیزوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں یہ کھوج کرنی بھی چاہیے کیونکہ ابھی تک کسی بھی معاشرے نے ایسے طریقے دریافت نہیں کیے کہ جن سے سیاسی امیدواروں کے کردار کا صحیح اور باقاعدہ اندازہ لگایا جا سکے اور یہ دیکھا جا سکے کہ وہ دباؤ کی فضاء میں یا مال و دولت اور آن بان کا لالچ دیکھ کر کس طرح کا طرزِ عمل ظاہر کریں گے۔[4]

اقتدار کے متلاشیوں میں سے کون اس کے قابل ہوتا ہے اور کون نہیں، اس کا اندازہ افلاطون کی 'جمہوریہ' میں مذکور جائجیز کی انگوٹھی والی کہانی سے بھی ہوتا ہے۔ اس انگوٹھی کا کمال یہ تھا کہ اسے پہن کر کوئی جب چاہے لوگوں کی نظروں سے غائب ہو سکتا تھا۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ طلسم یا اقتدار سے وابستہ تحریصات سے بچ نکلنا کسی شخص کیلئے بھی آسان نہیں ہوتا۔

کوئی شخص بھی اتنا مہاتما نہیں ہوتا کہ یہ موقع ملنے کے بعد بھی انصاف کی ڈگر پر قائم رہ سکے کہ جب وہ جو چاہے حاصل کر سکتا ہو جس کے ساتھ چاہے بوس و کنار کر سکتا ہو، جسے چاہے مار سکتا ہو یا قید سے رہا کر سکتا ہو وہ سب چیزیں کر سکتا ہو جو کہ اسے فانی انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ایک دیوتا کا مقام دلا سکتی ہیں۔

چنانچہ اقتدار کی مثال بجلی کی سی ہے کہ جو ضروری بھی ہوتی ہے لیکن خطرناک بھی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

خطرناک اس اعتبار سے کہ یہ اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ بجلی پانے والے لوگوں کو تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ مختلف ادوار میں لیڈروں کی اخلاقیات سے متعلق بیانات کا خاص لب و لہجہ بھی اس بات کا غماض ہے۔ بعض بیانات تو ایرازمس کی وعیسائی بادشاہ کی تربیت' میں درج حکمران کی خوبیوں کی فہرست کی طرح غمناک حد تک تصوراتی ہیں: حلیم، بردبار، رحمدل، انصاف پسند، مہذب، مہربان، ایماندار، متین، اعتدال پسند، محتاط، فیاض اور دیانت دار (یہ سب وہ خوبیاں ہیں جنہیں بوبیو کے بقول 'کمزوری' قرار دیا جا سکتا ہے)۔ ان بیانات کی لفاظی دیکھ کر نا ہمواری کی مخالفت کی تشویش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (کنفیوشس کی طرح) بعض مصنفین قاری (اور خود) کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اخلاقی اصولوں پر چلنا ہمیشہ حکمرانوں کے اپنے بہترین مفاد میں ہوتا ہے۔ بعض افراد ایسے بھی ہیں جو اس بات کے انکاری ہیں مثلاً نازی رہنماؤں اور ان کے دفاع میں پیش پیش دانشوروں کی باتیں سن کر تو یوں لگتا ہے کہ جیسے انہیں صرف طاقت اور جسمانی قوت کے بل پر چلتی دنیا کا تصور کر کے ہی لطف ملتا ہے اور جیسے شکست خوردہ لوگوں کیلئے ان کے دل میں رتی بھر برداشت بھی نہیں۔

لیڈروں کی اخلاقیات

اگر اقتدار برے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اچھوں کو بدکار بناتا ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جو لیڈروں کو صحیح راہ پر چلنے پر مجبور کرتی ہے؟ اچھی حکمرانی کا امکان اس لیے رہتا ہے کہ ہر شخص میں اخلاق کا تھوڑا سہی، کچھ نہ کچھ مادہ ضرور ہوتا ہے۔ تاہم تجربے، ماحول اور موروثیت کے امتیازات و اخلاقیات کے سبب ہر شخص کی اخلاقی پختگی اور مضبوطی میں فرق بھی بالضرور پایا جاتا ہے۔ سماجی معیارات کردار میں مضبوطی بھی پیدا کرتے ہیں اور لالچ اسے بگاڑ بھی سکتے ہیں (مثلاً میکس ویبر بتاتا ہے کہ افسر لوگ اپنے سے اوپر والوں کے آگے اتنے فرمانبردار اس لئے ہوتے ہیں کہ بصورت دیگر ان کے احساس ذمہ داری کے مجروح ہونے کا خدشہ ہوتا ہے)۔ (5)

جمہوری نظام میں لیڈروں کے اچھے اخلاق کی حتمی ضمانت ان رائے دہندگان سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

حاصل ہوتی ہے جو کہ انہیں منتخب کرنے کیلئے ووٹ ڈالتے ہیں۔ بدعنوان اور بد معاشی لوگوں کا احتساب کم از کم بعض مرتبہ بیلٹ بکس پر ہی ہو جاتا ہے اور بیشتر دساتیر میں بھی اس بات کی گنجائش رکھی جاتی ہے کہ مقننہ حکمرانوں کا مواخذہ کر سکے اور عدلیہ ان کے خلاف تحقیقات عمل میں لا سکے۔ اختیارات کے ناجائز استعمال کو روکنے کیلئے وضع کی گئی ان تدابیر کو اہل مغرب کی عظیم ترین ایجادات و برآمدات قرار دیا جا سکتا ہے لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس معاملے میں بعض دیگر تہذیبوں میں اس سے بھی زیادہ گہری بصیرت اور حکمت مشاہدے میں آتی ہے کہ حکمرانوں اور افسروں کے ذہنوں میں اخلاقی اصول کیسے ڈالے جا سکتے ہیں۔ چینی روایت میں اس مسئلے پر خاص طور پر بہت کام ہوا ہے۔

کنفیوشس کا کہنا ہے کہ 'حکمرانی کا مطلب خود کو ٹھیک راستے پر چلانا ہے کیونکہ اگر آپ خود میں درستی پیدا کر کے لوگوں کی رہنمائی کرتے ہو تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ خود کو درست نہ کرے؟' اسے اگر کوئی چاہے تو خیالی پلاؤ بھی قرار دے سکتا ہے مگر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ کنفیوشس کے نظریات نے اس کے بعد کے زمانوں میں حکمرانوں کے کردار پر بہت زیادہ اثرات مرتب کیے ہیں۔[7] ایک طرف دیکھیں تو ہمیں فلسفی چوتسائی کی کتابی دانش نظر آتی ہے جس کا خیال تھا کہ انسانی فطرت کاملاً اخلاقی ہے لیکن اس پر مادیت کا میل چڑھ جاتا ہے۔ اس کا فلسفہ بیسویں صدی تک چین کے سول سروس کے امتحانات کا رہنما بنا رہا۔ دوسری سمت دیکھیں تو ہمیں وہ مکتبہ فکر نظر آتا ہے جس کی بنیاد وانگ یانگ منگ نے رکھی تھی اور جو ذاتی اصلاح کیلئے اس تصور کو بنیاد بنا کر مراقبے کی صلاح دیتا ہے کہ اخلاقی اصول عالمگیر اور خلقی ہوتے ہیں اور لہٰذا اپنی تربیت سے انہیں دریافت کیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ اخلاقی علم اور سماجی عمل کو لازم و ملزوم خیال کرتے تھے اور اپنی ذات اور معاشرے کی بیک وقت اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔

چین میں افسروں کی استحقاقی تقرریوں کی مضبوط روایت اور اس سرزمین پر علم و فضل کی ترقی دونوں کنفیوشس کے نظریات کی ہی مرہون منت ہیں۔ تاہم یہ نظریات کوئی واضح نسخے تجویز کرتے نظر نہیں آتے مثلاً ان سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ آیا افسروں کو بدعنوانی سے پاک رکھنے کیلئے ان کی تنخواہ بڑھائی جانی چاہیے یا کہ ان میں انکساری پیدا کرنے کیلئے اسے کم رکھنا ضروری ہے۔ لیکن اس نظریے نے کہ کسی شہنشاہ کا جواز و استحقاق

allurdupdfnovels.blogspot.com

اس کے اخلاقی خصائل کا محتاج ہوتا ہے، کنفیوشس کے افسروں کو 'ملوکیتی نظام میں رہتے ہوئے غالباً وہ واحد ہتھیار ضرور عطا کیا تھا کہ جس سے وہ شاہی اقتدار کو حدوں میں رکھ سکتے تھے اور ایک نیک نہاد حکومت کے قیام کو یقینی بنا سکتے تھے۔ (8)

ہندوستان کی تاریخ میں کسی الوہی بادشاہت یا پروہت راج کی روایت کا سراغ نہیں ملتا بلکہ یہاں برہمنوں اور ریاستی اقتدار (جو کہ عموماً کشتریوں کے ہاتھوں میں ہوتا تھا) کے درمیان خلیج نے حکومت کی اخلاقی ذمہ داریوں کی تعریف و تعین کے مسئلے کو اور بھی زیادہ اہم بنا دیا تھا۔ ہندوستان کی مذہبی کتابوں مثلاً مہابھارت اور رامائن جیسی رزمیہ نظموں اور کئی غیر مذہبی ادب پاروں کے بڑے بڑے طویل حصوں میں راج دھرم یعنی بادشاہوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کے بارے میں بحث چلتی نظر آتی ہے۔ ان مباحث میں عموماً انصاف اور خوشحالی کے فروغ اور لوگوں کو دوسروں پر ظلم اور ان کے استحصال سے روکنے کے فرائض کی بات ملتی ہے۔ بادشاہ کا دھرم یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ انصاف، غیر جانبداری اور نرمی سے کام لے اور لگان کے معاملے میں زیادہ سختی نہ کرے۔ کمزور ہونے کی صورت میں اسے چاہیے کہ وہ رعایا کی فلاح و بہبود پر توجہ دے تاکہ اسے لوگون کی حمایت حاصل ہو سکے اور اس کیلئے اسے نئے مفتوحہ علاقوں کے باسیوں کے ساتھ بھی رحمدلی سے پیش آنا چاہیے۔ لوگوں کی فلاح کیلئے سماجی تحفظ کو یقینی بنانے کیلئے مفصل ضابطوں اور قوانین کا نفاذ جائز ہے کیونکہ (ارتھ شاستر، کے الفاظ میں) 'بادشاہت کا مطلب عوام ہی ہوتے ہیں۔ ایک بانجھ گائے کی طرح رعایا بغیر بادشاہت کچھ نہیں دیتی'۔ بدھ سیاسی مفکرین نے ان تصورات سے بڑے اچھوتی باتیں نکالیں۔ مہاوستو بادشاہوں کو صلاح دیتا ہے کہ وہ نقل مکانی کی حوصلہ افزائی کریں اور پڑوسی ملکوں سے دوستانہ تعلقات کو فروغ دیں۔ 'کودانتا سوترا' میں انہیں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ وہ غریبوں کو سستی خوراک اور تاجروں کو سرمایہ کاری سے مدد فراہم کریں۔

جدید مغرب میں لیڈروں کی اخلاقیات کے بارے میں بہترین بات میکس ویبر کی ان خطبات میں ملتی ہے جو اس نے 19-1918ء میں جنگ کے بعد کی افسردہ سردیوں میں دیئے تھے اور جو بعد میں politiks als Beruf کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ان خطبات میں ویبر نے سیاستدانوں کی تین اہم خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے پہلی خوبی نصب العین کیلئے حب اور وفا، دوسری اس نصب العین کے معاملے میں احساس ذمہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

داری اور تیسری اشیاء وافراد سے غیر وابستگی کے معاملے میں تناسب کا خیال ہے۔

اس فہرست میں دلچسپ چیز ویبر کا ارادی ابہام ہے۔ اس نے پہلی بات حب کی کی ہے یعنی اپنی ذمہ داری اور اس چیز کا خیال کہ کیا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسے ہم ایک اخلاقی نقطہ آغاز قرار دے سکتے ہیں جو لوگوں کی احتیاجات سے اور آدرشوں اور حقیقت کے درمیانی خلا سے توانائی حاصل کرتا ہے۔ یہ وہ چیز بھی ہے جو لیڈر کو دوسروں تک اپنی بات پہنچانے اور انہیں قائل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ دوسری خوبی اس کے اوپر ایک اور اخلاقی احساس یعنی اقدامات اور فیصلوں کے نتائج کی ذمہ داری کا لیپ دے دیتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اچھے ارادے ہونا یا احکام عشرہ یا دوسرے تجریدی اصولوں پر چلنا ہی کافی نہیں۔ ہم لیڈروں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے اقدامات کے تمام مضمرات اور اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات پر غور کریں۔ اس کیلئے انہیں بعض دفعہ شطرنج کے ماہر کھلاڑیوں کی طرح ذہن لڑانا پڑتا ہے جن کی نظر پوری بساط پر ہوتی ہے اور جو دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ یہ چال چلیں گے تو کیا ہوگا اور اگر وہ چلیں گے تو کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں عام روز مرہ خدمت اور لیڈروں کی خدمت کے درمیان کا پاٹ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ عام خدمت میں اچھی طرح سننے اور توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں لیڈروں سے ہم توقع کرتے ہیں کہ ان میں سمجھنے کی ایسی قابلیت ہو کہ جو شاذ ہی کسی میں نظر آتی ہو۔ اس قابلیت کی ایک عمدہ مثال پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے فوری بعد کے لمحے کے مکمل تاریخی اور اخلاقی مضمرات کو بھانپنا ہے۔ برطانوی چیف آف ملٹری سٹاف لارڈ ایلن بروک، جو کہ برطانوی ٹھکانوں پر متوقع جاپانی حملے کے متعلق پریشان تھا، اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ 'اوہ خدایا! ایک غلط اندازے نے سارے عملے کی 72 گھنٹے کی شدید محنت ضائع کر دی'۔ چرچل نے صرف اتنا کہا تھا کہ 'سو آخر کار ہم جنگ جیت ہی گئے'۔ اسے امریکہ کو جنگ میں لانے کے پورے مضمرات کا اندازہ تھا اور اس بات کا بھی کہ بظاہر ایک خوفناک آفت وسیع تر تناظر میں نعمت کیسے ہوتی ہے۔

تیسری خوبی یعنی وابستگی کے معاملے میں تناسب کے ساتھ جل، آنک، ضبط نفس (تاکہ طاقت کا غلط استعمال نہ ہو) اور ذاتی جذبات کی تعطلی (تاکہ طاقت کا استعمال غیر جانبدارانہ طریقے سے ہو) جیسی دیگر اور بھی بہت سے مہارتیں آ جاتی ہیں۔ عدم وابستگی سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

وہ چیز ممکن ہو جاتی ہے جسے زین بودھی 'مبتدی کا ذہن' کہتے ہیں۔ اس کا مطلب سوچ کی وہ تازگی ہے جسے علم و قابلیت کی زیادتی فنا کر دیتی ہے۔

اس فکری لچک کا مطلب یہ بنتا ہے کہ حکمران اور سائنس، انجینئرنگ یا علمیت میں کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ اس کی زیادہ مشابہت موسیقاری اور کوہ پیمائی سے ہے جہاں ماہرین چند مقررہ قواعد میں رہتے ہوئے اپنی چال میں اختراع بھی برتتے رہتے ہیں اور قدر دانوں سے اپنی دلیریوں کی داد بھی وصول کرتے رہتے ہیں۔ کتابی طریقوں پر چلتے رہنے سے کامیابی کم ہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کنفیوشس مت والے مصلحت (چوآن) کو راست روی کے ایک بہت اہم تکمیلی جز کی حیثیت دیتے تھے۔ خوش سماعتی اور ٹھیک مشاہدہ بھی اس کا لازمی حصہ ہے۔ تانگ عہد کا ایک معروف وزیر اور دانشور شہنشاہ کو متواتر یہ کہتا رہتا تھا کہ 'زمانے کی تبدیلیوں کو سمجھا کریں اور عقیدوں اور مفروضوں کی قید سے بچیں'۔ اسی طرح فارابی کی تحریروں میں بھی اچھے حکمران میں سیاسی علم (حکومت کے چلن اور اصولوں کا علم) اور سیاسی تجربہ دونوں یکجا نظر آتے ہیں جو دونوں مل کر اس میں وہ ضروری لچک پیدا کرتے ہیں جو غیر یقینی اور نا معلوم حالات و واقعات سے نبھا کرنے کیلئے لازم ہوتی ہے۔[9] عدم وابستگی بے غرض بھی ہو سکتی ہے۔ مارکس آریلیئس لیڈروں کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ 'ہر دن کا آغاز خود کہ یہ کہہ کر کریں کہ آج مجھے دخل اندازی، ناشکری، بدتمیزی، بے وفائی، بغض اور خود غرضی کا سامنا کرنا ہے، لیکن عقلمند بندے کا کام کیا ہے کہ 'جو بھی پیش آئے اسے بغیر خفگی کے قبول کرتا جائے'۔ انا کی معطلی حقائق کا سامنا کرنا' اپنی کوتاہیوں کے بارے میں دیانت کا مظاہرہ کرنا اور ذمہ دار نہ ہوتے ہوئے بھی ذمہ داری کو قبول کرنا آسان بنا دیتی ہے۔ ونسٹن چرچل نے سقوط سنگاپور کے بعد کہا تھا: 'مجھے پتہ نہیں تھا' مجھے بتایا نہیں گیا تھا، میں نے پوچھ لیا ہوتا۔' کیوبا کے میزائلوں کا بحران ایک بحران ہی رہا، کسی بہت بڑی آفت کی شکل اختیار نہ کر سکا' وجہ؟ وجہ اس کی یہ تھی کہ صدر کینڈی کے نزدیک ایک ایسا شخص تھا جو اسے بتا دیتا تھا کہ جناب صدر آپ غلطی کر رہے ہیں۔ عین اس وقت جبکہ یہ بحران اپنے عروج کی طرف بڑھ رہا تھا اور جنرل کرٹس لمے نے جنگ کی صلاحیں دینا شروع کر دیں تھیں (کارروائی نہ کرنے کا نتیجہ 'اتنا ہی برا نکلے گا جتنا کہ میونخ میں معاملہ ٹھنڈا ہونے سے نکلا تھا') ماسکو میں متعین امریکی سفیر فوائی کولر نے امریکی حکام کو یہ باور کرایا تھا

allurdupdfnovels.blogspot.com

کہ جنرل اور اس کے ساتھی روسیوں کی پرغیض اور دھمکی آمیز تاروں کا غلط اندازہ کر رہے ہیں۔ سوویت یونین کو تو بس اس چیز کی 'تلاش ہے کہ کسی طرح وہ خجالت کے بغیر اس دلدل سے باہر آ جائے'۔ (11)

لیڈر کے اخلاقی ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ ذمہ داری لینے کیلئے تیار ہو اور اسے جمہوری نظام کا دل بھی کہا جا سکتا ہے۔ حتمی ذمہ داری ان افراد کی ہوتی ہے جنہیں اپنے شہریوں کے سامنے بالمشافہ جواب دینا اور زیادہ گڑ بڑ ہونے کی صورت میں استعفیٰ دینا پڑتا ہے۔ تاہم بعض اوقات لیڈر ذمہ داری قبول کرنے کا دعویٰ اس سے پہلو تہی کے ایک بڑے عیارانہ حربے کے طور پر کرتے ہیں اور اب لیڈروں میں یہ بات بہت عام ہو گئی ہے۔ وہ بڑا پکا منہ بنا کر یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ تمام تر غلطیوں کے ذمہ دار صرف وہی تھے جبکہ اندر سے ان کا مقصد خود کو بہت اخلاقی ثابت کرنا ہوتا ہے۔ زیادہ کوشش ان کی ذمہ داری کے بار کو قبول کرنے کے اپنے اشتیاق کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ہوتا ہے جبکہ فی الواقع ان کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ مزید تحقیقات اور لعنت ملامت سے بچا جائے۔ اس عادت کی کچھ مشابہت اس سنڈ روم سے بھی ہے جسے مائیکل والزر نے میکس ویبر پر اپنے تبصرے میں 'خادم مبتلا' کا نام دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مشکل میں گرفتار 'نوکر' جھوٹ بولتا ہے، چالبازی سے کام لیتا ہے، دوسروں کی ہلاکت کا موجب بنتا ہے ...... اور اذیت برداشت کرتا رہتا ہے، لیکن چونکہ ہمیں یقین نہیں ہوتا کہ اس کی حرکات کے پیچھے اصل محرکات کیا ہیں، ہم سوچتے ہیں کہ 'یہ خادم یا تو اذیت کوشی میں مبتلا ہے، یا ریاکاری میں اور یا دونوں میں'۔ (12)

میں نے جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے کچھ اس چیز کیلئے بہت اہم ہیں کہ جسے قیادت کا داخلی دائرہ کہا جا سکتا ہے اس سے میری مراد لیڈر کے بنیادی فرائض ہیں۔ یہ خوبیاں بنیادی احتسابات سے نکلتی ہیں یعنی براہ راست کس کی خدمت ہو رہی ہے اور کس کا احتساب کون کر سکتا ہے۔ جمہوری نظام میں اس میں جماعت بھی آ جاتی ہے، پارلیمان بھی اور عوام بھی۔ تجارتی اداروں میں اس میں پہلے حصص خریدنے والے آتے ہیں اور پھر دیگر مفاداتی حلقے۔ زیادہ مشکل مسائل تب پیدا ہوتے ہیں جب ہم دوسرے دائرے پر غور کرتے ہیں۔ اس دائرے میں وہ سب لوگ آ جاتے ہیں جو حکومتی سرگرمی سے متاثر تو بھلے ہوتے ہوں مگر ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی یا پھر بہت ہی کم ہوتی ہے۔ ان میں آئندہ نسلیں، دوسرے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ملکوں کے شہری اور کمزور اور رائے دہی کے حق سے محروم لوگ آ جاتے ہیں۔ چونکہ ہمارے بنیادی اخلاقی اصول عالمگیر ہوتے ہیں ہم عظیم ترین لیڈر انہیں مانتے ہیں جو پہلے حلقہ انتخاب کو فراموش کیے بغیر اس وسیع تر حلقے سے بات کرنے کی سکت بھی رکھتے ہوں ۔ یہ وہ لیڈر ہوتے ہیں جن میں اس سے قطع نظر کیے بغیر کہ وہ عام حالات میں کس کی خدمت کر رہے ہیں' کائنات کے جوتوں میں کھڑے ہونے کی' صلاحیت ہوتی ہے۔ دانا لیڈر ایک حلقے کے مفادات کو دوسرے کے مفادات کے ساتھ تولنے سے احتراز کرتے ہیں لیکن اپنے شہریوں پر زیادہ بوجھ ڈالے بغیر ان میں مطابقت پیدا کرنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیتے ہیں۔

جیسا کہ روز ویلٹ نے ایک بار کہا تھا انسانی کمزوری کے سبب زیادہ طویل دورانیوں تک عوام کی سرگرمی کے بلند ترین سر کے مستقل اعادے سے نہیں ملائی جا سکتی'۔ ان مختلف سطح کی توقعات سے پورا اترنے کیلئے بہت زیادہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں شامل ہونے کی تیاری کرتا روز ویلٹ ، جنگ و جدل سے تائب ہوتا اشوک اعظم ، اپنی قوم کو عالمی ترقی کیلئے کوشش کرنے کی ترغیب دیتا اولف پالمے، یہ سب اسی قسم کے تطابق (صف بندی) کی مثالیں ہیں، ایک ایسے لیڈر کی مثالیں جو اپنے منصب اور اپنے حلقہ انتخاب سے کامیابی سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ تیرھویں صدی قبل مسیح کے مصر میں انسانوں کی طرف سے ایک نیا مذہب بنانے کی کوشش ناکامی کی ایک ابتدائی مثال ہے۔ یہ ایک ایسے لیڈر کی مثال ہے جو ایک ہی وقت میں اپنی رعایا کو بھی دھوکہ دے رہا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی اشتعال دلا رہا تھا۔[13]

ذاتی خصائل کا کیا کیا جائے؟ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ لیڈروں کو آنکنے کیلئے ذاتی رویے کو استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر وہ نجی زندگی میں ریا کار ہیں یا دھوکے بازی کرتے ہیں یا بہت زیادہ پیتے پلاتے ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور عوام یا ذرائع ابلاغ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس میں دخل اندازی کرے؟ یہ صحیح ہے کہ ذاتی خصائل اور سیاسی کارکردگی کے درمیان علت و معلول کا کوئی براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔ چرچل جب وزیر اعظم تھا تو وہ بہت زیادہ شراب نوشی کرتا تھا۔ روزانہ ایک بوتل وسکی تو پی ہی جاتا ہوگا۔ اسے تمبا کو نوشی کی لت بھی تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ اس کی واحد ورزش صحت مندانہ طریقوں سے زندگی بسر کر کے فوت ہونے والے دوستوں کے جنازوں کو کندھا دینا ہے۔ اڈولف ہٹلر شراب

allurdupdfnovels.blogspot.com

نہیں پیتا تھا بلکہ وہ گوشت سے بھی پرہیز کرتا تھا۔ بیسویں صدی کے بہت سے عظیم لیڈروں کے بارے میں سامنے آیا ہے کہ وہ عورت کے رسیا تھے یا پھر جبری دروغ گو،لیکن اس سے ان کے کارناموں کی چمک دمک میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

تاہم ذاتی رویے کو سنجیدگی سے لینے کے خلاف یہ سب دلائل غلط ہیں۔ عین اسی وجہ سے کہ ہمارے پاس عموماً ایسی مناسب معلومات کی کمی ہوتی ہے کہ جس سے متوقع لیڈروں کے اوصاف کو جانچا جائے، ہمیں ان کے ضبطِ نفس، دباؤ کی صورت میں ان کے طرزِ عمل اور ان کی دیانت کے ان دیگر اشارات پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ اشارے متعلقہ یا فیصلہ کن ہوں اور انہیں ان دیگر شواہد کے ساتھ رکھ کر تولنا پڑتا ہے کہ جو ان عہدوں سے زیادہ متعلق ہوتے ہیں کہ جن پر ان کے فائز ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ مونیکا لیونسکی سے بد سلوکی کی وضاحت کرتے ہوئے بل کلنٹن کے یہ کہنے سے کہ ''کیونکہ میں کر سکتا تھا'' وہ کوئی اسی وقت اپنے عہدے یا تاریخ کی قبولیت سے نہیں جاتا رہا تھا۔ (صدر متراں پر جب ایک ناجائز بچے کے باپ ہونے کا الزام لگا تھا تو اس نے کہا تھا 'et alors?') لیکن اس کا اس کردار کی جانچ کے اعتبار سے متعلقہ ہونا لازم ہے کہ جو کلنٹن نے بطور ایک لیڈر کے اپنے منصب کو دیا۔

سرکاری اخلاقیات

ریاست کے اندر رہتے ہوئے سرکاری افسروں کی اخلاقی ذمہ داریاں اپنے لیڈروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ میکس ویبر کا خیال تھا کہ ان پر 'ذمہ داری کا ایک بالکل الٹ اصول' لاگو ہوتا ہے، کیونکہ کسی سرکاری افسر کی عزت 'اس کی اس صلاحیت میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے اوپر والے لوگوں کے احکامات پر ایمانداری سے عملدرآمد کرتا رہے، جبکہ کسی سیاسی لیڈر کی عزت اس کے افعال کے سلسلے میں سراسر اس کی ذاتی ذمہ داری پر ہوتی ہے جس سے نہ تو وہ انکار کر سکتا ہے اور نہ اسے کرنا چاہیے اور جسے نہ ہی وہ کسی اور کے سر پر ڈال سکتا ہے اور نہ ہی اسے ڈالنی چاہیے'۔ ظاہراً دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ افسر جب تک احکامات کی تعمیل کرتے رہیں ان کی کوئی اخلاقی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

اکثر حکومتوں میں سرکاری افسروں میں جس سب سے بڑی خوبی کا ہونا ضروری خیال

allurdupdfnovels.blogspot.com

کیا جاتا ہے وہ قانونی طور پر اپنے عہدوں پر فائز حکام بالا سے وفاداری ہے (اور یہ صلاحیت ہے کہ اگر حکام بدلیں تو فٹافٹ وہ اپنی وفاداری بھی بدل لیں)۔ دوسری خوبیوں میں نتائجیتی معاونت شامل ہے یعنی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا، دیانت داری، مخصوص مفادات کے حامل حلقوں سے اجتناب، طویل المیعادی سوچ، صحیح طریقہ کار اور اصولوں کی پاسداری، غیر شخصی پن اور اپنے عہدے کے طفیل ملنے والی سرکاری معلومات سے فائدہ نہ اٹھانا۔[15]

جہاں تک افسروں کی اخلاقیات کا سوال ہے یہ بات نہیں دیکھی جاتی کہ آیا انہوں نے مطلوبہ نتائج حاصل کیے ہیں یا نہیں بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا انہوں نے مقررہ طریق کار کے مطابق کام کیا ہے کہ نہیں اور انہیں غفلت کے گناہوں کی بجائے ارتکاب کے گناہوں کے اعتبار سے زیادہ پرکھا جاتا ہے۔

افسروں کے لئے زیادہ براہ راست تحریصات طاقت اور روپے پیسے کی ہوتی ہیں۔ ان کا ان دونوں چیزوں سے ہر روز واسطہ پڑتا ہے اور ان کا لالچ میں آ کر کچھ نہ کچھ اپنا فائدہ نکالنے کی کوشش کرنا لازم ہوتا ہے۔ بیشتر ریاستوں اور سلطنتوں نے ایسے قوانین وضع کیے تاکہ افسر طاقت اور دھن دولت جمع کرنے کی بجائے اپنی توجہ اپنے فرائض منصبی پر مرکوز رکھیں۔ چین میں امتحانات اور قابلیت کی بنا پر تقرریوں کے اصول بنائے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایک مستقل اشرافیہ کو وجود میں آنے سے روکا جائے۔ بازنطینی سلطنت میں جسٹنین کے وقت سے یہ رسم شروع ہوئی کہ سرکاری افسروں کو انجیل پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانا پڑتا تھا کہ وہ اپنے فرائض 'حیلہ بازی یا دھوکے' کے بغیر سرانجام دیں گے۔ انہیں تحفے تحائف قبول کرنے، اپنے عزیزوں اور پڑوسیوں میں شادیاں کرنے اور اپنی جائے ملازمت پر مکانات تعمیر کرنے کی ممانعت تھی۔ یہ آخری اصول بعد میں معطل کر دیا گیا جس سے سول سروس اور جنگجو اشرافیہ کے درمیان تنازعہ کھڑا ہو گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ شدید تر ہوتا چلا گیا۔

اس سلسلے میں بعض حکومتوں نے بہت سخت اقدامات بھی کئے تاکہ سرکاری افسروں کیلئے طاقت اور مال و دولت اپنی آل اولاد تک منتقل کرنا آسان نہ رہے۔ مملوک پہلے غلام تھے جنہیں خلافت کیلئے عسکری خدمات سرانجام دینے کیلئے کاکیشیا سے لایا گیا تھا لیکن بعد میں وہ فرمانروا بن گئے (جیمز ہیرنگٹن نے اپنی کتاب 'اوشنا' میں جو اس نے اس وقت لکھی جب مملوکوں کے عروج کا زمانہ تھا، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ 'وہ بہت سخت گیر تھے لیکن

allurdupdfnovels.blogspot.com

مصریوں کیلئے نرم گوشہ رکھتے تھے)۔ وہ ہر دفعہ مملوکوں کی ایک نئی پود برآمد کرتے تھے اور مملوک ہی لیڈر منتخب کرتے تھے۔ ان کے وجود کی منطق یہ تھی کہ شاہی خاندانوں کو وجود میں آنے سے روکا جا سکے، ان کی وفاداریاں صرف ریاست کے ساتھ ہوں او وہ ساری تحریصات کا شکار ہونے سے بچے رہیں (بازنطینی سلطنت کے زنخوں کی طرح وہ بھی اپنی مراعات اپنی اگلی نسل کو منتقل کرنے سے قاصر تھے) اگر حالیہ دور کی طرف آئیں تو1960ء کے عشرے میں سنگاپور کے لی کوآن یو نے اپنے مشیروں سے یہ مشورہ طلب کیا تھا کہ کیوں نہ ہم بھی ملک چلانے کیلئے مملوکوں کی طرز کا لشکر تشکیل دیں۔

جدید برطانوی سول سروس کو بہت مختلف اخلاقی اصولوں پر استوار کیا گیا تا کہ اسے اس پرانے نظام کی طرفداری، اقربا پروری، نالائقی اور بے اعتدالی سے بچایا جا سکے کہ جس میں سرکاری عہدے شرفا کے نا اہل لڑکوں کو بیچ دیے جاتے تھے۔ دو مصلحین سر سٹیفرڈ نارتھ کوٹ اور سر چالرز ٹریولین کو جدید سول سروس کے معمار تصور کیا جاتا ہے جنہوں نے انیسویں صدی کے وسط میں بڑا کام کیا۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ مستعدی اور دیانتداری کے درمیان بڑا گہرا رشتہ ہے۔ انہوں نے ایک ایسا نظام متعارف کرایا جس میں سرکاری افسروں کو پہلے کی نسبت زیادہ تحفظ اور عزت و وقار دیا گیا، ان کی تقرریاں مقابلے اور استحقاق کی بنا پر کی جانے لگیں اور انہیں اس چیز کا پابند بنا دیا گیا کہ وہ منتخب لیڈروں کی مکمل فرمانبرداری کریں۔ اس سے سیاستدانوں کے ہاتھ سے افسروں کو رکھنے اور نکالنے کا اختیار جاتا رہا لیکن اس کے بدلے میں انہیں وفاداری، قابلیت اور رازداری جیسی اجناس میسر ہونے لگیں۔ سرکاری افسر سیاسی خود مختاری اور شناخت سے محروم ہو گئے لیکن اب وہ غیر معینہ مدت تک ملازمت اور استحقاق کی بنا پر ترقی کرنے کے قابل ہو گئے۔ اس کے بعد سول سروس کا ذاتی تاثر اخلاقی دیانت سے بہت مضبوطی سے منسلک ہو گیا: رشوت خوری سے اجتناب، قانون کی فرمانبرداری اور عوامی خدمت کو ایک اعلیٰ مشن سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ پورا خلوص۔

دنیا کی بہت سی سول سروسوں کی تشکیل میں اخلاقی تربیت ابھی تک اپنا کردار ادا کرتی چلی جا رہی ہے۔ کوئی ایسا شخص جو خود کو ایک وضعدار اور معزز شخص سمجھتا ہے اس کیلئے غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ کام بہت تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

سرکاری ادارے درخواست گزاروں کو ملازمت دینے سے پہلے ایک بہت طویل اور دشوار عمل سے گزارتے ہیں۔ چین کے مقابلے کے امتحانات، فرانس میں ای این اے کی ملازمت کیلئے سخت مقابلہ، افواج میں بھرتی کیلئے ذلتوں اور مشقوں سے گزارنے کا عمل، یہ سب ایک مشترکہ شناخت کی حوصلہ افزائی اور لوگوں کو نئی اخلاقی اقدار سے مطابقت اختیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

ان بہت سی مثالوں کے پیچھے یہ تصور کارفرما ہے کہ ہر انسان کا دنیا میں آنے کا ایک مقصد ہے اور اس طرح کی خدمت کیلئے پوری زندگی وقف کرنا پڑتی ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی کہ کبھی شروع کر لی اور کبھی چھوڑ دی۔ (اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس سے انسان کے دیگر اخلاقی عوارض میں مبتلا ہونے کا خدشہ بھی ہوسکتا ہے مثلاً حکومت کے تجارتی امکانات اسے اپنے سحر میں لے سکتے ہیں)۔ بعض دیگر عام حوالے بھی ہیں جو عدم وابستگی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ افسروں کو اختیارات کو حظ اٹھانے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ جیسا کہ سقراط کا خیال ہے کہ اختیارات کو مجبوری کے ایک بوجھ کے طور پر لیا جانا چاہیے اور اس بار کو باقی چیزوں خصوصاً ان فطری انسانی جبلتوں سے الگ رکھا جانا چاہیے جو انسان کو اپنے اہل خانہ اور عزیز واقارب کی مدد پر ابھارتی ہیں۔

افسروں اور مشیروں کے معاملے میں فاصلہ بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر ان کی کسی ایک حکومت یا حکمران سے وابستگی بہت زیادہ بڑھ جائے تو پھر ان کیلئے آئندہ حکومت یا حکمران کے ساتھ کام کرنا مشکل ہوسکتا ہے۔ 1968ء کے امریکی صدارتی انتخابات کے دوران ہنری کسنجر رچرڈ نکسن اور اس کے حریف ہوبرٹ ہمفری دونوں کو ویتنام امن مذاکرات کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات کی خفیہ معلومات بہم پہنچاتا رہا۔ اس نے کابینہ میں جگہ ملنے کے بعد بھی نکسن سے کسی حد تک فاصلہ برقرار رکھا جس سے اس کیلئے یہ ممکن ہوا کہ وہ جیرالڈ فورڈ کے تحت بھی اپنی خدمات سرانجام دے سکے۔

اخلاقی رویے کیسے سیکھے جاسکتے ہیں؟

allurdupdfnovels.blogspot.com

جو حکومتیں اخلاقیات کا خیال رکھتی ہیں وہ افسروں میں اخلاقی رویے پیدا کرنے کیلئے کنفیوشسی تدریس کے روایتی طریقے بروئے کار لاتی ہیں اور اصولوں، تمثیلوں اور ماضی کے حوالوں سے کام لیتی ہیں۔ حالیہ دور میں اس کی ایک مثال وہ اخلاقی استدلال ہے جس کی تدریس ہاورڈ یونیورسٹی کے کینیڈی سکول کے ایم اے پبلک ایڈمنسٹریشن کے کورسوں میں کی جاتی ہے۔

تاہم انہیں اخلاقیات سیکھنے کے بہترین طریقے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عموماً ہم اخلاقیات ویسے ہی سیکھتے ہیں جیسے کہ دوسری چیزیں۔ جیسے جیسے ہم سماج میں دوسروں کے ساتھ رہتے ہوئے بڑے ہوتے چلے جاتے ہیں، جزا و سزا کا سامنا کرتے ہیں اور اپنے اردگرد کی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمارے اخلاقی شعور میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اخلاقیات کی مشابہت رٹے سے سیکھے جانے والے علم کی نسبت زبان سے زیادہ ہے جس میں قواعد اور الفاظ کے علاوہ تبدیلی و اختراع کی بھی بے حد گنجائش ہوتی ہے۔ ان میں اصول تو ہوتے ہیں لیکن اصولوں کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں آ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی کو اخلاقیات کو اصولوں سے خلط ملط کرتے دیکھ لیں تو ہم 'اندھی تقلید' کی بات کرتے ہیں۔ یہ چیز انتہائی صورتوں میں 'لاشوں کی تقلید' کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔ یہ وہ محاورہ ہے جو اڈولف آئخمن نے یروشلم میں اس پر چلنے والے ایک مقدمے کے دوران خود اپنے لئے استعمال کیا تھا۔

زبان کی طرح قابلیت کو بھی نری رسمی تدریس کے بجائے مشق اور تجربے سے نشوونما ملتی ہے۔ ارسطو لکھتا ہے کہ 'انسان کو عقل کے محل میں داخل ہونے کیلئے عادت کے دالان میں سے گزرنا پڑتا ہے'۔ تجربہ و تامل سے اخلاقیات انسان کے کردار کا جز بن جاتی ہے اور کسی حد تک ہر مہارتی رویے کی طرح ایک داخلی اور خود کار شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اس معاملے میں متعدد مشرقی روایات میں ایک جیسی سوچ دیکھنے کو ملتی ہے۔ مثلاً چینی دانشور مینگزے نے اخلاقی رویے کو 'توسیع' یعنی ایک صورت حال کے اصولوں کے دوسری صورتحال پر اطلاق کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے چنانچہ ہم کسی ایک ایسی صورت حال کا اطلاق کہ جس میں ہم بلا تردد دوسروں کے لئے ہمدردی محسوس کرتے ہیں اس سے زیادہ پیچیدہ دیگر جگہوں پر بھی کر سکتے ہیں۔ اخلاقیات سیکھنے کا مطلب محض اصول سیکھنے کی

allurdupdfnovels.blogspot.com

بجائے مناسب مزاج کونشوونما دینا ہے۔ خادم بننے کا مطلب خادم ہونا اور خادم کے طور پر کام کرتے ہوئے خود اپنی فطرت کی کایا کلپ کرنا ہے۔

اس عام فہم نظریے کے پیچھے خودی کا ایک طبعزاد تصور کارفرما ہے اور یہ اس خودی کا تصور ہے جو کہ ایک مربوط انا کے اس مغربی تصور کی نسبت کم وحدتی ہے جو کہ حسابیاتی اصولوں کے تتبع میں شعوری طور پر جانچ پڑتال کا عمل سرانجام دیتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ خودی ان عوامل پر مشتمل ہوتی ہے جن کا ہمیں شعور نہیں ہوتا بلکہ کہنا چاہیے کہ ایسے عوامل کہ جن کا ہمیں شعور ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارا ذہن تجربے اور شعوری انتخابات کے توسط سے تراکیب بناتا چلا جاتا ہے جن میں اخلاقی میلانات و خصائل بھی شامل ہوتے ہیں۔ تجربے اور عمل کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خودی ان چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے کہ جو یہ سوچتی ہے اور کرتی ہے خصوصاً ان چیزوں پر جو یہ دوسروں کے بارے میں سوچتی ہے یا دوسروں سے کرتی ہے اور اس کی صورت گری زبان اور روابط کے توسط سے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ نجی بھی ہوتی ہے اور عمومی بھی۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو دوسری چیزوں سے بالکل مبرا اور الگ تھلگ ہو۔ تاؤ تے چنگ کے مطابق 'اعلیٰ ترین خوبی کا مالک صرف خوبی تک نہیں رہتا اور یہی چیز اس میں خوبی پیدا کرتی ہے'۔ اگرچہ دیکھنے میں یہ بات بے معنی سی محسوس ہوتی ہے لیکن اگر ہم اسے تعلیم و تربیت کے سیاق و سباق میں دیکھیں تو اس کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ جدید نفسیات بھی اس نظریے کی تصدیق کرتی ہے۔ فرانسکو وریلا نے اپنی وفات سے کچھ دیر قبل جو خطبات دیے تھے ان میں وہ کہتا ہے:

'جدید مغربی سائنس ہمیں سکھاتی ہے کہ خودی قیاسی اور خالی ہوتی ہے اور یہ ہمارے خرد جہانوں میں پیدا ہونے والے ضعف سے نپٹنے کیلئے ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ تاؤ'

'کنفیوشس مت اور بدھ مت ہمیں سکھاتے ہیں کہ اخلاقی مہارت فطری اعتبار سے متزائد ہوتی ہے اور اسے عام زندگی اور عمل میں اس خالی خودی کے جاری احساس کا علم ہوتا ہے ......اخلاقی شد بد خودی کے قیاسی پن سے اس متزائداور براہ راست واقفیت کا نام ہے'۔ (16)

بہت سے ایسے افراد کو کہ جن کی تربیت انہیں اخلاقیات کو معین اصولوں کے ساتھ تولنا سکھاتی ہے، یہ بات مشکل محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ جوناتھن گلوور بتاتا ہے بیسویں

allurdupdfnovels.blogspot.com

صدی کے سب سے غیر اخلاقی افعال اخلاقیات کی عدم موجودگی کی وجہ سے نہیں بلکہ حد سے زیادہ بے لچک اخلاقی اصولوں کے طفیل رونما ہوئے مثلاً ان حضرات نے جو پہلی عالمی جنگ کے دوران اپنے ملکوں کی قیادت کر رہے تھے، قومی آن کی اخلاقیات کو ایک مطلق بنا لیا اور ایسی اخلاقیات کی پیروی کے نتائج کی چنداں پرواہ نہ کی[17] اور گولاگ بنانے والے کمیونسٹ خود کو انسانیت کی تعمیر نو کیلئے بپا ایک غیر معمولی جہاد کا جزو تصور کرتے رہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی گزارنے کیلئے واضح اصولوں کی ضرورت نہیں ہوتی یا ہم سب کو اپنی اپنی اخلاقیات خود ایجاد کرنا چاہیے۔ اصول ایک شارٹ ہینڈ کا کام کرتے ہیں اور انہیں قوموں کو طویل زمانوں کے دوران حاصل ہونیوالے تجربات کا ست قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ اس چیز سے منتج ہونیوالی کرپشن کو روکتے ہیں جسے فلسفی نتائجیتی (consequentialist) استدلال کہتے ہیں اور جو طریقوں کا جواز بنانے کیلئے مقاصد کو استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح اگر اخلاقی تصورات بچوں کو سکھانے ہیں یا انہیں آئندہ نسلوں تک پہنچانا مقصود ہے تو ان کا مناسب حد تک سادہ ہونا بھی ضروری ہے۔ ایسی دنیا کہ جس میں ہر کوئی اپنے اخلاقی اصول خود بنانے لگ جائے، جلد ہی ایک جہنم کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ ہر قوم میں اخلاقیات کی ایک پرت ایسی ہوتی ہے جس کا یہ وضع اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے اور اسے اصولوں کے ایک ایسے مجموعے کے طور پر سکھایا جانا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جن پر کوئی لے دے نہ ہو سکے۔

تاہم اس سے آگے بحث کی گنجائش ضرور موجود ہے۔ رسمی اصولوں سے آگے یہی وہ مقام ہے جہاں لیڈروں کو نہ صرف تجربہ و تامل کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ انہیں ایسے حلقوں کی رہنمائی بھی درکار ہوتی ہے جو ان کے دست نگر نہ ہوں یعنی ایسے لوگوں کی رہنمائی جو کہ انہیں کھری کھری سنا سکیں بلکہ کبھی کبھی سخت سست بھی۔

اخلاقی گونا گونی اور اتحاد

میں نے یہ موقف پیش کیا ہے کہ اخلاقیات کو کسی ایسے اصولوں کا مجموعہ تصور نہیں کیا جانا چاہیے کہ جن کی انسانی ذہنوں میں پیوند کاری کی جاتی ہے بلکہ یہ تجرید و تامل سے زندہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

رہتی ہے اور بہت سی شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ بلا شبہ بعض ریاستوں میں اخلاقی کثرت نے بقاء کو ممکن بنایا۔ کوئی اخلاقی اصول لازماً عالمگیر ہوئے بغیر بھی معتبر ہو سکتا ہے۔ عثمانیہ سلطنت میں سب قوموں کو اپنے قوانین کی پیروی اور محصولات اکٹھے کرنے کی اجازت تھی بشرطیکہ وہ سلطنت سے وفادار رہیں اور اسے خراج ادا کرتے رہیں۔ قرون وسطیٰ کے انگلستان میں لمبارڈ اور ہینسی ایسے علاقوں میں رہتے تھے جہاں ان کا اپنا انتظام چلتا تھا جبکہ چودھویں صدی میں چین کی سیاحت کرنے والا افریقی سیاح ابن بطوطہ کہتا ہے کہ اس کے بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے اپنے مخصوص علاقے تھے جہاں انہیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ آج کے دور کے بہت سے معاشرے گونا گونی کی گنجائش دیتے ہیں مثلاً بھارت میں بہت سے اقلیتی گروہوں کے قوانین کا احترام کیا جاتا ہے۔ یقیناً کسی معاشرے میں اتحاد و اتصال کیلئے یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ایک جیسے عقائد و اقدار کی پیروی کرتا ہو یا اچھے برے کے بارے میں سب کے اعتقادات ایک جیسے ہوں۔ [18]

بلاشبہ گونا گونی اس سے آگے تک جاتی ہے۔ اگر کسی معاشرے کا قریب سے جائزہ لیں تو اس میں بعض عام مرکزی اصولوں کے ساتھ ساتھ امتیازی اخلاقی وتیروں کا ایک مرقع بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ چنانچہ سپاہی نظم و ضبط اور فرمان برداری کی ایک کائنات میں بلا چوں چرا زندگی بسر کرتے ہیں اور اس میں بے رحمی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اراضی اور دیگر اثاثوں (مثلاً عجائب گھروں) کے مہتمم نگہداشت اور کم از کم خلل اندازی، فطرت اور روایت کی تعظیم کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ تاجر اور کاروباری افراد آسان واقفیت اور کمزور تعلقات، نتائجیت پسندی، معاہدوں کی تعظیم اور تجارت کے معاملے میں شفاف پن کو وقعت دیتے ہیں اور لا حاصل اقدار کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یونیورسٹیوں اور تجربہ گاہوں میں کام کرنے والے حضرات جو علم کے ساتھ سب سے براہ راست طور پر وابستہ ہوتے ہیں، تجربہ و تحقیق، گہرائی اور پیچیدگی کو وقعت دیتے ہیں اور اپنے شعبے میں رہتے ہوئے اپنے کام کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ روحانی زندگی بسر کرنے والے افراد غیر مادی چیزوں، ضبط، انکساری اور روایت کو اہمیت دیتے ہیں۔ نگہداشتی شعبے سے منسلک لوگ حلم، بے غرضی اور قربانی کو وقعت دیتے ہیں اور پیسے کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹروں کیلئے زندگی کا تقدس سب سے اہم ہوتا ہے اور وہ بحرانی وقتوں میں اضافی ضرورت کو پیش

allurdupdfnovels.blogspot.com

نظر رکھتے ہیں۔

ان میں سے بعض اخلاقی اصول پیشہ وارانہ ضابطوں میں آ کر باقاعدہ شکل وصورت اختیار کر لیتے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ بیرونی باشندوں کو باہر رکھا جائے اور دوسری یہ کہ گاہکوں اور عوام کو اس برے برتاؤ سے محفوظ رکھا جائے جو علم واختیار کی اونچ نیچ سے بآسانی درآتا ہے۔ بقراطی حلف مریض کو ڈاکٹر سے بچاتا ہے جو کہ ہمیشہ اس کی نسبت زیادہ جانتا ہوتا ہے۔ استاد پابند ہوتا ہے کہ وہ حقیقت دوسروں تک پہنچائے، ان پر اپنے عقائد مسلط نہ کرے۔ فوجیوں کو ان لوگوں میں رہ کر ہتھیار استعمال کرنے کی ممانعت ہوتی ہے جن کی خدمت کیلئے انہیں بھرتی کیا جاتا ہے اور مارشل آرٹس کے ماہر اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ وہ اپنی مہارت صرف اپنے دفاع کیلئے استعمال کریں۔ ان میں سے بہت سے اخلاقی نظریے کہیں کہیں جا کر آپس میں الجھ بھی جاتے ہیں مثلاً بعض دفعہ ایسی بحثیں بھی ٹھن جاتی ہیں کہ آیا ڈاکٹروں اور مذہبی تنظیموں کو دولت وشہرت کیلئے کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں۔

ان مختلف اخلاقی وتیروں کا سب سے زیادہ پتہ بحران یا ناکامی کی صورت میں چلتا ہے۔ گڑ بڑ زیادہ ہونے کی صورت میں تحقیقات کرنے والے عموماً یہ نہیں دیکھتے کہ آیا صحیح چیزیں کی گئی تھیں یا نہیں بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ آیا صحیح طریق کار کی پیروی کی گئی تھی یا کہ نہیں مثلاً نو گیارہ یا 2005ء میں امریکی ریاست نیو اورلینز کو تباہی سے دوچار کرنے والے طوفان کیٹرینا کے بعد مختلف تحقیقاتی اداروں نے اس بات کی تفتیش کی تھی کہ ان مواقع پر مختلف دیگر اداروں نے کیسا طرزِ عمل ظاہر کیا تھا، سراغرساں اداروں نے اہم معلومات کو کیسے دبایا یا نظر انداز کیا تھا ڈاکٹروں نے بیماروں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا، حکومت کے کار پردازوں نے خوراک اور دیگر امدادی سامان کیسے فراہم کیا تھا، سیاستدانوں نے پشتوں کی تعمیر کے لئے ضروری سرمایہ کاری میں کمی کیسے کی تھی۔

ایسے لمحے ان بہت سی اخلاقی دنیاؤں پر سے پردہ الٹ دیتے ہیں جن پر کوئی حکومت مشتمل ہوتی ہے...... دیانت، افادیت، طریق کار اور غیر جانبداری کو وقعت دینے والی افسروں کی دنیا، اقتدار، بیان بازی، فریب اور لچک کو اہمیت دینے والی سیاستدانوں کی دنیا، دنیا کو قانونی اور لاقانونی، مجرم اور بیگناہ کی ثنویت کے تناظر میں دیکھنے والی اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

مثال اور اصول کے ذریعے چلنے والے قانون کی دنیا، ان میں سے ہر ایک کی اپنی زبان اور معیارات ہیں جن سے یہ اپنی طرف اشارہ کرتی ہے اور اپنے روزمرہ وتیروں کو معنی دیتی ہے۔ ان سب میں یہ ایک خاصیت مشترک ہے کہ یہ دوسروں کو اپنے فریم ورک کے منشور میں دیکھتی ہے جس سے چیزوں کی شکل کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔(19)

ان اخلاقی اختلافات سے حکومت کے دو یکسر مختلف نظریے جنم لیتے ہیں۔ ایک کے مطابق حکومت دیگر تخصیصی شعبوں کی طرز کا ایک شعبہ اور قوانین، اصولوں اور حاکمیت کا سر چشمہ ہوتی ہے اور دوسرے شعبوں کی طرح محدود و مسدود ہوتی ہے، چنانچہ حکومت کی مہارات کو انتظام اور مذاکرات، قوانین وضع کرنے اور ہنگامی حالات سے نپٹنے کی تخصیصی مہارتوں کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ حکمرانی سے متعلقہ پیشوں کی اپنی دنیائیں ہوتی ہیں۔ پیشہ ور سیاستدانوں کو رائے عامہ، انتخابی معرکہ آرائی اور موقف اپنانے کے فن میں تخصیص حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض لابیاں اور تحریکیں چلانے والے، مشیر اور مبصر بھی اس سفر میں ان کے شریک ہوتے ہیں اور یہ دونوں حلقے باہم مل کر سیاست واقتدار کی تصویر میں رنگ بھرتے ہیں۔ تاہم ان سب کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں صاحبان کشف یا پیغمبروں کے طور پر نہیں بلکہ نل سازوں اور مستریوں کے طور پر رکھا جاتا ہے (بادشاہ امام نہیں ہوسکتا ...... سر پر تاج رکھ کر داعی کا سفید چولا نہیں پہنا جا سکتا'۔ یہ الفاظ مخدوم الملک نے اکبری مسجد کے رئیس کے نام ایک خط میں تحریر کیے تھے۔ یہ خط اکبری مسجد پہنچنے سے پہلے پکڑا گیا اور مخدوم کو سزائے موت کا سامنا کرنا پڑا تھا)۔

دوسرے نظریے کے مطابق حکومت دوسری تمام اقلیتوں سے اوپر ایک بالاتر قوت ہوتی ہے جو مختلف اوقات میں ان دیگر تمام چیزوں کا خیال رکھتی ہے۔ اس کا کام چیزوں کا یکجا کرنا، کل کو دیکھنا اور اسے اکٹھا کرنا اور کل کی بقا و ترقی کیلئے ان میں سے ہر دنیا کو معنی دینا ہوتا ہے۔ بدترین صورت میں یہ نظریہ دیگر شعبوں پر کلیتی یورش کا جواز مہیا کرنے لگتا ہے، کبھی مذہب کے نام پر کبھی نظریے کے نام پر اور کبھی منڈی کے نام (ٹراٹسکی لوئی چہار دہم کے دعوے 'میں ہی ریاست ہوں'، کی اضافی انکساری کا موازنہ سٹالن کے دعوے، 'میں ہی سماج ہوں'، سے کیا گیا تھا') تاہم بہترین صورت میں یہ نظریہ حکمرانوں کی ایسے طریقوں کی جستجو کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس سے تمام معاشرے کی رہنمائی ایک ایسی قسم کے علم وفہم سے ہو سکے

allurdupdfnovels.blogspot.com

جو کہ ہر جز و کی معذوریوں سے بالا تر ہوتا ہے۔

اقتدار بطور عطیہ

غیر معمولی رہنما غیر معمولی انداز سے خدمت کرتے ہیں جس سے خدمت کے مفہوم کا ایک مختلف پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ بیشتر اوقات یہ لگ رہا ہوتا ہے کہ انہیں وجدانی طور پر ہی بھانپ لیا جاتا ہے کہ ان کے لوگوں کی اہم ترین ضرورت کیا ہے۔ ان کی زبان اور رویہ اضطراب انگیز ہوتا ہے۔ وہ اس چیز کو عیاں کرتے ہیں کہ بظاہر مستحکم دکھائی دینے والا نظام اصل میں بدنظمی ہے۔ وہ ایک متبادل نظام کی بات کرتے ہیں اور اس کے حصول کا طریقہ بتاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی، نیلسن منڈیلا اور ولی برانت جیسے رہنما اس تصور کی مثال ہیں کہ دنیا کی صورت گری کی جا سکتی ہے اور یہ محض فطرت یا غیر شخصی بڑے نظاموں کے ہی نہیں بلکہ انسانی حاکمیت کے تابع بھی ہوتی ہے۔ ان کے پاس عمل اور ذمہ داری کی زبان ہوتی ہے، ضرورت کی غلامی کی نہیں اور ان کا بہترین کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے رویے اور ان کی اخلاقی امنگوں کی سطح کو بلند سے بلند تر کرتے چلے جاتے ہیں۔[20]

اس مفہوم میں قیادت خدمت کے تصور کو ایک نئی سطح تک لے جاتی ہے۔ یہ خدمت ایسی نہیں ہوتی کہ جیسے لوگ ہوتے ہیں اور اپنی حاجات و احتیاجات کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں بلکہ یہ خدمت ایسی ہوتی ہے کہ وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے کہا تھا کہ 'زیادہ تر لوگ سوچنے کی بجائے مرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور سچ مچ وہ مرتے بھی ہیں' اور مدتوں سے چلے آتے عقائد کو مسمار کرنے والے رہنماؤں کو فوری انعامات کم ہی ملتے ہیں۔ امکان کے کسی نئے احساس کی نشوونما کی بجائے جسم کے ہشیاری دلانے والے حصوں پر ہاتھ پھیرتے رہنا کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ تاہم نسلوں تک یاد رکھے جانے والے رہنما وہ ہوتے ہیں کہ جو حال کی بجائے امکان کو بھانپتے ہیں اور پھر اس کیلئے جدوجہد کرتے ہیں۔ ایسے رہنماؤں کو اپنے اقتدار کی تناقضی نوعیت کا پتہ چل جاتا ہے اور انہیں اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی قیادت دیگر عام قیادتوں کی نسبت زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ میکس ویبر کے بقول الجھی حقیقت نے مطلق آدرشوں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا ہی ہوتی ہیں جن کی وجہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے عقیدوں کو ساتھ لے کر چلنے والے سیاستدانوں کے ذہن کے مفلوج ہو جانے کا خدشہ زیادہ ہوتا ہے۔ مثالیت پسندی لیٹ جانے اور غرور کے درمیان بہت نازک خط امتیاز ہوتا ہے۔ کوئی رہنما اس خط کی کون سی جانب رہتا ہے اس کا اندازہ آنے والی نسلیں ہی کر سکتی ہیں۔ اس کے اپنے زمانے میں اس کا اندازہ کم ہی ہوتا ہے۔

کسی ایسے رہنما کیلئے کہ جس کا خیال ہوتا ہے کہ کسی صورت حال کی حرکیات کا اسے دوسروں سے زیادہ پتہ ہے، ضبط نفس بہت مشکل ہو جاتا ہے اور بہت ضروری بھی۔ تبدیلیاں لانے والے رہنما سب سے آگے رہ کر قیادت کے فرائض سر انجام دیتے ہیں اور بعض اوقات وہ اتنا آگے چلے جاتے ہیں کہ ان کے دل میں آس پاس کے ہر شخص کیلئے حقارت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ برطانیہ میں چلنے والے ایک مزاحیہ پروگرام 'سپٹنگ امیج' میں ایک مرتبہ مارگریٹ تھیچر کو اپنے وزیروں کی معیت میں کھانا کھاتے دکھایا گیا تھا۔ وہ بیرے کو بھنا ہوا گوشت لانے کو کہتی ہے۔ جب بیرہ پوچھتا ہے کہ سبزیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تو وہ جواب دیتی ہے 'وہ بھی یہی لیں گی'۔ میرے خیال میں اس میں حیرانی کی قطعاً کوئی بات نہیں کہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ان 'سبزیوں' نے جمع ہو کر تھیچر کو حکومت سے نکال باہر کیا تھا۔

بڑے سے بڑا لیڈر بھی بلا واسطہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنا زیادہ اثر براہ راست احکامات کے ذریعے نہیں بلکہ لوگوں کے سوچنے اور دیکھنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کر کے دکھاتے ہیں۔ جب کلیمنٹ ایٹلی سے پوچھا گیا تھا کہ چرچل نے جنگ جیتنے کیلئے کیا کیا تھا (وہ خود جنگ کے دنوں میں نائب وزیر اعظم تھا) تو اس کا جواب تھا 'بس اس بارے میں صرف باتیں ہی کرتا رہتا تھا'۔ اس کی اس بات کو بعض اوقات کلمہ ملامت بھی خیال کیا جاتا ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ اس صورت حال کی بالکل عکاسی کرتی ہے جس میں لیڈر کی براہ راست حاکمیت اس کے اس اثر کی نسبت بہت کم اہم ہوتی ہے کہ جو وہ ان کروڑوں لوگوں کے مورال پر ڈالتا ہے کہ جن کے ہاتھ میں جنگ جیتنے یا ہارنے کی حقیقی طاقت ہوتی ہے۔

اس بات کو سمجھنے کیلئے لیڈر میں کافی زیادہ انکساری کا ہونا ضروری ہے لیکن لیڈروں کی روز مرہ زندگی انکساری کی جنس کو غیر فطری بنا دیتی ہیں۔ لوگ ان سے ادب و تعظیم سے پیش آتے ہیں، خوشامدی انہیں ہر دم گھیرے رکھتے ہیں، ان پر تحسین و آفرین کی بارش ہوتی

allurdupdfnovels.blogspot.com

رہتی ہے اور انہیں ایسی تقریبات میں شرکت کرنا ہوتا ہے جن میں انہیں غیر معمولی عزت و تکریم دی جاتی ہے۔ اخلاقی رویہ اعادہ وتکرار سے عادت میں ڈھلتا ہے۔ اس طرح غرور بھی اعادے سے عادت بن جاتا ہے اور جب ادب و احترام وصول کرتے کرتے لیڈر کو ایک عرصہ گزر جاتا ہے تو پھر اس کے دل میں یہ زعم گھر کرنا شروع کر دیتا ہے کہ وہ واقعی ان لوگوں کے مقابلے میں کوئی بہت بڑی شے ہے کہ جن پر وہ حکومت چلاتا ہے۔ صرف بہت مضبوط کردار کے بعض لیڈر ہی ایسے ہوتے ہیں کہ جو اس ساری واہ واہ میں رہتے ہوئے بھی خود پر اس کا اثر نہیں ہونے دیتے۔ ایک بادشاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ساحل سمندر پر اپنے تخت پر بیٹھا کرتا تھا تا کہ اس کے درباریوں پر واضح ہو جائے کہ اس کے اختیارات کی حدیں کہاں تک ہیں۔ یہ کہانی آج کل اس لیے بھی زیادہ یاد کی جاتی ہے کہ یہ اس دور میں بہت محیر العقول محسوس ہوتی ہے۔[21] (یہ حکایت اس لئے بھی دلچسپ ہے کہ اسے سن کر عظمت کی ناپائیداری کا خیال بھی دل میں تازہ ہو جاتا ہے۔ پے در پے شاندار فوجی مہموں کے بعد لگتا تھا کہ ڈنمارک کے بادشاہ اب انگلستان پر کئی صدیوں تک حکومت کریں گے لیکن ہوا کیا کہ ان کی حکومت بہت جلد جاتی رہی اور یہاں نارمنوں کو اپنا ثقافتی تسلط قائم کرنے کا موقع مل گیا)۔ چینی وزیر اعظم وین یاپاو کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اکثر چلتے چلتے پیشاب کرنے کے بہانے اپنا قافلہ اچانک روک دیا کرتا تھا جس سے اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ عام کسانوں اور ان کے گھر والوں سے بلا کسی تکلف کے بات چیت کر سکے اور سرکاری پراپیگنڈہ سے قطع نظر سماج کی اصل صورتحال سے آگاہ ہو سکے۔

اہل اقتدار کی اخلاقی ذمہ داریوں کے ضمن میں جو سب سے زیادہ متاثر کن کہانیاں سننے کو ملتی ہیں ان میں حکومتی عہدوں کو املاک کے طور پر نہیں بلکہ ایک عطیے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ جب کسی کو کوئی عطیہ ملتا ہے تو اس پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اس کا جواب ایسے ہی دے۔ اگر وہ صلاحیت کی شکل میں ہے تو اس پر یہ ذمہ داری آ جاتی ہے کہ وہ اس صلاحیت کی آبیاری کریں اور پھر اپنے عہدے پر پہنچ کر اس کا ثمر لوگوں کو واپس لوٹائیں۔[22] یہ تصورات اسی پرانے عقیدے سے اکتساب کرتے ہیں کہ تحائف دوسروں کے ساتھ بانٹنے سے ان میں برکت پیدا ہوتی ہے اور استعمال کرنے سے یہ خراب ہو جاتے ہیں اور اگر تحائف کا مالک ذخیرہ اندوزی کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ تبادلہ اشیاء

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے فریقین پہلے جیسے ہی رہتے ہیں بلکہ پہلے سے خوشحال ہو جاتے ہیں لیکن جہاں تک تحائف کا تعلق ہے ان سے دینے اور لینے والوں دونوں کی کایا کلپ ہو جاتی ہے اور تبادلہ تحائف سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے جاتے ہیں۔

آرٹ کی دنیا کے لوگ اس بات کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ فنکار صرف پیسے یا معاوضے کے لیے ہی نہیں دیتے بلکہ وہ اپنی صلاحیت کے عطیے کو لوگوں کے ساتھ بانٹنے کے جذبے سے معمور ہوتے ہیں۔ اگر ان کی فنکاری کو صرف انعام و اکرام اور مال و دولت تک ہی محدود کر دیا جائے تو اس سے یہ خدشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ انہیں ملنے والا عطیہ کہیں مسخ ہو کر ہی نہ رہ جائے۔ اس کی بجائے مثالی بات یہ ہے کہ فن کو عطیہ سمجھ کر حاصل کیا جائے۔ جہد و ریاضت سے اس کی پروش کی جائے اور پھر اسے جہاں جہاں بھی ممکن ہو تقسیم کر دیا جائے۔ بعض پیشوں خصوصاً طب اور تدریس پر بھی یہی تصور صادق آتا ہے۔ اس کا مطلب خدمت و انکساری اور دوسروں میں بانٹتے اور دوسروں تک پہنچاتے چلے جانے کی اخلاقیات ہے۔ مختلف چیزوں مثلاً مٹی، پانی، معدنیات اور ذہانت وغیرہ کے استعمالات دریافت کرنا انسان کی فطرت ہے۔ تحفے کے تصور سے یہ بھی باور آتا ہے کہ حکمت و مہارت کو لوگوں کی خاطر عمل میں نہ لانا فطرت کے خلاف ہے۔ ہم بہت سی لوگ کہانیوں میں ایسے کرداروں کو دیکھتے ہیں کہ جو ملنے والے عطیات کو آگے نہ پہنچانے کے سبب انتہائی عبرتناک انجام سے دوچار ہوتے ہیں کیونکہ ان کے عطیات ان کو ہی زد میں لے لیتے ہیں۔[23] عطیات دینا بجائے خود کوئی ایسا اچھا تصور نہیں ہے۔ نو گیارہ کی ہلاکتوں کے ذمہ دار متصور ہونے والے دہشت گردوں سے منسوب ایک کتابچے میں اسامہ بن لادن کی ان کے نام یہ نصیحت درج ہے کہ وہ اپنے راستے میں آنے والے ہر شخص کے قتل کے فریضے کو ایک عطیہ جانیں جسے ان کیلئے اپنے والدین کو دینا بنتا ہے۔ تامل ٹائگروں اور حماس کے خودکش حملہ آوروں کو مشن پر جانے سے قبل بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم کو سب سے بڑا عطیہ دینے جا رہے ہیں، عین اسی طرح کہ جیسے 1914ء میں افسروں اور جوانوں کو مورچوں میں بھیجتے وقت بتایا جاتا تھا۔ تاہم خود یہ زبان اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ یہ تصورات کتنے طاقتور ہوتے ہیں اور لوگ دان کے سلسلے کے ایک جز کے طور پر اپنی زندگی کو معنی دینے کی کتنی شدید خواہش کے حامل ہوتے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 12

شہری کومٹ منٹ

''انسان کے اندر احساس کی ایک مقدار ہوتی ہے جو اس وقت تک خوابیدہ حالت میں رہتی ہے جب تک کوئی چیز اسے تحریک دے کر عمل پر مائل نہ کر دے، نہیں تو یہ اسی حالت میں انسان کے ساتھ قبر میں چلی جاتی ہے''۔ (ٹامس پین)

میں جب لڑکپن میں تھا تو میرے قدم بہک کر سیاست کی طرف جا نکلے اور میں ایک سیاسی کارکن بن گیا۔ میں اہل اقتدار میں نظر آنے والی ریاکاریاں اور غربت و افلاس دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا جو اس متمول ملک میں اب بھی باقی تھا کہ جس میں پرورش ہوئی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ 'کچھ کیا جانا چاہئے' گو مجھ پر یہ اتنا واضح نہیں تھا کہ وہ 'کچھ' کیا ہوسکتا ہے اور آیا میرے پاس دینے کے لئے کچھ ہے بھی یا نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ حکومت کے ایوانوں میں فرشتے بیٹھے ہوں نہ کہ محض سرخ فیتوں کی گرہیں باندھتے ابن الوقت بیورو کریٹوں کا کوئی گروہ۔ سیاسی جدوجہد میری شناخت کا ایک جزو بن گئی اور میں نے اپنی نوجوانی کے بہت سے قیمتی لمحے دروازوں پر دستک دینے، گلی کوچوں میں میٹنگیں کرنے، ہڑتالیں اور مارچ کروانے اور ماؤ، لینن، مل اور جیفرسن جیسے لوگوں کی تحریریں پڑھنے میں ضائع کر دیے۔

اس سیاسی سرگرمی کی بہت سی خوبیاں تھیں۔ کچھ تو واضح تھیں (جیسے کہ اچھی تنظیم کی اہمیت کی تعلیم دینا) اور کچھ اتنی واضح نہیں تھیں (جیسے کہ مجھے اپنے ان ہم وطنوں کے نظریات کا مقابلہ کرنے پر مجبور کرنا جن میں ان مناصب پر پورا اترنے کے مشتاق کم ہی ہوتے تھے

allurdupdfnovels.blogspot.com

کہ جو میں انہیں تفویض کرتا تھا)۔ میں دنیا کو بہتر جگہ بنانے کے جذبے سے سرشار بہت سے شاندار افراد سے ملا جن میں سپین کی خانہ جنگی اور دوسری جنگ عظیم میں حصہ لینے والے لوگ بھی شامل تھے اور لاطینی امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں آمریت کے خلاف جدوجہد کرنے والی شخصیات بھی۔ گو بعض اوقات مجھے یہ بھی لگتا تھا کہ اس صاحب یا صاحبہ کے سیاسی نظریات واضح نہیں مگر اس کے باوجود میں ان کے کردار اور حوصلہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ آپ جانتے ہوں گے کہ دانتے نے اخلاقی بحران کے وقتوں میں غیر جانبدار رہنے والے افراد کیلئے جہنم کے تاریک ترین گوشے مخصوص کیے ہیں اور یہ لوگ جن کا تذکرہ میں ابھی اوپر کر رہا تھا وہ لوگ تھے جنہوں نے غیر جانبدار رہنا کبھی بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔

میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً یہ کہ حکومت کے پردوں کے پار کیسے دیکھا جا سکتا ہے، کیا نہیں کہا جاتا اور کیا کہا جاتا ہے اس بات کا اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے، یہ دیکھنا کہ ذلیل مفادات پر بلند و بالا آدرشوں کا نقاب کیسے سجایا جاتا ہے اور اس افسانے کی پرتوں کو کیسے ہٹایا جا سکتا ہے کہ جسے ہر ریاست خود کو چھپانے کیلئے استعمال کرتی ہے۔ انگلستان کے عظیم ترین انقلابی ولیم کا بٹ کی طرح جو 1834ء میں دارالعوام کے جلنے پر شادیانے بجا رہا تھا اور حکومت کو 'ڈراونے خواب' یا 'بدہضمی' کا نام دیتا تھا' یہ لوگ بھی بخوبی جانتے تھے کہ حکومتیں جو کچھ کہتی ہیں اس کا تجزیہ کیسے کیا جا سکتا ہے تاکہ تصنع، بلند آہنگ تقریروں اور خطرے کا جالا صاف کیا جا سکے۔

میں کبھی بھی ایک کامیاب کارکن نہ بن سکا۔ تاہم ان تجربات نے مجھے عوامی سرگرمی اور اس تصور کے بارے میں قائل ضرور کر دیا کہ بھیڑوں کے معاشرے کو آگے جا کر بھیڑیوں کی حکومت کو جنم دینا ہوتا ہے۔[1] جمہورتیں اس لئے زندہ رہتی ہیں کیونکہ ان میں کافی سارے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بھیڑیں بننے سے انکاری ہوتے ہیں اور بہت سے بہادر افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اقتدار میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کیلئے خونخوار معرکے لڑنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ریاستیں خادموں کی طرح زیادہ تر اس لیے پیش آتی ہیں کہ انہیں اس طرح پیش آنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک بار جب عوام اقتدار میں آ جاتے ہیں تو پھر ان کیلئے بھیڑیے بنے رہنا کافی نہیں رہتا کہ وہ سینے میں طیش بھر کر ریاست سے اپنے حقوق مانگتے رہیں کیونکہ اب ریاست ان کی خادم بن چکی ہوتی ہے

allurdupdfnovels.blogspot.com

بلکہ بہتر صحت، تعلیم اور خوشحالی جیسی زندگی کی اچھی چیزوں کا دارومدار ان کے عملوں اور طرز عمل پر اتنا ہی ہو جاتا ہے جتنا کہ ریاست کے عملوں اور طرز عمل پر۔

بہترین ریاست وہ ہوتی ہے جو عوام کی خادم کا کردار ادا کرے اور بہترین معاشرہ وہ ہوتا ہے جس کے ارکان ایک دوسرے کے خادموں کا کردار ادا کریں۔ اس باب میں میری بحث یہ ہو گی کہ اچھی حکومت کے لئے معاشرے کیا کردار ادا کرتے ہیں۔ کوٹلیہ لکھتا ہے کہ اچھی حکومت کا انحصار حکمران کے ضبط نفس پر ہوتا ہے جس کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ 'ہوس، غصے، حرص، غرور، تکبر اور حماقت، سے پیچھا چھڑا لے۔ لیکن اگر لوگ آقا بن جائیں اور ریاست ان کی خادم تو کیا یہ سب چیزیں ان پر بھی لاگو ہوتی ہیں؟

بہت سی فکر ایسی بھی ہے جو عوامی جدوجہد کو بڑے شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کا موقف ہے کہ اچھی جمہوریت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اعلیٰ طبقے اقتدار کیلئے رسہ کشی کرتے ہیں نہ کہ س بات پر کہ عوام فیصلہ سازی میں فعال کردار ادا کرنے لگیں۔ اس سوچ کے مطابق جمہوریت کی تاریخ کو بہترین طور پر سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اسے مصالحت کی تاریخ کے طور پر دیکھا جائے جس میں بہت سی پیچیدہ، طوفانی اور اتھری تحریکوں کو رام کر کے انتخابات اور منشوروں کے منظم ملاکھڑوں میں بدل دیا گیا۔ جب مزور تنظیموں کو تسلیم کر لیا جائے اور انہیں ہڑتالیں کرنے کی اجازت دے دی جائے تو پھر کارکنوں کو مشینیں چھوڑنے کی راہ ترک کرنا پڑتی ہے اور اجتماع منعقد کرنے کا حق ملنے پر مظاہرین کیلئے معین ومقرر ضابطوں کی پاسداری ضروری ہو جاتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ بہت زیادہ جذبات اور گرج چمک سے بربادی بھی آ سکتی ہے اور بہت زیادہ عالیشان سیاسی حکایتیں جو لوگوں کو سڑکوں پر لے آتی ہیں انہیں بڑی آسانی سے گمراہ بھی کر سکتی ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ تندو تیز تحریکوں اور انقلاب کے طوفانی لمحوں سے مچنے والی گرج چمک اور ہاہا کار نے ایک بڑی خاموش اکثریت کو آواز سے ہی محروم کر دیا۔ چنانچہ کیا یہ بہتر نہیں کہ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے انداز سے زندگی گزاریں اور ریاست اور سیاست اپنی اتھل پتھل کرتی رہے اور اسے گاہے گاہے صرف اسی وقت ٹھوکا دے دیا جائے کہ جب محسوس ہو کہ صورتحال بہت زیادہ خراب ہو سکتی ہے؟

اور کیا یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ عوام کو محض صارف بنا کر چھوڑ دیا جائے کہ وہ صرف وقفے

allurdupdfnovels.blogspot.com

وقفے سے مختلف دھڑوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے رہیں اور سیاسی دنیا ایک تخصیصی شعبہ بن جائے جو اپنے حال کو آپ ہی جانے اور اسے پیشہ ور سیاستدانوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے جن پر ذرائع ابلاغ نظر رکھیں اور اس کے لئے تنخواہ دار ماہرین کی خدمات سے کام لیں؟

اس سوچ کے مطابق عوام کی عدم دلچسپی ایک بہت اعلیٰ شے اور اس بات کی علامت بن جاتی ہے کہ حکومت کا کام ٹھیک چل رہا ہے اور لوگوں کو سیاسی جدوجہد پر اپنی توانائیاں ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سوچ کو اس دلیل سے بھی تقویت ملتی ہے کہ تہذیبی ترقی میں ہمیشہ زیادہ سے زیادہ پیچیدہ عوامل اختیار کرنے کا رجحان رہا ہے جبکہ وہ چیزیں جنہیں ہم آج کل انٹرفیسز کہتے ہیں زیادہ سادہ ہوگئی ہیں۔ چنانچہ اب پیسے اور کریڈٹ کارڈوں، معین معیارات کے مطابق طے شدہ معاہدوں اور قانونی پروانوں جیسے چند ایک قابل اعتماد آلات کی مدد سے ایک زیادہ پیچیدہ بازاری معیشت میں پہلے کی نسبت بہت زیادہ بآسانی شرکت ممکن ہوگئی ہے...... اب بہت زیادہ بڑھیا قسم کی کاروں کو پہلے کی نسبت بہت زیادہ اناڑی لوگ بھی چلا سکتے ہیں جنہیں یہ جاننے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی کہ کاربوریٹر کیسے کام کرتے ہیں اور ایسے آلکسی افراد بھی تکڑے سے تکڑے کمپیوٹروں سے کام لینے لگے ہیں جن کی بلا کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ سافٹ ویئر کیسے تیار کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ریاستی معاملات میں پیدا ہونے والی پہلے کی نسبت پیچیدگی سے حکمرانی عوام کی سمجھ سے بہت دور ہوتی جا رہی ہے۔ اگر وہ سچ مچ حکومت کی مالی پالیسیوں اور اس کے سوشل سیکورٹی کے نظاموں کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش میں لگ جائیں تو اس پر ان کا اس قدر وقت لگے گا کہ اس سے گھریلو زندگی اور معیشت تباہ ہو کر رہ سکتی ہے۔ تاہم تین یا چار دھڑوں کے درمیان کبھی کبھی کے انتخاب کے جمہوری طریق کار نے ہمیں ایک ایسا سادہ انٹر فیس مہیا کر دیا ہے کہ جو کوئی اتنا نپا تلا تو نہیں لیکن اس میں یہ طاقت ضروری ہے کہ ریاستی اقدامات کو عوامی ترجیحات کی روش پر رکھ سکے۔

مجہول سیاست کا عدم استحکام

allurdupdfnovels.blogspot.com

ان دلائل کو اتنی آسانی سے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت انتہائی پیچیدہ بھی ہوسکتی ہے۔ بہت سے ملکوں میں فقط اکا دکا افراد ہی ایسے ملتے ہیں جو صحیح معانوں میں سمجھتے ہیں کہ سوشل سیکورٹی اور حکومتی مالیات کے بڑے نظام کس طرح کام کرتے ہیں کیونکہ پے در پے اصلاحات نے تہہ در تہہ بہت زیادہ پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں (اور بعض مرتبہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو کوئی ان نظاموں کو واقعی سمجھنے لگتا ہے وہ بہت جلد پاگل ہو جاتا ہے)۔ چنانچہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں کہ ان نظاموں کو سمجھنے کا کام اور انہیں چلانے کا کام خاص افراد کو سونپ دیں جو ان کے ساتھ خود ہی مغز ماری کریں اور خود ہی انہیں چلائیں۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر اس طرح بہت زیادہ فیصلے دوسروں کو سونپنے سے جمہوریت غیر مستحکم ہو جاتی ہے اس کا لازمی نتیجہ بیگانگی کی حرکیات کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر لوگ ان کے نام پر کیے جانے والے کاموں کے معاملے میں واقعی غیر ذمہ دار ہوں گے تو وہ خود کو غیر ذمہ دار محسوس کرنا بھی شروع کر سکتے ہیں۔2004ء میں برطانیہ کی ایک علاقائی اسمبلی میں ہونے والے ریفرنڈم کے قریب ایک ووٹر یہ کہتی سنی گئی کہ اقتدار انجام کار ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں جاتا ہے جن کے پاس گھٹن سے پر بدنما کمروں میں لمبی لمبی نشستیں لگانے کی صلاحیت ہوتی ہے ...... یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں نے کبھی مقامی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔[3] اس کے رویے میں کوئی خاص نہیں بلکہ ایک عام بات تھی۔ ایک مرتبہ جب سیاست کو جھوٹ، دھوکے اور مشکوک عزائم کی بدصورت دنیا کے طور پر دیکھا جانے لگے تو عام لوگ اس سے کوئی تعلق نہیں بنانا چاہیں گے لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے اجتناب کر کے اس کو اور بھی دوسری طرح کی دنیا بنا دیں۔

مجہول عوام لازمی طور پر اس بارے میں کم فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ ان کے نام پر کیا کیا جارہا ہے لہذا انہیں زیادہ آسانی سے بھٹکایا جاسکتا ہے۔ جو شخص کبھی کسی ذمہ دار عہدے پر فائز رہا ہے (مثلاً یونین کونسل، کسی سکول کی مجلس حاکمہ یا کسی پیرش کونسل وغیرہ سے منسلک رہا ہے) وہ باب 5 میں بیان کئے گئے اخلاقی مسئلوں کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ وہ اس بات کا احساس کرسکتا ہے کہ بہت سی ریاستوں کو درپیش مشکل ترین مسائل صحیح اور غلط کے درمیان کی لڑائیوں کی بجائے صحیح اور صحیح کے درمیان جنگ کی وجہ سے پیدا ہوتے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہیں۔لوگوں میں اپنی آزادی استعمال کرنے سے اپنی آزادی استعمال کرنے کی قابلیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جنہیں اقتدار کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا ان کے خود کو اپنے لیڈروں کے ساتھ شناخت کرنے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے کہ وہ ان سب کو چور قرار دے کر مسترد کرنا شروع کر دیں گے بالکل ان مصرین کی طرح جن کیلئے ذمہ داری کے تجربے سے لاتعلق ہونے کے سبب اپنی اخلاقی آراء کو صحیح پیمانے پر رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ جمہوریت کے وہ نمونے جو شہریوں سے مجہول تماشائیوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں وہ کسی ریاست کے سب سے بنیادی کاموں سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام ہو جاتے ہیں یعنی خود کو قانونی حیثیت دینے کا کام اور وہ اقدامات جو لوگوں کے مفادات پورے کرنے کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔

شاید کسی مجہول اور ٹھنڈی جمہوریت کی سب سے سنگین برائی یہ ہوتی ہے کہ اگر لوگ اس بات سے لاتعلق ہو جائیں کہ ان کے حاکم کیا کر رہے ہیں تو اس بات کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے کہ آیا حکمران اخلاقی طرز عمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں یا کہ غیر اخلاقی طرز عمل کا۔ بعض معاشروں میں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمت والے صحافی یا سماجی کارکن سیکنڈلوں پر سے پردہ تو اٹھا دیتے ہیں لیکن پتہ چلتا ہے کہ ان باتوں کی تو کوئی پرواہ ہی نہیں کر رہا۔ اگر عوام اس حد تک لاتعلق اور بیزار ہو چکے ہیں تو پھر چاہے آپ اخبارات کے صفحوں کے صفحے سیکنڈل کی تفصیلات سے کالے کرنا شروع کر دیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور مجرم مزے سے اپنی وارداتوں میں لگا رہے گا۔ بہت سے حالیہ سیکنڈلوں میں یہی معاملہ دیکھنے کو ملا ہے۔فرانسیسی صدر شیراک نے معالی بد معاملگیوں کے شواہد سے متعلق آہ و بکا پر کوئی توجہ نہیں دی، وزیر اعظم برلسکونی نے مافیا سے اپنے تعلقات کے شواہد کو نظر انداز کر دیا (اور پھر خود کو مزید مشکلات سے بچانے کیلئے قانون ہی تبدیل کر ڈالا) صدر بش نے ابوغرائب میں کئے جانے والے تشدد کے متعلق ملنے والے تفصیلی ثبوتوں کو سنا ان سنا کر دیا۔ ان سب موقعوں پر کوئی سر نہیں کٹے اور لیڈر اس طرح اپنے معمولات نمٹاتے رہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور جیسے ان چیزوں میں تو ان کیلئے شرمندگی والی کوئی بات ہی نہیں (اور گمان ہے کہ لیڈروں کی نئی نسل نے بھی اپنے طرز عمل کو اسی کے مطابق ڈھال لیا ہے)۔ اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ بد دیانتی اور اخلاقی کرپشن کو ختم نہیں کیا جا سکتا اور یہ وہ قیمت ہے جو

allurdupdfnovels.blogspot.com

مضبوط قیادت کی خاطر برداشت کرنا ہی پڑتی ہے۔ تیرہویں صدی کے عظیم اطالوی سیاسی مفکر ایذو نے سلطنت رومہ کے ورثے پر بات کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس میں 'لوگ اقتدار کبھی بھی منتقل نہیں کرتے تھے اور کرتے بھی تھے تو اس طریقے سے کہ منتقل کر کے بھی اقتدار انہی کے پاس رہتا تھا'۔[4] اسے جمہوریت پر ایک بہت عمدہ تبصرہ قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ مہارت سے محروم ایک مجہول رعایا سے میل نہیں کھاتا۔ یہ لوگوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ ریاست کے متوازی اور بعض مرتبہ اس سے تصادم میں بھی اختیار استعمال کرنے کی اپنی استعداد کو برقرار رکھیں۔ اس سے ذرا زیادہ سادہ شکل میں، ٹامس ایکونیاس نے بھی یہی خیال پیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ حکومت کی بہترین شکل یہ ہونی چاہیے کہ 'اس میں ایک فرد ہر شخص پر حکم چلائے اور ان پر اچھے طریقے سے حکومت کرے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اچھی حکومت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ 'اس کے نیچے ایسے دیگر افراد بھی ہوں جو خود بھی اچھے طریقے سے حکومت کرنے کے قابل ہوں (تاکہ) تمام شہری عوامی امور میں دلچسپی لیں محض لیڈر چننے والوں کے طور پر ہی نہیں بلکہ خود حکومت کے امکانی اراکین کے طور پر۔[5]

خادم کے طور پر کام کرنے والی ریاست ایسی قوم کی متقاضی ہوتی ہے جو اپنے لئے اختیار لینے اور اس اختیار کو استعمال کرنے کیلئے بھی آمادہ ہو۔ چنانچہ جمہوریت کی تاریخ محض مصالحت اور مجہولیت کا ماجرا ہرگز نہیں ہوتی بلکہ یہ سماجی احتجاج اور اخلاقی ترغیب کی تاریخوں سے وابستہ ہوتی ہے جن میں سماجی تحریکیں لوگوں کے جذبات و مفادات کی ان کے مفروضہ نمائندوؤں سے بہتر نمائندگی کی دعویدار رہی ہیں۔ روایتی آئینی نظریہ منتخب حکومتوں کو قانونی حاکمیت کے واحد مخزن کے طور پر بیان کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن حقیقی جمہورتیں اپنی زندگی کیلئے حریف سیاسی جماعتوں کے داخلی چیلنج کی تکمیل کے لئے اس خارجی چیلنج پر انحصار کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ جمہوری خود کو سیاست کے توسط سے بھی شرمندہ تعبیر کرتا ہے اور اس کے باہر بھی۔ سیاست کے ذریعے یہ ریاست کو ایک ظالم آقا کی بجائے ایک خادم میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سیاست سے باہر یہ لوگوں کو ان کی اپنی دنیا کے معماروں میں بدل دیتا ہے جو معیشت کو اپنی خواہشات کے مطابق بناتے اور چلاتے ہیں کہ وہ ان کی ضروریات اور امنگوں کی عکاسی کرنے لگے۔ آیت اللہ کا دیوار جمہوریت کی بات

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرتے ہوئے کہتا ہے کہ (اسلام کے مطابق) 'انسانوں کو عالی ظرفی کی خصلت عطا کی گئی ہے۔ وہ خدائی خصلت کے حامل ہوتے ہیں وہ خدا کے نائب یا خلیفہ الارض کے طور پر فرائض سرانجام دینے کے اہل ہوتے ہیں'۔

بے اقتداروں کا اقتدار

اس طرح سے کام کرنے کا امکان کم سے کم مقتدر شخص کے پاس بھی ہوتا ہے۔ دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ قبل کی بات ہے کہ چو مملکت سونگ ریاست کے دارالحکومت کو محاصرے میں لے رہی تھی۔ چو فوجوں کے پاس سات دن کا دانہ پانی باقی رہ گیا تھا۔ سونگ ریاست آخری دموں پر تھی۔ اب دونوں طرف کے حکمران اس بات کی ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ دوسرے کی صورتحال کا اندازہ کریں چنانچہ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کی طرف یہ اندازہ کرنے کیلئے پیامبر بھیجے کہ ان کا دشمن کتنے دن نکال سکتا ہے۔ سونگ کے ایلچی نے قصد کیا کہ وہ حقیقت نہیں چھپائے گا۔ اس نے کہا کہ حالات بہت خطرناک ہیں۔ لوگ اپنے بچے کھا رہے ہیں اور ان کی ہڈیوں کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا اندازہ ہے کہ دوسرا شخص ایک عزت دار آدمی ہو گا اور ان کی حالت دیکھ کر رحم کھائے گا۔ اس کے بدلے میں چو کے بھیجے شخص نے بھی اس دیانت داری سے جواب دیا اور کہا 'جمے رہو'۔ ہمارے پاس صرف سات دنوں کا سامان بچا ہے'۔ جب چو کے بادشاہ کو یہ بتایا گیا تو پہلے تو اسے بہت غصہ آیا لیکن کچھ سوچ بچار کے بعد اس نے اپنا ذہن بدل لیا اور اپنی فوج کو محاصرہ ختم کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔

یہ مثال اس اعتبار سے بہت توجہ طلب ہے کہ دونوں ایلچیوں نے اس سب سے بنیادی مطالبے سے بے وفائی کی جو کوئی ریاست کر سکتی ہے یعنی تحفظ کے دفاع میں وفاداری کا مطالبہ۔ تاہم یہ بھی ہے کہ دونوں حضرات خدمت کے ایک بلندتر فریضے کے مطابق عمل کر رہے تھے۔ یہ وہ اختیار ہوتا ہے جو ہر کس و ناکس کے پاس ہوتا ہے اور اسے کم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک بڑا نازک اور پرخطر اختیار ہوتا ہے، ایک کارکردگی اور اثر کا اختیار جہاں ارادہ و قربانی کی قوت متوقع طرز عمل کے معیارات کو درہم برہم اور ایک مختصر دورانیے کے لئے دنیا

allurdupdfnovels.blogspot.com

کو تہہ و بالا کر دیتی ہے۔ سترہویں صدی کے انگلستان میں جارج فاکس نے کویکروں کی ایک تحریک کی بنیاد رکھی تھی جو اسی طرح کی خاموش اخلاقی قوت پر مبنی تھی (یہ کویکر تین سو سال بعد ماحولیاتی تحفظ کی گرین پیس تنظیم کے بانیوں کیلئے براہ راست تحریک کا موجب بنے)۔ انہوں نے پرامن عدم تعاون کی رسم ڈالی جسے وہ نا انصافی کے خلاف بہترین ردعمل تصور کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے اسے ایک سیاسی فلسفے میں تبدیل کر دیا۔ مارچ 1922ء میں جب گاندھی کو ہندوستان میں تحریک عدم تعاون کے قائد کی حیثیت سے گرفتار کیا گیا تو اس نے وکیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اقبال جرم کرتے ہوئے جج کو ایک قابل اعتراض مواد کا بھی پتہ بتا دیا جسے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ جب گاندھی نے عدالت میں بتایا کہ اس نے وفاداری و تعاون چھوڑ کر انحراف کی راہ کیوں اپنائی تو یہ مزید گاندھی کا مقدمہ نہ رہا بلکہ سامراجی نظام کے مقدمے میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اس نے جج سے کہا کہ اگر یہ نظام ٹھیک ہے تو پھر یہ اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس کیلئے سخت سے سخت سزا کا فیصلہ سنائے لیکن اگر اسے کوئی خلش محسوس ہوتی ہے تو اس کا فرض بنتا ہے کہ نوکری سے استعفیٰ دے دے۔ اس پر جج بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا کہ اس نے آج تک گاندھی جیسا کوئی اور شخص نہیں دیکھا جو اس کی عدالت میں پیش ہوا اور نہ ہی شاید دیکھے گا۔ تاہم اسے گاندھی کو بادل نخواستہ چھ برس کی قید سنانا پڑی لیکن اس کے بعد اس نے یہ بھی کہا کہ اگر حکومت اسے جلد رہا کر دے تو اس امر کی اس سے زیادہ اور کسی کو خوشی نہ ہو گی۔ چنانچہ انگریز سرکار نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوبارہ کبھی گاندھی پر مقدمہ چلانے کی کوشش نہ کی گو اسے بہت سے موقعوں پر گرفتار کرنے کی نوبت آتی رہی۔ (6)

اس سے چند عشروں بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مارٹن لوتھر کنگ نے گاندھی کے انہی تصورات میں تھوڑی جمع تفریق کر کے ان پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے پیروکاروں کو بتایا کہ 'ناحق ملا دکھ نجات کا باعث ہوتا ہے' اور پھر گاندھی کی طرح وہ بھی موت پر غلبہ حاصل کرتا چلا گیا۔ اس طرح کا انفرادی حوصلہ تبدیلی کے ہر عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ 1969ء میں پراگ میں جان پلاکس کی طرف سے دی جانے والی تصویروں کی قربانی یا ویت نام میں بدھ بھکشوؤں کی خودسوزی جیسی چیزیں لوگوں کو بیدار کرتی ہیں اور اہل اقتدار کے چہرے سے معمولیت کا نقاب الٹ کر دنیا کو اس کے ظلم و سفاکیت کا اصلی رخ دکھاتی ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

بعض عینکوں سے اس طرح کے اقدامات بہت غیر مقبول دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے اقدامات کو اصل میں ایک ایسا تحفہ یا قربانی کہا جا سکتا ہے جو بعض بڑے لوگ دوسروں کے مفادات کی خاطر دیتے ہیں۔ مذہبی اعتقاد اس طرح کی قربانیوں کو قابل فہم بنا سکتا ہے مثلاً 1989ء میں سڑکوں پر نکلنے والے مشرقی جرمنی کے شہریوں کی قیادت وہ مسیحی کر رہے تھے جو خدا کی طرف سے ملنے والے اجر اور اس زمین پر ملنے والے انصاف پر یقین کے حامل تھے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ بھی اس طرح کی اور اتنی ہی قربانیاں پیش کرتے ہیں جو کسی بھی دین یا مذہب پر یقین نہیں رکھتے۔

لوگ اپنی قربانی کیوں پیش کرتے ہیں؟ اس کے پیچھے اپنے ان احباب اور عزیز و اقارب کی محبت بھی کارفرما ہو سکتی ہے کہ جنہیں قتل یا قید کیا جاتا ہے یا جن کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یا یہ کوئی ایسا خمار بھی ہو سکتا ہے کہ جس کے زیر اثر انسان خود کو تقدیر یا تاریخ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ بغاوت ہی ایک بے معنی زندگی کو معنی دینے کا واحد طریقہ ہو سکتا ہے لیکن اگر بغاوت کے تاریک پہلو کو دیکھیں تو وہ موت کی پوجا کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔[7] تاہم ان افراد کی پرامن چیلنج کی روزمرہ بغاوت جو خود عقوبت کو دعوت دیتے ہیں اسے روکنے میں مدد دیتی ہے اور اس سے معاشرے اپنی عمیق ترین مطلوبہ اقدار کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

اگر انفرادی اخلاقی جرات انقلابی تبدیلی کا تخم ہے تو ہم اس کے اثمار کو بھی واضح طور پھلتا پھولتا دیکھ سکتے ہیں اور جوں جوں یہ ارتقاء آگے بڑھ رہا ہے ریاست کا وتیرہ بھی آقا کی بجائے خادم کا بنتا چلا جا رہا ہے اور یہ اسی کی بدولت ہے کہ گذشتہ دو صدیوں میں بڑے عوامی اداروں کو یہ حق ملا ہے کہ وہ خود کو رکنیت پر مبنی اداروں کی صورت منظم کر سکیں، چیخ و پکار کر سکیں اور اپنے مطالبات کیلئے آواز اٹھا سکیں۔ عوام کی اس فعالیت کا سب سے واضح اظہار وہ مظاہرہ ہے جس میں بہت سے افراد اپنی یکجہتی اور کومٹمنٹ آشکارہ کرتے ہیں اور نظام کی قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہوتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک اس طرح کے جدید مفہوم میں مظاہرے کا کوئی اتہ پتہ نہیں ملتا (اور یہ اصطلاح 1830ء کے عشرے تک ابھی عام استعمال میں نہیں آئی تھی) اور پھر جب لوگوں میں اخلاقی بیداری پیدا ہوئی تو دیگر سرگرمیوں کے بین بین مظاہرے بڑی تیزی سے پھیلتے چلے گئے۔ آزادیوں کے عظیم انقلابی

allurdupdfnovels.blogspot.com

مفکر جان ولکس کے پیروکار جس نے کہ 1770ء کے عشرے میں شمالی امریکہ سے متعلق برطانوی پالیسی کی کھلم کھلا مخالفت کی تھی، لندن کی سڑکوں پر عوام کے بڑے بڑے جلوسوں کا متواتر انعقاد کرتے رہے۔ تقریباً اسی دور میں کویکروں نے بھی غلامی کے خلاف تحریکوں کا آغاز کر دیا تھا۔ انہوں نے عدالتوں میں اپیلیں دائر کیں اور بائیکاٹ کیے اور لوگوں کو یہ جاندار نعرہ دیا کہ 'کیا میں ایک انسان اور بھائی نہیں ہوں'۔ غالباً عوامی احتجاج کی یہ پہلی بڑی تحریک تھی۔ اس کے بعد کے پچاس برسوں کے عرصے میں مظاہرے کا رواج پورے یورپ میں پھیلتا چلا گیا اور 1849ء تک اسے سیاسی سرگرم کے ایک باقاعدہ جزو کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور یہ نسبتاً بے نوا لوگوں کیلئے اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا ایک پسندیدہ حربہ بن چکا تھا۔ یہ مظاہرہ بتدریج ایک عسکری پریڈ کی شکل اختیار کر گیا جس کے اہداف شہر کے علامتی مراکز ہوا کرتے تھے۔ اس وقت سے مظاہروں کی تعداد میں بتدریج اضافہ دیکھنے میں آیا ہے اور اب یہ نہ صرف انقلاب پسند بائیں بازو کیلئے بلکہ سرکاری ملازموں اور طلباء بلکہ زمینداروں کے لئے بھی ایک ہتھیار کی شکل اختیار کر گیا ہے (ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں مظاہروں میں حصہ لینے والی آبادی کا تناسب 1990ء کے عشرے میں 1960ء اور 1970ء کے زیادہ فعال عشروں کی نسبت دگنا ہو چکا تھا)۔

گڈانسک، برلن، تہران اور منیلا (جہاں 1986ء میں مارکوس اور 2001ء میں ایسٹراڈا کا تختہ الٹا گیا) میں انقلابات مظاہروں کی بدولت ہی کامیاب ہوئے کیونکہ ان کی وجہ سے عوام کے اعتماد میں بہت اضافہ ہو چکا تھا اور ریاست کا اعتماد بہت پست ہو گیا تھا۔ مظاہرہ ایک خوفناک بلے کی نمائش یعنی قوت کے اظہار کا کام کرتا ہے جس سے طاقت کا استعمال بے فائدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ تاہم اس میں وہ خصائل بھی موجود ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ بتاتے ہیں یعنی جب لوگ خود کو واضح کرتے ہیں اور اقتدار کی توپوں کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان میں اخلاقی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

مظاہرہ اس بات کی علامت ہے کہ لوگ ریاست کی دنیا کے خاموش تماشائی بنے رہنے کی بجائے کھلاڑیوں کا روپ اختیار کر رہے ہیں۔ مظاہرہ ایک کشش کا کھیل ہے جو

allurdupdfnovels.blogspot.com

راہگیروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے اور مظاہرین ذرائع ابلاغ کے توسط سے دنیا کو اپنے کاذ کی اہمیت، اپنا اتحاد، اپنی تعداد اور کومٹمنٹ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔(8) بعض دفعہ مظاہرے میں جشن اور ندامت دونوں طرح کے عنصر بھی شامل ہو جا سکتے ہیں۔ ایلا بیمہ کے سابق گورنر جارج ویلس1995ء میں1965ء کے شہری حقوق کیلئے بپا کیے جانے والے اس مارچ کے سوانگ میں شریک ہوا تھا جس کی اس نے ماضی میں مخالفت کی تھی۔

تاہم مظاہروں اوراختیارات کے نفاذ میں تھوڑا ہی فرق رہ جاتا ہے۔ درحقیقت مظاہرے اختیارات کے نفاذ کی تقریباً ایک ضد ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایسے دعوے ہوتے ہیں جن کا رخ ریاست کی جانب ہوتا ہے اور ان کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ریاست کیا رد عمل ظاہر کرتی ہے۔ مظاہرے کھیل ہوتے ہیں اور کھیل کے طور پر ان کا کردار ہی اس بات کا خدشہ پیدا کر دیتا ہے کہ وہ بجائے ایک ذریعہ ہونے کے خود ہی مقصد کی شکل اختیار کر لیں گے۔

جمہوریت بطور مکالمہ

ذمہ داری بانٹنے اور حکومت کو اخلاقی ڈگر پر گامزن رکھنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو حکومت کے مکالمات میں شریک کیا جائے۔ وزیروں اور اعلیٰ افسروں کی ڈائریاں مکالمے سے بھری ہوتی ہیں ...... کمیٹیاں اور ورکنگ گروپ، ٹاسک فورسیں اور لابیاں، اور پتہ نہیں کیا کیا۔ جو چیز مختلف معاشروں میں فرق پیدا کرتی ہے وہ ہے ان مکالمات کی وسعت (آیا کہ ان میں کتنے لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے یا کتنے لوگوں کو ان سے باہر رکھا جاتا ہے) اور ان کا لب ولہجہ (کہ آیا لوگ جو حقیقت میں سوچتے ہیں انہیں وہ بات کہنے کا موقع ملتا ہے)۔

ماضی کے بہت سے معاشرے وافر عوامی بحث کو اچھے فیصلوں تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ تصور کرتے رہے ہیں اور لہٰذا اسے بہت زیادہ اہمیت و وقعت دیتے رہے ہیں۔ قدیم ایتھنز ہمیشہ اختلاف اور بحث مباحثے کا اکھاڑہ بنا رہتا تھا۔ بدھ اور جین روایتیں عوامی بحث

allurdupdfnovels.blogspot.com

مباحثے کی حوصلہ افزائی کیلئے مشہور تھیں اور رسمی حاکمیت کو زیادہ محترم نہ جانتی تھیں۔[9] اشوک نے ایک لاٹھ پر کندہ کروایا تھا کہ 'اپنے مسلک کی بڑائی اور دوسرے مسلکوں کی تذلیل نہ ہونی چاہیے...... اس کے برعکس دوسرے مسالک کو ہر موقع پر ہر طرح مناسب عزت دی جانی چاہیے۔ نیلسن منڈیلا نے اپنی خودنوشت سوانح میں عوامی بحث مباحثے کی ان افریقی روایات کا ذکر کیا ہے جن کا مشاہدہ اسے بچپن میں اپنے علاقے کے ریجنٹ ہاؤس میں منعقد ہونے والے اجلاسوں میں ہوا کرتا تھا: 'ہر وہ شخص جو بولنا چاہتا تھا، بولتا تھا' وہ لکھتا ہے اور 'خود انتظامی کی بنیاد یہ تھی کہ تمام لوگ اپنی آراء کے اظہار میں آزاد ہے اور شہریوں کی حیثیت سے سب کی قدر ایک سی تھی'۔[10] منگ ٹاڈ گٹلن ہمیں بتاتا ہے کہ 1960ء کے عشرے میں ہونے والے طلباء مظاہروں کی خبروں کو ذرائع ابلاغ نے کیسے اچھالا تھا اور ذرائع ابلاغ کی اس قدر توجہ سے ان کے لیڈروں کا دماغ کیسے خراب کیا تھا اور انہوں نے صحافیوں کی توجہ کا مرکز بنے رہنے کیلئے ایسے اقدامات کیونکر کرنا شروع کر دیئے تھے جن سے ان کی کاز کو کوئی فائدہ پہنچنے کا امکان نہیں تھا۔ ان میں عوام کی توجہ کا مرکز بنے رہنے کا اتنا شوق پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی کامیابیوں کا معیار نتائج کی بجائے اپنی خبروں کو جاننے لگے کہ آج کتنے اخباروں میں ہماری تصویر چھپی ہے اور کل ریڈیو اور ٹی وی نے ہمارے بارے میں کتنی خبریں نشر کی تھیں اور پھر یہ بھی ہوا تھا کہ انہوں نے تحریک کو آگے بڑھانے کی بجائے پرکشش علامات کو ترجیح دینا شروع کر دی تھی۔ جب ان قائدین نے حقیقت سے نظریں چرانا شروع کیں اور ان میں ٹی وی اور اخبار کی توثیق کی بھوک بڑھی تو پھر کیا ہوا کہ ان کی صرف اسی پر ہی بس ہو کر رہ گئی کہ مایوسی و غرور کی پہاڑیوں کے درمیان ہی دوڑتے رہیں۔ یہ وہ دام ہے جس میں آج کل کی ذرائع ابلاغ سے بھری دنیا میں تحریکی لوگ بآسانی پھنس جاتے ہیں۔

مظاہرے کو دوسروں پر اور ریاست پر اپنا حق جتانے کا ایک حربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کیلئے بہت زیادہ جرات اور بہادری بھی درکار ہو سکتی ہے اور یہ ریاستوں کو اخلاقی طرز عمل اپنانے پر مجبور کرنے کے سلسلے میں فیصلہ کن کردار بھی ادا کر سکتا ہے لیکن مظاہرہ معمول کی حکومتی مشینریوں کے باہر ہی باہر رہتا ہے اور اس کا یہ بھی خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ محض خود کلامی بن کر نہ رہ جائے اور مظاہرہ کے ہدف بننے والے افراد اس پر کان ہی نہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

دھریں اور یا پھر جیسا کہ 2003ء میں عراق پر ہونے والے حملے کے خلاف کیے جانے والے عالمی مظاہروں کے ساتھ ہوا تھا کہ لوگ اس پر کان تو دھریں لیکن اسے قابل اعتنا خیال نہ کریں۔

قدیم عہد کے چین میں ماہانہ اجلاس کا رواج شروع کیا گیا تھا جن میں کھانے پینے کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ لوگ ان اجلاس میں رویوں، انعامات اور اخلاقیات کو زیر بحث لاتے تھے اور یہ بحثیں اکثر شاہی فرمانوں کے ردعمل میں واقع ہوتی ہیں۔[11] مکالمے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ ہم حریف دعاوی کے درمیان یہ فیصلہ کریں کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم سوچتے کیسے ہیں۔ ہم اپنے دلائل کی خامیوں اور خوبیوں کے بارے میں صرف انہیں زبان سے نکال کر ہی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ تاہم بیشتر جمہورتیوں میں یہ مکالمات تاحال محدود نظر آتے ہیں۔ زیادہ مکالمات جو مشاہدے میں آتے ہیں وہ اولاً تو اشرافیہ گروہوں کے مابین ہوتے ہیں اور یا پھر اخبارات کے کالموں میں جن کا دارو مدار اخبارات کے مالکوں کی پسند و ناپسند پر ہوتا ہے۔ معاصر حکومت کا بیشتر روز مرہ کاروبار خود کلامی یا ایک شخصی ڈرامہ کے قریب تر دکھائی دیتا ہے جس سے کبھی کبھار، مشاورت، ردعمل، عوامی اجتماع اور سوال و جواب کے سیشنوں کے لہجے بھی ٹپک پڑتے ہیں۔ باورچی خانوں، میکدوں اور دفتروں، بلاگوں اور ویب پیجوں پر رونما ہونے والے دیگر مکالمے کسی حد تک ایک متوازی دنیا میں ہوتے ہیں۔ ان مکالموں کی نوعیت قدرے مختلف ہوتی ہے اور یہ زیادہ مساوی زیادہ مسلسل اور زیادہ بے وضع ہوتے ہیں۔ جمہورتیوں کیلئے چیلنج یہ ہے کہ آیا وہ ان دیسی مکالموں کی اس سے زیادہ مقدار کو اپنی سوچ بچار میں شامل کر سکتی ہیں یا نہیں۔

گذشتہ دو عشروں میں بہت سی نئی جمہورتیوں نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ان نمونوں سے آگے پیش رفت کر لی ہے جن کا یورپ اور شمالی امریکہ میں غلبہ ہے۔ وسیع تر مکالموں کو اداروں میں ڈھال لیا گیا ہے۔ نہ صرف انتخابات اور پارلیمانوں کی صورت (پارلیمان کا لغوی مطلب ہے 'بولنے کی جگہ' جس کی نگرانی سپیکر یا ''بولنے والا'' کرتا ہے)[12] بلکہ مقامی کونسلوں، پنچایتوں، اسمبلیوں اور شہری فورموں (انڈونیشیا کے فورم وار گاس کی طرح) کی صورت میں بھی۔ بعض ملکوں نے ان بہت زیادہ وسیع مکالموں کو اپنے دساتیر میں بھی جگہ دے دی ہے۔ فلپائن نے ایسا 1990ء کے عشرے کے اوائل میں کیا۔ اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے کچھ ہی عرصہ بعد برازیل کے1988ء کے آئین نے یہ دعویٰ کیا کہ مقامی خدمات میں عوام کی شرکت ایک جمہوری حق ہے جس سے فراہم کنندگان، سماجی تنظیموں اور حکومت کو مربوط کرنے والی ہزاروں کونسلوں نے جنم لینا شروع کر دیا (صرف صحت کے شعبے میں ہی اب تک پانچ ہزار سے زائد کونسلیں بن چکی ہیں)۔ بولیویا میں شہریوں پر مشتمل نگران کمیٹیوں کو یہ اختیار مل چکا ہے کہ اگر وہ اخراجات کو منصوبوں سے زیادہ دور ہٹتا دیکھیں تو وہ میونسپل بجٹوں کو منجمد کر سکتی ہیں۔ پورٹو ایلگری میں1990ء اور2000ء کے عشروں میں ایک لاکھ افراد، جو کل بالغ آبادی کا دسواں حصہ ہے، نے بجٹ سازی کے عمل کے ابتدائی مراحل کے دوران شراکتی اجلاسوں میں حصہ لیا۔[13]

اس کے متوازی انٹرنیٹ کے سماجی سافٹ ویئروں نے پہلے سے کہیں زیادہ افراد کیلئے ہر دم جاری مکالموں میں شرکت کرنا ممکن بنادیا ہے۔ اس سے لوگوں کو باہم بحث مباحثوں کا موقع ملے گا اور مستقبل میں نیچے سے اوپر زیادہ نامیاتی مفاہمتیں عمل میں آئیں گی۔ یہ مکالموں حاکموں اور محکوموں کے درمیان درجہ بندی کے تفاوت سے آگے نکل چکے ہیں اور اس مفروضے سے بھی کہ ہر شخص کی آراء برابر کی معتبر ہوتی ہیں۔ اب حاکمیت اور توجہ حاصل کرنا پڑتی ہے، ورثے میں نہیں ملتی کیونکہ اب زیادہ نمایاں حیثیت ان لوگوں کو دی جاتی ہے کہ جن کی سابقہ آراء دیگر شرکاء کی نظر میں مفید ثابت ہوئیں۔

دنیا کے سب خطوں نے جمہوری جذبے کو بالکل ایک جیسی قوت سے نہیں اپنایا۔ 1990ء کے عشرے میں ازبکستان میں صدر اسلام کریموف کے مقابلے میں صرف ایک شخص عبدالحافظ جالولوف کھڑا ہونے کی جسارت کر سکا تھا اور اس نے بھی خود کو ووٹ ان وجوہات کی بنا پر نہیں دیا تھا کہ 'دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے عزت دار طریقے سے پیش آنا نہیں بھولنا چاہیے ...... میرے نزدیک اپنے آپ کو ووٹ دینا کوئی شرافت والی بات نہ ہو گی'۔ لیکن بہت سے ملکوں میں ایسی شرافت کو ایک طرف رکھ کر بھرپور بحث مباحثے اور جدوجہد کا چلن اپنا لیا گیا ہے کیونکہ وہاں کے لوگوں کو یہ باور ہو چکا ہے کہ بھیڑیں بن کر نہیں رہنا چاہیے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

عمل بطور دلیل

جمہورتیوں میں عموماً مکالمے اس بارے میں ہوتے ہیں کہ ریاست کو عوام کیلئے کیا کرنا چاہیے۔ جب ہم ووٹ دیتے ہیں تو ہم خود کو شاید ٹیکسیشن میں تھوڑے سے اضافے سے زیادہ کسی بھی چیز سے شاذ ہی کومٹ کرتے ہیں۔ تاہم جمہوری کلچر میں ایک بہت اہم روایت موجود ہے جس کا مقصد ہوتا ہے کہ مظاہرے اور مکالمے کی معذوریوں سے بالا ہو سکے۔ یہ اس تصور سے استنباط کرتی ہے کہ جب ہمیں کوئی مسئلہ نظر آئے تو ہماری یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ بجائے ریاست کا انتظار کرنے کے جہاں تک ممکن ہو ہم اسے خود حل کریں۔ یہ نئے معاشرے کو بحث کی بجائے عمل کے ذریعے نئے سرے سے تخلیق کرنے کی روایت ہے۔

انیسویں صدی کے دوران جب کچھ لوگ سڑکوں پر مارچ میں مصروف تھے کچھ لوگ باہمیت، فطریت، آزادی اور مساوات پر مبنی ایک نیا معاشرہ تخلیق کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رابرٹ اوون، چارلز فوریئر، ہم ایٹی این کابے اور ہوریس گریلی ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے خیالی کمیونوں کو تحریک دی اور بعض صورتوں میں انہیں تخلیق بھی کیا۔[14] انہوں نے جو کچھ کیا اسے نظریاتی شکل بھی دی اور اپنے تصورات پیش کرنے کیلئے کتابچے اور اخبارات شائع کیے۔ مثال کے طور پر رابرٹ اوون اس چیز کے تمام خواص کا پیش خیمہ بنا جسے بیسویں صدی کے اواخر میں سماجی ناظم کا نام دیا گیا۔ دنیا کو منظم کرنے کے مختلف ماڈلوں کے تسلسل نے لوگوں کے تخیل کو اپنی گرفت میں لیا اور پھر یہ سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ بعض افراد نے مختلف طرز کی تدریس (سٹائنر اور مونٹیسوری سکولوں اور فروبَل کنڈر گارٹنوں کی طرح) یا علاج معالجے (مثلاً مہلک بیماریوں میں مبتلا افراد کیلئے شفا خانوں کی ترقی) کا تصور پیش کیا۔ کوآپریٹو سوسائٹیاں ساری دنیا میں پھیلتی چلی گئیں۔ برطانیہ کا مائیکل ینگ اس سماجی زرخیزی کی ایک نمایاں مثال تھا۔ اس نے اوپن یونیورسٹی سے لے کر انجمن صارفین تک کوئی ساٹھ سے زائد تنظیمیں بنانے میں مدد دی جن میں سے ہر ایک اس بارے میں ایک انقلابی تصور کی تجسیم تھی کہ دنیا مختلف کیسے بن سکتی ہے۔

سب کے سب تخیلاتی یوٹوپیا اور کمیونوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان کے آدرشوں

allurdupdfnovels.blogspot.com

نے ان تضادات کو اور بھی دوچند کر دیا جو کسی بھی قسم کی حکومت میں کارفرما ہوتے ہیں۔ کسی بھی انسانی گروہ کو کسی بھی سطح پر اصولوں، حاکمیت اور نظم کی ضرورت ہوتی ہے اور حاکمیت کا نفاذ کرنے والے افراد اخلاقی طور پر کبھی بھی خالص نہیں رہ سکتے۔ جلد یا بدیر اس گروہ کی بقاء کا انحصار مشکل فیصلوں اور سمجھوتوں پر ہو جاتا ہے اور جب یہ مرحلہ آتا ہے تو پھر آدرش بڑی تیزی سے ادھڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آدرش جتنے زیادہ مطلق اور متقاضی ہوتے ہیں، وہ اتنے ہی زیادہ ضرر پذیر ہوتے جاتے ہیں۔ ہیگل نے اس نقطے پر خاص طور پر بہت اچھا لکھا ہے۔ وہ اپنے پیش رو کانٹ کے اخلاقیاتی دلائل پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ 'ایسے داخلی خلوص اور تکمیل ذات' کا تقاضا کرتے ہیں کہ صرف ایک ریاکار شخص ہی اخلاقی طرز عمل کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ (15)

اس سے زیادہ نتائجیت پسند بے شمار مثالیت پرست دانشور ایسے بھی تھے جنہوں نے سماجی تنظیم کی نئی نئی شکلیں اور زندگی کے نئے نئے طریقے وضع کیے جو مکمل اطاعت و انقیاد کے متقاضی نہیں تھے اور ان میں سے بہت سی شکلوں اور طریقوں کو فروغ بھی ملا بلکہ وہ مرکزی دھارے کی صورت بھی اختیار کر گئے۔ سماجی تبدیلی کی ایک متبادل تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ ان شکلوں اور طریقوں کی پرانے مفادات کی اکثر و بیشتر پیش آنے والی مزاحمت کے باوجود توضیح و ترمیم اور اشاعت کیسے کی گئی اور جسے اب ہم خدمتی ریاست تصور کرتے ہیں اس کا کتنا بڑا حصہ پہلے افسر شاہیوں اور سیاستدانوں سے بعید پالا پوسا گیا۔

ایک ایسی تاریخ ہمیں بتا سکتی ہے کہ ریاستوں کیلئے تبدیلی کے گہرے عوامل کیلئے راہ ہموار کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ معاشروں میں تبدیلی لانے کیلئے وضع کئے گئے زیادہ بلند نظر منصوبوں کو عموماً ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ انسانی فطرت کی تشکیل نو کی کمیونسٹ کوششوں کی ناکامی کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں لیکن اس طرح کی ناکامیاں، اگرچہ اس سے بہت زیادہ کم سطح پر، صدر لنڈن جانسن کے غربت کے خاتمے کے 'عظیم سماج منصوبہ' اور 1980ء کے عشرے میں امریکہ و برطانیہ میں قدامتی اخلاقی اقدار کے نفاذ نو کے منصوبے پر بھی اثر انداز ہوئیں۔ جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو کامیابی ان کوششوں کو حاصل ہوئی جنہوں نے کسی سماجی تحریک کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس کی وجوہات بہت سیدھی سادھی ہیں۔ بنیادی سماجی تبدیلی ہمیشہ لوگوں سے یہ تقاضہ کرتی ہے کہ وہ اپنی عادتیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

اور عقیدے بدلیں اور جب تک لوگوں کے پاس ایسا کرنے کی اپنی وجوہات نہیں آ جاتیں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ ریاستیں کسی سماجی تحریک کے مطالبات کو شرمندہ تعبیر کر سکتی ہیں اور بہت سی سماجی تنظیموں کیلئے اس وقت تک کامیابی حاصل کرنا ویسے ہی ناممکن ہوتا ہے جب تک کہ وہ کسی ریاست کو اپنے مطالبات قانون کا حصہ بنانے پر راغب نہ کر لیں۔ تاہم ریاستیں تبدیلی کی سلسلہ جنبانی بہت شاذ ہی کر پاتی ہیں۔

اس کے بنیادی مضمرات اس چیز کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں کہ ہم اخلاقی اوصاف کے فروغ کے سلسلے میں ریاستوں کے کردار کے متعلق کیسے سوچتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ریاست معاشرے کے باہر یا اوپر نہیں بیٹھی رہ سکتی کہ وہاں بیٹھے اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرتی رہے۔ اس کی بجائے اسے معاشرے کے اندر بیٹھنا اور ایک زیادہ تخلیقی طرز کی شہریت کو جواب دینا پڑتا ہے جو محض ریاست کی چھان بین اور ترغیب سے متعلق ہی نہیں بلکہ اس کے اندر اور اس کے گرد تبدیلی لانے سے متعلق ہوتی ہے۔ ہوبرٹ ڈریفس اور اس کے ساتھی اسے 'نئی دنیاؤں پر سے پردہ ہٹانا' کہتے ہیں۔ لوگ مشق اور اس مشق کے بارے میں سوچ بچار کے ذریعے اکٹھے اپنی زندگیوں کو منظم کرنے کے نئے طریقے دریافت کرتے ہیں۔ اس کی صورت ایک ہی مرض میں مبتلا افراد کی امداد باہمی کی تنظیم بھی ہو سکتی ہے، چھوٹے قرضہ جات فراہم کرنے والی ایسی تنظیم بھی ہو سکتی ہے جس میں خواتین دوسری خواتین کو قرضوں کی فراہمی کا انتظام سنبھالیں اور معلمین کی ایسی انجمن بھی ہو سکتی ہے جو نو عمر مجرمین کی اصلاح کیلئے اپنی خدمات پیش کرے۔

اس طرح کی ساری سماجی تبدیلی بہت زیادہ شراکتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس میں لوگوں کو مل کر کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ بہت زیادہ اخلاقی بھی ہوتی ہے لیکن یہ اخلاقیات کا نفاذ بہت کم کرتی ہے۔ سلیکان ویلی کے ایک کاروباری اصول دان جارج گلدر ایک کاروباری مہم جو کی خوبیوں سے متعلق ایک بہت دلچسپ تعریف دیتا ہے جو اس طرح کی شراکتی تبدیلی کے سیاق و سباق میں ایک خاص معنی رکھتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کسی کاروباری شخص میں پائے جانے والی پہلی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ دینا جانتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ہنری فورڈ کی مثال پیش کی ہے جس نے گاہک بنانے کیلئے اپنی کاریں بہت کم قیمت پر پیش کی تھیں جسے مستقبل میں متوقع پھل کیلئے ایک عارضی قربانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسری خوبی، وہ بتاتا

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہے، عاجزی ہوتی ہے جس سے اس کی مراد یہ ہے کہ وہ 'اپنے کاروبار کے دھول مٹی اور گند کوڑے' میں بہت سا وقت صرف کر سکتا ہو۔ وہ سماعت کی خوبی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ کاروباری شخص کو 'اس قدر منکسر المزاج اور کائیاں ہونا چاہیے کہ جو اپنے نفس کی اس تکسیر کو برداشت کر سکے کہ جو دوسروں سے سیکھنے کے عمل میں پیش آتی ہے'۔ تیسری خوبی خود کو وقف کرنا ہے جس سے اس کی مراد ایسے لوگ ہیں کہ جو 'خود کو' اپنے وقت وقت کو، اپنی دولت اور اپنی نیند کو کسی کام پر لگا دیتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جو 'کسی نجات بخش تصور پر اپنے اعتقاد کی وجہ سے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں'۔

یہ بات کاروباری دنیا کے اکثر حضرات سے بہت بعید دکھائی دیتی ہے لیکن سماجی کاموں میں مشغول خدمت گاروں کی تعریف بہت خوب کرتی ہے۔ اگر ہم قیادت کی تعریف ایک ایسے ادارے کے طور پر کریں کہ جو معاشرے کو وہ کچھ دیتا ہے جس کی کہ اسے ضرورت ہوتی ہے نا کہ وہ کہ جس کی وہ مانگ یا توقع کرتا ہے تو اسے ہم قیادت کا آئیڈیل قرار دے سکتے ہیں۔

ایک ایسی فعال اور مشغول شہریت کے آئیڈیل کی جڑیں کہ جس کی توانائیاں معاشرے پر بھی اسی قدر صرف ہوتی ہیں جتنی کہ ریاست پر، بہت گہری ہیں۔ جیمز ہیرنگٹن اسے قدیم روم اور یونان کے ورثے کا بہترین جزو قرار دیتا ہے جن کی آزادیوں کو زوال ان وحشیوں کے راج کی وجہ سے آیا جنہوں نے اپنی 'حکومت کی بری خصلتوں، سے دنیا کے پورے چہرے کو مسخ کر دیا تھا۔(16) کاروبار حکومت میں لوگوں کی بہت زیادہ فعال شمولیت ہی ماضی کی آزادیوں کو بحال کر سکتی ہے اور مفاد عامہ اور اس کے ساتھ انفرادی آزادی صرف اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے کہ اگر ہر شخص اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں قوم کے سپرد کرنے کیلئے تیار ہو۔ اس کی کتاب میں گردشی دفتروں، روک ٹوک اور شہری شراکت کے یوٹوپیا کی بات کی گئی ہے جس کیلئے مصنف بڑے پر تخیل انداز سے کبھی کوئی تصور وینس سے لیتا ہے تو کبھی کوئی روایت ایتھنز کی۔ اس کی تہہ میں کارفرما آئیڈیل یہ تھا کہ 'آزادی خدمت کی ہی ایک شکل ہے کیونکہ عوامی خدمت کی بھینٹ کو شخصی آزادی برقرار رکھنے کی ایک ضروری شرط تصور کیا جاتا ہے'۔(17)

ریاستی خدمت کے آدرش کی طرح خدمت کا یہ آدرش بھی بلند آہنگ تقریروں سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

نہیں بلکہ عملی کاموں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی پرورش مقامی معاشرے، سڑکوں اور سکولوں اور عوامی مقامات کی روز مرہ حقیقتوں اور اس سوچ میں ہوتی ہے کہ چھوٹے موٹے جرائم کے مرتکب افراد کو سزا کیسے دی جائے۔ لوگ انہی مسئلوں سے نبرد آزما ہو کر ہی یہ سیکھتے ہیں کہ شہری اختیار کو کیسے نافذ کیا جائے اور انہی عملی کاموں کے توسط سے ہی لوگوں کے براہ راست مفادات قوم کی ارفع احتیاجات سے مربوط ہوتے ہیں (ولیم جیمز نے بھی ایک ایسی جمہوری سیاست کی بات کی تھی کہ جو اس چیز کو یقینی بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے کہ 'عام عادتیں عوامی زندگی کا حصہ بھی بن جائیں')۔ اور یہ عمل ہی ہے کہ جس کے طفیل مُصلحین ایسے پائلٹ بننے سے بچے رہتے ہیں کہ جنہیں یہ تو پتہ ہوتا ہے کہ جہاز اڑانا کیسے ہے لیکن جو یہ نہیں جانتے ہوتے کہ اسے اتارنا کیسے ہے (دے تکویل اپنی ایک تصنیف میں ایسے دانشوروں کی بات کرتا ہے کہ 'جن کے اور عمل کے درمیان تقریباً لامتناہی بعد ہوتا ہے' اور جو 'ادب کی ساری عادتیں سیاست میں' لے آتے ہیں۔ دی تکویل بھی یہاں اسی قسم کے خطرے کی بات کرتا دکھائی دیتا ہے)۔

فعال خدمت کے آدرش کا مطلب ہے ذمہ داری کا ایک قوی احساس۔ تحفظ، بہبود، انصاف اور سچائی کی ریاستی ذمہ داریوں میں شہریوں کو بھی حصہ بٹانا چاہیے اور یقیناً فوجوں میں کام کرنے، ٹیکس ادا کرنے، صدقہ خیرات کرنے، جیوریوں میں شریک ہونے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لئے تیار شہریوں کی شمولیت کے بغیر ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوا بھی نہیں جا سکتا۔

مشروط حقوق:

خدمت کے اس آدرش سے حقوق اور ذمہ داریوں کی نوعیت سے متعلق ایک بہت مختلف نظریہ اخذ ہوتا ہے۔ حقوق کے ضمن میں ہونے والی پیش رفت گذشتہ دو صدیوں کے دوران ہونے والی انسانی ترقی اور اس پیش رفت کی حوصلہ افزائی دونوں کا نتیجہ ہے۔ حقوق کی زبان نے ان نسبتاً زیادہ اشتمالی سودوں اور معاہدوں کی سرگذشت فراہم کی ہے کہ جنہیں معاشرے زندہ رہنے کیلئے طے کرتے چلے آئے ہیں۔ تاہم حقوق کا نظریہ اور مشق سے اس چیز کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ لوگوں اور تنظیموں کو کیا کرنا چاہیے۔ صرف حقوق کی بات کرتے

allurdupdfnovels.blogspot.com

رہنے سے جلد ہی منطقی عدم توازن کی صورت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ تمام حقوق لازمی طور پر ذمہ داریوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان کا براہ راست مطلب جیسا کہ بعض اوقات کہا جاتا ہے ذمہ داریاں نہیں بھی ہو سکتا مثلاً ایک صغیر سن بچے کے بہت سے حقوق ایسے ہوتے ہیں جو اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتے لیکن ان کا منطقی اعتبار سے دوسروں (مثلاً والدین، ریاستی ادارے اور اجنبی) پر عائد ذمہ داریوں سے تعلق ضرور ہوتا ہے کیونکہ اگر ان ذمہ داریوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو حقوق خالی خولوں میں تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ تصور کہ فعال خدمت کسی بھی آزاد معاشرے اور ایسی بات کیلئے کہ جس میں اخلاقی خوبی کی امنگ ہوتی ہے ایک ضروری بنیاد فراہم کرتی ہے شہریت اور حقوق سے متعلق ہمارے معاصر تصورات کیلئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ شہریت جس کیلئے دو سو سال سے زائد عرصے تک جنگ جاری رہی اور جو اب بیشتر دنیا میں عام ہو چکی ہے کسی بھی ایسے شخص کو جو کہ بعض مقررہ معیارات پر پورا اترتا ہو آپ ہی آپ حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ معیار بعض ملکوں میں حسب نسب اور زمین ہو سکتا ہے اور دیگر میں ولدیت اور محل وقوع۔ شہریت کے حقوق ملکی سرحدوں کے اندر تو ہمہ گیر ہوتے ہیں لیکن سرحدوں پر آ کر یکا یک معطل ہو جاتے ہیں۔ آپ کے حقوق کا انحصار اس بات پر نہیں ہوتا کہ آپ نے کیا کیا ہے، آپ کتنے اچھے یا برے ہیں یا آپ نے معاشرے کو کیا دیا ہے بلکہ یہ آپ ہی آپ حاصل ہو جاتے ہیں۔ شہریتی حقوق کے کسی بھی امتیاز کو رجعتی خیال کیا جاتا ہے (شاید ما سوائے قیدیوں کے حقوق کے) اور وہ حقوق کے فطری قانون کے نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر مساوی حقوق فطرت سے حاصل ہوتے ہیں تو ان کی تقسیم میں کسی قسم کا امتیاز برتنے کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔ بیشتر معاشروں کو اس مسئلے پر طویل اور تلخ لڑائیوں سے گزرنا پڑا ہے کہ کون شمار میں آتا ہے اور کیسے کجروی مثلاً خونی رشتہ داروں، اقرباء اور مہاجرین، عارضی کارکنوں اور طلباء کو کیا حقوق ملنے چاہئیں۔ تاہم یہ اصول کہ کسی بھی ایسے شخص کو جو کم از کم معیارات کی ایک معینہ سطح پر پورا اترتا ہو ملک کے اندر رکنیت کے مکمل حقوق ملنے چاہئیں اب عام ہو چکا ہے اور اسی طرح یہ مفروضہ بھی کہ ملک سے باہر کے کسی بھی شخص کو کوئی بھی ایسے حقوق نہیں دیئے جا سکتے۔

لیکن اگر ایک صحت مند معاشرے کا انحصار مستقل فعال مشغولیت پر ہوتا ہے تو یہ ایک

allurdupdfnovels.blogspot.com

کلاسیکی ساختی شکل پر منتج ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بے عمل افراد فعال افراد کے طفیلیے بن جاتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی محنت سے فائدہ اٹھانے لگتے ہیں جو انتخابات لڑتے ہیں، بورڈوں میں شمولیت اختیار کرتے ہیں یا حکومتی ناکامیوں اور کامرانیوں کی چھان پھٹک کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس میں کوئی حصہ نہیں ڈالتے۔ عدل کے ضمن میں طفیلیے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے لیے جیوری کے حق کا مطالبہ تو کرتے ہیں لیکن جب انہیں جیوری میں شریک ہونے کا کہا جاتا ہے تو وہ اس ذمہ داری سے بچنے کیلئے ہر حربہ استعمال کرنے پر تل جاتے ہیں۔ جنگ کے ضمن میں مفت خورے انہیں کہا جا سکتا ہے کہ جو پہلے تو جنگ کیلئے شور مچاتے ہیں لیکن جب انہیں یا ان کی اولاد کو جنگی خدمات پیش کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے ہیں۔ سیاست کے میدان کے مفت خورے وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں نہ تو یہ پرواہ ہوتی ہے کہ سیاسی جماعتیں کیا کر رہی ہیں اور نہ ہی وہ ووٹ ڈالنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں کہ جو پہلے کی نسبت بہت زیادہ مربوط ہو چکی ہے، جس میں ہجرت و نقل مکانی کی شرح بہت اوپر جا چکی ہے اور زیادہ آمدنی والے افراد میں تحرک بہت بڑھ چکا ہے، مفت خورے اور طفیلیے ایسے لوگ ہیں جو خوشحالی اور امن و امان سے بہرہ یاب تو ہوتے ہیں لیکن اپنے اردگرد کے معاشرے کے ساتھ ان میں کسی قسم کی وفا کا کوئی شعور نہیں ہوتا۔ ایسے افراد کا رویہ حصہ داروں کی بجائے کرایہ داروں یا مہمانوں کا سا ہوتا ہے۔

ماضی کے معاشرے لوگوں کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے پر مجبور کر کے ان مسائل کو حل کرتے رہے ہیں مثلاً زیادہ خطرے کے وقت جبری فوجی بھرتی کا حکم دے دیا جاتا تھا، لوگوں کو جیوری کی خدمات حکماً ادا کرنا پڑتی تھیں اور کوئی بیس ایک ملکوں میں جبری ووٹنگ کا رواج بھی رہا ہے۔ لیکن اس طرح کا جبر کسی آزاد معاشرے سے مطابقت نہیں رکھتا اور تخصصات کے رجحان کا مخالف ہے۔ لہٰذا یہ بڑی قدرتی سی بات ہے کہ ہم بعض خاص ذمہ داریاں ہر کس و ناکس کے سپرد کرنے کی بجائے صرف پیشہ ور سیاستدانوں، ججوں اور فوجیوں کو سونپتے ہیں۔

اگر ہمیں اس امر کا یقین ہو جائے کہ کافی مقدار میں شہری توانائی ہمیشہ دستیاب رہے گی تو ان میں سے کوئی چیز بھی مسئلہ نہیں رہتی لیکن ہوتا کیا ہے کہ بعض معاشروں میں بعض وقتوں پر یہ توانائی کم پڑ جاتی ہے۔ تسکین و شناخت کے ایک ذریعے کے طور پر شہری زندگی

allurdupdfnovels.blogspot.com

اور سیاست کی کشش میں کمی پیدا ہوسکتی ہے۔ البرٹ ہرشمان نے ایک مرتبہ مایوسی کے ان دوروں کی بات کی تھی جو معاشروں کو مفاہمت کی لہروں سے کاہلی کے زمانوں کی طرف دھکیل دیتے ہیں جب توانائیوں کا رخ اس کی بجائے نجی زندگی کی طرف ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے سماجی مسائل لوگوں میں پریشر گروپ بنانے اور عہدوں کیلئے کھڑا ہونے کی تحریک پیدا کرتے ہیں لیکن ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب انہیں مسائل کا کوئی حل نظر آتا محسوس نہیں ہوتا تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس پر لوگ اپنی ساری توجہ معاشرے سے ہٹا کر اپنے باغیچوں کی آرائش پر مبذول کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ انہیں ایک بار پھر یہ کھٹکنا شروع ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے اردگرد کی دنیا میں توازن قائم نہ ہوگا تو وہ بھی ایک مسرور وخوشحال زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ ہرشمان کی حکایت خود کو دہراتی ہے لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ دور اٹک بھی سکتے ہیں۔ اگر سماجی زندگی میں سرگرم معدودے چند لوگوں اور دیگر شہریوں کے درمیان مطابقت میں کمی پیدا ہو جائے تو (مثلاً برطانیہ میں مقامی کونسلروں کی اوسط عمر آج کل اٹھاون برس ہے) اس سے آگے سے آگے چلتا رہنے والا ایک منحوس چکر بھی شروع ہوسکتا ہے۔ ان افراد کے زیادہ انتہا پسند یا زیادہ خبطی ہونے کی صورت میں بھی لوگ اس سماجی زندگی سے متنفر ہو سکتے ہیں جس کا مقصد ان کی خدمت کرنا ہوتا ہے۔

جمہوریت کی ایک عقلیت پسندانہ، انفرادیت پسندانہ اور افادیت پسندانہ سرگزشت یہ ہے کہ اس کا مدار ایک تضاد پر ہوتا ہے۔ جمہوری طاقت کا مقصد ان مفادات کی نمائندگی کرنا ہوتا ہے جن کا اظہار حریف جماعتوں کے درمیان انتخابی مقابلے کے دوران ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ووٹنگ اور سیاسی سرگرمیاں بعض اعتبار سے بہت زیادہ غیر منطقی بھی ہوتی ہیں۔ یہ بہت کم ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کا ووٹ انتخابی نتائج پر کوئی قابل قدر اثرات مرتب کرے اور فوری الیکٹرانک ووٹنگ کے اس دور میں بھی ووٹر کو حریف جماعتوں کا موقف سمجھنے اور اپنی ترجیح کا اظہار کرنے پر جو محنت صرف کرنا پڑتی ہے وہ ووٹر کے اثر ورسوخ سے کوئی تناسب نہیں رکھتی۔ سیاسی سرگرمی اور عہدوں کیلئے کھڑا ہونا اختیار کے نفاذ کے ایک طریقے کے طور پر زیادہ عقلی محسوس ہوسکتا ہے لیکن پیراڈوکس یہی ہے کہ سیاسی سرگرمی صرف اسی صورت میں قابل عزت محسوس ہوتی ہے کہ جب اس کا مقصد سیاسی کارکن کے اپنے مفادات پورے کرنا نہ ہو۔ اس کے جائز یا ناجائز ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے تحفہ یا عطیہ سمجھا جائے،

allurdupdfnovels.blogspot.com

کاروبار نہیں۔

ووٹنگ کے بارے میں دستیاب تمام شواہد بتاتے ہیں کہ اکثر لوگ ووٹ ڈالنے اس لیے نہیں جاتے کہ وہ اسے مفادات پورے کرنے کا ایک عقلی اور افادی طریقہ سمجھتے ہیں۔ بعض انتہائی صورتوں کے سوا جہاں کہ انتخابات میں جوڑ بہت برابر کا ہوتا ہے، ووٹنگ کو صرف شناخت اور فرض اور شہری اور سیاسی نظام کے درمیان ایک تعلق کے ایک اظہار کے طور پر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک سیدھا سادہ ثبوت اعتماد کے بارے میں جمع کردہ اعداد و شمار سے ملتا ہے۔ حکومت پر اعتماد میں کمی کے ساتھ ووٹنگ کی شرح میں تقریباً اسی تناسب سے کمی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ نتیجہ اس چیز کے مکمل طور پر متضاد ہے جو آپ اس عقلی ماڈل سے توقع کرتے ہیں کہ جس کے مطابق عدم تسلی کو پہلے سے زیادہ فعالیت اور سرگرمی پیدا کرنی چاہیے۔ اسی طرح ووٹنگ کے ان حلقوں میں سب سے کم ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے کہ جن کے بارے میں توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ سرکاری اقدام سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے مثلاً غریب اور بے نوا طبقے۔[18] وہ چیز جسے پیئر بوردیو نے، 'معاشری طور پر پیدا کیا گیا کھلی جگہوں کا خوف' کہتا ہے بہت سے لوگوں کو اس بات پر مائل کر دیتا ہے کہ خود کو سماجی زندگی سے الگ کر لیں[19] اور آمدنی کی بڑھتی ہوئی ناہمواریوں کا کم ہوتی شہری مشغولیت (اور ووٹر ٹرن آؤٹ) نیز دباؤ، غصے، اوچھے پن اور بے وقری کے عام احساس سے بڑا مضبوط تعلق ہوتا ہے (اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کہ قتل اور دیگر پر تشدد جرائم کی بھی آمدنی کی اونچ نیچ سے بہت قریبی نسبت دیکھنے میں آتی ہے)۔[20]

چنانچہ رائج الوقت شہریت کا لبرل ماڈل کئی محاذوں پر ضرر پذیر ہو جاتا ہے۔ یہ اس چیز کی وضاحت نہیں کرتا کہ لوگ شہریوں کا کردار کیوں ادا کرتے ہیں، یہ ان تعہدات کو ہی نقصان پہنچا سکتا ہے کہ جن پر اس کا دارومدار ہوتا ہے، یہ مفت خوری کو شہہ دے سکتا ہے اور مفت خوری سے خفگی کی بنا پر سماجی سرگرمی معاشرے کی احتیاج سے نیچے گر سکتی ہے۔

شہریت کا اس سے ایک مختلف تصور اس بات کا بھی لحاظ کرے گا کہ شہری زندگی اور اچھی حکومت کا انحصار احترام اور پہچان کے ایک بنیادی معیار اور کچھ لینے اور کچھ دینے پر ہوتا ہے۔ کوئی معاشرہ بھی اپنے بہت سے ارکان کی فعال کومٹمنٹ کے بغیر پھل پھول نہیں سکتا خواہ وہ اس کا اظہار پیشہ وارانہ انداز میں کریں یا غیر پیشہ وارانہ طریقے سے۔ اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے شہریت سے متعلقہ حقوق زیادہ مشروط ہو جاتے ہیں۔ ایک بنیادی سطح کے شہریتی حقوق ہر اس شخص کو حاصل ہو جاتے ہیں جو قانون کی اطاعت کرنے اور ٹیکس ادا کرنے پر آمادہ ہوتا ہے لیکن اس سطح سے آگے مزید حقوق ان افراد کو ملتے ہیں جو اپنے معاشرے کیلئے زیادہ کام کرتے ہیں ...... مثلاً انتخابات میں ووٹ ڈال کر، جیوری کی خدمات ادا کر کے یا سماجی خدمت کیلئے وقت دے کر۔

صحت کے شعبے میں اس بارے میں بہت بحث چلتی رہی ہے کہ آیا علاج معالجے کے حقوق کسی طور ذمہ داریوں سے متعلق کیے جانے چاہئیں یا کہ نہیں یہ ذمہ داریاں اس چیز کو یقینی بنانے کی بھی ہو سکتی ہیں کہ بچوں کو چھوتی امراض کے خلاف ٹیکے لگ رہے ہیں اور علاج کے سلسلے میں ان افراد کو ترجیح دینے کے بارے میں بھی جو زیادہ صحت مندانہ طرز زندگی اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس بات کو مانتے ہیں کہ تعلیم کے شعبے میں بعض حقوق کا تعلق رویوں سے ہوتا ہے اور اس کا مطلب صرف یہ نہیں کہ ان بچوں کو زیادہ امداد فراہم کی جائے جو امتحانوں میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان اصولوں میں توسیع بھی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً مجرموں کو سزائیں دینے والے جج، منصوبہ جات کے بارے میں فیصلے کرنیوالے پینل اور کمپنیوں کے ادغام کی نگرانی کرنے والی کمیٹیاں سب اس بات کی جانچ پڑتال کر سکتی ہیں کہ کسی فرد یا ادارے نے اپنے معاشرے کے لئے کتنا کام کیا ہے۔

ان میں سے ہر مثال میں اس چیز کے تعین میں کہ شرائط کس قدر قانونی ہیں ساری اہمیت تفصیلات کی ہے۔ مشروطیت کے حق میں بہت زیادہ ناخوشگوار دلائل سامنے آتے ہیں اور ان کا نشانہ عموماً غریب طبقے بنتے رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے ایک عظیم سماجی و سیاسی مفکر بیٹرس ویب نے 1932ء کے رائل کمیشن برائے بیمہ بیروزگاری کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ وظائف بیروزگاری کو ایک ہیلتھ کورس میں مقررہ حاضری سے مشروط کیا جائے جس میں شرکاء کو مختلف طرح کی ورزشیں اور لیکچر دیئے جائیں۔ اس کے بعد کے نیولبرل دانشور اکثر اس سے بھی بہت آگے تک جاتے ہیں اور وظائف کی وصولی کو مفصل تعہدات سے مشروط کرنے کی تجویز دیتے ہیں۔ تاہم دیگر وہ مثالیں جن کا حوالہ دیا گیا ہے یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ذمہ داریوں کو لوگوں کی آزادیوں پر کوئی قدغن لگائے بغیر بھی اجاگر کیا جا سکتا ہے اور انہیں یہ گنجائش دی جا سکتی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ کم درجے کے حقوق و فرائض کا انتخاب بھی کر

allurdupdfnovels.blogspot.com

سکتے ہیں۔

مشروط شہریت کا تصور کوئی کلیۃً نئی چیز نہیں۔ بہت سے معاشرے نئے آنے والے افراد کو ان کی کافی طویل اقامت کے بعد شہریت کے مکمل حقوق تفویض کرتے ہیں۔ امریکہ میں امیریکور رضا کار پروگرام کیلئے کام کرنے والے کارکنوں کو اعلیٰ تعلیم کیلئے مالی امداد فراہم کی جاتی ہے اور متعدد معاشرے فوجیوں کو ان کی معاشرے کیلئے دی گئی قربانیوں کے صلے میں خصوصی مراعات سے نوازتے ہیں۔ تاہم یہ تصور کہ شہری حقوق آپ ہی آپ اور ہر کسی کو بلا تفریق ملنے چاہئیں ایک بنیادی اصول کے طور پر اپنی ایک بڑی مضبوط جگہ بنا چکا ہے اگرچہ یہ تصور کچھ دینے اور کچھ لینے کی اخلاقیات کے ایک زیادہ عام فہم تصور کے خلاف جاتا ہے۔

ریاست بطور انفراسٹرکچر

یہ دلیل بھی کہ اچھی حکومت کا دارومدار معاشرے کے مستقل کام اور معاشرے کے اندر خدمت پر ہوتا ہے اس سلسلے میں بہت بنیادی مضمرات کی حامل ہے کہ ریاست کی تنظیم کیسے ہونی چاہیے۔ معاصر ریاست کی بیشتر مشینری بنیادی طور پر جمہوری دور سے قبل کی ہے جو اس ریاست کے ساتھ اپنے تسلسل کی عکاسی کرتی ہے جو بادشاہوں اور شہنشاہوں کی سیوا کیا کرتی تھی (امریکہ کو تاہم اس سلسلے میں استثناء حاصل ہے کیونکہ یہ ملک اپنی قومی افسر شاہی تشکیل پانے سے قبل وجود میں آیا تھا)۔[21] وہ ریاست جس پر کہ لبرل، سوشل ڈیمو کریٹ اور کرسچین ڈیموکریٹ عناصر نے قبضہ جمایا اپنی نوعیت کے اعتبار سے جمہوری نہیں تھی بلکہ اسے احتساب کی بجائے حکم کے گرد تشکیل دیا گیا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہے۔ حاکمیت اوپری سرے پر مرتکز ہوتی ہے اور پھر یہ درجہ بندیوں کے توسط سے قوانین، ہدایات اور احکامات کی صورت نیچے کی طرف آتی ہے۔ ریاستی امور چلانے والے افسران دارالحکومت میں مرتکز اشرافی حلقوں سے عموماً بہت زیادہ شیر وشکر ہوتے ہیں۔ اس ریاست کے قلب میں تحفظ و سلامتی کے ذمہ دار افسران ایک ایسے کلچر میں کام کرتے ہیں جو خلقتاً اخفاء پر زور دیتا ہے اور سیاسی و سماجی سرگرمی اور بحث مباحثے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

یہ تنظیم کا وہ نمونہ نہیں ہے جو شدید عوامی شراکت سے بآسانی عہدہ برآ ہو سکتا ہے یا اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہ کسی بھی ملک میں لنکن کے لوگوں کی، لوگوں کے ذریعے اور لوگوں کیلئے حکومت کے تصور کے قریب نہیں آ سکا۔ اس کی بجائے ہمارے پاس وہ حکومت ہے جسے انتخابی حلقے منتخب کرتے ہیں، جو لوگوں کا احترام کرتی ہے اور مختلف درجات تک ان کی فلاح کیلئے کام کرتی ہے۔ پہلے والی صورتحال کے اعتبار سے یہ ایک بہت بڑی پیش رفت ہے لیکن اسے مکمل جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ ریاست کے حکم میں تو تبدیلی واقع ہوئی ہے لیکن خود ریاست میں نہیں۔ انیسویں صدی کا فرانسیسی انارکیت پسند پرودّاں عمر بھر جمہوریت کے اس بگاڑ کی مذمت کرتا رہا جس نے اس کے مطابق اسے مسخ کر کے محض اقتدار کیلئے رسہ کشی میں تبدیل کر دیا۔ اگر صورتحال کا جائزہ لیں تو اس کا موقف واقعی درست محسوس ہوتا ہے۔[22]

چنانچہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست کو مختلف طور پر منظّم کیسے کیا جا سکتا ہے اور اس میں جمہوریت کا فروغ کیسے ممکن ہے؟ اسے کس طور پر تشکیل دیا جائے کہ عوام بھی ریاست کے ساتھ اقتدار اور ذمہ داری اس طرح بٹانے لگیں جیسے کہ ایذو قدیم روم کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ اختیارات منتقل بھی کرتا تھا جبکہ اسے اپنے ہاتھ میں بھی رکھتا تھا؟

انیسویں اور اوائل بیسوی صدی کے بہت سے انقلابی اس قدیم تصور کی تائید کرتے رہے ہیں کہ ریاست کی اس طرح کی تشکیل نو صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے توڑ ہی دیا جائے۔ بڑا پیمانہ جمہوریت کا دشمن تھا جس طرح کہ اقتدار پر اجارہ داری اس کی دشمن تھی۔ چنانچہ کیا ہوا کہ لوکل کونسلوں اور کمیٹیوں، فیصلہ سازی کے عوامی فورموں، کمیونوں اور سوویتوں، شراکتی بجٹ سازی، شہریوں پر مشتمل جیوریوں اور اسمبلیوں اور ججوں کی بجائے عوام پر مشتمل عدالتوں کے تجربے شروع ہوئے جو آج بھی جاری ہیں۔ ان سب کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ ریاستی اقتدار پر صرف منتخب سیاستدانوں اور افسروں کی اجارہ داری نہ رہے بلکہ اسے مقامی سطح پر لایا جائے اور عوام اس میں ساجھے دار بنیں۔

ان سب تجربات کے پیچھے یہ تصور کارفرما تھا کہ ریاست اس وقت تک صحیح معنوں میں عوام کی خادم نہیں بن سکتی جب تک کہ ریاست اور عوام کے درمیان حائل پھاٹکوں کو ختم نہیں کر دیا جاتا۔ یہ درحقیقت چیخوف کے اسی تصور کی حقیقی شکل تھی جس میں وہ 'غلاموں کو

allurdupdfnovels.blogspot.com

اپنی صفوں سے قطرہ قطرہ نچوڑ باہر کرنے' کا کہتا ہے۔

انقلابی نمونے دنیا کو اس وحدتی اور ہموار ریاست سے ایک بہت مختلف قسم کی مثال دکھائی جس میں حاکمیت کو بڑی صفائی سے عوام کی مٹھیوں سے نکال کر ریاست کے ایوانوں تک پہنچا دیا جاتا تھا جہاں سے یہ پھر درجہ بندیوں کے توسط سے نیچے کی طرف عود کرتی تھی۔ ان نمونوں نے اس ممکنہ مستقبل کی نشاندہی کی جس میں ریاست اور عوام کے درمیان کی دیواروں کو چھیدا جا سکتا تھا اور جس میں لوگ اپنی اجتماعی آزادی کا بہت مختلف طریقوں سے استعمال کر سکتے تھے، کبھی سول سوسائٹی کے توسط اور کبھی ریاست کے ذریعے۔ لیکن یہ نمونے اپنی بہترین صورت میں ناہموار تھے اور بدترین صورت میں ژولیدہ اور سفاک۔ جمہوریت کی سب سے انقلابی شکلیں صرف ایک بہت مختصر دورانیے کیلئے ٹمٹما سکیں مثلاً پہلی عالمی جنگ کے بعد کے اور یا پھر 1968ء کے بعد کے انقلابی دور میں۔ یہ جمہورتیں ان سخت قسم کے فیصلوں کیلئے خصوصاً ناموزوں تھیں جو کسی ریاست کو لینے پڑتے ہیں، خصوصاً جنگ اور امن سے متعلق۔ ریاست کے ٹھنڈے اور کتابی طریقوں اور عوامی اجتماع کے بلند آہنگ تقریری کلچر کے درمیان بھی بہت زیادہ عدم مطابقت موجود تھی، مثلاً 1980ء کے عشرے میں لیکن لونگ سٹون کے گریٹر لنڈن کونسل کے شراکتی فورموں کے توسط سے ہزاروں افراد پہلی مرتبہ حکومتی کاروبار میں شریک ہوئے جن میں بہت سے افراد کا تعلق انتہائی بے نوا اور پسے ہوئے حلقوں سے بھی تھا۔ تاہم اس میں مسئلہ یہ پیش آیا کہ زیادہ حلق پھاڑنے والے افراد باقی سب پر چھا جاتے تھے اور زیادہ جذباتی حضرات کے آگے محتاط اور متذبذب افراد کی آواز دب کر رہ جاتی تھی۔ یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ کوئی گروہ جتنا بڑا ہوگا اس میں شامل کوئی رکن اس کے اقدامات کے بارے میں اور کسی کھلی زیادتی پر ردعمل ظاہر کرنے کے معاملے میں اسی قدر کم ذمہ داری محسوس کرے گا۔ اس میں یکسانیت یا آہستہ رو اور پراحتیاط حکمت عملیوں کی سعی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ طریقے جو لوگوں کو باہم اکٹھا کر رہے تھے اس دانائی کو سامنے لانے سے قاصر رہے جو اس ہجوم میں موجود تھی۔ بلکہ اکثر اوقات اس سے بالکل الٹ نتیجہ برآمد ہوا۔ اکثر اوقات یہ بھی محسوس ہوا کہ زیادہ سوچ بچار اور گفت وشنید اختلافات کو مزید ہوا دے رہی ہے اور لوگوں میں اس بات کا احساس بڑھ رہا ہے کہ ان کی دوسروں سے نااتفاقی کس قدر زیادہ ہے۔ ریاست میں شامل ان لوگوں کے سامنے کہ جو

allurdupdfnovels.blogspot.com

اسے صحیح معانی میں خادم بنانے کیلئے کوشاں تھے، وہی بات آئی جو قرنوں سے بہت سے خادموں کے سامنے آتی رہی ہے اور جو مغلوب الغضب اور دائماً شاکی مالکوں کی ڈانٹیں اور گھرکیاں ہمیشہ بھگتتے رہے ہیں۔

بہت مقامی سطح پر شراکت کے خطرات بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ اس سطح پر امکان یہ ہوتا ہے کہ بحث زیادہ عملی ہو گی۔ برازیل کے پورٹو الیگری سے لے کر برطانیہ کی انقلابی احیاء کی سکیموں تک مقامی شراکت کے سلسلے میں منظر عام پر آنے والی اختراعات نے جو کارکردگی دکھائی ہے وہ بڑے پیمانے کی انقلابی کونسلوں کی کارکردگی سے بہت اعلیٰ ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ مقامی کونسلوں کا سروکار زیادہ تر محلوں کی صفائی ستھرائی جیسے روکھے پھیکے کاموں سے رہتا ہے چنانچہ ان کے لچھے دار بیانات اور شعلہ بیان مقرروں کے نرغے میں آنے کا امکان کم ہوتا ہے۔

حالیہ برسوں میں اس بارے میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے کہ بڑے پیمانے کے مکالمے اور مذاکرات تعمیری کیسے ہو سکتے ہیں جن میں کہ ہر ایک کو اظہار رائے کا مناسب موقع ملے اور فیصلے واضح اور شفاف طریقوں سے عمل میں آئیں۔ امید ہے کہ ان طریقوں کا ارتقاء انٹرنیٹ اور اس کے بعد آنے والی چیزوں کی مدد سے جمہوریت کو بہت بدل کر رکھ دے گا جس سے بہت زیادہ لوگوں کو سوچ بچار اور گفت وشنید کا موقع ملے گا، دانا اور مفید ہونے کی شہرت کے حامل افراد کی آواز زیادہ دور تک پہنچے گی اور مباحثوں کو فیصلوں میں بدلنے میں مدد ملے گی۔ دوسرے لفظوں میں ان اقدامات سے پورے کے پورے معاشروں کو ان طریقوں پر سوچنے میں مدد ملے گی جو کسی حد تک انسانی دماغوں سے زیادہ مماثل ہیں۔ ان مذاکرات میں یہ بات بھی ہو گی کہ صرف بڑا رتبہ یا بڑا نام ہی حکمت و دانائی کا معیار نہیں رہے گا اور نہ ہی پیچیدہ مسائل کے حل کے ضمن میں ریفرنڈموں، الیکشنوں اور پولوں میں ملنے والی سادہ اکثریتوں کو مناسب طریقہ تصور کیا جائے گا۔ اس کی بجائے سب سے زیادہ کامیاب ان طریقوں کو تصور کیا جائے گا جو مباحثاتی استدلال، کھلی بات چیت اور آراء کے مجموعے کو اس طرح یکجا کرے کہ معاشرے کی پوری ذہانت کو بروئے کار لایا جا سکے ...... یہ وہ چیز ہے جسے کرنے میں انیسویں صدی کے سیاسی طریقے بہت بری طرح ناکام ہوئے۔[24]

allurdupdfnovels.blogspot.com

شہری تحریک کی ریپبلکن روایت کا ایک اور پہلو بھی ہے جو بحث سے متعلق کم اور عمل سے متعلق زیادہ ہے ۔ یہ اس امر سے بحث کرتا ہے کہ عوام اور ریاست مل کر تبدیلی کیسے حاصل کر سکتے ہیں اور ریاست اپنے وسیع تر مفہوم میں انفراسٹرکچر یعنی وہ آلات اور پلیٹ فارم کیسے مہیا کرسکتی ہے جس کے ساتھ لوگ اپنے معاشرے کا ناک نقشہ خود معین کرسکیں اور اپنے حل خود تراش سکیں۔

اقتصادی زندگی میں یہ تصور بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ بعض قدیم اور کچھ بیسویں صدی کی ریاستوں نے معیشت کی منصوبہ بندی کرنے اور اسے چلانے کی تفصیلاً کوشش کی لیکن بیشتر جدید ریاستیں اس کی بجائے اصول بنانے، قانون نافذ کرنے اور عوامی اشیاء فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ عوام اور نجی کاروبار خطرات مول لے سکے اور لین دین کر سکے۔ ریاست جو 'انفرا' سٹرکچر مہیا کرتی ہے وہ ان ڈھانچوں کو تقویت دیتے ہیں جو معاشرہ خود بناتا ہے اور منڈی کا غیر مرئی ہاتھ ان بہت سے اقدامات کو عام خوشحالی میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ یہ بات دوسرے شعبوں پر بھی ایسے ہی صادق آتی ہے۔ سوسائٹی کے اندر وہ قوانین اور مالی نظام جو نئی تنظیمیں قائم کرنا آسان بناتے ہیں خود تنظیمی کے جذبے کو فروغ دینے میں مدد دیتے ہیں خصوصاً اگر ریاست پیسے، مہارات اور مشاورت بھی مہیا کرے۔ تعلیم کے شعبے میں ریاست خود سکول فراہم کرسکتی ہے یا یہ قانون اور مالی معاونت، تربیت و رہنمائی کا ایک ایسا ماحول مہیا کرسکتی ہے جس سے لوگوں کیلئے اپنے سکول کھولنا آسان بنایا جا سکے جبکہ ریاست اوپر بیٹھی سرپرستی، معاونت اور نگرانی کے فرائض سرانجام دیتی رہے اور نصابی مواد اور داخلہ پالیسیوں کو کنٹرول کرتی رہے۔ اسی طرح ریاست مریضوں کے علاج کیلئے ہسپتال فراہم کرسکتی ہے یا یہ ایسے آلات بھی مہیا کرسکتی ہے جس سے لوگوں کیلئے اپنی صحت کی نگہداشت خود کرنا آسان ہو جائے۔ انفرادی زندگیوں پر بھی یہی اصول عائد ہوتا ہے ۔ آج کل بہت سی ریاستیں اسی بات کا دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ لوگوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کیلئے معاونت کرتی ہیں اور شہریوں کو ایسے آلات بہم پہنچاتی ہیں جس سے وہ اپنی زندگی خود چلاسکیں، اپنے کیریئر کی منصوبہ کرسکیں اور اپنے احساس امکان کو وسعت دے سکیں۔

سٹرکچرز کی بجائے انفراسٹرکچر فراہم کرنے سے خدمتی تعلق کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

اس سے یہ خدشہ کم ہو جاتا ہے کہ ریاست، اچھی نیت سے، فرد سے اخلاقی خود مختاری چھین کر اسے زیادہ محتاج بنا دے گی۔ لیکن یہ اس سے آگے بھی جاتی ہے۔ ریاستوں میں خدمت سے متعلق بیشتر حالیہ فکر نے نجی شعبے سے ماڈل مستعار لیے ہیں جس نے خود صنعتی مصنوع سازی کے رفتار، معیار، تسلسل اور قابلیت کو فروغ دینے والے نمونوں سے بہت زیادہ استفادہ کیا تھا۔ اس کے باوجود ریاست کی مہیا کردہ بہت سی خدمات صرف اس حد تک کام کرتی ہیں کہ فرد انہیں کام کرنے میں مدد دیتا ہے۔ کوئی بھی سکول اس وقت تک تعلیم فراہم نہیں کر سکتا جب تک کہ بچے سیکھنا نہ چاہیں اور والدین اس میں ان کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔ ڈاکٹر اپنے مریضوں کو صرف اسی صورت تندرست کر سکتے ہیں کہ اگر وہ اپنا خیال رکھنے پر آمادہ ہوں۔[25] یہ خدمات کسی خاص وقت پر کوئی خاص جنس مہیا کرنے والے موضوع سازی کے ماڈل سے بھی بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ اس کی بجائے یہ فنون سے زیادہ مشابہ ہیں جنہیں کمال کی جستجو میں حرکی تکرار (کلیۃً مماثل تکرار کے برعکس) اور غور و پرداخت اور اصلاح سے کومٹ منٹ کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی ایسے ڈھانچے میں آسان نہیں جس میں احکام اوپر سے نیچے کی طرف اور احتساب نیچے سے اوپر کی طرف چلتا ہو۔

خدمت کے صنعتی نمونے ایک اور وجہ سے بھی گمراہ کن ہیں۔ وہ امنگوں سے الٹ سمت میں اشارہ کرتے ہیں۔ بیشتر لوگوں کیلئے مثالی خدمت وہ ہوتی ہے جو امیروں کو حاصل خدمات سے قریب تر ہوتی ہے خواہ نجی ہسپتالوں کی خدمات کی بات کر لیں یا ان خدمات کا جو درزیوں، وکیلوں یا مالی مشیروں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ خدمات انسانی، بلا توسط، انفرادی اور میل جول والی ہوتی ہیں اور یہ صرف درپیش ضرورت کو ہی پورا نہیں کرتیں بلکہ ضرورت کی پیش دستی بھی کرتی ہیں اور 'ایک قدم آگے تک جاتی ہیں'۔[26] معالجاتی خدمات کے ضمن میں خادم کا کام آقا کو تبدیل کرنا، اسے زیادہ صحت مند، تندرست اور خوش و خرم بنانا ہوتا ہے۔ چنانچہ ریاستوں کیلئے حقیقی خدمت کا مطلب ہے مشترکہ پیداوار اور ذمہ داری کے معاملے میں ان خدمتی ماڈلوں پر دوبارہ گہری سوچ بچار کرنا جن میں چھوٹی سطح کے یونٹ بھی شامل ہو سکتے ہیں اور لوگوں کو صرف خود مختار بنانے کی بجائے انہیں بدلنے کی کومٹ منٹ بھی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

اس تصور کی جڑیں بہت قدیم زمانوں میں ملتی ہیں۔ کنفیوشسی روایت میں لوگوں کے بارے میں تصور یہ تھا کہ ان میں اخلاقی کمال حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور ایسی تعلیم اور مثال مہیا کرنا حکومت کی ایک بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کہ جس سے لوگوں میں صحیح اخلاق اور طرز حیات کی پرورش ہوسکے۔ ارسطو نے 'نکو ما کی اخلاقیات' میں ان طریقوں کا ذکر تفصیلاً کیا ہے جن سے ریاست ایک بہتر سماج کی تشکیل کیلئے انسانی نفسیات کے نرم حصوں پر کام کر کے ان کی صورت گری کر سکتی ہے۔ بعد میں جان سٹوارٹ مل نے بھی اسی رنگ میں بات کی ہے اور کہا ہے کہ حکومت کے معیار کا تعین کرنے والی سب سے اہم چیز اس کے شہریوں کا معیار ہوتا ہے چنانچہ حکومت کو شہری میں اچھے اوصاف اور ذہانت کو فروغ دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔[27]

تاہم مغربی حریت پسندی (لبرل ازم) اس تصور کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ ریاستوں کو فعال طور پر اپنے شہریوں کے رویے کی تراش خراش کرنی چاہیے خواہ اس کی نیت یہی ہو کہ شہری اپنی زندگیوں کے بارے میں زیادہ ذمہ داری لیں۔ زیادہ جدید حریت پسندی وژن کی بجائے طریقہ کار کو زیادہ اہم جانتی ہے۔ اس کے مطابق جو چیز عوامل کے اعتبار سے ٹھیک ہے اس کی اہمیت اس شے سے زیادہ ہے کہ جو نتائج کے اعتبار سے اچھی ہے۔ شہریوں کے شعور میں کسی قسم کی مداخلت سے یہ خدشات پیدا ہونے لگتے ہیں کہ ریاست ساز باز کر کے آزاد انسانوں کی برین واشنگ کر رہی ہے اور نفسیاتی علم کی صورت حال جس قدر بہتر ہو گی (چنانچہ مداخلت بھی زیادہ موثر ہو جائے گی) اس کے استعمال سے متعلق خدشات میں بھی اضافہ ہو گا۔ ہربٹ سپینسر نے ایک دفعہ پیش گوئی کی تھی کہ ریاست کا کردار بہت ہی کم ہو کر رہ جائے گا کیونکہ سماجی نظم و ضبط انسانی فطرت کو اس درجہ بدل دے گا اور یہ معاشرتی زندگی سے اس قدر مطابقت اختیار کر لے گی کہ اسے خارجی روک ٹوک کی ضرورت ہی نہیں رہے گی بلکہ یہ خود ہی اپنے ضبط میں آ جائے گی۔[28] جدید دور کے انسان کو سپینسر کی یہ بات آزادی کی تحریف محسوس ہوتی ہے۔

کسی بھی معاشرے کو داخلی اور خارجی ضبط کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے اور اسے اپنے ارکان کی کچھ نہ کچھ تراش خراش کرنا ہی پڑتی ہے۔ اگر ریاست کو شعوری اور شفاف طور پر یہ کرنے سے روک دیا جائے تو پھر دیگر ایسے طاقتور اداروں کے لئے

allurdupdfnovels.blogspot.com

میدان کھلا رہ جاتا ہے کہ جن کی جوابدہی شاید نہیں کی جاتی۔ ایسے اداروں میں ذرائع ابلاغ، مذاہب اور تشہیر کنندگان کا نام گنوایا جا سکتا ہے۔ عین اسی وجہ سے کہ ریاست کی تصورات اور اطلاعات پر اجارہ داری پر آج کل اس قدر جرح کی جاتی ہے، کسی فعال (activist) ریاست کا اب اتنا خوف نہیں رہا۔ بہرکیف بجائے اس کے کہ یہ بے ترتیبی سے ہو یہ بہتر ہے کہ اس بارے میں بات چیت اور مکالمے سے کام لیا جائے کہ معاشرہ کن اچھے خواص کو فروغ دینا چاہتا ہے اور کن برے اوصاف پر روک لگانا چاہتا ہے۔

انسانی صلاحیت وشعور کا ایسا ارادی ارتقاء ہو سکتا ہے کہ انتخاب وانفرادی آزادی کے کسی حامی کو بہت ناگوار گزرے لیکن اگر اچھی حکومت کا دارومدار حکمرانوں کی سیرت پر ہوتا ہے اور اگر جمہوریت میں حکمران عوام ہوتے ہیں تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشرتی ترقی کا دارومدار لوگوں کے آگہی وضبط کے اوصاف کے شعوری ارتقاء پر ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ لوگوں میں اچھی چیز کو فروغ دیا جانا چاہیے اور بری چیز کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے اور اچھا کیا ہے اور برا کیا اس بارے میں بہت زیادہ بحث مباحثے ہونے چاہئیں۔

بعض مثالیت پسندوں کے مطابق ایک مثالی اور فعال سول سوسائٹی سیاست کی جگہ لے سکتی ہے۔ ولیم مورس کی 'لا مکان کی خبریں' میں ایک کردار سیاست کے بارے میں پوچھتا ہے تو اسے جواب ملتا ہے کہ 'سیاست کے ضمن میں ہم بہت خوشحال ہیں ...... کیونکہ ہم میں سیاست نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں'۔ بہت سے لوگ ایک ایسی دنیا پر یقین رکھتے ہیں جس پر صرف اور صرف قوانین' انتظامیہ اور منڈیوں کی حکمرانی ہو۔ ان کا خیال ہے کہ یہ سیاست کی گنجلوں اور الجھاؤ کی نسبت کسی نہ کسی طور پر زیادہ عقلی ومنطقی ہیں۔ تاہم سیاست انسانوں کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ جیسے وہ ہیں اور اختلاف اور تنازعات کے تانے بانے پر استری پھیرنے کی تمام کوششوں کا ناکام ہونا لازم ہے۔ میں نے یہاں جو بات کی ہے وہ حکمرانی کے کسی ایسے اچھے نظام کی نہیں کی کہ جس کی ضمانت کامل اصول دیتے ہوں بلکہ حکمرانی کے ایسے اچھے نظام کی بات کی ہے جو کم نہیں بلکہ زیادہ سیاسی سماج میں متواتر کام اور مستقل تفریح پر چلتا ہے۔ جاندار اور طاقتور عوام کے بغیر بہترین سے بہترین جمہوری ریاست بھی جمود کا شکار ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہے کہ عوام صرف بخشیں اور مطالبات کرنے کے معاملے میں ہی فعال نہ ہوں بلکہ اپنے اردگرد کی دنیا کو تبدیل کرنے کیلئے بھی تن من اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

دھن سے کوشاں ہوں۔ یہ آدرش بہت قدیم زمانوں سے چلا آتا ہے۔ لاوزے لکھتا ہے کہ اچھا سربراہ وہ ہوتا ہے کہ جس کی لوگ تعریف کریں، برا سربراہ وہ ہوتا ہے جسے لوگ ناپسند کریں اور عظیم قائد وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں لوگ کہیں 'ہم نے یہ خود کیا ہے'۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 13

بے چینی پیدا کرنے والا علم بطور وسیلہ تجدید

''پوتر! تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ دنیا کو کتنی قلیل بصیرت اور علم سے چلایا جاتا ہے''۔

(منسوب بہ پوپ جولیس سوم)

1967ء میں امریکی وزیر دفاع رابرٹ میکنا مارا نے ویت نام جنگ پر جو اس وقت اپنے عروج پر تھی، ایک مفصل تحقیق کا حکم دیا تھا۔ وہ جنگ کے محرکات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ آیا امریکہ یہ لڑائی جیت سکتا ہے اور کیا اس کے پریس آفیسر ہلاکتوں کے بارے میں روزانہ جو اعداد و شمار جاری کرتے ہیں وہ صحیح ہوتے ہیں۔ اس پر افسروں اور تجزیہ نگاروں کی ٹیم نے ایک 47 جلدی رپورٹ پیش کی تھی جو بحیثیت مجموعی پوری کی پوری امریکی خارجہ پالیسی اور رویے پر انتہائی پر مذمت تنقید پر مشتمل تھی۔ اس میں امریکی رویوں کی اس قدر شدید مذمت کی گئی تھی کہ اس کی اشاعت کو روکنے کیلئے حکومت کو بہت زیادہ زور لگانا پڑا تھا۔

ان دستاویزات جنہیں کہ پینٹا گون پیپرز کا نام دیا گیا، کے منظر عام پر آنے سے اخبارات کے کردار پر بہت زبردست بحث چل نکلی تھی۔ حکومت کی حکم امتناعی کیلئے دائر کی گئی درخواست ایک جج گور کے سامنے پیش ہوئی جس نے حکومت کا دعویٰ مسترد کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ اہل حکم کو 'ایک جھگڑالو پریس' ایک ضدی پریس' ہر جگہ پہنچ جانے والا پریس' آزادی کی اعلیٰ اقدار کی خاطر برداشت کرنا پڑا۔ تاہم اس مقدمے میں صرف ذرائع

allurdupdfnovels.blogspot.com

ابلاغ کی آزادی کا ہی مسئلہ نہیں تھا۔ اس سے حکومتی علم کے اخلاقی کردار کے متعلق اہم سوالات بھی پیدا ہوئے۔ حکومتوں کو خوش انتظامی کیلئے خارجی تنقید اور جانچ پڑتال کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن انہیں شک وتنقید کے رواں تبصرے کے بغیر راز داری میں سوچنے اور بحث کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں داخلی شفافیت اور بحث مباحثہ کا ایک ایسا کلچر درکار ہوتا ہے جو آزاد اور غل غپاڑہ کرنے والے ذرائع ابلاغ سے موافقت نہیں رکھتا جن کی ہر وقت تاڑ یہ ہوتی ہے کہ اندر کی باتیں معلوم کر کے لوگوں کو بتایا جائے کہ حکومت میں دراڑیں پڑ چکی ہیں اور یہ بے یقینی کا شکار ہے۔

باب 4 میں یہ بات ہو چکی ہے کہ حکومتیں اپنے داخلی اوصاف کی وجہ سے اچھی نہیں ہوتیں بلکہ اس لیے اچھی ہوتی ہیں کہ ان کا ماحول انہیں اچھا بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ شفافیت انکا ماحول کیسے تبدیل کرتی ہے اور افسروں اور حکمرانوں کیلئے کرپشن اور خودغرضی کی راہ پر چلنا مشکل کیسے بناتی ہے۔ تاہم حکومت اور علم کا تعلق اس سے بہت دور تک جاتا ہے۔ حالیہ برسوں میں حکومت علم پر مبنی معاشروں کی طرف ایک وسیع تر منتقلی میں اس طرح پھنس کر رہ گئی ہے کہ جس سے ان کے اخلاقی ماحول کی مزید کایا کلپ ہوئی ہے۔ سچائی کی ذمہ داری، اتھارٹی کی اتھارٹی ریاستوں کے کنٹرول سے آگے گزر چکی ہے اور اب وہ اس میں اپنی ضروریات کے مطابق مزید تراش خراش نہیں کر سکتیں۔ لیکن جہاں یہ چیز دیکھنے میں آئی ہے بہت سی نئی مشکلات اور متبادلات بھی سامنے آنے لگے ہیں۔

سچائی کے متعدد راستے اور رواداری

پہلی بات تو یہ ہے کہ رواداری کا مظاہرہ کیسے کیا جائے۔ کوٹلیہ لکھتا ہے کہ 'حکمران جاسوسوں کے توسط سے دیکھتے ہیں جیسے کہ گائے بو کے توسط سے برہمن صحیفوں کے توسط سے اور باقی لوگ عام آنکھوں سے'۔ حکمران اپنے برتر علم اور اپنی گناہوں اور غلطیوں کو چھپا لینے کی استعداد کی بدولت اچھا برا جو چاہے کر سکتے تھے۔

ماضی کے حکمران یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کی سوچ بہت بلند ہے جس تک عام لوگوں کی رسائی ممکن نہیں لیکن بہترین شہرت کی حامل جدید حکومتیں خود تنقید کی دعوت دیتی

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہیں اور اس سے سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ انہیں یہ آگاہی ہو چکی ہے کہ سچائی کو صرف ایک ہی راستہ نہیں جاتا اور دانائی پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔

اس کا مطلب بے حد رواداری بھی نہیں۔ کسی آزاد معاشرے کی پہچان یہ نہیں ہوتی کہ وہ ہر طرح کے اقدامات کو برداشت کرتا چلا جاتا ہے کیونکہ ایسا کرنا ناممکن ہے (کوئی بھی جمہوریت لڑکیوں کے ختنے، بچوں میں منشیات کے استعمال اور کثیر ازدواجی کو برداشت نہیں کرتی)۔ اس کی بجائے اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ سچائی کی طرف جانے والے مختلف راستوں کو تسلیم کرتا ہے اور خود میں اس قدر چیلنج اور مباحثہ جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جو اسے اپنے ہی عقیدوں سے بچائے رکھے اور اس کے ساتھ سرکاری افسر اور مشیر بھی حاکموں کے سامنے سچ بولنے سے پرہیز نہیں کرتے۔(1)

ماضی کے اوراق پلٹیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یونان میں جمہوریت اور جذبات یعنی منطق اور بحث وتمحیص کی ان عقلی تکنیکوں کو ایک ساتھ عروج حاصل ہوا جنہیں برماندیس، افلاطون، سقراط اور ہیراقلیطس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ معاشرے علم دریافت کرنے کے اصولوں پر متفق ہو سکتے ہیں اور اسے عوام کے سامنے ان طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ جس سے سچائیوں اور جھوٹوں میں تمیز کرنا ممکن ہو سکے۔ فی الواقع استدلال کے مشترکہ طور پر مقبول طریقوں کے بغیر یہ دیکھنا ممکن نہیں ہوتا کہ کوئی جمہوریت کس طرح کام کر رہی ہے۔ ان کا یہ بھی موقف تھا کہ سچائی کشف سے نہیں ملتی، اس پر کسی خاص گروہ یا اشخاص کی اجارہ داری نہیں ہوتی اور یہ کہ علم متحرک ہوتا ہے نہ کہ جامد۔

اس سلسلے میں جمہوریت کو صنف حکومت اور سوچ دونوں طور پر دشمنوں سے لڑنا پڑا ہے۔ تحریری دستاویزات پر استوار مذاہب اور ریاستوں کے لئے رواداری کیلئے گنجائش پیدا کرنا اکثر و بیشتر ایک مشکل امر رہا ہے اور اگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ واحد مصدقہ سچائی ان کی ملکیت ہے تو اسے عقل بھی تسلیم کرتی ہے۔ مارکسیت اور لینن ازم کو اس قدر عدم رواداری کا سامنا بھی کرنا پڑا کہ ماؤ دور کے چین میں طلباء کو اس لیے جیل بھیج دیا جاتا تھا کہ وہ ماؤ کی تعلیمات سے توجہ ہٹا کر مارکس اور لینن کو اتنا زیادہ کیوں پڑھتے ہیں۔ بعض اشتمالی لیڈروں کے بیانات میں خلیفہ عمرؓ کی اس بات کی بازگشت سنی گئی جو انہوں نے سکندریہ کے کتب خانے کو تباہ کرنے کے بعد کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا اگر تو اس میں موجود کتابیں اللہ کی رضا

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے مطابق ہیں تو ان کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ہمارے پاس قرآن موجود ہے اور اگر یہ اللہ کی رضا کے مطابق نہیں ہیں تو پھر بھی ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ جدید دور میں آ کر مسلم نظریہ دان سید قطب نے وحدانیت کے تصور میں اور بھی بے لچک پن پیدا کر دیا اور ایک ایسی وحدانی ثقافت کے حق میں دلائل پیش کئے جس میں انہوں نے کسی شک یا بحث کی کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دی۔ انہوں نے کہا کہ دینی اور دینوی میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اگر خدا ہی واحد خدا ہے تو اسے بلا شک وشبہ ہر شے اور زندگی کا ہر اختیار حاصل ہے۔

عیسائیت بھی بار بار عدم رواداری کا مظاہرہ کرتی نظر آتی رہی ہے مثلاً امریکہ کے انجیلی مسیحیوں نے ایک بار مطالبہ کیا تھا کہ بچوں کو ایسی اخلاقی کتب پڑھنی چاہئیں جن میں بتایا جائے کہ ڈائنوسار اور رکاز خدا نے چند ہزار سال قبل تخلیق کئے تھے۔ بعض لوگوں نے تو اس کیلئے بھی تحریکیں چلائیں کہ عوام کی رہنمائی کیلئے لگائے گئے سائن بورڈوں سے یہ بات حذف کی جائے کہ گرینڈ کینین لاکھوں برس قبل وجود میں آئی تھیں۔ پھر اگر ایسے افراد جارج ڈبلیو بش کی اس تقریر پر تالیاں نہ بجاتے تو کیا کرتے کہ جس میں اس نے کہا تھا کہ مشرق وسطیٰ پر اس کی پالیسیوں کے سلسلے میں اسے اپنے ارضی باپ کی نسبت آسمانی باپ سے زیادہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

یکتائی اور جہان سے الگ دانائی کے ان سب دعوؤں کی جڑ مذہب ہے۔ لیکن اگر تاریخ کو سامنے رکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان دعوؤں کے ساتھ ساتھ نئی نئی بنی قبروں کی باس بھی آ رہی ہوتی ہے۔

عقلی تحمل و رواداری کی اگر کوئی بہترین مثال دیکھنی ہو تو وہ بھی ہمیں ایک مسلمان فرمانروا اکبر میں نظر آتی ہے۔ اس کا تعلق ایک ایسے دور (سولہویں صدی) سے ہے جب اس طرح کی بصیرت و فراست کا عیسائی بادشاہوں میں نام ونشان بھی بمشکل ملتا ہے۔ اکبر نے کہ جو ایک ایسے ہندوستان کا حکمران تھا جس کی اکثریت بھی ہندوؤں پر مشتمل تھی، یہ فرمان جاری کیا تھا کہ 'کسی بھی شخص کو اس کے مذہب کی بنا پر ہرگز نہ چھیڑا جائے اور کوئی بھی شخص جو چاہے مذہب اختیار کر سکتا ہے'۔ اس نے کہا تھا کہ ہم 'روایت کی دلدل' پر ہی سارا انحصار نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں رہنمائی کیلئے 'راہ عقل' کو استعمال میں لانا چاہیے۔ اکبر نے کہا کہ ریاست کو مذاہب کے درمیان غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس نے غیر

allurdupdfnovels.blogspot.com

مسلموں پر جزیہ ختم کر دیا اور دہریہ لوگوں کے بشمول ہندو فکر کے تمام مختلف مسلکوں سے کھلے عام مذاکرات کئے۔

اکبر نے اپنے مشیر ابوالفضل کی اعانت سے ایک غیر دینی اخلاقیات کا اجراء کیا اور 'صلح کل' کے اسلامی تصور میں ترمیم کر کے اسے ایک باطنی تصور سے ایک زیادہ عملی نظریے میں تبدیل کر دیا۔ یہ نیا تصور اس چیز کی وضاحت کرتا تھا کہ مختلف النوع گروہ آپس اکٹھے مل کر ہم آہنگی سے زندگی کیسے بسر کر سکتے ہیں۔ اس کی رو سے بادشاہت الوہی تھی اور حاکم اور رعایا کے درمیان ایک معاہدہ بھی۔ اس سلسلے میں ایک بہت بصیرت افروز حکایت بھی مشہور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اردگرد کے افراد کو رواداری کا مطلب سمجھانے کیلئے کیا تدابیر اختیار کی تھیں۔ ان دنوں ایک مسلم عالم نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہر بچہ جبلی طور پر مسلمان ہوتا ہے۔ اکبر نے فیصلہ کیا کہ اس بات کو پرکھا جانا چاہیے۔ چنانچہ بیس نوزائیدہ بچے لے کر انہیں ایک آیا کے سپرد کر دیا گیا اور یہ پابندی لگا دی گئی کہ اس کے علاوہ کوئی بھی شخص ان سے بات یا ملاقات نہیں کر سکتا۔ اکبر نے کہا کہ 'ہم دیکھیں گے کہ آیا یہ بچے کوئی ایسی آواز نکالتے ہیں کہ جس پر محمدؐ یا اکابرین اسلام میں سے کسی اور کے نام کا شائبہ پڑتا ہو۔ سال کے اختتام پر جب دیکھا گیا تو سب کے سب بچے گونگے ہو چکے تھے۔

جدید ذہن کو یہ مثال بہت سفاک محسوس ہوتی ہے لیکن اس نے رواداری کے محض ایک مجہول فہم کی بجائے ایک فعال سمجھ کی بات واضح کر دی اور تعصّبات، غلط فہمیوں اور عدم رواداری کے خلاف مسلسل جنگ میں مصروف حاکم اور ریاست کا ناک نقشہ فاش کر دیا۔

اچھی حکومت کی دوسری شرط یہ ہے کہ اسے خود کو کسی ایک سچائی تک محدود نہیں رکھنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ عقل و استدلال، جھوٹ اور سچائی میں امتیاز کے بعض طریقے مشترک بھی ہوتے ہیں۔ عہد روشن خیالی کے فلسفیوں کا بڑا اصول یہ تھا کہ جابر حکومت کی بنیاد لازماً جھوٹ اور عقیدہ پرستی پر ہوتی ہے اور آزاد حکومت کی بنیاد معروضی حقائق یعنی ایسے حقائق پر ہونی چاہیے کہ جو حکومت کے کنٹرول سے باہر ہوں۔ جابر حکومت کی یہ نشانی ہوتی ہے کہ وہ معروضی صداقت سے سیکھنے کی بجائے اپنی صداقت خود تخلیق کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

2002ء میں امریکی صدر بش کے ایک مشیر نے ایک صحافی ران سکنڈ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اس وقت 'ایک ایسے معاشرے میں بیٹھے ہیں کہ جسے ہم حقیقت پر مبنی معاشرہ کہتے ہیں' اور جو اس بات پر یقین کے حامل لوگوں پر مشتمل ہے کہ حل 'آشکارہ حقیقت کے دانشمندانہ مطالعۂ سے نکلتے ہیں۔ لیکن اس نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا 'یہ وہ طریقہ نہیں کہ جس پر آج کی دنیا چلتی ہے۔ اب ہم ایک سلطنت کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور جب ہم کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو ہم اپنی حقیقت خود پیدا کرتے ہیں۔ اور جب آپ اس حقیقت کا دانشمندانہ طریقے سے جائزہ لے رہے ہوں گے تو ہم پھر کوئی اقدام کریں گے اور نئے حقائق کو جنم دیں گے اور آپ اگر چاہیں تو ان کا بھی جائزہ لے سکتے ہیں'۔

حکومت کا سچائی سے تعلق اس سے زیادہ پیچیدہ ہے جتنا کہ روشن خیالی کا آدرش یا اس کا عکس تسلیم کرتا ہے۔ یہ اس مقناطیس کے اشیاء سے تعلق جیسا زیادہ ہوتا ہے جو کچھ اشیاء کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، کچھ میں بگاڑ پیدا کرتا ہے او دیگر کو دفع کرنے لگتا ہے۔ کارل مارکس نے اسے بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ حکومت مقولات کی صورت گری کیسے کرتی ہے اور عارضی انسانی تعلقات کو فطری حقائق اور ناقابل تغیر حقیقتوں کا روپ دے کر متبادلات کا تصور کرنا ناممکن کیسے بناتی ہے۔ چنانچہ منڈی کی معیشتوں میں جو چیز نجی کمپنیوں کو اپنی محنت فروخت کرتے افراد کے درمیان آزادانہ تبادلہ لگتی ہے اصل میں استحصال کا انتہائی غیر مساوی تعلق ہوتا ہے۔ [3] سیاست میں بھی حکومتی حقائق کچھ اس طرح کر کے پیش کیے جاتے ہیں کہ وہ فطری محسوس ہوں۔ جارج آرول کے ناول '1984' ء میں بھی یہی بات دکھائی گئی ہے۔ اس ناول میں 'نیوسپیک' نامی زبان اس لیے اختراع کی جاتی ہے کہ صرف خیالات کو بے نام اور لہٰذا ناقابل تصور کر کے پیش کیا جا سکے۔

یہ بات ان طریقوں سے آشکار ہوتی ہے جنہیں ریاستیں ناخوشگوار حقائق سے معاملہ کرتے وقت بروئے کار لاتی ہیں۔ معلومات جتنی فراواں آج کے دور میں ہیں اور ان تک رسائی اب جتنی آسانی سے ہو جاتی ہے اس سے قبل کبھی بھی سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا اور ایسے راز اور اندر کی باتیں تھوڑی ہوتی ہیں کہ جو جلد باہر نہیں آ جاتیں۔ لیکن اس سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ عوام لازماً بہت زیادہ باخبر ہوں گے مثلاً جارج بش کی حکومت امریکی شہریوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کو اس بات پر بڑی کامیابی سے قائل کر لیا تھا کہ نیو

allurdupdfnovels.blogspot.com

یارک پر نو گیارہ کے حملوں کے پیچھے عراق کا ہاتھ تھا۔ دیگر ریاستوں کی طرح امریکی حکومت مشکل تصورات پر پابندی تو عائد نہیں کر سکتی تھی چنانچہ اس نے سوچا کہ کیوں نہ انہیں نکرے لگا دیا جائے اور انہیں دبانے کی بجائے مرکزی دھاروں سے نکال باہر کر دیا جائے۔ اگر بہت سے لوگ حریف تصورات کی پرواہ نہیں کرتے یا انہیں ماننا نہیں چاہتے تو خواہ وہ اخبارات یا انٹرنیٹ پر عام دستیاب بھی ہوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اگر کسی معاشرے کا بڑا حصہ اپنی جدلیات ...... استدلال اور جھوٹ اور سچ میں تمیز کے اپنے طریقوں...... پر اصرار نہیں کرتا تو حکومت غالب آ سکتی ہے۔

شفاف اور بااخلاق ذرائع ابلاغ :

ایک مرتبہ بی بی سی ریڈیو نے برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کا ایک انٹرویو کیا جس میں اس کے بچپن کے بارے میں بھی بات ہوئی۔ دوسرے دن اخبارات میں جو خبر چھپی اس میں لکھا تھا کہ انٹرویو کے دوران ٹونی نے جیکی ولسن کو دیکھنے کا ذکر بہت خوشی خوشی سے کیا تھا جو کہ نیو کاسل یونائٹڈ فٹ بال کی جانب سے ان کے گراونڈ کے گیلو گیٹ اینڈ کی طرف سے کھیل رہا تھا۔ صحافیوں نے جلد ہی یہ بات پکڑ لی کہ اس وقت تک تو ولسن نیو کاسل کو ویسے ہی چھوڑ چکا تھا اور گیلو گیٹ اینڈ ابھی تعمیر ہی ہوا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے شخص پر جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنے آرام سے جھوٹ بول دیتا ہے، کسی اور معاملے کے بارے میں اعتماد کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ صحافیوں، سوانح نگاروں اور حزب مخالف کے سیاستدانوں نے اس بات کو بہت اچھالا اور جب یہ کتابوں کا حصہ بنی تو پھر کسی کو بھی یہ جاننے کی ضرورت باقی نہ رہی کہ آیا یہ درست ہے یا نہیں۔ پھر لوگوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ہر طرف بلیئر جھوٹا بلیئر جھوٹا ہونے لگی۔ اب سنئے بعد میں کیا ہوا۔ یہ ٹیپ اس انٹرویو کے آٹھ برس بعد کسی صحافی کے ہاتھ لگی اور بات یہ سامنے آئی کہ بلیئر نے تو درحقیقت اس طرح سے بات کی ہی نہیں تھی۔

یہ مثال بہت معمولی سی ہے لیکن یہ جدید ریاست کیلئے سچائی کی اہمیت کو بیان کرنے کیلئے کافی ہے۔ علم و معلومات سے مالا مال معاشروں کیلئے سچائی اشرف الاقدار کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ ہمارا روزمرہ زندگی ، کاروبار اور سیاست کے معاملے میں بالواسطہ خبر پر انحصار بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایک صدی قبل سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی تھی کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہمارے اردگرد کے لوگ کیا کہتے یا کرتے ہیں۔ لوگ روز مرہ زندگی بنیادی وسائل پر گزارتے تھے۔ آج یہ معلوم کرنے کیلئے کہ ہمیں کیا کھانا ہے، کون سا پیشہ اختیار کرنا ہے یا کسے ووٹ دینا ہے، ہم کتابوں، اخبارات، ویب سائٹوں اور ٹی وی پروگراموں سے رجوع کرتے ہیں۔

نتیجتاً یہ سوال کہ کس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور کس کے حقائق قابل بھروسہ ہیں بہت اہم ہو جاتا ہے اور صحافیوں اور سیاستدانوں، سرکاری ملازموں، غیر حکومتی تنظیموں اور سائنسدانوں کے درمیان ایک میدان جنگ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ریاستوں کو علم و صداقت کیلئے کچھ کرنے کی استعداد ثابت کرنے کیلئے بڑی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ ان کی حقیقتیں عموماً مشکوک ہوتی ہیں۔ زیادہ اکھڑ جھوٹ بولنے والوں کا جلد ہی پتہ چل جاتا ہے۔ ذہین لوگوں کو یہ چالاکیاں آجاتی ہیں کہ کیا اور کب کچھ کہنا ہے اور سچائی کے معاملے میں ڈنڈی کیسے مارنی ہے۔

لبرل سیاسی نظریے میں آزاد ذرائع ابلاغ کو اس چیز کی بہترین ضمانت خیال کیا جاتا ہے کہ آخر میں سچائی ہی غالب رہے گی۔

دنیا کے بہت سے حصوں میں صحافی جبر اور جھوٹ کے خلاف جنگ میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتے ہیں مثلاً یوکرائن میں جہاں صدر کچمہ کے ایک محافظ مائیکولا میلنی چینکو پر ایک اہم صحافی گانگازے کے قتل کا منصوبہ تیار کرنے کا الزام لگا تھا یا بنگلہ دیش میں جہاں انفرادی جرأت کی علامت بن جانے والے صحافی سومی خان جسے دہشت گردی میں ملوث ملک کی بعض بڑی شخصیات کے چہروں کو بے نقاب کرنے کی پاداش میں متعدد دفعہ زدوکوب کیا گیا اور چھریاں ماری گئیں۔ سچائی تک پہنچنے کی جدوجہد میں مصروف آزاد ذرائع ابلاغ کا تصور اب بھی معتبر حیثیت رکھتا ہے۔ ترقی یافتہ جمہوریتوں میں بھی نجی اور سرکاری ذرائع ابلاغ ہی وہ ادارے ہیں جو ان وسائل سے لیس ہیں جو حکومتی بد اعمالیوں کی تحقیق کیلئے درکار ہوتے ہیں۔ بی بی سی، نیو یارک ٹائمز، ڈی سائیٹ یا لے موند جیسے اداروں کو اب صحافت سے منسوب کیا جانے لگا ہے اور منڈی کی قوتیں یقیناً سچائی کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ جب وہ کوئی بہت ہی بڑی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھیں تو ایک نکمی سی معذرت بھی فوراً ہی سامنے آجاتی ہے۔ یہ انہی کی بدولت ہے کہ حکمرانوں کی کارستانیوں کے بارے میں مستند اور بے

allurdupdfnovels.blogspot.com

لاگ تخمینوں کے متلاشی افراد کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا۔ وہ خبریں اور تجزیے جو پہلے صرف تعلقات والے امراء اور شرفاء کو ملتے تھے اب عام دستیاب ہونے لگے ہیں۔

تاہم اگر آزاد ذرائع ابلاغ کے بغیر جمہوریت ممکن نہیں ہوتی، اس سے براہ راست یہ مطلب نہیں نکلتا کہ جہاں ذرائع ابلاغ آزاد ہوں گے حکمرانوں کو بھی صحیح طور پر آنکا اور جانچا جائے گا۔ جب فرانسیسی انقلاب کے بعد آزادی تقریر کو رواج ملا تھا تو اس کے نتیجے میں کوئی یہ نہیں ہوا تھا کہ بہت سنجیدہ جانچ اور پرکھ پھوٹ پڑی تھی بلکہ وہ نتیجہ برآمد ہوا تھا جسے مورخ سائمن چامہ نے 'نزاعی بے ضبطی' کا نام دیا ہے جس میں پہلے بادشاہ قتل ہوا اور پھر اس دور کی ابتداء ہوئی جسے عہد دہشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[4] اس سے آگے اگر جدید دور تک چلے آئیں تو اس میں بھی ذرائع ابلاغ شاید بے باک تفتیش کیلئے تو اتنے موافق ثابت نہیں ہوئے جتنے کہ یہ تعصب یا غصہ نکالنے کیلئے ہوئے ہیں۔ یہ چیز ایک حد تک تو ذرائع ابلاغ کی منڈیوں کی نوعیت کی عکاسی کرتی ہے۔ بعض اوقات تو یہ درستی اور سچائی کا اچھا صلہ دیتی ہیں لیکن اگر معلومات کے ساتھ تفریح بھی شامل ہو جائے اور اگر صداقت صارفین کیلئے کوئی اتنی بڑی ترجیح نہ رہے تو پھر ذرائع ابلاغ بڑی آسانی سے سنسنی خیزی اور مالکان کے تعصّبات کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔

اگر قارئین اور ناظرین کے پاس اس چیز کے بارے میں آزادانہ معلومات کی کمی ہوتی ہے کہ آیا کوئی اخبار یا چینل سچ بات کہتا ہے یا نہیں تو ان سے کسی معقول فیصلے کی امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کس پر یقین کریں اور کس پر نہ کریں۔ اور اگر انٹرنیٹ کی بات کریں تو وہ اس سے بھی زیادہ مشکل مسئلہ ہے۔ انٹرنیٹ پر حقائق اور ذرائع کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ پڑھنے والا ویسے ہی بوکھلا کر رہ جاتا ہے (اور صحت کے مسئلے پر بعض حالیہ مطالعات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اگر لوگ ویب پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے عزیز و اقارب پر انحصار کریں تو ان کے باخبر ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں)

حکومتی ڈھانچے صرف اس صورت میں اچھے رویوں کے فروغ کیلئے کام کرتے ہیں کہ اگر وہ ان میں کام کرنے والے افراد کی اخلاقیات سے مطابقت رکھتے ہوں اور یہی بات ایک دوسرے کے حریف ذرائع ابلاغ پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر منڈی سے منسلک پیشہ ور افراد میں سچائی کی تلاش کے کسی مضبوط اخلاقی رویے کا فقدان ہو تو منڈی کے نقائص

allurdupdfnovels.blogspot.com

اور بھی زیادہ ہو جاتے ہیں بالکل ایسے ہی کہ جیسے سیاستدانوں اور افسروں میں خدمت کے کسی مضبوط اخلاقی رویے کے نہ ہونے سے سیاسی نقائص دو چند ہو جاتے ہیں۔ تاہم دیکھا یہ گیا ہے کہ بہت سے اخبارات، رسائل اور ٹی وی یا ریڈیو پر کام کرنے والوں کو اس بات کی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ آیا وہ جو نشر کر رہے ہیں یا چھاپ رہے ہیں وہ سچ ہے یا غلط۔ گندی حکومتوں کی طرح ان کا نظریہ بھی یہی ہوتا ہے کہ حقیقت کی ترجمانی نہیں کی جاتی بلکہ اسے تخلیق کیا جاتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی تیسرے فریق کی اتھارٹی کو تسلیم کرتے ہیں جو انہیں بتائے کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ٹھیک ہے یا کہ غلط۔

بعض ذرائع ابلاغ جس طرح کام کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ لوگوں کے اپنے گردو پیش کی دنیا کے بارے میں تناظر میں ایک بڑے باقاعدہ انداز سے بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ڈیرک باک کے اخذ کردہ اعدادوشمار کے مطابق 1996ء میں نصف امریکی شہریوں کا خیال تھا کہ گذشتہ پانچ برسوں میں امریکہ میں ملازمتوں کی مقدار میں کمی واقع ہوئی ہے، 80 فیصد کا خیال تھا کہ مہنگائی میں کوئی کمی نہیں ہوئی، 60 فیصد کا کہنا تھا کہ بیروزگاری میں یا تو اضافہ ہوا ہے اور یا یہ ویسے کی ویسی ہے، 60 فیصد کا خیال تھا کہ وفاقی بجٹ کے خسارے میں مزید اضافہ ہوا ہے، اور ایک اکثریت کا یہ کہنا تھا کہ فضائی آلودگی بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ سب کے سب خیالات غلط تھے۔[5]

حال ہی کی بات ہے کہ ایک برطانوی ادارے موری نے لوگوں کے اپنے سماج کے بارے میں خیالات جاننے کیلئے سروے کیا جس کے نتیجے میں پتہ چلا کہ عوام نقل مکانی، یورپ اور جرائم جیسے مسئلوں پر بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہیں اور جب لوگوں کو اصل حقائق بتائے جاتے ہیں تو اکثر ان کے رویے تبدیل بھی ہو جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی حرکیات کے ضمن میں غلط خبر رسانی کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے۔[6]

ہر طرف چھائی جذباتیت کے عالم میں جذباتیت سیاستدانوں کو فائدہ دیتی ہے جبکہ سنجیدہ دیانتداری سے الٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔[7] عوام کی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی ہے کہ وہ ہیرالڈ ایونز (ایک انتہائی معتبر ایڈیٹر جس کا امریکہ اور برطانیہ دونوں ملکوں میں بڑا اثر ہے) کی اس نصیحت پر عمل کریں کہ جو اس نے اپنے صحافیوں کو کی تھی۔ اس نے انہیں متنبہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرتے ہوئے کہا تھا کہ سیاستدانوں کی باتیں سنتے وقت آپ کو ہمیشہ یہ سوچنا چاہیے کہ 'یہ حرامی مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟' آئی ایف سٹون بھی اسی طرح کی بات کرتا ہے: 'حکومتیں جھوٹ بولتی ہیں'۔

ذرائع ابلاغ میں سچ بولنے کی اس مضبوط اخلاقیات کے ساتھ اس طرح کی تشکیک سیاست کی بہترین چیزوں کی مزید حوصلہ افزائی کر سکتی ہے۔ لیکن اس طرح کی کسی اخلاقیات کے بغیر یہ رویہ صرف قنوطیت کو پروان چڑھا سکتا ہے اور کسی بھی سچائی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ صحافی جو پہلے سیاستدانوں کی طرف سے کھانے کھاتے تھے اب سیاستدانوں کے کھانے کھانے لگے ہیں اور اپنا قدبت بڑھانے کیلئے انہیں بیساکھیوں کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں۔ اینتھنی سمپسن جو کہ جدید برطانوی سیاست کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں باقاعدہ رپورٹ مرتب کرتا رہا ہے کہتا ہے کہ 1960ء کے اوائل میں شائع ہونے والے اس کے پہلے شمارے اور 2004ء میں شائع ہونے والے آخری شمارے میں سب سے بڑی تبدیلی یہ تھی کہ اخباروں اور ٹی وی چینلوں کے مالک نئی اشرافیہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جو سیاستدانوں بڑے تاجروں اور امراء سے خراج کی توقع کرتے ہیں بلکہ وصول بھی کرتے ہیں، اکثر اشرافیہ حلقوں کی طرح جب ذرائع ابلاغ کے وڈیروں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی جوابدہی ہونی چاہیے یا کہ آپ کو اخلاقی معیارات کا پاس کرنا چاہیے تو انہیں بھی یہ بات بہت ناگوار گزرتی ہے۔ اطلاعات و معلومات کے گرد گردش کرنے والے معاشرے کے مرکزے میں موجود یہ اخلاقی خسارہ تجارتی ابلاغیات کے حجم میں بے انتہا اضافے سے پیدا ہونے والے وقت اور توجہ کے مقابلے سے اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ سیاسی ابلاغیات کی طرح تجارتی ابلاغیات بھی بالواسطہ اس تصور کو فروغ دیتی ہے کہ سچائیاں و چائیاں کچھ بھی نہیں ہوتیں، صرف حربے اور حکمت عملیاں ہوتی ہیں اور دعوے ہوتے ہیں (یہ وہ نظریہ ہے جس نے ابلاغیات کے تدریسی مطالعے کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے)۔

عوام کو بہتر خبروں اور حقائق کی ہی ضرورت نہیں ہوتی۔ جان سٹوارٹ مل نے ٹھیک کہا تھا کہ 'ان کے مفہوم کو منکشف کرنے والے تبصرے کے بغیر بہت کم حقائق ایسے ہوتے ہیں کہ جو اپنا ماجرا بیان کر سکیں'۔ نہ ہی ہم سیدھے سادھے معروضی حقائق پر مشتمل کسی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تاہم ہماری اداروں (حکومتوں اور ذرائع ابلاغ) سے خواہش یہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہونی چاہیے کہ وہ سچائی و معروضیت کی تلاش کو بہت زیادہ قدر و قیمت دیں چاہے یہ آدرش پورے طور پر کبھی بھی حاصل نہ ہوسکتا ہواور ہماری ان سے یہ خواہش ہونی چاہیے کہ وہ اپنی جانچ اور اندازوں کو بہت ناپ تول کر پیش کریں کیونکہ اگر لوگ ہر سیاستدان کو بدمعاش سمجھنے لگے تو ممکنہ بدمعاشوں کے پاس اس کی کوئی بھی وجہ باقی نہیں رہ جائے گی کہ وہ خود کو لگام دیں۔[8]

کچھ حل ایسے بھی ہیں جن کی معاشرے جمہوریت کو کارگر بنانے میں ذرائع ابلاغ کے اہم کردار کو سمجھنے کے بعد جستجو کرتے رہے ہیں۔ ایک حل یہ ہے کہ اخبارات اورالیکٹرانی ذرائع خبر رسانی کو تقویت و تحفظ بہم پہنچایا جائے، انہیں ریاست اور منڈی دونوں سے محفوظ بنایا جائے اور اس چیز کو یقینی بنایا جائے کہ ان کے پاس تلاش حقیقت کی مضبوط اخلاقیات اور توجہ کے مسابقے کیلئے کافی وسائل موجود ہوں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ خود ذرائع ابلاغ پر معتبری کے اصولوں کا اطلاق کیا جائے تا کہ انہیں درستی جیسے معیارات پر سر عام پرکھا جا سکے۔ یہ حکومتوں کے کرنے کا کام نہیں لیکن معیارات کو یقینی بنانے میں سول سوسائٹی اور یونیورسٹیاں بہت زیادہ فعال کردار ادا کر سکتی ہیں۔ وہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی تحقیق کر سکتی ہیں اور صحافیوں اور ذرائع ابلاغ کو درستی وسچائی کی ایک مضبوط اخلاقیات کا پابند کر سکتی ہیں۔[9]

ریاستوں کا انحصار علم پر

ذرائع ابلاغ کو بہت وقعت حاصل ہے کیونکہ وہ اس ماحول کا بہت اہم جزو ہوتے ہیں کہ جس میں حکومتیں کام کرتی ہیں۔لیکن ان کی اہمیت اور پیمانہ ہی صرف وہ واحد طریقہ نہیں ہے کہ جس سے حکومتوں کا ماحول تبدیل ہوا ہے۔ سیاست کے اخلاقی کردار کے معاملے میں حکومتوں کے علم پر بڑھتے ہوئے انحصار کی بھی اتنی ہی اہمیت رہی ہے ۔شیلی نے کہا تھا کہ شاعر دنیا کے ایسے قانون ساز ہوتے ہیں کہ جنہیں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس نے یہ بات عین اس لمحے پر کہی تھی جب سائنسدانوں اور انجینئروں نے اس بات کا اس سے کہیں زیادہ شد و مد سے دعویٰ کرنا شروع کر دیا تھا۔ آج کے دور میں کوئی بھی معاشرہ علم کے وافر مراکز کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ان مراکز سے مراد ہے کیمیا وطبعیات پر تحقیق کرنے والے سائنسدان، صارفی رویے اور نئے مادوں پر تحقیق کرنے والے کاروباری ادارے ، نئی

allurdupdfnovels.blogspot.com

احتیاجات کی کھوج کرنے والی رضا کار تنظیمیں اور فن تعمیر اور علاج معالجے کے نئے طریقوں کی جستجو کرنے والے ماہرین۔

ماضی کی بعض ریاستیں اس نوع کے نتائجیتی علم کو وقعت دیتی رہی ہیں۔ فرانسس بیکن کی علم اور عقل پر استوار ریاست کی حمایت کی جھلک ہمیں اٹھارہویں صدی کے شہادتی تحقیق کے ان چینی تصورات میں بھی ملتی ہے جنہوں نے ایسے اخلاقی اصولوں کو ہدف تنقید بنایا کہ جن کی تجربی تصدیق ممکن نہیں ہوتی۔[10] تاہم علم کے ذرائع کی اہمیت حالیہ دور میں آ کر بہت زیادہ آشکارہ ہوئی ہے اور پیشوں، کاروباری اداروں اور شہری تنظیموں سے اسے اور زیادہ تقویت ملی ہے۔ وہ جدلیاتی و منطقی استدلال جسے کہ یونانی حکمت کا دل خیال کیا جاتا ہے اب جدید ریاست میں بہت حد تک نفوذ کر چکا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب جدید حکومت کے دیگر بڑے عہدوں میں چیف سائنسدان ، چیف میڈیکل آفیسر، چیف اکانومسٹ اور شماریاتی چیف کا عہدہ بھی شامل ہونے لگا ہے۔ عموماً وہ حکومت کے اندر بھی اپنے پیشوں کی اتنی ہی نمائندگی کرتے ہیں جتنی کہ اس سے باہر اور وہ خود کو پیشہ وارانہ اخلاقیات نیز علم کا پاسبان تصور کرتے ہیں۔ وہ طاقتور اس لیے ہوتے ہیں کہ ایک جدید جمہوریت کا مسلسل پیداوار اور علم و معلومات کی پیہم اشاعت کے بغیر چلنا محال ہوتا ہے اور اس میں سافٹ ویئر اور نئے مادوں سے لے کر نرخوں اور رائے عامہ تک کی سب معلومات آ جاتی ہیں۔ مخصوص مفادات کو خوش کرنے کیلئے تیار کی گئی غلط معلومات سے کسی کو بھی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد معاشرے اکثر و بیشتر تجارتی میڈیا کو آزاد کرنے سے ابتدا کرتے ہیں کیونکہ تجزیہ و معلومات کے درست اور تنقیدی بہاؤ کے بغیر منڈیوں کا چلنا محال ہوتا ہے۔ یہ تجزیے ہی ہمیں بتاتے ہیں آیا کس کمپنی کے حصص کی قدر ان کی حقیقت سے اوپر جا پہنچی ہے، آیا اس کے ناظمین نا اہل ہیں یا اس کی نئی مصنوعات فضول ہیں۔

جواز کا دارو مدار سائنسی استدلال کے ایک مہین خط پر ہوتا ہے اور اس انحصار میں اضافہ بھی مشاہدے میں آ رہا ہے۔ جب 2001ء میں حکومت برطانیہ کو کھر اور منہ کی وبا کا سامنا کرنا پڑا تھا تو اس کی ساکھ کا سارا دارومدار اس بات پر آ گیا تھا کہ آیا وہ اس قابل ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا کوئی معقول تجزیہ پیش کر سکے اور یہ بتا سکے کہ یہ مرض کس رفتار

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے پھیلے گا۔ حکومت کو اس کی روک تھام کیلئے ایک قابل اعتبار منصوبے کی بھی ضرورت تھی۔ اسے برطانوی وزراء کی خوش نصیبی سمجھئے کہ اس وقت کے چیف سائنسدان کو ساری بات سمجھ میں آ گئی جس سے ان سب کی بچت ہوگئی۔ اس نے ایک ایسا ماڈل تیار کیا کہ جس سے اس وباء کی ممکنہ چال کے بارے میں قبل از وقت بتانا ممکن ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس پر قابو کیسے پایا جا سکتا ہے۔[11] 2004ء میں سارس کی وبا پھوٹنے پر چینی حکومت کو بھی اسی طرح کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شروع میں انکار کا رویہ اختیار کیا گیا لیکن سرکاری پالیسی چلانے والے سائنسدان پر جلد ہی یہ بات عیاں ہوگئی کہ اقرار (مسئلے کا اقرار اور اس بات کا کہ اس پر قابو پانے کیلئے کیا کیا جا رہا ہے) کی بجائے انکار کا رویہ زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

کینز کی یہ بات بہت مشہور ہوئی تھی کہ حکومت آگاہی سے زیادہ اور کسی چیز کو ناپسند نہیں کرتی کیونکہ یہ فیصلہ سازی کے عمل کو بہت زیادہ پیچیدہ اور مشکل بنا دیتی ہے، لیکن بہت سی صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں حکومتوں کا آگاہی کے بغیر گزارہ مشکل ہو جاتا ہے۔ لاعلمی سے بہت زیادہ خرچہ بھی اٹھ سکتا ہے خصوصاً جب عوام یا دنیا والے دیکھ بھی رہے ہوں۔ چنانچہ مثال کے طور پر اگر طبی نگہداشت کیلئے ٹھوس شواہد کو بنیاد نہیں بنایا جاتا اور یہ آزاد تجربے، ثبوت اور بحث کے بغیر عمل میں آتی ہے تو لازمی بات ہے کہ یہ اس قدر موثر نہیں رہے گی اور اس کا سیاسی فائدہ بھی زیادہ نہیں ہو گا اور وہ ملک جہاں حکومتوں نے طبی علوم پر نظریاتی موقف اختیار کیا وہاں کے عوام کو اس کی بڑی مہنگی قیمت چکانا پڑی۔ صدر ٹابوامبیکی کی ایڈز اور ایچ آئی وی کی باہمی نسبت کے بارے میں تشکیک کی وجہ سے جنوبی افریقہ کے بہت سے شہریوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے جس طرح کہ نصف صدی قبل سوویت یونین میں ہوا تھا جہاں ترامنیم لیسینکو کے زرعی سائنس پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے لاکھوں افراد بھوک سے مرنا شروع ہو گئے تھے۔

وہ نظام جو علم تیار کرتے ہیں اور اس کی اشاعت کرتے ہیں ان تدابیر اور اقدار کے محتاج ہوتے ہیں جنہیں ریاستیں متاثر تو کر سکتی ہیں کنٹرول نہیں کر سکتیں۔ ان میں برسوں مل کر سچائی کیلئے جستجو کرتے رہنے والے ساتھیوں کی باہمی تنقیدیں اور تبصرے، تفتیش و تنقید کو وقعت دینا، جدت و تجربہ، صرف افادیت کی بجائے عمق و فراست کو اہمیت دینے والا ضابطہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

اقدار، دبے ہوئے علم کو کھود باہر نکالنے والی تحریکیں اور کارکن وغیرہ آ جاتے ہیں۔ علم کے ان نظاموں کو اپنی خود مختاری کی شرائط طے کرنا پڑتی ہیں کیونکہ اکثر ریاستوں پر معاشی انحصار کے ساتھ نام کی خود مختاری ہی دیکھنے میں آتی ہے (علمی تحقیقات پر خرچ ہونے والا بیشتر پیسہ ان محصولات سے آتا ہے جو ریاستیں اکٹھا کرتی ہیں جیسا کہ ترقی یافتہ ملکوں میں غیر حکومتی تنظیموں کی آمدنی کا تقریباً 30-40 فیصد حصہ)۔[12] تاہم حکومتوں کے آزادانہ علم پر انحصار کا مطلب ہے کہ وہ ناکامی یا ذلت یا دونوں کا خطرہ مول لیے بغیر اسے مسخ یا اس میں خرد برد نہیں کر سکتیں۔

آئن سٹائن کو ایک مرتبہ مسلسل دو برس اپنے طلباء کو امتحان میں وہی سوالات دہرانے پر اپنے سیکرٹری کی جھڑکیاں سننا پڑی تھیں۔ اس کا جواب تھا کہ صحیح ہے کہ سوالات وہی تھے لیکن جوابات وہی نہیں تھے۔ یہی بات جدید ریاستوں پر صادق آتی ہے۔ انہیں تحفظ، بہبود، انصاف اور سچائی کے بارے میں جن بیشتر سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ وہی پرانے والے ہی ہوتے ہیں لیکن ان کے جوابات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ریاستوں کے باہمی انحصار اور علم کے زیادہ تر آزادانہ نظام کی صورت برآمد ہوا ہے جسے حقائق، تحقیقات اور آڈٹوں کے وافر بہاؤ میں دیکھا جا سکتا ہے جو امیر ملکوں کی جدید ریاستوں کا خاصہ بن چکا ہے۔ اب وہ پائلٹوں، پڑتالوں اور رئیل ٹائم فیڈ بیکوں کے توسط سے اس بات کا علم زیادہ منظم انداز سے حاصل کرنے لگی ہیں کہ کیا چیز کام کر رہی ہے اور کون سی نہیں کر رہی اور اب وہ اپنے روز مرہ کاموں میں ایسے نیٹ ورکوں پر انحصار کرنے لگی ہیں جن میں پیشہ ور افراد، پالیسی ساز اور بیرونی ماہرین ایک دوسرے سے علم اور اعداد و شمار لیتے اور دیتے رہتے ہیں کینسر کی نگہداشت جیسے شعبوں کی طبی انجمنوں یا فیڈرل ریزرو یا بینک آف انگلینڈ کی مالی پالیسی کی کمیٹی کے گرد موجود معاشیات دانوں کی صفت کی طرح یا پھر ان ہزاروں ماحولیاتی سائنسدانوں اور ماہروں کی مانند جو آب و ہوا کی تبدیلی یا حیاتیاتی کثرت کے بارے میں آراء دیتے ہیں۔

ان لوگوں کی نظریے اور تعصب کو حقیقی دنیا کے ٹیسٹوں میں سے گزارنے کی خواہش کو ہمیشہ سیاسی حدود کا سامنا رہے گا۔ کوئی لیڈر بھی نہیں چاہتا کہ سرد مہر پڑتال کنندگان ان کے کسی پسندیدہ منصوبے کو ردی کے ڈھیر میں تبدیل کر دیں۔ لیکن حکومتوں کو اب یہ معلوم ہو

allurdupdfnovels.blogspot.com

چکا ہے کہ بہت سے شعبوں میں سچائی کی کھوج کرنے والی ان تدابیر کو استعمال میں لانا ٹھیک رہتا ہے بجائے اس کے کہ وہ یہ ظاہر کریں کہ ان کی فراست ہی سب سے زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے۔

شفافیت اب اتنی ہی خود کار ہوتی جا رہی ہے جتنی کہ کبھی رازداری ہوا کرتی تھی۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ حکومتیں ہی صرف ایسے سفینے ہوتے ہیں جن کی چھتوں میں چھید پڑتے ہیں۔ اب یہ چھید اداروں کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اب شہری اپنے محلے کے سکول یا پولیس والوں کی کارکردگی کی تفصیلات ویب پر ملاحظہ کرتے ہیں اور اپنی قومی حکومت کی کارکردگی کا موازنہ دیگر حکومتوں سے انٹرنیٹ کے ذریعے کرتے ہیں۔ ریاستیں اب سول سوسائٹی اور معیشت کو غذا اور موٹاپے، کرنسی کے ذخیروں، موسمی پیش گوئیوں اور سلامتی کے بارے میں قابل اعتماد معلومات فراہم کر کے ان کے کام کو آسان بنانے کی کوشش کرتی ہیں (حتیٰ کہ حکومت کی خفیہ ایجنسیاں بھی اتنی خفیہ نہیں رہیں۔ وہ بھی اب اپنے خطراتی تخمینے ویب پر شائع کرنے لگی ہیں۔ حاصل بحث یہ ہے کہ اب حکومتی سرگرمی کے بہت تھوڑے شعبے ہی ایسے ہوں گے کہ جو (کم از کم بعض جگہوں پر) علمی انقلاب سے نہیں گزرے، جن کے شعوری تجربے، تھیوری اور ماڈلنگ میں تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ پہلے جہاں ریاستیں معاشرے کے ہر جزو کو منارے پر چڑھ کر دیکھا کرتی تھیں اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو چکا ہے۔ اب ریاستی کاموں کو دیکھا جاتا ہے، ان کی چھان بین، جانچ پڑتال اور ناپ تول کی جاتی ہے اور شہریوں کی نجی زندگیوں کو اخفا حاصل ہو گیا ہے۔

اس تبدیلی کے اخلاقی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بری حکومت ایسی حکومت ہوتی ہے کہ جو جوابدہی سے انکاری ہو، چھپنا شروع کر دے، جو خود کو ہی اپنا جواز ماننے لگے اور باقی سب کے احتساب کے درپے ہو جائے۔ بری حکومت وہ حکومت ہوتی ہے جو اپنی حقیقت خود تخلیق کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے برعکس اچھی حکومت وہ ہوتی ہے جو خود کو چھان بین کیلئے پیش کرتی ہے اور اس چیز کو تسلیم کرتی ہے کہ سچائی کو تلاش کیا جاتا ہے، اسے ٹھونسا نہیں جاتا۔

تاہم ریاست اور سماج کی درمیانی حدوں کو مٹانے کا یہ عمل کوئی اتنا بھی مناسب نہیں ہے کہ جتنا یہ بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ علم جو کہ ریاست سے پرے پیدا ہوتا ہے وہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ان عوام سے بھی پرے پیدا ہوتا ہے جن کی اسے خدمت کرنا ہوتی ہے۔ بیشتر علمی شعبوں میں عوام کی خدمت کی نسبت اپنی خدمت کا احساس بہت زیادہ قوی ہوتا ہے اور ان میں سے بیشتر یہ سوچتے ہیں کہ عوام میں اپنی زندگیوں کی مناسب طور پر تفسیر کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ تشددی کیمپوں میں تجرباتی اذیت سے لے کر جبری نس بندی تک گذشتہ صدی کی ظلم کی بہت سی داستانوں میں خردمند اور خوش نیت ماہرین بھی ملوث رہے ہیں۔ انسانیت اور ہمدردی کے احساسات علم سے بہت جلد کافور بھی ہو جایا کرتے ہیں اور ماہرین عوام کو مقصد کی بجائے وسیلہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ بموں اور گیس چیمبروں سے بھی زیادہ خوفناک آمر ریاستوں کی انتظامیہ یعنی شناختی کارڈوں اور قواعد وضوابط کی وہ جفاکش افسر شاہی تھی کہ جس نے ہلاکت اور خونریزی کو اتنی موثر شکل دی اور نظم و ضبط کے روز مرہ آلات کا اطلاق ایک انتہائی مکروہ کام پر کیا۔[13] اپنے علم کے ممکنہ استعمالات سے بے پرواہ سائنسدان، 'حکم کے بندے'، افسران اور ظلم و جور کو کھڑے تکتے رہنے والے صحافی، یہ سب بے تعلقی کے اس کلچر کے خدشات کی مثالیں ہیں جن میں پیشہ وارانہ ضابطہ اقدار کی تعریف کومٹ منٹ کی بجائے کومٹ منٹ کے فقدان سے کی جاتی ہے۔

تاہم اس لاپروائی اور کورپن کے باوجود جب ریاستیں علم کے ایسے شفاف نظاموں میں بہت اچھی طرح گندھ جاتی ہیں کہ جن میں معلومات آسانی اور آزادی سے بہنے لگتی ہیں تو ان کی بہت سی مخصوص خرابیوں میں وہ پہلے والی پائیداری باقی نہیں رہتی۔ ایک خرابی خود فریبی کی ہوتی ہے۔ انسان کوئی منطقی حیوان نہیں بلکہ منطق بنانے والا حیوان ہے۔ یہ بہت جلد اثر بھی قبول کر لیتا ہے، اس میں یہ نقص بھی ہے کہ جو چیز ظاہراً کامیاب دکھائی دے اس کی نقل کرنے لگتا ہے اور مشکل پیدا کرنے والی معلومات کو نظر انداز کرنے میں تو اس کا جواب نہیں۔ بڑی افسر شاہیاں اپنے ہی عقائد میں غتربود کرنے میں ماہر ہوتی ہیں ...... ریاست کی ذہانت اور سخاوت کی نمائش کیلئے تیار کئے گئے پوٹیمکن دیہات کا ہدف عموماً حاکم بھی اتنے ہی ہوتے ہیں جتنے کہ وہاں آنے والے دوسرے لوگ۔ سب ریاستوں کے اپنی کہی ہوئی بات کے اسیر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لوگوں میں سچ سننے کی صلاحیت محدود ہوتی ہیں اور وہ کسی ایک سچائی کیلئے اپنی زندگیاں جس قدر کھپاتے ہیں، ان کیلئے اسے مسترد کرنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ انقلابی تبدیلی کا وعدہ کرنے والوں کے پراپیگنڈے سے سب

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے زیادہ نقصان انہیں ہی پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ آپ سالویشن آرمی کو آسانی سے نہیں بتا سکتے کہ کسی سالویشن (نجات) کا امکان نہیں۔ جارج آرول نے 1948ء میں کہا تھا کہ حکمران لیبر پارٹی کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا اپنا پراپیگنڈہ ہے...... یہ بات درست ثابت نہ ہوئی (حزب مخالف کے قدامت پسندوں کی پسندیدہ صداقتوں پر اس کی تنقید اس سے بھی زیادہ سخت تھی)۔

تنقید مسترد کرنے والی ریاستوں کو عوام کی پرسکون زندگی کی خواہش سے مدد ملتی ہے۔ ریاستوں کی تباہی اور نسل کشیوں کی بہت سی کہانیوں میں ایک چیز مشترک ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان حوادث میں ملوث بہت سے کار پرداز ایسی چیزوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ جو بعد میں دیکھنے پر بہت واضح محسوس ہوتی ہیں اور دوسری چیز یہ کہ عوام بھی جھوٹ اور چپ کے جرم میں ساجھی بن جاتے ہیں۔ تاہم جہاں خود ریاست کے اندر شفاف ذرائع ابلاغ، بحث و تجزیہ اور علم کے آزاد ذرائع موجود ہوتے ہیں، ان خود فریبیوں کو برقرار رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جب ذرائع ابلاغ 'دوسرے فریق کی بات بھی سنو'، کو ممکن بناتے ہیں تو ہمیں سنائی دینے لگتا ہے کہ ریاستی اقدامات کے موصولی سرے پر بیٹھے لوگوں پر کیا بیت رہی ہے اور پھر ہمیں وہ اخلاقی فہم حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ جو متاثرین کے اوجھل یا چپ سادھے رہنے سے نہیں ہوتا۔

شفاف وسائل، شفاف معلومات اور نیٹ ورکوں کے داخل کا کام یہ سب چیزیں ان برائیوں سے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ وہ ریاستوں کو ان کے اپنے آپ سے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ یہ محض اتفاق ہی نہیں کہ حالیہ برسوں میں ریاستوں نے سب سے بھیانک غلطیاں اس وقت کیں کہ جب انہوں نے ایسی معلومات پر انحصار کیا کہ جو خارجی چیلنج اور جانچ کے کسی باقاعدہ عمل کے تابع نہیں تھیں۔ خفیہ ایجنسیاں خطرات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے رجحان کے لئے بدنام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ توثیق کے تابع بہت کم ہوتی ہیں اور یہ رجحان اس وقت اور بھی زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے جب سیاسی لیڈر واضح طور پر بتا دیتے ہیں کہ وہ کون سے حقائق کے طلبگار ہیں۔ 2000ء کے عشرے میں امریکہ کی طرف سے کیا گیا یہ جھوٹا دعویٰ کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے ہتھیاروں کے انبار لگے پڑے ہیں اس چیز کی ہزاروں میں سے فقط ایک مثال ہے کہ جب

allurdupdfnovels.blogspot.com

علم کو جانچ پڑتال کے نظام سے کاٹ دیا جاتا ہے تو یہ کتنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے (چونکہ امریکی خاص طور پر اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے پر اس قدر تلے ہوئے تھے' ان ہتھیاروں کی تلاش پر مامور ایک انسپکٹر نے کہا تھا کہ 'believing is seeing' ۔ یقیناً اس نے وہی بات کی جو کرنے کیلئے اسے کہا گیا تھا)۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں پوشیدہ بڑے ہتھیاروں تک صرف ایک اسرائیلی فرد خائی ونونو ہی پہنچ سکا جسے انعام کے طور پر کئی برس قید تنہائی میں گذارنا پڑے۔

توثیق اور ثالثی

علم کے غلط استعمالات کو کون سی چیز روکتی ہے؟ وہ کون سی چیز ہے جو حکومتوں کیلئے جھوٹ بولنا یا جھوٹی سچائیاں بنانا مشکل بنا دیتی ہے؟ اس کا سادہ سا جواب ہے توثیق (validation)۔ چونکہ ریاست کے سچ مشکوک ہوتے ہیں معاشرے اس علم کی پیداوار کو مضبوط کرنے اور رویے کو زیادہ عمومی طور پر جانچنے کیلئے ایک مختلف نئی تدبیر پر انحصار کرنے لگے ہیں اور وہ ہے توثیق اور ثالثی کی تدبیر......توثیق دعوؤں کی سچائی پرکھنے کیلئے اور ثالثی اس لئے کہ اس میں ایک تیسرا فریق بھی شامل ہو جاتا ہے جو جائزے اور تحقیق کے ایک اپنے اور مختلف تناظر کا حامل ہوتا ہے۔

سولھویں صدی کا ایک عثمانی شاعر کنالی زادہ علی چیلیپائی لکھتا ہے کہ 'سچی دوستی کا مطلب دوست کے کام کو ایک دشمن کی آنکھ سے دیکھنا ہے'۔ اس وزن پر ریاست کے صحیح مفادات بھی ایک دشمن کی آنکھ سے جانچ پڑتال کرنے میں ہوتے ہیں۔ یہ اصول کئی زمانوں سے کاروباری اداروں پر لاگو کیا جاتا رہا ہے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ ان کے حسابات درست ہیں۔ اس کا اطلاق پیشوں اور عوامی خدمات پر کیا گیا ہے خصوصاً جہاں شہریوں اور ان لوگوں کے علم کے درمیان بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے کہ جن پر شہریوں کو انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اطلاق برطانوی نیشنل آڈٹ آفس اور آڈٹ کمیشن کے توسط سے حکومت پر بھی کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر (مثلاً بھارتی ریاستوں کیرالہ اور بنگال میں) عوامی اخراجات کی بڑی مدوں پر عوامی سماعت سے بھی کچھ اسی طرح کے اہداف حاصل

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہوئے ہیں۔ دوسری صورت میں شہری تنظیموں نے فریضہ سرانجام دیا ہے مثلاً1990ء کے عشرے کے اوائل میں عوامی خدمات پر شہریوں کا رپورٹ کارڈ متعارف کرایا گیا تھا جس پر ان خدمات کی کارکردگی کا سکور خدمت کی ترسیل، کرپشن اور سٹاف کے رویے کے اعتبار سے درج کیا جاتا تھا۔[14] بولیویا میں1990ء کے عشرے کے وسط میں قانون عوامی شراکت کی رو سے کمیونٹی کی بنیاد پر 'نگران کمیٹیاں' قائم کی گئی تھیں جن کے پاس مالی اختیارات بھی تھے اور یہ اختیار بھی تھا کہ وہ میونسپلیٹیوں کے خلاف باقاعدہ شکایت بھی درج کرا سکتی تھیں جس کے نتیجے میں ان کا بجٹ بھی بند ہو سکتا تھا۔ نیچے سے اوپر توثیق کی یہ مثالیں اوپر سے نیچے توثیق کی نسبت زیادہ موثر ثابت ہوئی ہیں اور انہوں نے طاقت کے توازن کو یقینی طور پر تبدیل کیا ہے۔

بین الاقوامی طور پر توثیق کا عمل عام ہو رہا ہے۔ یورپی اتحاد نے 'شفاف ارتباط' کا اصول اپنا لیا ہے اور وہ حکومتوں کے بہتر رویے کو فروغ دینے کیلئے ہدایات و قوانین کی بجائے شفافیت اور رفیقی دباؤ(Peer Pressure) کو بروئے کار لا رہا ہے۔ اس کی ایک کوشش یہ بھی ہے کہ حکومتوں کو آئندہ نسلوں پر قرضوں کا بوجھ لادنے سے روکا جائے۔ درحقیقت عوامی رائے اور دوسری حکومتوں کی آراء مل کر بیرونی توثیق کنندہ کا کردار ادا کرنے لگی ہیں۔ بعض حکومتوں نے ان نرم بیرونی پابندیوں کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا ہے، ان سگریٹ نوشوں کی طرح جو کہ سگریٹوں اور تمباکو نوشی پر پابندی کی بڑے زور و شور سے حمایت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عالمی مالیاتی فنڈ اور ورلڈ بینک بھی انہی طریقوں سے کام کرتے ہیں۔ وہ ملکی پالیسیوں پر رپورٹیں مرتب کرتے ہیں اور سفارشات پیش کرتے ہیں (جن پر اکثر بڑی لے دے بھی ہوتی ہے) ان کے کام کو ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل (جو پوری دنیا میں بدعنوانی کے اعداد و شمار پر نظر رکھتی ہے) جیسی تنظیمیں مزید تقویت پہنچاتی ہیں۔[15]

ضروری نہیں کہ ان میں سے کوئی توثیق کنندہ سچائی تک ان حکومتوں سے زیادہ رسائی رکھتا ہو کہ جن کی وہ نگرانی کرتے ہیں۔ بعض اوقات انہیں برے فیصلوں کو قانونی حیثیت دینے کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ماہرین بعض اوقات ماہرانہ طریقے سے غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ تاہم سیاستدانوں اور سرکاری افسروں کی نسبت ان کے سچائی سے وابستہ ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو توثیق و ثالثی کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

گراف میں اضافے نے ریاستوں کو زیادہ جوابدہ اور اہل بنا دیا ہے اور ان میں صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت بڑھی ہے (حکومت کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ یہ غلطیاں بھی کرے مگر اس پہ کوئی حرف بھی نہ آئے ...... وہ ایسا کرنا مشکل بنا دیتے ہیں)۔ کم از کم حکومت کی بقول چرچل 'اصطلاحی نادرستیوں' (جھوٹ) کے رجحان کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔

تاہم مطلق سچائی کی بات حکومتوں پر لاگو نہیں کی جا سکتی۔ سچائی سلامتی اور بہبود جیسے دیگر اخلاقی اہداف سے متصادم ہو سکتی ہے۔ سلامتی کے ضمن میں مثلاً آپ کسی نئے اسلحے کے بارے میں زیادہ کھل کر باتیں نہیں بتا سکتے۔ اس سے اس کی موثریت کو فرق پڑ سکتا ہے۔ بہبود کی بات کریں تو یہاں بھی حکومت کو بعض مرتبہ لب سینے پڑتے ہیں۔ کسی متوقع معاشی جھٹکے یا ٹیکسوں میں کسی ممکنہ تبدیلی کے بارے میں زیادہ منہ کھولنے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ سچائی انصاف کے مقابل بھی آ سکتی ہے مثلاً کیا عوام کو یہ حق دیا جانا چاہیے کہ انہیں ہر مجرم کے ٹھکانے کا علم ہو یا ہر بچے باز کے حالیہ پتے کا پتہ ہو؟ شفافیت بھی اتنی ہی بڑی برائی بن سکتی ہے جتنی کہ راز داری۔

جیسا کہ روز مرہ زندگی میں پیش آتا ہے ہم سب کو سچائی اور دیگر اخلاقی اصولوں کی اضافی اچھائی کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ سیاستدانوں کے بارے میں یہ بات زیادہ کہی جا سکتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس چیز میں امتیاز کیا جانا چاہیے کہ آیا سچائی دبانے میں حکومت کا اپنا مفاد زیادہ ہے یا عوام کا۔ اس کا واحد معقول جواب یہ ہے کہ ریاست کے اندر توثیق کا کام ہونا چاہیے۔ بعض حکومتوں میں دوسروں کی ای میلوں اور ٹیلی فون کالوں میں گڑبڑ کو روکنے کے نیم عدالتی نظام پہلے ہی کام کر رہے ہیں۔ اس اصول کا اطلاق ان فیصلوں پر بھی کیا جا سکتا ہے کہ معلومات کے ساتھ کیا کیا جائے ...... لوگوں کو کیا بتایا جائے، کب بتایا جائے اور کس بنیاد پر۔ لارڈ ایکٹن لکھتا ہے کہ 'ہر خفیہ چیز بوسیدہ ہو جاتی ہے، انصاف کی عملداری بھی'۔ جب تلک کافی حد تک قانونی توثیق کنندگان نہیں مل جاتے، توثیق کی ایسی تدابیر شفافیت کی برائیوں اور رازداری کی برائیوں کے درمیان ایک مناسب توازن قائم کر سکتی ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

تجزیہ اور اختراع: ریاست بطور لیبارٹری:

ماضی کی قدامت پسند ریاستوں نے علم پیدا کیا اور پھر اسے منجمد کر دیا۔ صرف کہنے کی بات نہیں بعض اوقات تو اسے واقعی پتھر کے ایسے مندروں میں دفن کر دیا گیا جن میں فرامین، داستانیں اور اعلانات کندہ کیے گئے۔ فرعونوں کے مصر اور شاہانہ عہد کے چین نے روایت کے احترام کو نمو دی اور اسے جامد کرنے کی کوشش کی۔ نئے علم کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اسے توجہ صرف اسی صورت میں ملتی تھی کہ اگر اسے پرانے علم کی دریافت کے طور پر پیش کیا جاتا۔

عمومی طور پر دیکھا جائے تو اب کے دور کی ریاستوں نے اختراع سے بدکنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو جنگ کا خطرہ اور اس کی تیاریاں ہیں اور پھر بہتری کی طرف سفر کا اخلاقی تقاضہ۔ بعض ریاستوں نے تو بہت ہی زیادہ اختراع دکھائی۔ سٹالن کے منصوبہ بندی اور گلاگوں کے نظام میں بڑی جدت تھی۔[16] پال پاٹ کا کمبوڈیا کے شہروں کو خالی کرنے کا اقدام بڑی تخلیقی اور انقلابی بات تھی اور پھر فرانس کے انقلابیوں کو دیکھیں جنہوں نے دس دس گھنٹے کے دن اور دس دس دنوں کے ہفتے ایجاد کئے لیکن ان کے تصورات کے حق میں مزید کچھ تھوڑا ہی کہا جا سکتا ہے۔

تاہم ریاست میں اور اس کے گرد اختراع کی حوصلہ افزائی خود خوفی کے رجحانات کے سدباب کا ایک طریقہ بھی ہے کیونکہ اس سے یہ سوالات سامنے آتے رہتے ہیں کہ 'ریاست کو کیا کرنا چاہیے'؟ اور 'اسے ان چیزوں کو بہتر کیسے بنانا چاہیے'؟ ریاستوں کے پاس اختراع کو نمو دینے والے بعض صریحی دباؤ نہیں ہوتے مثلاً اسے مقابلے بازی کا مسئلہ نہیں ہوتا یا تباہی کا خطرہ درپیش نہیں ہوتا۔ بڑے منصوبے ایک اپنی ہی منطق بنا لیتے ہیں۔ بڑی افسر شاہیوں میں ناکامی (یا زیادہ سوالات پوچھنے) سے وابستہ لاگت کامیاب خطر پسندی کے صلے سے زیادہ ہوتی ہے اور اگر ریاستیں بے لچک قواعد وضوابط میں تبدیلی نہیں کرتیں، ناجائز ٹیکس لگاتی ہیں یا تاجروں کو ہراساں کرتی ہیں تو اختراع کا پہیہ جام ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ ناگزیر نہیں۔ ریاستوں کو اس طرح تشکیل دیا جا سکتا ہے کہ وہ اختراع کی حوصلہ افزائی کرنے لگیں اور خود کو چھان بین اور پرکھ پڑتال کیلئے پیش کریں۔ اٹھارہویں

allurdupdfnovels.blogspot.com

اور انیسویں صدی کی بہت سی فیصلہ کن اختراعات سرکاری اداروں (زیادہ تر افواج) کے دم سے ظہور پذیر ہوئیں اور بیسویں صدی کی اہم اختراعات کا بڑا حصہ بھی ریاستوں کی براہ راست سرپرستی سے تکمیل کو پہنچا۔ اس میں جیٹ انجن کو لے لیں، انٹرنیٹ کی بات کر لیں یا ویب کی۔ اب سب جانتے ہیں کہ انٹرنیٹ امریکی محکمہ دفاع کے ایک ادارے ڈار پا کی بھول چوک سے وجود میں آیا اور اسی طرح ویب سرن کی دین ہے گو اس دین کو بھی بھول چوک ہی کہا جائے گا۔[17] اس طرح مین ہٹن پراجیکٹ اور اپالو خلائی پروگرام بھی حکومتی سرپرستی میں نمو پانے والی کامیاب اختراع کی بڑی مثالیں تھیں۔ اس کے برعکس حریف فطہ یوں کی وضع طویل وقتی پیمانوں اور اساسی اختراع کی غیر یقینیوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

اگر تحقیق اور حرفتی ترقی کی ریاستی سرپرستی اب ایک قاعدہ بن چکی ہے (اور جی ڈی پی کے تناسب سے اس میں اضافہ بھی دیکھنے میں آ رہا ہے) تو حکومت کے اندر اختراع کیلئے ارادی حکمت عملیوں کی کمی نظر آتی ہے۔ پرانے منصوبوں پر تنقید برداشت کرنا اور اس ضمن میں تجربے کے چیلنج کا سامنا کرنا حوصلہ کی بات ہے۔ اس طرح اگر سیاستدان کو یہ اعتراف کرنے کیلئے کہا جائے کہ کوئی نئی پالیسی ایک غیر ثابت شدہ تجربہ ہے تو یہ بھی کچھ زیادہ ہو جائے گا کیونکہ اس کیلئے انہیں اپنے علم کی کمی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ میں نے ایسے وزیر دیکھے ہیں جو ابھی منصوبہ شروع ہوئے چند ہفتے ہی گزرے ہوتے ہیں کہ اس کی کامیابی کے ڈھول پیٹ رہے ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ناخوشگوار نتائج کو ویسے ہی دبا دیا جاتا ہے اور تیسری صورت یہ کہ بعض چیزیں واضح طور پر سامنے آئیں لیکن انہیں بڑی ڈھٹائی سے نظر انداز کر دیا گیا۔ تجرباتی منصوبوں اور پڑتالوں کا اس کے باوجود بھی پھیلتے چلے جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ زیادہ علم کے فوائد خجالت و ناکامی کے خدشات سے زیادہ وزن کے حامل ہوتے ہیں۔ بہت سی حکومتیں اپنے بارے میں دانستہ علم تخلیق کرتی ہیں۔ وہ اپنے افسرانہ ڈھانچوں میں اور خدمات میں اختراعات کیلئے کھلے طور پر پیسہ مختص کر سکتی ہیں، وہ لچک کو فروغ دے سکتی ہیں (مثلاً بعض ایسے شعبوں میں اداروں کو قواعد کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت دے کر کہ جہاں ان کا خیال ہو کہ موثریت کو فرق پڑے گا، جیسا کہ برطانیہ کے روزگار اور تعلیم کے شعبوں میں ہوا)۔ وہ نئے ماڈلوں کو پرورش دے سکتی ہیں (ایسا مواقع پیدا کر کے کہ جن میں نئے تصورات کو پنپنے کا موقع مل سکے، جیسے کہ سنگا پور

allurdupdfnovels.blogspot.com

نے کیا ہے)۔ اس کے علاوہ وہ ایسے زیادہ انقلابی اقدامات بھی کر سکتی ہیں کہ جو خرچے اور رسد کو الگ الگ کر سکیں اور جہاں تک عوامی پیسے کا تعلق ہے، مقابلے کی فضا پیدا کر سکیں۔ جو علم وہ پیدا کرتی ہیں اس کی خاصیت نیم سائنسی ...... مثلاً لیبر مارکیٹ کی پالیسیوں کی جانچیں یا طبی آزمائشیں ...... سے لے کر تصورات تک ہو سکتی ہے: ای گورنمنٹ اور بائیو ٹیکنالوجی کے انضباط جیسے مختلف شعبوں میں ان کی مدت غیر یقینیت اور غلطیوں کی ضامن ہوتی ہے ......لیکن اس کے باوجود ان تمام شعبوں پر سائنسدان لائنس پالنگ کی یہ بات اب بھی لاگو ہوتی ہے کہ 'اچھے تصورات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بہت سارے تصورات حاصل کیے جائیں اور پھر ناقص تصورات کو رد کر دیا جائے'۔

حکومت کے اندر اختراع وجودت کی حوصلہ افزائی کرنے والی ان تدابیر کو حدوں میں رکھنا پڑتا ہے۔ بیشتر ریاست میں اندیشے اور تخلیق کو برداشت نہیں کیا جا سکتا ...... نیلی یا کاسنی ٹریفک لائٹیں لگانا یا جوہری بجلی گھروں میں نویکلی طرز کے تحفظاتی طریقے اختیار کرنا غیر اخلاقی اور اعتماد شکنی کے مترادف ہو گا۔ لیبارٹریوں میں شہریوں پر طبی تجربات آزمانا اخلاقی طور پر غلط ہے۔ اس کی بجائے ریاستوں کو ایسے محفوظ مواقع تراشنے پڑتے ہیں جہاں وہ بغیر کسی بڑے خدشے کے علم پیدا کر سکیں۔[18] ان تدابیر کا مجموعی مقصد حدت پیدا کرنا، اسے آزمانا اور پھر اس میں سے بہت تھوڑے سے ایسے ممکنات کو چھان کر الگ کرنا ہوتا ہے کہ جو کام دے سکیں۔ لیکن ان کا بالواسطہ مقصد سیاسی تعلیم کے تخیل کو وسعت دینا اور اس طرح لوگوں کو نئے امکانات کا شعور دلانا بھی ہوتا ہے۔

جرمن شاعر ہولدرلین کہتا ہے کہ جو چیز ریاست کو دوزخ ارضی بناتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اسے جنت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن غلطی یہ رہی ہے کہ لوگ ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ جنت کو صرف ایک ہی راستہ جا سکتا ہے اور وہاں جانا کیسا لگے گا اس بارے میں صرف ایک ہی سوچ ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حریف علم کے بارے میں فراخی ذہن کا ہونا کس قدر اہم ہے۔ حکومتوں کیلئے علم بہت اضطراب انگیز ہو سکتا ہے (پینٹا گون پیپرز کا) علم تو یقیناً تھا جس کا بعد میں رابرٹ میکنا مارا نے اعتراف بھی کیا 'ہم سے غلطی ہوئی ۔ بہت سخت غلطی سرزد ہوئی'۔ لیکن یہ بے چینی ہی ہے جو انہیں زیادہ واضح انداز سے سوچنے اور عمل کرنے میں مدد دیتی ہے اور یقیناً انجام کار امریکہ کو ان انکشافات سے فائدہ بھی پہنچا۔ ان کی وجہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے نکسن ویتنام سے آسانی سے دستبردار ہو سکا اور اس طرح لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ گئیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 14

کیا کوئی حکومت پوری دنیا کی خدمت کر سکتی ہے؟

''اگر پوری دنیا اس میں حصہ نہ لے تو کوئی چیز بھی دوبارہ نہیں ہو سکتی ......کوئی بھی سوالات ایک نقطے پر جمع ہو کر حل نہیں ہو سکتے'۔ (پال ویلری)

اخلاقیات ریاستی سانچوں میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ اس باب میں میں دوبارہ اچھی حکومت کی عالمی جہتوں کی بات کروں گا۔ میرا سوال ہے کہ آیا ریاستیں اس بات کی ذمہ دار ہوتی ہیں کہ اپنی حدود سے باہر محافظت فراہم کریں یا بہبود، انصاف اور سچائی کو فروغ دیں۔ یہاں میں اس چیز کا تجزیہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ سفارتکاری کی شائستہ دنیا میں نوعمر فوجی اور مزدور، چھوٹے ہتھیار اور لینڈ مائنز، منشیات کی تجارت یا ہیروں کی فروخت جیسی چیزیں کیونکر در آئی ہیں اور ہمیں ان بہت سی انسانی احتیاجات کے بارے میں کیسے سوچنا چاہیے کہ جن کا بین الاقوامی پیمانے پر باہمی انحصار اس قدر ہو گیا ہے کہ جو پہلے کبھی بھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

جدید قومی ریاست کے دو رخ

پورے جدید عہد کے دوران سیاسی نظریے اور عمل دونوں کا ابتدائی مفروضہ یہ رہا ہے کہ قومیں (یا معاشرے) بند ہوتے ہیں، الگ تھلگ جزیروں کی طرح ہوتے ہیں اور اخلاقی حوالے سے خود کفیل ہوتے ہیں۔ جدید جمہوری ریاستیں اس معاملے میں بہت امتیاز سے

allurdupdfnovels.blogspot.com

کام لیتی رہی ہیں کہ انہیں اپنے شہریوں کیلئے کیا کرنا چاہیے اور جو شہری نہیں ہیں ان کیلئے کیا کرنا چاہیے۔ قومی حدود کے اندر خدمت کے بارے میں سیاسی اور اخلاقی مباحث ریاست کے منابع کی صورت گری کرتے ہیں۔ حریف طبقے اور جماعتیں عدل و انصاف پر بڑی بے دردی سے ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہی ہیں لیکن وہ سب اس بات کو تسلیم کرتی رہی کہ داخلی پالیسی کے لئے اخلاقی معاملات کو رہنما بنایا جانا چاہیے۔ دراصل جہاں تک اندرون ملک کا تعلق ہے جمہوری ریاستوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا کہ وہ آقاؤں کی بجائے خادموں کی طرح کام کریں۔ جس ریاست نے اقتدار اور شان و شوکت کی جستجو کا مظاہرہ کیا وہ جلد ہی اپنا جواز، علمی ربط کی امید اور اقتدار کھو بیٹھی۔

تاہم خارجی اعتبار سے جمہوری سے جمہوری ریاستیں بھی بہت مختلف طرز عمل کا مظاہرہ کرتی رہیں اور ایک ایسے نظریے پر عمل پیرا رہیں جس میں ریاستوں اور قوموں کے مفادات مماثل تھے (اور کم از کم یہ کہ اگر نہیں بھی تھے تو اس میں دیگر ریاستوں کا کوئی دخل نہیں تھا) اور حکومت اور اخلاقیات میں بہت دور کی رشتہ داری تھی بلکہ ان کا آپس میں بول کلام بھی بمشکل ہی تھا۔ مزے کی بات ہے کہ اس دوری کا سہرا ایک مذہبی شخصی کارڈینل رشیلو کے سر بندھا جو ساز باز کرنے کا دھنی تھا۔ ہنری کسنجر لکھتا ہے کہ 'رشیلو نے جس دنیا کی بنیاد رکھی، اس میں ریاستیں کسی ضابطہ اخلاق کی پابند نہ رہیں'۔(1) ہینز مورگن تھا جس سے کہ بیسویں صدی کے سفارتکاروں نے بہت گہرا اثر قبول کیا اس بات کو بہت مفصل انداز سے بیان کرتا ہے کہ ریاست کا مفاد بنیادی کیوں ہوتا ہے، دنیا طاقت کی جستجو اور دوسروں پر غلبے پر کیوں چلتی ہے اور دیگر اہداف کی جستجو میں پڑنے سے تباہی و ہلاکت کیوں چلی آتی ہے اور دوسرے غلبہ کیوں پا لیتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ 'پوری تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں سرگرم قومیں خود کو جنگ کی شکل کے منظم فساد کیلئے تیار کر رہی ہوتی ہیں' سرگرمی سے اس میں مصروف ہوتی ہیں یا اس سے صحت یاب ہونے کی کوشش کر رہی ہوتی ہیں'۔

یہ دلائل ریاست کے طاقتور لیکن محدود کردار کو صحیح ثابت کرتے رہے۔ اسے تبلیغ یا دوسروں کا قبلہ تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اسے مفاد کے ایک تنگ تصور پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور اس کے تحفظ کیلئے تمام ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔ اسے اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

طرح کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے جیسے دیگر ریاستیں بھی اس بنیادی مسئلے کے بارے میں فکر مند ہیں اور جیسے کہ وہ نا قابل اعتماد ہیں۔ تمام بیان بازی اور نظریے کو ذاتی مفاد کے نقاب سمجھا جانا چاہیے۔ اقدار، دوستی اور افہام وتفہیم کو فروغ دینے کا کام سول سوسائٹی پر چھوڑ دیا جانا چاہیے۔ اخلاقیات کو ایک مہنگی بلکہ ایک مہلک عیاسی تصور کیا جانا چاہیے۔

امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے دنوں میں لینن کے پیرو کار بھی اسی تصور کے حامی تھے۔ اس زبانی وعملی مدد کے باوجود کہ جو وہ عالمی انقلاب کیلئے پیش کرتے تھے وہ اپنی حقیقت پسندی میں شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار تھے۔1940ء کے وسط اور اواخر میں سٹالن کے پر پیچ حربے اس حقیقت پسندی کے دیو کار کے نمائندہ تھے جن پر نظریات کا باریک سا لبادہ چڑھا ہوا تھا (اور بیشتر 'حقیقت پسندی' کی طرح یہ ہمیشہ بہت زیادہ حقیقت پسند نہیں تھا...... جس کی زیادہ وضاحت اس کے یہ ماننے سے انکار میں ہوتی ہے کہ ہٹلر 1941ء میں حملہ کرے گا)۔

ایک ایسی دنیا میں کہ جس میں جنگ ہی بنیادی طور پر سیاسی بقاء اور ارتقاء کا تعین کرتی تھی، بد اعتمادی کا یہ موقف اکثر و بیشتر قابل فہم رہا۔ معاشرے کے اندر اچھائی اور اعتماد کے تحفظ کا انحصار اس کے باہر بھرپور بد اعتمادی پر رہا۔ درحقیقت سلامتی کو یقینی بنانے کیلئے یہ زیادہ کارگر حربہ ہوتا ہے کہ دشمن آپ کی ممکنہ چال کا پہلے سے اندازہ نہ کر سکے اور یہ چال ایک سی نہ رہے بلکہ بدلتی رہے۔ اس سے دشمن خوفزدہ رہتا ہے کہ نہ جانے کیا جواب ملے یا حریف کس بات پر اتر آئے۔ اس کے مقابلے میں ہر لمحہ یکساں اور قابل اعتماد طرزِ عمل پیش کرنا بے فائدہ رہتا ہے۔ شمالی کوریا کے رہنما برسوں اس حکمت پر کامیابی سے عمل کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ پکاسو نے ایک مرتبہ کہا تھا 'بہترین حساب کتاب وہ ہوتا ہے کہ حساب کتاب ہو ہی نہ'۔

موجودہ چینی حکومت حقیقت پسندی کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کلاز وٹز کی 'بر سر پیکار' کی جتنی کاپیاں ہر سال چین میں بکتی ہیں باقی ساری دنیا میں نہیں بکتیں اور اس کے حکمران بڑی بے رحمی سے مفادات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں...... سفارت کاری کے ذریعے خام مال (خصوصاً تیل) کیسے حاصل کیا جائے، جاسوسی کر کے دنیا کی بڑی کمپنیوں کے منصوبوں کے بارے میں باخبر کیسے رہا جائے اور کبھی طاقت استعمال کرنے کی دھمکی اور کبھی

allurdupdfnovels.blogspot.com

نرمی سے دوسرے ملکوں کو ہمنوا کیسے بنایا جائے۔

سولھویں اور سترہویں صدی میں فرانسسکو ڈی وتوریا، فرانسسکو ڈی سواریز اور ہیوگو گروشیس جیسے الٰہیات دانوں نے بین الاقوامی قانون، مشترکہ اقدار ور اخلاقیات پر مبنی دنیا کی ایک متبادل سوچ کو فروغ دیا۔ اس کی عقلی توجیہہ عمانوئیل کانٹ نے عالمی امن کی سیکولر سوچ کی صورت میں اپنے مقالوں 'عالمگیر تاریخ کا تصور' اور 'دائمی امن' میں پیش کی اور بہت سے صاحبان عمل بھی اسی طرح کے منصوبے تجویز کرتے رہے' مثلاً پنسلوینیا کے بانی ولیم پین نے قوموں کے درمیان انصاف کے قواعد قائم کرنے اور ان کے نفاذ کیلئے شہزادوں کی پارلیمان بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ ڈک ڈی سلی نے منحرف بادشاہوں کی گوشمالی کیلئے یورپی فوج اور ٹام پین نے یورپین ریپبلک کی تجویز پیش کی تھی جس کی نگرانی کیلئے اس نے کہا تھا کہ ایک جنرل کونسل تشکیل دی جائے جو قوموں کے مابین تنازعات حل کرائے۔

گذشتہ چند صدیوں کے بیشتر دورانیے میں یہ تجویزیں محض خوابوں خیالوں سے زیادہ کی حیثیت حاصل نہ کر سکیں۔ ایسے کسی منصوبے کی ساکھ کا دارومدار اس بات پر تھا کہ سب فریق خصوصاً بڑی طاقتیں اس کی پابندیوں پر متفق ہوں اور یہ کیونکر ہوگا اس کی کوئی معقول ترکیب سامنے نہ لا سکے۔ تاہم بیسویں صدی کے دوران کہ جو عالمی جنگوں اور انقلابات کا عہد تھا' یہ خواب و خیال اتنے خواب و خیال نہ رہے اور داخلی سیاست اور عالمی سیاست کے درمیان کی خلیج کا پاٹ کم ہوتا چلا گیا۔ جمہوری کلچر کے بارے میں یہ بات سامنے آئی کہ یہ مطلق حقیقت پسندی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ایک بار جب عوام یہ بات ماننا بند کر دیں کہ ریاست بجائے خود ایک مقصد ہے اور اسے مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ اور اپنی احتیاجات کی خادم تصور کرنا شروع کر دیں تو پھر دنیا کے بارے میں سوچ کا تبدیل ہونا بھی لازم ہے۔ میکیا ولی، مورگن تھا اور ان جیسے دوسرے مفکرین کو یہ سوال درپیش تھا کہ ریاست کے مفادات کو بہترین طور پر آگے کیسے بڑھایا جا سکتا ہے؟ لیکن دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے عوام کی زیادہ دلچسپی اس سوال میں تھی کہ ان کی ضروریات بہترین طور پر کیسے پوری ہو سکتی ہیں۔

اس زاویے سے دیکھنے پر بہت سے قدیم مفروضے منطقی اعتبار سے نامعقول اور اخلاقی لحاظ سے مشتبہ نکلے۔ ان میں ایک مفروضہ جنگ سے متعلق تھا کہ یہ قوموں کی طاقت

allurdupdfnovels.blogspot.com

کی حتمی ثالث کے طور پر اپنا وجود برقرار رکھے گی اور عالمی تشدد کی بڑی اصناف ریاستوں کے مابین جنگیں ہوا کریں گی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب سوائے بڑی طاقتوں کے تمام ملک جنگ سے تائب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ دنیا اب اس قدر مربوط ہو چکی ہے کہ اگر کوئی جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے حلیفوں کی بجائے حریفوں سے زیادہ سابقہ پڑے گا۔ ماضی میں علاقہ جات تسخیر کرنے کے آرزومند جارح ملکوں کے کامیاب ہونے کے امکانات 50 فیصد ہوتے تھے اور حرفتی برتری کی صورت میں تو یہ شرح اور بھی بہت بڑھ جاتی تھی جیسا کہ انیسوی صدی میں استعماری طاقتوں کے بارے میں دیکھنے میں آیا۔ بیسویں صدی کے وسط تک یہ تناسب گر کر 30 فیصد تک پہنچ چکا تھا۔ 1980ء کے عشرے (ایران پر عراقی اور فاک لینڈ پر ارجنٹائن کے حملے کا دور) تک پہنچتے پہنچتے یہ شرح 19 فیصد اور صدی کے آخر تک صفر کے قریب پہنچ چکی تھی۔

صرف یہی نہیں کہ جارح ملکوں کو اکثر شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے بلکہ اس سے بھی اکثر انہیں پچھتاؤ کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ بیسویں صدی کے قابل ذکر دور میں اکثر جارحین اپنی ہی جارحیت کے ہاتھوں تباہ ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر آسٹریا وہنگری اور جرمن سامراج برباد ہوئے۔ نازی جرمنی دوسری عالمی جنگ کا سب سے عبرتناک شکار بنا۔ افغانستان میں فوجی مداخلت سے سوویت یونین کا اپنا کباڑہ ہوا۔ یورپی ریاستیں جو کہ اٹھارہویں اور انیسوی صدی میں یورپی خطے میں مقابلے اور پھر عظیم استعماری سلطنتوں کے توسط سے ایک دوسری کو مضبوط بناتی رہیں بیسویں صدی میں ایک دوسرے سے لڑ بھڑ کر بے دم ہو گئیں۔

ایک دوسرا مفروضہ یہ غائب ہوا ہے کہ قومی مفاد کیلئے لڑی جانے والی جنگ عموماً جائز ہوتی ہے۔ جنگ کے اخراجات کیلئے پیسے کی ضرورت نے بادشاہوں کو مجبور کیا اور انہوں نے اقتدار پارلیمانوں کے حوالے کر دیا۔ اسے ولیم آف اورنج کی ہشیاری ہی کہیے کہ اس نے بھانپ لیا تھا کہ اسے پارلیمان میں انگلستان کے امیر ٹیکس دہندگان کو وہ وقعت دینا پڑے گی جس پر کہ جنگیں لڑی گئی تھیں لیکن ہوا کیا کہ جب وہ کھیل میں شریک ہوئے تو پتہ چلا کہ ان میں توسیع پسندی کی بھوک اتنی ہی زیادہ ہے جتنی کہ بادشاہوں میں تھی۔ تاہم بیسویں صدی کی وسیع تر جمہوریت نے حکمرانوں اور اشرافیہ کی جنگ کرنے کی صلاحیت پر بندش لگائی دی کیونکہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

اب غرباء کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس سے انہیں ملے گا کچھ کم اور نقصان زیادہ ہو گا۔ جنگ اپنا جواز اس لئے بھی کھو بیٹھی ہے کہ اس کی بے تمیزی لوگوں پر ماضی کی نسبت زیادہ کھل چکی ہے۔1900ء میں شہریوں اور فوجیوں کی ہلاکتوں کا تناسب10.50 فیصد تھا لیکن اب یہ 90 فیصد سے بھی زائد ہوسکتا ہے۔ حالیہ عراقی جنگ میں یہ تناسب اس سے بھی زیادہ رہا۔ ثانوی نقصان سے بچاؤ کی خاطر سمارٹ ہتھیاروں کے استعمال کے تمام تر شور وغوغے کے باوجود زیادہ تباہی پھر بھی عام شہریوں پر ہی ٹوٹی ہے اور ایک اندازے کے مطابق2003ء میں امریکی حملے کے وقت سے لے کر اب تک کوئی25000 شہری پر تشدد موت کا شکار ہو چکے ہیں جن میں سے 37 فیصد ہلاکتیں اتحادی فوجوں کی یلغار سے براہ راست واقع ہوئیں جو اس تعداد سے چار گنا زیادہ ہے جو کہ بغاوت کے نتیجے میں ہلاک ہوئے تھے۔(3)

جمہوریتوں اور جمہوریاؤں کی تاریخ میں صلح جوئی والی بات کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ لبرل اقدار پر یقین رکھنے والے لوگ اس بات کو ماننے کیلئے شاذ ہی آمادہ نظر آئے ہیں کہ ان کی اقدار کو صرف کسی مخصوص جگہ یا انسانی گروہ تک محدود کر دیا جائے۔ بلکہ جوں جوں زیادہ لوگ سیاسی زندگی میں شامل ہوئے توسیع پسندانہ توانائیاں زیادہ کھل کھیلتی نظر آئیں۔ یہ محض اتفاق ہی نہیں کہ اتنی زیادہ بڑی سلطنتیں جمہوریاؤں کے بل پر معرض وجود میں آئیں۔ روم، ایتھنز، نیدرلینڈ، برطانیہ اور امریکہ سب نے خود اپنی اقدار سے اخلاقی اعتماد اور توسیعی توانائی اخذ کی۔ بعض موقعوں پر یہ توانائیاں انتہائی جمہوری اور عوامی حکومتوں کے خلاف بھی استعمال کی گئیں۔ خاکی الیکشن کی اصطلاح برطانوی رائے دہندگان کے جنگ بوور کے دنوں کے جنگجویانہ موڈ کی طرف اشارہ کرنے کیلئے اختراع کی گئی تھی جو امریکہ کی عوامی شورش کو کچلنے کے خواہاں تھے۔ اٹھارہویں اور بیسویں صدی کے درمیان زیادہ جمہوری آباد کار معاشرے سب سے زیادہ نسل کش ثابت ہوئے۔ امریکہ اور آسٹریلیا کے مقامی باشندوں پر گوروں کے ہاتھوں ہونے والے ظلم کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حقوق اور ووٹ آپ ہی آپ وہ چیز پیدا کرنے لگتے ہیں جسے کہ آج کل ونیک عمل کہا جاتا ہے۔ یہ بات بالکل فضول ہے کہ جمہوری ملک جمہوری ملکوں سے نہیں لڑتے۔1920ء میں انقلابی روس پر برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے حملے،1973ء میں جمہوریہ چلی اور1950ء کے عشرے میں جزواً جمہوری ایران کی پائمالی،1990ء کے عشرے کے اوائل میں الجیریا میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

اسلامی حکومت کے انتخاب کو روکنے کیلیئے کی جانے والی ملی بھگت اور2000ء کے عشرے میں وینزویلا کے صدر شاویز کو خراب کرنے اور اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کیلیئے کی جانے والی پے درپے ناکام کوششیں اس کلیے کی نفی کرتی ہیں۔ جمہوریت ملک کے اندر بھی فساد کو ہوا دے سکتی ہے مثلا ہندوستان میں جمہوری گہما گہمی کے ادوار میں فساد میں اضافہ اور مارشل لاء کے دوران کمی دیکھنے میں آتی رہی ہے۔

تاہم اس سب کے باوجود اندرون ملک خدمت اور بیرون ملک خدمت کے جذبے کے مابین ایک تعلق ضرور ہوتا ہے۔آج کے دور کے جمہوری ملک صرف آمروں کے خلاف اقدامات کا ہی جواز پیش کرسکتے ہیں۔ اور غیر جمہوری ملکوں سے اپنے معاملات میں وہ عموماً پابندیوں اور بندشوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ چونکہ جمہوری کلچر مکالمے اور جواز پر استوار ہے اس کے پھیلاؤ سے جس کی لاٹھی اس کی بھینس، کے رویے کیلیئے گنجائش کم ہوتی جارہی ہے۔اب بہت زیادہ جنگی عزائم کی حامل جمہورتیں بھی اس بات کی وضاحت کو اہمیت دینے لگی ہیں کہ وہ جنگ کا راستہ صرف آخری حربے کے طور پر اختیار کرتی ہیں، عام شہریوں کو تحفظ دیتی ہیں اور اپنے اقدامات کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔

عالمی سطح پر خدمت کا مفہوم واضح کرنا ذرا مشکل ہے۔ جائز جنگ کے اصولوں کا حقیقی زندگی پر اطلاق کیسے کیا جاسکتا ہے اس پر کوئی عام اتفاق رائے حاصل کرنا ناممکن ثابت ہوا ہے جیسا کہ عراق پر حملے اور کوسوو میں مداخلت کے موقع پر ہونے والے مباحث سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ملکوں کے اندر دباؤ کے وقتوں میں انصاف کے اصولوں کا اطلاق کرنا کبھی بھی آسان نہیں رہا۔مثال کے طور پر ویتنام کی جنگ کے دوران امریکی سینٹر مارک ہیڈ فیلڈ نے سینٹ میں ایک قرارداد پیش کی تھی جس میں امریکہ کو اپنے جنگی جرائم پر اظہار ندامت کیلیئے کہا گیا تھا۔ اس پر باوجود اس کے کہ اس نے صرف ابراہام لنکن کے خانہ جنگی کے دوران کسے گئے الفاظ ہی دہرائے تھے اسے غیر محبّ وطن ہونے کے طعنے سننے پڑے۔

تاہم اس میں کوئی شک کی بات نہیں کہ جنگ میں اب وہ پہلے والا طمطراق نہیں رہا۔ جنگ کے بارے میں لوگوں کے تصورات میں بہت تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اور تجربے نے بھی ان تبدیلیوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔جنگیں بپا کرنے والے اکثر یہ موقف پیش کرتے ہیں کہ جنگ سے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں اور تمام کشیدگیاں دور ہو جاتی ہیں۔ جہاں

allurdupdfnovels.blogspot.com

مسئلے طول پکڑ جائیں اور تنازعات کا کوئی حل نظر نہ آ رہا ہو تو لوگ بے فائدہ اور بے نتیجہ مذاکرات کی بجائے جنگ کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ تاہم جنگ بھی زیادہ فیصلہ کن کم ہی ثابت ہوتی ہے۔(4) بلکہ اکثر کیا ہوتا ہے کہ مسئلہ زیر زمین چلا جاتا ہے اور کسی اور روپ میں دوبارہ نمودار ہو جاتا ہے۔ یہاں اسرائیل اور فلسطین کے درمیان ایک زمانے سے چلی آتی لڑائی کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور دونوں عالمی جنگوں کو بھی ...... ان میں ہر جنگ فیصلہ کن حل کیلئے شروع کی گئی تھی لیکن ہوا وہی کہ پہلی عالمی جنگ نے افراتفری کو جنم دیا، دوسری نے بٹوارے کیے اور تیسری یا سرد جنگ انتشار و بدنظمی پر منتج ہوئی۔ دہشت گردی اور جبر بار بار ایک دوسرے کا بہانہ بنتے رہے ہیں۔

اگر جنگ مطلوبہ مقاصد کے حصول کے ذریعے کے طور پر اتنی موثر نہیں رہی، امن پر یہ بات اور زیادہ صادق آتی ہے۔ قوموں کے درمیان پر امن عادتیں جنگی عادتوں کی طرح مدد گار ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ اقدامات جو دوسروں کی سلامتی میں تخفیف کیے بغیر کسی قسم کی سلامتی میں اضافہ کرتے ہیں دوسرے متبادلات کے مقابلے میں زیادہ موثر رہتے ہیں۔ سرد جنگ کے آخری مراحل میں اور یورپی اتحاد نے ہمیں یہی سبق دیا ہے۔ زیادہ رویئت، شفاف پن اور باہمی نگرانی سے دونوں فریقوں کی سلامتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب ان اقدامات کی پیروی میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ گفت شنید پر آنے، دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرنے، اعتماد کرنے اور کھلے پن کا مظاہرہ کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ چاروں شانے چت لیٹ گئے ہیں کہ دوسرا جب چاہے حملہ کر لے۔ یہ سب اس قسم کی اخلاقی شد بد کی مثالیں ہیں کہ جسے تھیوری کی بجائے صرف عمل سے ہی سیکھا جا سکتا ہے۔

یہ دنیا بیشتر اعتبار سے ایک زیادہ پر امن جگہ بن چکی ہے۔ گذشتہ صدی کے نصف آخر میں ریاستوں کے داخلی تنازعات میں اضافہ دیکھنے میں آیا تو ریاستوں کے مابین تنازعات میں کمی ہوئی۔ ان میں سے بہت سے تنازعات استعماریت کے نکلنے کے عمل اور سرد جنگ کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ تاہم 1990ء کے عشرے کے اوائل سے مسلح تنازعات کی تعداد میں 40 فیصد اور بڑے تنازعات (1000 سے زائد فوجی ہلاکتوں پر منتج ہونے والی جنگیں) کی تعداد میں 80 فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اجتماعی ہلاکتوں کی سالانہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

تعداد میں بھی اسی شرح سے تخفیف دیکھنے میں آئی ہے۔[5]

جنگ و جدل کی بہت سی عادتیں اب روز بروز گذشتہ ارتقائی دور کے کسی بچے عضو کی طرح محسوس ہونے لگی ہیں۔ باقی اب جو چیز بچی ہے وہ عزت نفس اور غرور ہے جس کی اب مزید میدان جنگ کی زیر و رقم ریاضی سے تعریف نہیں کی جاتی۔ اس میں کوئی شک والی بات نہیں کہ ایک بہت عجیب و غریب نمونہ ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ جنگیں اب مزید قتل عام اور بدلوں پر منتج نہیں ہوتیں۔ اس کی بجائے وہ تحائف پر منتج ہوتی ہیں ...... مثلاً وہ مارشل پلان جس نے 1940ء کے عشرے میں یورپ کی تباہ حال معیشت کو سنبھلنے میں مدد دی۔ امریکہ کی طرف سے جاپان کو بڑے پیمانے پر دی جانے والی مالی اعانتیں (لیکن ویتنام کو یہ معاونت نہ مل سکی۔ اس کی غلطی شاید یہ تھی کہ وہ امریکہ کے ساتھ اپنی جنگ میں کامران رہا تھا) اور 2001ء میں افغانستان اور 2003ء میں عراق کو دی جانے والی امداد سب اس نئے نمونے کی تصدیق کرتی ہیں۔

اگر 'حقیقت پسندی' یعنی جنگ کو سیاست کی توسیع کے طور پر استعمال کرنے والی حریف قومی ریاستوں کی دنیا کے بڑے مفروضے تحلیل ہو چکے ہیں تو ان کے نظریاتی سہارے بھی باقی نہیں رہے۔ حقیقت پسندی (خصوصاً مورگن تھا اور اس کے پیروکاروں کے پیش کردہ نظریے میں) کا ایک سنگ بنیاد یہ تصور تھا کہ لوگ اور ریاستیں طاقت کی متلاشی ہوتی ہیں اور لہٰذا ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ طاقت ہرگز اچھی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں اخلاقیات کو کبھی بھی کوئی خاص وقعت حاصل نہ ہو سکی۔

اسے اکثر ایک عالمگیر طور پر درست دعوے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کچھ لوگوں کیلئے بعض اوقات درست ہو سکتا ہے لیکن یہ سب لوگوں کے لئے سب وقتوں میں درست نہیں ہوتا بلکہ اکثر لوگوں کیلئے اکثر اوقات بھی درست نہیں ہے۔ (جیسا کہ ہم نے اس سے قبل ملاحظہ کیا میکیاولی نے یہ لکھتے وقت حقیقت پسندی سے بھی زیادہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا کہ گراندی یعنی شہری اشرافیہ میں 'ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی بہت خواہش' ہوتی ہے، لیکن اکثر لوگوں میں 'واحد خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان پر کوئی غلبہ نہ پائے')۔

مزید برآں اس حد تک کہ بعض لیڈروں میں طاقت کی اس طرح کی جستجو ہوتی ہے اس کا حقیقت پسندی کے دوسرے بڑے جزو یعنی تصور مفادات سے تناؤ پیدا ہونا تقریباً ایک

allurdupdfnovels.blogspot.com

یقینی امر ہے۔ انیسویں صدی کے برطانوی وزیراعظم لارڈ پالمرسٹن اور اس وقت سے لے کر آج تک کی سفارتکاروں کے مطابق ریاست کے مفادات ابدی لیکن اس کے تعلقات عارضی ہوتے ہیں۔ تاہم اس سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ عوامی مفادات، قومی مفادات اور ریاست کے مفادات مماثل اور یکتا ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض شعبے ایسے بھی ہیں جن میں کسی گروہ کے مفادات غیر مبہم ہوسکتے ہیں (مثلاً تجارت اور بین الاقوامی اداروں کی مالی امداد کی شرائط) حقیقی صورتوں میں مفادات اکثر اتنے واضح نہیں ہوتے۔

حتیٰ کہ ریاستوں کے براہ راست مفادات خود بھی شاذ ہی یکتا ہوتے ہیں۔ اکثر ریاستیں اشرافیہ کے حریف اجزا (مثلاً تجارتی، فوجی، انسانی، پیشہ وارانہ) کی عکاس حریف قوتوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ تاریخی تناظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً ویتنام میں امریکی، سیر الیون میں برطانوی اور نومیبیا میں فرانسیسی مفاد کیا تھا؟

1960ء کے عشرے میں امریکہ کے وہ فوجی جو اس بارے میں پریشان تھے کہ وہ Hue یا Danang میں کیا کر رہے ہیں کسی معقول وجہ سے ہی پریشان تھے۔

پیچھے بیان کردہ تمام وجوہات کی بنا پر لوگوں کے مفادات اور ریاستوں کے مفادات کے درمیان خلا کا امکان ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ بین الاقوامی امور میں آ کر یہ خلا کچھ زیادہ ہی وسیع ہو جاتا ہے کیونکہ بیشتر ملکوں میں صرف معدودے چند امیر لوگ اور ادارے ہی ایسے ہوتے ہیں جن کے قابل قدر مفادات ملک کی سرحدوں سے پرے بھی ہوتے ہیں (یہی وجہ ہے کہ سیاست اس سے ہمیشہ بہت زیادہ مقامی اور داخلی ہوتی ہے کہ جتنی یہ باہر سے دکھائی دیتی ہے)۔ ریاستی مفادات زیادہ تر حکمران طبقوں اور ان طبقوں کے اندر موجود خاص لوگوں کے مفادات ہوتے ہیں۔ ماضی کی بیشتر جنگوں اور فوجی مہمات کو قومی پرچم کا لبادہ اوڑھا یا گیا یا ان کیلئے مفروضہ خطرات اور آن پر آنچ کو جواز بنایا گیا لیکن حقیقت پوچھیں تو ان کا مقصد یہ تھا کہ ان سے حکمرانوں کو کیا ملے گا۔ سمندر پار کی بیشتر مہمات میں چند افراد کو بازیاں جتوانے کیلئے ریاست کے اور بہت سے لوگوں کے وسائل کو داؤ پر لگایا گیا۔ یہ سلطنت اور استعماریت دونوں کی مشترکہ حکایت ہے۔ اور موخر دور کی بیشتر بین الاقوامی مہمات پر بھی یہی حکایت صادق آتی ہے۔ ایسی بہت سی مہمات میں ریاستوں پر بہت زیادہ مالی بار پڑا لیکن ان سے خاص خاص ٹھیکے داروں، فوجی صنعتوں اور وسائل نکالنے کا کام

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرنے والی کمپنیوں کی خوب چاندی ہوئی۔ انہوں نے خوب جھولیاں بھریں لیکن اکثریت کو اورعوام کو خاک بھی حاصل نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جمہورتیں اکثر اپنے حکمرانوں کو زنجیریں پہنانے کی کوشش کیوں کرتی ہیں؛ تاکہ انہیں جنگیں بپا کرنے میں دشواری پیش آئے۔ امریکی دستور بنانے والے بیرون ملک مہم جوئیوں سے اس قدر خوفزدہ کیوں تھے اور پارلیمانی اور اسمبلیاں اپنے صدروں اور وزیروں کو دائرے میں رکھنے کی کوشش کیوں کرتی رہتی ہیں، اس چیز کا مطالبہ کیوں کرتی ہیں کہ انہیں مزید جاننے کا حق دیا جائے کہ خفیہ ایجنسیاں ان کے نام پر کیا کر رہی ہیں اور فوجی کارروائی کرنے سے قبل ووٹ کا حق کیوں مانگتی ہیں؟

بین الاقوامی امور کی انجام دہی نے داخلی جمہوریت کے ساتھ قدم ملانے میں بہت وقت لیا ہے اور یہ اب بھی اپنا ماضی خادم ریاست کی بجائے مقبوضہ ریاست کے جزو کے طور پر ظاہر کرتی ہے۔ اس کا مشاہدہ برآمد کنندگان خصوصاً اعلیٰ ٹیکنالوجی اور اسلحے کے تاجروں کے امداد پر قبضے میں کیا جا سکتا ہے۔ (ایڈم سمتھ کے برآمدی امداد کی بے ہودگی ظاہر کرنے کے دوسو سال بعد) اسے اس رویے میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ بیشتر سفارتی خدمات سرمایہ وتجارت کو محنت اور انفرادی مسافروں پر ترجیح دیتی ہیں (اور ایک حقیقی جمہوریت میں اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے) ۔ یہ سب بین الاقوامی امور کی مخصوص کجی اور معروضی قومی مفادات کے نہ ہونے کی علامتیں ہیں۔

اس دور میں آ کر اس چیز کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے کہ عوام اپنے حاکموں کو لگامیں دے کر رکھیں۔ اس زیادہ مستقل و مربوط دنیا میں ماضی کے گناہوں کا سایہ حال پر بھی پڑ سکتا ہے۔ آج کے شہریوں کو پشتوں قبل کئے جانیوالے جرائم کیلئے مورد الزام ٹھہرانے کو کوئی زیادہ معقول رویہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر نازی جرمن میں یہودیوں پر ہونے والے مظالم، غلامی اور آئر لینڈ کے قحط کے تاوان کے مطالبات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ تعین کرنا مشکل ہو جائے گا کہ خط کہاں کھینچا جائے۔ تاہم ان میں سے بعض مطالبات جو کسی قوم یا گروہ سے ماضی کے گناہوں کی تلافی کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں کی ایک اخلاقی منطق ضرور بنتی ہے ۔1990ء اور2000ء کے عشروں کے دوران نیوزی لینڈ کے اس معاہدہ وائیٹانگی پر دوبارہ غور کیلئے منعقد کئے جانے والے طویل مذاکرات جس پر ابتداً 6 فروری1840ء کو دستخط کئے گئے تھے اس کی ایک کلاسیکی مثال ہیں۔ اگرچہ یہ کہنے کی کوئی تک نہیں بنتی تھی کہ اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

دور کے سفید فام نیوزی لینڈر اس بد اعتمادی کے ذمہ دار تھے جو اس معاہدے اور اس کی تعبیر پر چھائی رہی، انہیں اس کی تلافی کی ذمہ داری قبول کرنا ہی پڑی کیونکہ انہیں ماؤریوں کے ساتھ مل کر رہنا تھا جو دو چھوٹے جزیروں پر ان کے ساتھ ساجھی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ کچھ ایسا لگتا ہے کہ جیسے جدیدیت نے قدیم ہندوستان کے کرما کے تصور کو دوبارہ دریافت کر لیا ہو جس کے مطابق اچھے اور برے اعمال کے نیک یا بد اثرات عشروں اور صدیوں تک بھی باقی رہتے ہیں۔

جمہوریت کی بنیاد صرف اور صرف مفادات پر رکھنے کا مسئلہ اس سے بھی گہرا ہے۔ مفادات ایسی چیزیں نہیں جو فرق پیدا کرتی ہیں یعنی جو وقعت و اہمیت کی حامل ہوتی ہیں اور جن کیلئے لوگ کٹ مر سکتے ہیں اور قربانیاں دے سکتے ہیں۔ بیشتر لوگوں کے احساس تشخص میں مادی مفادات اور علامتی اقدار دونوں چیزیں شامل ہوتی ہیں اور جسے قومی مفاد کہا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ بجائے کسی قابل محسوس یا مادی چیز کے ایک علامتی قدر کے طور پر زیادہ با معنی ہے۔ چنانچہ ویت نام میں کمیونزم کے خلاف لڑائی (یا کیوبا میں کمیونزم کے فروغ) کا اخلاقی مقصد سے بھی اتنا ہی تعلق تھا جتنا کہ کسی واضح مادی مفادات سے ۔1980ء کے عشرے میں ایران میں اسلامی انقلاب کے فروغ اور امریکہ کے بعض طاقتور گروہوں کی طرف سے روس میں عیسائیت کی حوصلہ افزائی کے پیچھے بھی یہی چیز کارفرما ہے۔ اگر ریاستیں اپنے داخلی معاملات میں حقوق انسانی، انصاف، ماحولیاتی بہتری اور آزادی کا خیال رکھتی ہیں تو پھر وہ قومی مفادات کے نام پر بیرون ملک بھی ان چیزوں کو آسانی سے نظرانداز نہیں کر سکتیں۔

ریاست کا سرحدوں سے باہر دائرہ اختیار

امریکہ، فرانس، برطانیہ اور دوسری مغربی اقوام کی اختیار کردہ اخلاقیات کی تہہ میں کارفرما نظریہ اخلاقی اصولوں کو عالمگیر تصور کرتا ہے۔[7] اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ خادم ریاست کی ایک سوچ یہ بھی ہے کہ یہ اپنی خدمت کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنی سرحدوں کے پار تک بھی پھیلا سکتی ہے۔ ایک اچھی حکومت اپنے شہریوں کی بہبود و تحفظ کی ضروریات

allurdupdfnovels.blogspot.com

پوری کر کے دوسروں کی خدمت کی جستجو بھی کر سکتی ہے۔

اس تصور نے1960ء کے عشرے میں اور اس کے بعد بھی شمالی پروٹسٹنٹ ملکوں کی فیاضانہ سیاست کو گرمائے رکھا۔ خصوصاً کینیڈا اور سویڈن نے امداد اور ترقی کی ایسی پالیسیوں کی بنیاد رکھی جن کے مطابق اقوام اور مہارات ان طریقوں سے تقسیم کی جانے لگیں کہ جو فرانس یا برطانیہ کی پس استعمال پالیسیوں یا سرد جنگ کی امریکی چالوں سے قطعی مختلف تھا۔

اس تصور کی کہ کوئی ریاست اپنی خدمت کو سرحدوں کے پار تک بھی لے جا سکتی ہے واضح حدود موجود ہیں اور صرف اسی بناء پر نہیں کہ لا متناہی ضروریات اور محدود وسائل کے مابین خلا ہوتا ہے۔ اس کی سب سے اہم حد یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اقدام سے دوسروں کی خود مختاری کو گزند پہنچ سکتی ہے اور آچھائے اور افریقہ میں عیسائیت پھیلانے کی طرح کے خدمتی آدرش پھیلانے کی ماضی کی کوششوں کے خلاف آج کل بڑا اعتراض یہی اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بعض مہین حدیں اور بھی ہیں۔ کوئی ریاست اپنے شہریوں اور دوسروں کے درمیان غیر جانبدارانہ طور پر کام نہیں کر سکتی یا کرتی ہے تو پھر یہ ریاست یا اپنے شہریوں کی خادم نہیں رہتی اور یا بعض بنیادی اخلاقی اصولوں کو پریشان کرنے کے اندیشے کو مول لیے بغیر اپنی سرحدوں کے پار کام نہیں کر سکتی کیونکہ اگر کوئی ریاست سرحدوں کی پروا کیے بغیر پیسہ صرف کرے بھی تو یہ ان لوگوں سے پیسہ وصول نہیں کر سکتی کہ جو اس کے شہری نہیں اور اسی طرح یہ ان کو جوابدہ بھی نہیں ہو سکتی۔

یہ بات قانون پر بھی صادق آتی ہے۔ آج کل اس اصول کے حق میں بڑی گرما گرم بحثیں جاری ہیں کہ قوانین اور ان کا نفاذ غیر علاقائی ہونا چاہیے اور اس کے جواز کے طور پر یہ تصور بھی پیش کیا جا رہا ہے کہ اخلاقی اصول ہر جگہ ایک ہوتے ہیں۔ آئخمن پر نازی جرمنی میں کیئے گئے جرائم کی پاداش میں یروشلم میں چلائے جانے والے مقدمے نے ایک نظیر قائم کی۔ اس کے بعد بیلجیم نے عالمگیر قانون کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے1990ء کے عشرے میں کی جانے والی نسل کشی میں ملوث روانڈا کے چار شہریوں کو سزا سنائی۔2005ء میں ایک برطانوی عدالت نے ایک افغان کمانڈر فریادی سرورزداد کو 1990ء کے عشرے میں افغانستان میں کیئے جرائم کی پاداش میں اقوام متحدہ کے ٹارچر کنونیشن کے تحت سزا دی۔

ان مقدموں کے دوران بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ صرف زرداد

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے مقدمے کی مثال ہی دیکھ لیں جس پر حکومت برطانیہ کو تقریباً 3 ملین پاؤنڈ کی خطیر رقم خرچ کرنا پڑی اور بلا شبہ ان مقدموں سے تشدد اور نسل کشی کی حوصلہ شکنی کرنے میں بڑی مدد ملی۔ لیکن غیر علاقائیت کے اس اصول کے غلط استعمال کے امکانات بھی بہت زیادہ ہیں۔ ایسے فیصلوں کے جواز کو بھی چیلنج کیا جا سکتا ہے (ایک غیر ملکی جج کا کیا حق بنتا ہے کہ وہ میرے وطن کے بارے میں کوئی فیصلہ سنائے؟) اور شاذ و نادر مواقع کے سوا کسی ایک قوم کے نظام عدل کیلئے یہ عملی بات نہیں کہ وہ ساری دنیا کو اپنی عملداری میں لانے کی کوشش کرے۔

جنگ کو بطور آلۂ انصاف استعمال کرنے سے بھی اسی طرح کے مسائل جنم لیتے ہیں۔ کیا کوئی ریاست ایسے لوگوں کی نسبت کہ جو اس کے شہری نہیں غیر جانبدارانہ طور پر کام کر سکتی ہے، کیا انہیں خطرات سے تحفظ فراہم کر سکتی ہے اور کیا انہیں ان کی اپنی ریاست سے درپیش خطرات سے بچا سکتی ہے؟ اس نوع کی مداخلتوں کو بہت سے لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ وسیع تر مفاد کے پیش نظر جائز ہوتی ہیں مثلاً تنزانیہ کا عدی امین سے چھٹکارا دلانے کیلئے یوگنڈا پر حملہ، بھارت کی مشرقی پاکستان میں مداخلت جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش معرض وجود میں آیا اور ویتنام کھمیر روج کو وہاں سے نکالنے کیلئے کمبوڈیا پر حملہ۔ ان میں سے ہر ایک وسیع تناظر میں جائز جنگ کی تھیوری کے سب مطالبات پر پورا اترا۔ یہ دعویٰ بجا ہو سکتا ہے کہ فوری خطرہ درپیش تھا اور دیگر تمام طریقے آزما لئے گئے تھے (یہ مثالیں کم کم یاد کئے جانے والے اس اصول پر بھی پورا اترتی ہیں کہ اگر آپ پر حملہ ہو تو مارنے کی بجائے آپ کو مر جانا چاہیے۔ اپنے دفاع کو جنگ کا جواز نہیں بنایا جا سکتا، سوائے اس کے کہ جب دوسرے معصوم لوگوں پر حملہ کیا جا رہا ہو)[8] یہ مثالیں میشل والزر کی اس شرط پر بھی پورا اترتی ہیں کہ انسانی بنیادوں پر مداخلت صرف اس صورت میں جائز ہے کہ جب یہ ایسے اقدامات کے رد عمل کے طور پر کی جائے (کامیابی کی کافی توقعات کے ساتھ) 'کہ جن سے انسانیت کے اخلاقی ضمیر کو صدمہ پہنچا ہو'۔[9] دوسرے لفظوں میں ان میں سے ہر مثال میں جس ریاست پر بھی حملہ کیا گیا تھا وہ عالمی رائے عامہ کی غیر رسمی عدالت کے مطابق مجرم کے درجے تک پہنچ چکی تھی۔ ان مثالوں میں یہ بھی ہے کہ حملہ آور ملک مداخلت کے بعد بہت جلد اپنے لوگوں کے سامنے جوابدہ ایک فعال ریاست پیچھے چھوڑ کر دوسرے ملک سے نکل آیا۔ یہ نہیں کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

وہیں جم کر بیٹھ گیا۔

تاہم اس طرح کے تمام اقدامات کے خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ کلاوزوتز متنبہ کرتا ہے ہر جنگ میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ قابو سے نہ نکل جائے۔ ریاستیں اپنی سرحدوں کے اندر اس بات کا بہت سختی سے خیال رکھتی ہیں کہ لوگ قانون کو کہیں اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں کیونکہ اس سے بہت بھیانک نتائج برآمد ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ بری سے بری صورت میں اس سے انارکی اور افراتفری بھی جنم لے سکتی ہے جبکہ بہترین صورت میں بھی کیا ہو گا کہ انتشار کی حوصلہ افزائی ہو گی اور ریاست کی حاکمیت کو ضعف پہنچے گا۔ انہی وجوہ کی بنا پر بین الاقوامی نظام میں اس بات پر سخت حدود عائد کرنا پڑتی ہیں کہ ریاستیں اپنے مفادات اور سلامتی کیلئے خطرہ محسوس کرنے پر کیسا ردعمل ظاہر کر سکتی ہیں۔ جب کوئی تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو ہم تیسرے فریق مثلاً عدالتوں یا بین الاقوامی اداروں کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہ آ کر ثالثی کرائے کیونکہ وہ ایک معتدل جذباتی حالت میں ہوتا ہے۔ ریاستوں کی طرح ان تیسرے فریقوں یا ثالثوں میں بھی خامی ہو سکتی ہے اور بعض اوقات وہ کچھ کرنے کی گھڑی میں بھی کچھ نہیں کر پاتے۔ لیکن اگر کوئی انمشتر کہ قانونی اداروں کو نظر انداز کر کے یکطرفہ کارروائی کرتا ہے تو اسے صرف فوری اور براہ راست خطرے کی انتہائی صورتوں میں ہی اخلاقی و عملی طور پر جائز قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس طرح کی کار وائیاں دوسروں کو بھی آپے سے باہر ہونے کا جواز مہیا کر سکتی ہیں۔

یہاں ہم ایک مرتبہ پھر ویبر کی اس تنبیہ کی طرف آئیں گے جو اس نے سیاست کے دو مہلک گناہوں کے بارے میں کی تھی: حقیقت پسندی کا فقدان اور فیصلوں کے نتائج کیلئے ذمہ داری کا فقدان، کمزور مشترک اداروں کی اس دنیا میں حقیقت پسندی یکطرفہ کارروائیوں کو مہمیز دے سکتی ہے لیکن فیصلوں کے تمام تر نتائج کیلئے ذمہ داری ان کارروائیوں کیلئے ایک مضبوط زنجیر کا کام دے سکتی ہے جو بصورت دیگر بہت ضروری اور واضح طور پر برحق محسوس ہوتی ہیں۔ 1721ء میں شائع ہونے والی اپنی تصنیف 'فارسی خطوط' میں مونٹیسکو کہتا ہے کہ اگرچہ بعض اوقات بعض قوانین میں ترمیم کرنا ضروری ہوتا ہے انسان کو یہ تبدیلی صرف 'کانپتے ہوئے ہاتھوں' سے ہی کرنی چاہیے۔[10] جنگ کا استعمال خواہ مفادات کے آلہ کار کے طور پر ہو یا اصولوں کے اس پر بھی یہی بات لاگو ہوتی ہے اور یہ بھی ہے کہ ہمیں ایسے

allurdupdfnovels.blogspot.com

لیڈر پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے کہ جو قوت کے استعمال کا زیادہ دلدادہ یا اس سے متعلقہ ابہامات کو خاطر میں نہ لائے۔

خود کو ضبط میں رکھنا اس لیے بھی اہم ہے کہ داخلی محاذ کی نسبت بین الاقوامی محاذ پر اخلاقی طور پر بہت زیادہ ناگوار مواقع کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان سب کا خواب دینا نہ تو ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی جائز۔ دور دراز کے ممالک کی نسبت تنازعات کے پیچھے کارفرما ہمارے علم اور غیر ارادی نتائج سے متعلق ہماری حساسیت میں کمی کا امکان ہوتا ہے۔ مزید برآں جب ایک مرتبہ کسی دوسری ریاست کے بارے میں یہ تصور بن جاتا ہے کہ وہ خیر وشر کے درمیان تگ و دو کی غلط جانب پر ہے تو پھر افہام وتفہیم یا سمجھوتہ یا خیر کے نام پر اخلاقی سمجھوتوں کو تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

تدارکی یا پیش از وقت کارروائیوں کی منصوبہ بندی کے وقت 'کانپتا ہاتھ' اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ پیش از وقت حملوں کو صرف اسی صورت میں جائز قرار دیا جا سکتا ہے کہ جب مخبری بہت اعلیٰ معیار کی ہو اور نقصان کا خدشہ بہت سنگین نوعیت کا ہو۔ لیکن اگر پیش از وقت کارروائیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ چکنی ڈھلوان پر پھیلتی اخلاقی گنجل میں جا گرتی ہیں، کیونکہ اس بارے میں کافی علم کم ہی دستیاب ہوتا ہے کہ کس چیز کا تدارک کیا جا رہا ہے یا کہ اسے روکنے کے لئے عمل میں لائی جانے والی کارروائی کتنی موثر ثابت ہو گی (اگر دوسری جنگ عظیم کے دوران ناروے پر اپنے تدارکی حملے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جاتا تو اس سے حملہ آور کی اخلاقی ساکھ کو کتنا نقصان پہنچتا؟ لیکن خود ان منصوبوں کا تدارک تو ہٹلر نے ہی کر دیا)۔ کسی تدارکی یا پیش از وقت اقدام میں واضح نقص یہ ہوتا ہے کہ اس کی زمانی یا مکانی کوئی داخلی حدود و قیود نہیں ہوتیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی ممکنہ حملے یا اندرون ملک کسی مجرمانہ کارروائی کو روکنے کیلئے ہمیں کہاں تک جانا چاہیے؟ اس میں بنیادی نوعیت کا ایک اور اخلاقی مسئلہ بھی آ جاتا ہے جس کی نشاندہی وتوریا نے کئی صدیوں قبل یہ کہہ کر کی تھی کہ 'کہ اس بات کو قبول نہیں کیا جا سکتا کہ کسی شخص کو محض کسی ایسے گناہ کی پاداش میں ہلاک کر دیا جائے کہ جو اسے ابھی کرنا ہے'۔ (11)

بہت سی قوموں کا گاہے گاہے ایسے معاملات میں مداخلت کے لیے دل کرتا رہتا ہے کہ جو انہیں براہ راست متاثر نہیں کرتے ...... انسانی ہمدردی کی بنا پر یا کسی جابر حکومت کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

تختہ الٹنے کیلئے۔ آئینی حدیں ہماری اخلاقی حسوں پر قید نہیں لگا سکتیں۔ ہم دوسرے انسانوں کی ضروریات کا جواب انسانوں کے طور پر دیتے ہیں، قانونی مقولات کے طور پر نہیں اور جب ریاستیں اپنے شہریوں کی بہبود کے تحفظ پر آمادہ یا اسے تحفظ دینے کے قابل نہ رہیں تو پھر دل کارروائی پر اکڑ ہی پڑتا ہے۔ جب 1980ء کے عشرے میں ایتھوپیا میں قحط پڑا تھا اور صومالیہ فساد کی لپیٹ میں آیا تھا اور 1990ء کے عشرے میں سربیا نے کوسووو پر جبر و استبداد کا بازار گرم کیا تھا تو ساری دنیا کے لوگ چیخنے لگے تھے کہ بھائی کچھ کرو، بھائی کچھ کرو۔ اگر جنگوں کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کیا جائے تو یہ نفسیاتی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے بے چینی کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر عمل کی طاقت بھی ہو اور پھر بھی آپ عمل نہ کریں تو مکمل طور پر نہ سہی کسی نہ کسی حد تک آپ بھی ہونے والی زیادتیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔

تاہم کسی اقدام سے خود مختاری کا توازن تبدیل ہو سکتا ہے اور کسی بھی دور رس اقدام سے اس ریاست کی خود مختاری کا متاثر ہونا لازم ہوتا ہے کہ جس کے علاقے میں کوئی مسئلہ یا جرم واقع ہو رہا ہوتا ہے۔ جب یہ بات صاف طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ کوئی ریاست زیادتی کر رہی ہے یا اس کی ملی بھگت سے زیادتی ہو رہی ہے تو اس بات کا اخلاقی جواز مہیا ہو جاتا ہے کہ مظلوموں کی مدد کی جائے لیکن کسی دوسرے خود مختار ملک کا اس اختیار کو استعمال کرنا ہمیشہ مسائل کو جنم دیتا ہے خواہ وہ کارروائی کتنی بھی اچھی نیت سے کیوں نہ کرے۔

پانچو ولا کی مثال سے بہت سے دوسروں کو عبرت پکڑنا چاہیے تھی۔ پانچو ولا بیسویں صدی کے آغاز میں میکسیکی انقلاب کے ابتدائی مراحل میں امریکیوں کا ہیرو تھا لیکن جب وینوستیانو کرنیزا فاتح کے طور پر ابھرا تو پانچو ولا نے چواوہ کے اپنے آبائی علاقے میں پھر سے لوٹ مار اور ڈکیتیوں کا بازار گرم کر دیا۔ 1916ء میں اس کے گروہ نے سرحد پار امریکی نیو میکسیکو میں کولمبس پر دھاوا بول دیا جس پر لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔ صدر وڈ رو ولسن نے اس کی گرفتاری کیلئے فوج روانہ کی جو بڑھتے بڑھتے ایک لاکھ جوانوں تک پہنچ گئی اور اسے فضائیہ کی مدد بھی حاصل تھی۔ جب اس فوج نے صحراؤں اور پہاڑوں میں اس کی تلاش شروع کی تو میکسیکو کے عوام کے تیور الٹ گئے۔ وہ میکسیکی کسان جو کہ اس سے قبل تک اس کی حرکتوں سے تنگ تھے اسے غیر ملکی سینہ زوری کے سامنے سینہ سپر ایک باغی ہیرو گردانے لگے۔ ولا نے کئی ماہ تک امریکی فوجیوں کے ناک میں دم کئے رکھا جو بالآخر اگلے برس جنگل

allurdupdfnovels.blogspot.com

خوار ہو کر واپس لوٹ گئے۔ اس اقدام کے معاملے میں اہم بات یہ نہیں تھی کہ یہ جائز تھا یا کہ ناجائز بلکہ اہم بات یہ تھی کہ امریکی کارروائیوں نے ایک ملک کی خودمختاری کے غرور کو پامال کیا تھا۔

ووڈ رو ولسن تو پہلے ہی بہت جارح خارجہ پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ 'میں جنوبی امریکہ کے ملکوں کو یہ سکھاؤں گا کہ مزید اچھے لوگوں کو منتخب کیا کریں' اس نے کہا تھا۔ اس سے اس کا مقصد1914ء میں ڈومینیکن ریپبلک اور1915ء میں ہیٹی میں مداخلت کا جواز پیش کرنا بھی تھا۔ تاہم ان سے اور بے شمار دیگر ناکام مداخلتوں سے سبق یہ حاصل ہوتا ہے کہ کسی دوسری ریاست کے معاملات میں مداخلت کرنے والی کسی ریاست کیلئے یہ مشکل ہوتا ہے کہ اسے خادم تصور کیا جائے گا۔ ایسی ریاست ان لوگوں کو جوابدہ نہیں ہوتی کہ جن کی اسے خدمت کرنا ہوتی ہے۔ ایسی صورتوں میں بہت سا تاریخی بوجھ بھی ساتھ ہوتا ہے اور عین اس وجہ سے کہ وہ زیادہ تر پڑوسی ہوتی ہیں انہیں غیر جانبدار تصور نہیں کیا جا سکتا۔ طاقتور ملکوں خصوصاً بڑی طاقتوں کے اقدامات ان خدشات کو بہت ہی بلند درجے پر لے جاتے ہیں۔ اپنے نجات دہندوں سے خفگی بھی اتنی ہی فطری ہوتی ہے جتنی کہ ان کی تعریف اور یہ قدرتی امر ہے کہ سلطنت کی عادتیں، خواہ ارادے ان کے جتنے بھی نیک ہوں، سامراجیوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہوتی ہیں کیونکہ وہ رسمی مفہوم میں خادم بننے پر کبھی بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ 1945ء کے بعد یورپ میں کئے گئے 'امریکی اقدامات' جنہیں لنڈ ایسٹاڈ نے بجا طور پر 'سلطنت بوسیلہ دعوت' کہا ہے، اسی زمرے میں آتے ہیں۔[12] ہمیں ایک مرتبہ پھر اس عمومی سبق کی طرف واپس آنا پڑتا ہے کہ جب بھی کوئی ایسی شناخت خطرے میں پڑتی ہے کہ جو ہمارے لئے اہم ہوتی ہے تو یہ ہمارے لئے اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔

زیادہ غیر جانبدار وسیلے زیادہ سودمند رہتے ہیں۔ افریقی اتحاد، اقوام متحدہ جیسے عالمی اداروں اور ایسی تنظیموں کو کہ جن کا کام دوسروں کی خودمختاری میں دخل دینا نہیں بلکہ کسی خاص وقت پر کسی خاص مسئلے کو حل کرنا ہوتا ہے زیادہ کامیاب تصور کیا جاتا ہے اور ان پر کوئی پرانا بار بھی نہیں ہوتا۔ تاہم ان کو بھی غیر اور ظالم سمجھے جانے کا اندیشہ موجود رہتا ہے اور چونکہ یہ ادارے دوسرے ملک میں ایک ریاست کی طرح کام کر رہے ہوتے ہیں اس ملک کے اپنے لوگوں میں ریاست کی طرح کام کرنے کی استعداد کم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے طور پر افریقہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جسے گذشتہ تیس برسوں میں بہت زیادہ امداد تو ملی ہے لیکن وہاں قیادت و حکمرانی کے شعبے میں بہت زیادہ زوال بھی مشاہدے میں آیا ہے۔ اگنا تیف کے بقول اس سے استعداد میں اضافہ کیا ہونا ہے پہلے والی استعداد بھی جاتی رہتی ہے۔ طاقتور ملکوں کو غریب اور کمزور اقوام کو ہانکنے کی لت پڑ جاتی ہے جس سے غریب ا ور کمزور اس آزادی اور خود مختاری سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ غلطیاں کریں، ان سے سیکھیں اور چیزوں کو اپنے انداز سے سرانجام دیں۔

مداخلتوں اور ان سے پیدا ہونے والے اندیشوں کا لپکا ہمیشہ ایک حد میں رہے گا۔ لبرل اخلاقی نظریہ عالمگیر ہے لیکن اخلاقی جذبات یکساں نہیں ہوتے۔ اس بات کو کہ لوگوں کو دوسروں سے ہمیشہ ایک طرح سے پیش آنا چاہیے خواہ وہ اہل خانہ ہوں یا کوئی دور کے اجنبی، عملاً ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہے گا۔ قریبی اور ہم جیسے لوگوں کا درد دور کے اجنبیوں کے درد کی نسبت زیادہ براہ راست طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دکھائی دینے والے لوگوں کا درد نہ دکھائی دینے والوں کے درد کے مقابلے میں زیادہ براہ راست طور پر محسوس ہو گا (یہی وجہ ہے کہ کسی جنگ کا ثانوی نقصان کسی عام قتل یا اس جبر کی نسبت زیادہ شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ جو اس سے قبل ہوا ہوتا ہے)۔ یہ غیر یکسانیت مدد دینے والے ملکوں کو متاثر کرتی ہے۔ جہاں کارروائی کرنے کی غرض و غائیت انسانی ہمدردی ہوتی ہے، مداخلت کی تحریک معاشرے کا ایک حصہ زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے جبکہ کارروائی کرنے کی ذمہ داری دوسرے حصے پر پڑنے کا احتمال ہوتا ہے۔ (جس میں معاشرے کے سب سے پسے ہوئے حصوں سے لیے گئے فوجی بھی آ جاتے ہیں)۔

یہ تاملات ہمیں ایک مرتبہ پھر خدمت کے سوال کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل دو خدمتوں کے درمیان کا تناؤ ہے، ایک تحفظ، بہبود، انصاف اور سچائی کی ضروریات کی تکمیل سے متعلقہ خدمت اور دوسری وہ خدمت کہ جو احتساب اور اقتدار سے متعلق ہوتی ہے۔ اس میں شک والی بات نہیں کہ احتساب اور مشترک اقتدار کے بغیر خدمت ہو سکتی ہے۔ بہت سی آمر حکومتیں بھی خادم کے طور پر کام کرتی رہی ہیں۔ جبر کے مقابلے میں عموماً پدریت (یا مادریت) اخلاقی طور پر ترجیح کے لائق ہوتی ہے۔ جہاں ضروریات بہت شدید اور مقامی ادارے کمزور ہوں تو وہاں کارروائی نہ کرنا ایک غلط بات ہو گی اور اس کی سیدھی

allurdupdfnovels.blogspot.com

سادھی وجہ یہ ہے کہ وہاں جن لوگوں کی خدمت کی جا رہی ہے ان کو جواب دینے کیلئے کوئی قانونی نظام ہی وجود نہیں رکھتا۔ تاہم احتساب کے بغیر خدمت عدم استحکام کی طرف مائل ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد تنازعات اور مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ادھوری حقیقتوں اور منطق بازیوں میں لپٹے، خدمت کے نقاب کے پیچھے چھپے ذاتی مفاد کو روکنے کیلئے کچھ کرنا محال ہو جاتا ہے۔ بے لوثی کے جذبے سے پر غیر حکومتی تنظیموں پر بھی یہی بات لاگو ہوتی ہے۔ ہنگامی حالات میں خدمت سیاست پر مقدم ہو جاتی ہے لیکن جمہوریت کی فراست یہ کہتی ہے کہ خدمت اس وقت تک پائیدار ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آ جاتا کہ جن کی خدمت کی جا رہی ہوتی ہے۔ ان سب وجوہات کی بنا پر حریف اقوام کی حقیقت پسند دنیا اور عالمی طور پر عمل کرنے کے ذرائع اور جواز کی حامل عالمی حکومت کے آدرش کے درمیان نصف فاصلے کی پوزیشن مشکل اور اخلاقی اعتبار سے پست اور ناپائیدار ہو جاتی ہے۔

عالمی حکومت

لوگ ایک طویل عرصے سے عالمی حکومت کی بات کرتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ خدمت کے متضاد مفاہیم کو خود میں سمو کر مسائل کا حل پیش کر سکتی ہے۔ یورپی اتحاد کی مشرقی یورپ تک توسیع سے ان میں سے کچھ مقاصد حاصل بھی ہوئے ہیں اور اس نے غریب اور قابل رحم ملکوں کو یورپی اداروں کے برابر کے حصہ داروں میں بدل دیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا قدیم ریاستوں نے ضرورت اور مواقع دونوں کے ردعمل میں نمو پائی۔ ان گنجان باہمی طور پر منحصر آبادیوں کی کہ جن کیلئے 500 برس قبل ریاست وجود میں آئی تھی آج کل پوری دنیا میں نقل کی جا رہی ہے جس سے پانی کی فراہمی، آب و ہوا کی تبدیلی، حیاتیاتی گویا گونی میں انحطاط اور ان عدم توازنوں کی صورت حال ابتر سے ابتر ہوتی جا رہی ہے جو دنیا کے ان خطوں کہ جن کے پاس زیادہ مقدار میں خوراک پیدا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں اور ان خطوں کے درمیان نظر آ رہے ہیں کہ جنہیں خود کو خوراک مہیا کرنے کیلئے بہت زیادہ تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ جہاں ریاستیں دوسرے لوگوں کے مسائل کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ردعمل میں نمو پاتی ہیں، عالمی حکومت آہستہ آہستہ ریاستوں اور قوموں کے مسائل کے ردعمل میں نما پا رہی ہے جن میں پانی کے مسئلے پر بڑھتے ہوئے تنازعات اور فضا میں زہریلی گیسوں کا اخراج، خانہ جنگیاں اور نسل کشیاں اور دہشت گردی اور منظّم جرائم میں روز افزوں اضافے جیسے مسائل شامل ہیں۔ یہ مسئلے تحفظ، ارتباط اور قیدیوں کی مشکلات کے ان بہت سے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں جو کہ قدیم ریاستوں کا جواز مہیا کرتے تھے تاہم اب ان کا پیمانہ ماضی کی نسبت بہت بلند ہو چکا ہے۔ یہ زندگی موت کے مسئلے ہیں اور یہ ہم انسانوں کے لئے چیلنج ہیں جو تاریخ کا شکار بننے کی بجائے اپنی تاریخ خود بناتے ہیں۔

قومی ریاستوں کیلئے اب مزید یہ ظاہر کرنا ممکن نہیں رہا کہ وہ اپنے عوام کی امنگوں اور مفادات کا واحد وسیلہ ہیں اور زیادہ عقلمند ریاستوں کے پلے اب یہ بات پڑ چکی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کے بغیر اپنے فرائض پورے نہیں کر سکتیں۔ ان کے شہریوں کو دوسری ریاستوں کی مدد کے بغیر تحفظ فراہم نہیں کیا جا سکتا، دوسروں سے تجارت کے بغیر انہیں خوشحال نہیں بنایا جا سکتا اور اگر دوسرے تندرست نہیں رہتے تو انہیں بھی تندرست نہیں رکھا جا سکتا۔ ایک ایسی دنیا میں کہ جہاں لوگ صبح کسی ملک میں ہوتے ہیں تو شام کسی ملک میں، انصاف کو کسی ایک جگہ تک محدود نہیں رکھا جا سکتا اور سچائی تو کبھی بھی کسی سرحد کو نہیں مانتی۔ اس کا نتیجہ قومی ریاست کے اس بحران کی صورت میں برآمد ہوا ہے جس کا خلاصہ فلپ بوبٹ نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے:

کوئی بھی قومی ریاست اپنے شہریوں کو خطرناک ہتھیاروں سے تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتی، اپنے قومی قوانین (بشمول اپنے بین الاقوامی معاہدوں کے) پرعمل پیرا کسی بھی قومی ریاست کو یہ ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے لیڈروں کو مجرموں کی حیثیت سے کٹہرے میں نہیں کھڑا ہونا پڑے گا یا اس کے طرزِ عمل کو بین الاقوامی جبر کے لئے قانونی جواز کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ کوئی بھی قومی حکومت اپنی معاشی زندگی یا اپنی کرنسی کو موثر طور پر کنٹرول نہیں کر سکتی، کوئی بھی قومی حکومت اپنی ثقافت اور طرز زندگی کو تصویروں اور تصورات کی اشاعت سے نہیں بچا سکتی خواہ وہ کتنے ہی غیر اور ناگوار کیوں نہ ہوں، کوئی بھی قومی حکومت اپنے سماج کو اوزون کی تلفی، عالمی درجہ حرارت میں اضافے اور چھوتی وباؤں جیسی بین الاقوامی مشکلات سے نہیں بچا سکتی۔ (14)

allurdupdfnovels.blogspot.com

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام ریاستیں یکساں طور پر بے اختیار ہیں۔ بلکہ سرد جنگ کے بعد طاقت اور اخلاقیات کا ایک نیا جغرافیہ ظہور میں آیا ہے۔ اول تو وہ لاقانون علاقے ہیں جہاں قومی حکومتوں کا کوئی بس نہیں چلتا۔ مشرقی تمور، بخازیا اور بوسنیا جیسے علاقے بھی ہیں جہاں اقوام متحدہ کو محافظت، خوراک کی فراہمی اور امن و امان قائم کرنے کیلئے اکثر جانا پڑا ہے۔ دوم وہ علاقے ہیں جہاں صورتحال بہتر ہے اور جنہیں بین الاقوامی قانون کو تسلیم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ یورپ اس کی واضح ترین مثال ہے۔ تیسرے نمبر پر وہ ملک ہیں جو ایسی خارجی قدغن سے خوش نہیں۔ان میں شمالی کوریا جیسے 'غنڈہ ممالک' بھی شامل ہیں اور امریکہ و چین جیسے طاقتور ترین ملک بھی آ جاتے ہیں جن کی طاقت میں آنے والے برسوں میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔

ایسے مستقبل کے امکانات بھی موجود ہیں جس میں یہ دونوں ملک باہمی انحصار کے ان نئے مسائل کے حل کے سلسلے میں قیادت کے فرائض سرانجام دے سکتے ہیں۔ وہ اس مربوط دنیا کے دو قصبوں کے طور پر اپنی جگہ مضبوط بنائیں گے، کارروائی کے ان حقوق کا دعویٰ کریں گے کہ جو یہ دوسروں کو نہیں دیتے اور اپنے خریداروں اور اتحادیوں کو تحفظ فراہم کریں گے۔

ان دونوں ممالک کو دوسروں پر علاقائی کنٹرول کے کلاسیکی مفہوم میں سلطنتیں تو نہیں کہا جا سکتا سپر پاورز کہا جا سکتا ہے لیکن وہ طاقت اور دوسروں پر حکم چلانے کی خواہاں ضرور ہیں اور ایک ایسی دنیا کی آرزومند ہیں جہاں بڑے ملکوں اور چھوٹے ملکوں، خوش نصیب شہریوں اور بدنصیب شہریوں کیلئے اصول مختلف ہوں گے۔ ہیری ٹرومین نے جنگ عظیم کے بعد کہا تھا کہ 'ہم خواہ جتنے بھی طاقتور ہو جائیں ہمیں خود کو اس چیز کی اجازت نہیں دینی چاہیے کہ جو چاہیں کرتے پھریں' لیکن شاید آج کے امریکہ اور چین پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ یہ ایسی طاقت کے طلبگار ہیں کہ جس کی کوئی حد نہ ہو اور جس میں کوئی اور شریک نہ ہو اور اصول بھی وہ اپنی مرضی سے جو چاہیں جب چاہیں بناتے پھریں۔ اگر ہابز کا 'آدمیوں کیلئے بھیڑیا آدمی' سیاست کا نقطہ آغاز ہے تو 'سلطانوں کیلئے بھیڑیا سلطان' ریاستوں کے امور کا نقطہ آغاز ہو سکتا ہے۔اس نظریے کے مطابق ہمیشہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ حق کو طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کمزور اخلاقی مطالبات یا قانون کی حکمرانی کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

وعدے پر انحصار نہیں کر سکتا۔

سپر پاور کی بنیادی نشانی یہ ہے کہ یہ اس اخلاقی تصور کو چیلنج کرتی ہے جو مغربی تہذیب اور عالمی معاشرے کیلئے ایک مرکزی حیثیت اختیار کر چکا ہے یعنی وہ مقولاتی لازمہ جسے سب سے پہلے کانٹ نے الفاظ کا روپ دیا تھا اور جس کے مطابق کسی بھی اصول کے معتبر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا عالمگیر سطح پر اطلاق کیا جا سکے۔ سپر پاورز کی نشانی یہ ہے کہ وہ ایسے حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ دوسروں کو نہیں ملنے چاہئیں۔ یہ جوہری اسلحہ رکھنے، خاص خاص صنعتوں کو تحفظ دینے، فوجی قوت استعمال کرنے، پیش از وقت کارروائیاں کرنے اور اپنے دائرہ اثر میں مخرف ممالک سے ظالمانہ سلوک کرنے کے حقوق ہو سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک اخلاقیات ہر ایک کے لئے یکساں نہیں ہوتی۔ امریکہ و چین عصر حاضر کی واحد دو ممکنہ سپر پاورز ہیں اگرچہ بھارت اور روس بھی اس دوڑ میں شریک ہونے کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں اور یورپی اتحاد بھی یہ سمت اختیار کر سکتا ہے۔ امریکہ و چین دنیا کے بارے میں ان تصورات کے وارث ہیں جو 2000ء برس سے زائد عرصے سے ایک بہت بڑے پیمانے پر چلتے چلے آ رہے ہیں اور پھر دونوں انقلابی ممالک بھی ہیں (چین پر اب بھی اس کے قصر شاہی کے احاطے سے حکومت کی جا رہی ہے جبکہ روم واشنگٹن میں تبدیل ہو چکا ہے)۔[15]

ان دونوں میں سے کوئی ملک بھی سوائے حربے کے طور پر عالمی حکومت کی کسی پابندی کو قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا اگرچہ دونوں تعاون کو سود مند خیال کرتے ہیں (اور امریکہ میں بین الاقوامی امور پر جمہوری مباحث نسبتاً زیادہ کثرت سے دیکھنے میں رہے ہیں)۔ یہ جانتے ہوئے کہ عالمی حکومت انہیں نظر انداز نہیں کر سکتی دونوں اس سے اپنے اپنے انداز سے سمجھوتے عمل میں لانے کی جستجو میں ہیں۔ دونوں خود کو غیر معمولی اور یکتا ملک تصور کرتے ہیں۔ امریکی خود کو ایک اخلاقی مقصد کی حامل ایک اعلیٰ قوم اور صنعت و حرفت اور دولت میں سب سے بالا خیال کرتے ہیں۔ کبھی یہ ملک الگ تھلگ ہونے کی پالیسی کی طرف گامزن نظر آتا ہے تو کبھی یہ دنیا کی ایک آدرش کے مطابق تشکیل نو کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ چین بعض دیگر اعتبارات سے یکتا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے یکتا ہے کہ اس سے زیادہ آبادی کسی ملک کے پاس نہیں (اگر بھارت اوپر نہ آ گیا تو) تہذیب اور ریاستی طاقت کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

تسلسل کے اعتبار سے بھی یہ بے مثال ہے اور پھر چینیوں کو اس چیز کا بھی بہت قوی احساس ہے کہ تاریخ اب ان کے حق میں جا رہی ہے۔[16]

بڑی طاقتوں کے طور پر ان میں بہت بنیادی فرق دکھائی دیتے ہیں۔ چین سے موازنہ کریں تو امریکہ میں جمہوریت جوبن پر ہے، یہ بہت زیادہ شفاف ہے اور اختلاف سے اس قدر چیں بجبیں نہیں ہوتا۔ چین کے مقابلے میں بہت زیادہ طاقتور بھی ہے۔ کوئی دوسرا ملک اس کی جوہری صلاحیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ چاہے تو کسی بھی ملک کے جوہری ہتھیار بغیر کسی جوابی حملے کے خدشے کے تباہ کر سکتا ہے۔ تاہم اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اس کا تسلط عروج پر ہو گا۔ عالمی رائے عامہ اور عالمی اداروں کو تحریک میں لانے کیلئے جو بھر پور مقابلہ ہونے والا ہے اس کے آثار پہلے ہی سے دکھائی دے رہے ہیں۔ امریکہ اور چین دونوں دوسرے ملکوں سے دو طرفہ معاہدوں، خصوصی مراعات کی پیش کشوں اور مشروط امدادی پیکجوں کی چالیں چلیں گے۔ زیادہ مشکلات پیدا کرنے والے ملکوں کے خلاف دھمکیاں اور فوجی دباؤ استعمال میں لایا جائے گا۔ بہت زیادہ خطرہ یا خرچہ مول لیے بغیر اندرون ملک حوصلے بلند رکھنے اور بیرون ملک 'دوسروں کو تھپکی دینے' کیلئے ممکنہ طور پر کمزور دشمنوں کا انتخاب کیا جائے گا۔ (امریکہ بیس سالوں میں گریناڈا، پانامہ، افغانستان اور عراق جیسے چھوٹے اور ناتواں ملکوں سے لڑتا بھڑتا چلا آ رہا ہے)۔ اخلاق و ثقافتی مباحث اور جواز سازی، ٹی وی چینلوں اور ویب سائٹوں ، درسی کتابوں اور خبروں پر بہت زیادہ پیسہ صرف کیا جائے گا (چھپ چھپا کر عالمی حکومت کی بے سکتی ظاہر کرنے پر بھی پیسہ لگے گا اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں گے کہ یہ کوئی اقدامات عمل میں نہ لا سکے)۔

تاہم ان ممکنہ سپر پاورز یہ بھی نہیں کہ جو دل میں آئیں کرتی چلی جائیں۔ امریکہ کے بارے میں اب تک جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ روایتی جنگیں تو جیت سکتا ہے لیکن عوامی حمایت کی حامل فوجوں کے خلاف غیر روایتی جنگیں جیتنا اس کیلئے اتنا آسان نہیں رہا۔ صومالیہ، کولمبیا اور ویت نام کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ دنیا کے طول و عرض میں پھیلے اس کے 725 فوجی اڈے صرف قوت کی علامت ہی نہیں ہیں، ان سے امریکہ کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس کی بے مثل جوہری برتری نے ایران جیسے دیگر غیر جوہری ملکوں کو بھی شہہ دی ہے کہ وہ بھی اپنی فوجی خود مختاری کو برقرار رکھنے کے لئے اس کھیل میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

شامل ہوں۔ چین نے حالیہ برسوں میں ویتنام والی جو واحد عسکری مہم جوئی کی ہے اس میں اسے خجالت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دونوں سپر پاورز خوراک، توانائی اور منڈیوں کے معاملے میں دوسروں کی محتاج ہیں۔ ان کی محتاجی وسائل خصوصاً تیل کو کنٹرول کرنے کی جدوجہد میں شدت پیدا کرے گی۔ تاہم یہ چیز دونوں سپر پاورز کے درمیان گنجائش اور عالمی حکومت کو بھی ممکن بنا سکتی ہے۔ ایسی گنجائش اخلاقی اعتبار سے پیچیدہ ہوسکتی ہے لیکن ان آبادیوں یامعاہدوں سے زیادہ نہیں جن سے بیشتر ریاستوں نے آغاز لیا تھا۔ اس کیلئے سپر پاورز اور عالمی اداروں کے مفادات کو ایک جگہ مرتکز ہونا ہوگا، ایک ایسا ارتکاز جو محدود تعداد کے فیصلہ کن اقدامات اور تعاون میں مشترکہ دلچسپیوں کے گرد ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔

استعماریت کے بعد کی دنیا

استعماریت کے بعد ایک ایسی دنیا کس حد تک ممکن ہے کہ جو لوگوں، معاشروں اور قوموں کے مساوی حقوق کو تسلیم کرتی ہو؟ اچھی حکومت اور قانون کی حکمرانی سے متعلق ماضی کی سوچیں محض سوچیں ہی رہیں حقیقت کا روپ نہ دھار سکیں۔ جمہوری قومی ریاستوں میں جبر، محصولات اور جوازیت کا سلسلہ برقرار رکھنے کی صلاحیت اب بھی بین الاقوامی اداروں کی نسبت بہت زیادہ ہے اور وہ ایک برتر اخلاقی حیثیت کا دعویٰ اس لئے کرتی ہیں کہ انکے لیڈر عوام کے ذریعے براہ راست منتخب ہوکر آتے ہیں۔

تاہم یہ تصور کہ انسانی معاشروں کی بنیادی ضروریات سے استنباط کرنے والے اخلاقی فرائض کو خود کو عالمی سطح پر واضح کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کوئی واہمہ نہیں ہے۔ کیتھولک اور عیسیٰ کی تعلیمات کو دنیا میں حقیقت کی شکل دینے کے خواہاں دیگر مسیحی ممالک کا عزم ہمیشہ عالمی رہا ہے۔ اسی طرح اسلامی امہ اور اس سے منسلک فلاحی تنظیموں اور ہمدردی کو فروغ دینے والی تعلیمات، خوشحالی کے فروغ کیلئے کام کرنے والے بودھی سنگھ اور یوٹوپیا کیلئے جدوجہد کرنے والی کمیونسٹ پارٹی اور کومن ٹرن پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ان سب نے ایک عالمگیر اور بین الاقوامی مطالبے کو ادارے کی شکل دی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسے ادارے تعمیر نہ کرسکا کہ جو انسانی احتیاجات کو ہموار طریقے سے پورا کرتے اور ان

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں سے کوئی بھی ریاستوں کے اخلاق پر زیادہ پائیدار اثرات مرتب نہ کر سکا۔

ایک زیادہ شفیق عالمی نظام کے بارے میں سوچنے والے بیشتر ابتدائی مفکرین عالمی حکومت سے خوفزدہ رہے اگرچہ ان میں اس امن کی آرزو بھی موجود تھی جسے کہ عالمی حکومت یقینی بنا سکتی تھی۔ کانٹ کا خیال تھا کہ یہ ایک 'خوفناک آمریت' میں بدل سکتی ہے۔ عالمی حکومت کی زیادہ ریاست آسا شکلیں تاریخی اعتبار سے غیر معمولی ہیں۔ لیکن وہ کوئی 150 برس کے عرصے سے خاموشی سے اپنے ارتقاء کے سفر پر گامزن ہیں اور وہ ڈینیوب جیسے دریاؤں پر تجارت و راہداری کے انضباط کے معاہدوں اور انیسویں صدی کے وسط میں ڈاک اور بعد میں ٹیلی گرافی نظام کے انضباط کیلئے کئے گئے انتظامات کی بنیادوں پر استوار ہوئیں۔ انہیں ضرورت اور مشترکہ مفادات کی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ تاہم عالمی حکومت کے اس سے بڑے عزائم کو بالآخر عوامی سرگرمی اور عالمی سول سوسائٹی کے پنپنے سے بھی فائدہ ملا جس میں انیسویں صدی کے وسط کی غلامی مخالف تحریکوں اور 1880ء کے عشرے کی بلقانی تحریکوں سے لے کر بیسوی صدی کی حقوق انسانی، عالمی ماحولیات اور انسانی ہمدردی کی بنا پر مداخلت کی تحریکیں بھی آجاتی ہیں۔

قومی حکومت کی طرح عالمی حکومت سے منسوب بیشتر طاقت بھی پہلے حاصل کی گئی پھر اس پر اتفاق ہوا اور بعد میں اسے قانونی حیثیت حاصل ہوئی۔ 1945ء میں قائم ہونے والے اقوام متحدہ کی کہانی بھی یقیناً یہی ہے۔ ایک چھوٹا گروپ وجود میں آیا جس نے ایک تاریخی لمحے سے فائدہ اٹھایا۔ یورپی اتحاد کی نشوونما بھی یہی خواص ظاہر کرتی ہے۔ پختہ عزم کے مالک پہل کاروں نے رائے عامہ وضع ہونے سے بہت پہلے اپنا کام شروع کیا (گو انہوں نے قومی پارلیمانوں سے منظوری ضرور حاصل کی) اور وہ نہ صرف ایک مشترک افسر شاہی بلکہ کرنسی، مقننہ، عدالتیں اور ابتدائی سطح کی فوج جیسے قومی ریاست کے بیشتر لوازمات تخلیق کرنے میں کامیاب رہے۔ اقوام متحدہ کی بھی اپنی اسمبلی، افواج، بینک، طبی خدمات نیز عالمی عدالت انصاف اور بین الاقوامی عدالت فوج داری جیسے ادارے موجود ہیں۔

وہ محرکات جن کی وجہ سے عالمی تنظیمیں وجود میں آئیں اتنے ہی ملے جلے تھے جتنے کہ وہ محرکات جن کی وجہ سے قومی ریاستیں نمودار ہوئیں۔ طاقتور ملکوں نے بین الاقوامی

allurdupdfnovels.blogspot.com

اداروں کو اپنے مفادات پورے کرنے کے لئے استعمال کیا۔ سرد جنگ کے دوران سوویت یونین اور امریکہ دونوں میں سے ہر ایک کا بغل بچہ ریاستوں کا ایک اپنا کنبہ اور ایک اپنا محلّہ تھا جس کی ذمہ داری وہ قبول کرتا تھا۔ انہیں سب سے بڑا خطرہ یہ درپیش رہا کہ کسی بھی وقت کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا ہو سکتا ہے جس کے دوران کیا گیا کوئی تجاوز انہیں جواب دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔ طاقت کے متعدد مراکز کے حامل ملکوں میں نظم و نسق برقرار رکھنے کیلئے کوشاں کمزور حکومتوں کی طرح انہیں یہ خوف دامن گیر رہا کہ چھوٹے مسائل بھڑک کر بڑے تنازعات کی شکل اختیار کر سکتے ہیں اور انکے زیادہ لڑاکا پڑوسی انہیں جنگ میں شامل کر سکتے ہیں۔ ان کیلئے اقوام متحدہ چھوٹے مسئلوں کے غیر ضروری طور پر بڑا ہونے کے خلاف ایک طرح کی بیمہ پالیسی تھا۔ یورپ میں بھی ترقی صرف اس وقت کی بین الاقوامی سیاست میں کارفرما محرکات کی وجہ سے ہی ممکن تھی۔ فرانسیسی استعمار دم توڑ چکا تھا اور وہ اپنے تسلط کے اظہار کیلئے نئے وسیلے ڈھونڈ رہا تھا۔ جرمنی خود کو خود سے بچانے کی فکر میں تھا۔ چھوٹے ملک بڑے ضامنوں کی تلاش میں تھے اور تجارت بڑی سے بڑی منڈیوں کے چکر میں تھی۔

تاہم قیام کے بعد تمام حکومتوں کی ایک اپنی منطق ہوتی ہے جو مفادات پر مبنی کسی علتی وضاحت سے بڑی ہوتی ہے۔ یورپی اتحاد نے عوام کے شکوک و شبہات اور متصادم قومی مفادات کے باوجود توسیع اور زیادہ سے زیادہ ممالک کو اپنے ساتھ ملانے کی رفتار برقرا رکھی۔ اسی طرح اقوام متحدہ کے گرد بننے والی نوزائیدہ حکومت نے بھی علمی اتصال کی کوشش کی ہے ...... اپنے افسانے اپنے دوام کی علامتیں اور اقدار کا ایک ایسا ڈھانچہ بنانے کی جو اسے قومی ریاستوں کے ساز باز سے تحفظ دیتا ہے۔

عالمی حکومت سے بات چیت کرنا بامعنی ہوتا ہے کیونکہ ایسے اداروں کی واقعی چلتی ہے۔ وہ قوانین کو نافذ کرتے ہیں اور ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ ان کی قانونی حیثیت کو مانا جاتا ہے اور وہ عالمگیر ہوتے ہیں۔ لیکن وہ پیشے، افراد اور ٹیکنالوجی کی کمی کے سبب کچھ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں بے حساب ہیں لیکن ان کے پاس ٹیکس اکٹھے کرنے یا فوجی بھرتی کرنے کے اختیارات نہیں ہوتے اور نہ ہی ٹیکنالوجی تیار کرنے کے کوئی آزادانہ وسائل ہوتے ہیں۔ 1925ء میں جاری ہونے والے کیمیائی ہتھیاروں پر پابندی کے جنیوا معاہدے کی طرح کے ایسے بین الاقوامی قوانین کو جنہیں کہ بہت سے ممالک قبول

allurdupdfnovels.blogspot.com

کر چکے ہیں، کو بھی بلا دھڑک توڑا جا تا رہا ہے (مثلاً 1980ء کے عشرے میں صدام حسین ان کی خلاف ورزی کرتا رہا)۔ عالمی ادارے کو تا حال جواز کو طاقت میں تبدیل کرنے کے موثر طریقے نہیں مل سکے۔ ان کے پاس دنیا کے مشترکات (جیو سٹیشنری مدار، سمندر، انٹارکٹیکا یا سائبر سپیس) کو محصولاتی ذرائع بنا کر ان سے فائدہ اٹھانے کے حقوق نہیں ہیں اور ان کے ڈھانچوں کی توضیع نصف صدی قبل کے خطرات کے اعتبار سے تو بہتر ہو سکتی ہے لیکن یہ منظّم جرائم، آب و ہوا کی تبدیلی اور دہشت گردی جیسے آج کے خطرات سے نمٹنے کے اعتبار سے ٹھیک نہیں۔ دوسری طرف عالمی تنظیم برائے تجارت جیسے وہ ادارے جن کے پاس کچھ نہ کچھ طاقت موجود ہے وہ اس طاقت کو جواز میں بدلنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔

متصادم اصولوں کی وجہ سے ان اداروں کی اصلاح نہیں ہو پاتی۔ ان میں سے بعض اندھی طاقت کے غماز ہیں: اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل (جو کہ 1945ء کے فاتحین پر مشتمل ہے) کی فوجی طاقت، مالی اداروں (جو کہ امداد لینے والوں کی بجائے دینے والوں کا ساتھ دیتے ہیں) میں حق رائے دہی کی اقتصادی طاقت۔ بعض شہریت کے اصولوں کی عکاسی کرتے ہیں یعنی اس تصور کی کہ ہر شخص صرف موجودگی کے سبب مساوی رکنیت کا حقدار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہر ملک اپنے طرز عمل، آئین یا اقدار سے قطع نظر اقوام متحدہ (یا اولمپکس یا بہت سے دیگر عالمی اداروں میں) میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ عالمی معاشرے سے حوصلہ افزائی پانے والے اخلاقی اصولوں (مثلاً یہ اصول کہ بلا اشتعال جارحیت کی سرکوبی کی جانی چاہیے، آلودگی پھیلانے والوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا چاہیے یا یہ کہ تمام لوگ انسانی حقوق کے سزاوار ہوتے ہیں) اور ان کے نفاذ کے وسیلوں کے فقدان کے درمیان تناؤ کی صورت میں نکلتا ہے۔

عالمی اداروں کی پہلی کمزوری بعض تعمیری اختراعات کی موجب بھی بنی ہے۔ عالمی حکومت نے جزوی طور پر ایک کھلے نظام کے طور پر ارتقاء پایا ہے اور اسے جبری طاقتوں کی بجائے ابلاغیات اور علم نے مجتمع کیے رکھا ہے اور اسے فیصلہ سازی میں رسمی و غیر رسمی ان نیٹ ورکوں سے مدد ملی ہے جن میں 25000 کے قریب بین الاقوامی غیر حکومتی تنظیمیں بھی شامل ہیں۔ یہ ہزاروں کھلاڑیوں کی صف بندی کا کام بڑے اچھے طریقے سے کر سکتے ہیں (جیسے کہ بعض ملکوں نے کسی بہت زیادہ نمایاں قیادت کے بغیر خوشحالی حاصل کر لی ہے۔ ماہرین

allurdupdfnovels.blogspot.com

سیاسیات جاپان کا تجزیہ اکثر ایک نظام مراتب کی بجائے ایک نیٹ ورک کے طور پر زیادہ کرتے ہیں) اور آراء کی ایسی فضائیں پیدا کر سکتے ہیں جو فیصلوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ تاہم ان ڈھیلے ڈھالے نیٹ ورکوں کی ساخت مشکل فیصلوں اور قربانیوں، وسائل کے انتظام یا جواز یا مشترکہ اقدار کی پرورش کیلئے موزوں نہیں۔(17)

چاروں ذمہ داریاں اور عالمی حکومت

چنانچہ عالمی حکومت ایک واہمے کی بجائے ممکن کیوں ہے؟ انسانوں میں یہ ایک بہت زبردست اور حیران کن صلاحیت موجود ہے کہ وہ افق پر امکان کی معمولی سی کرن دیکھ کر بھی جوش و جذبے سے معمور ہو جاتے ہیں۔ تاہم یہاں ہم محض امنگوں کے بجائے تبدیلی کی ایسی لہروں کی بات کر رہے ہیں کہ جنہیں دیکھا جا سکے۔ عالمی حکومت واہمے سے کچھ بڑھ کر ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اس دنیا کا بڑھتا ہوا باہمی انحصار ہے اور دوسری وجہ خدمت، امن اور آزادی کی وہ مشترکہ اقدار ہیں جو ہر سیاسی روایت اور ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں (اگرچہ بعض مذہبی کتابوں میں قتل و انتقام کی ترغیب بھی ملتی ہے)۔

یہ تصور کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں کہ اگر اس کا غایتی اصولوں سے استنباط کیا جائے اور اگر اقوام عالم اور عالمی اداروں کے درمیان ایک معاہدہ (جان رانز نے اسے قانون اقوام کا نام دیا تھا) عمل میں آ جائے تو عالمی حکومت کیسے لگے گی۔ یہ سب اس چیز کی تصدیق کرتی ہیں کہ حکومتوں کو ہر سطح پر ایک جیسے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ اقوام متحدہ کا خاندان اور یورپی اتحاد میں جمع ہونے والے اداروں کا خاندان دونوں قومی ریاستوں کی طرح کے جواز کے ایک ہی جیسے اخلاقی ڈھانچے کے حامل ہیں۔ ان کی طرح یہ بھی اپنی اخلاقی قوت اور علمی ڈھانچہ انسانی معاشروں کی تحفظ، بہبود، انصاف اور سچائی کی بنیادی ضروریات سے اخذ کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اب ایک عالمی جہت اختیار کر چکا ہے، تحفظ کے معاملے میں بہت زیادہ اور دوسرے معاملات میں اس سے کم۔ عالمی ادارے ان ضروریات کا جواب کیسے دیتے ہیں وہ قومی ریاستوں سے لازماً مختلف ہو گا، چھوٹے معاشروں کی تو خیر بات ہی چھوڑیں۔ موخر الذکر ایسے اخلاقی مباحث

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے حامل ہوتے ہیں جو بہت فراواں اور موقع محل کے مطابق ہوتے ہیں اور ان کا تعین تاریخ نے کیا ہوتا ہے۔ مختلف النوع معاشروں کی خدمت کرنیوالے عالمی اداروں کیلئے عالمگیر مشترک اخلاقیات کو زیادہ محدود ہونا پڑتا ہے۔[18] تاہم ان ذمہ داریوں کی شکل مماثل ہوتی ہے۔

عالمی تحفظ

کسی بھی عالمی حکومت کا فرض اولین تحفظ کی فراہمی ہوتا ہے ......جنگوں کے تدارک اور انہیں محدود رکھنے کیلئے قوانین کا نفاذ، امن قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کی صلاحتیں اور خطرات و آفات سے بچنے کیلئے قوتیں۔ ہینز کیلسن جس نے اقوام متحدہ کی تشکیل کیلئے ذہنی سوچ مہیا کرنے کے سلسلے میں بہت زیادہ کام کیا تھا، نے اس بحث کو اس کی واضح ترین صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ قومی ریاستیں حق پر مبنی کسی معاشرے کے حصول کیلئے داخلی طور پر غیر موزوں وسیلے ہیں۔ ضرورت ایک ایسے برتر نظام کی ہے ...... عالمی سطح کے ......جس میں سے قومی حکومتوں کے قوانین کو اخذ کیا جا سکے۔ صرف یہی چیز اس بات کی ضمانت دے سکتی ہے کہ طاقتور ریاستیں کمزور ریاستوں پر غلبہ حاصل نہیں کریں گی۔ یہ مخصوص ریاستوں سے بالاتر ایک عالمگیر معاشرہ ہوگا، جو سب کو خود میں سمو لے گا اور نظام کو ایک نئی ماورائی طاقت چلائے گی اور ریاستوں کے مابین مقابلے کی انارکی کا خاتمہ کرے گا۔[19]

کیلسن سیاست پر قانون کی بالا دستی پر یقین رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ قانون کو تمام طرح کی آئیڈیالوجی سے پاک اور طبعی علم یا ثبوت سے آزاد کر دیا جائے۔[20] اقوام متحدہ کا مقصد محض قومی حاکمیت سے ماورا ہونا نہیں بلکہ خودخود مختار سیاسی نظام کے تصور سے ماورا ہونا اور اس کی جگہ قانون کا دینا تھا۔ مشکلات کے باوجود اس وژن کا کچھ حصہ اس صورت میں شرمندہ تعبیر ہو چکا ہے کہ بین الاقوامی قانون نے طاقتور ترین ریاستوں کیلئے بھی جارحانہ جنگ کے اخراجات میں اضافہ کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ سے اغماض کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ جیسا کہ عراقی حملے کے بعد امریکہ کے علم میں آیا جب وہ قیام امن میں مدد دینے کیلئے کافی اتحادی حاصل کرنے سے قاصر ہو گیا تھا۔ ابھی تک بھی کوئی ایسے رسمی قوانین موجود نہیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

کہ جو لوگوں کو ان کی اپنی ریاستوں سے بچانے کی عالمی معاشرے پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کی تعریف کر سکیں لیکن اس بارے میں بہت شدت کی بحث و تمحیص سننے میں آتی رہی ہے کہ اس ذمہ داری کو رسمی شکل کیسے دی جائے اور اس چیز کو یقینی بنانے کیلئے کیسی شرائط عائد کی جائیں کہ مداخلت پکی عادت میں تبدیل نہ ہو جائے۔[21]

تاہم کیلسنکی قوانین کی حکمرانی کی سوچ سنگین ترین خطرات سے نپٹنے کیلئے غیر موزوں ہے۔ مجموعی اعتبار سے پوری دنیا کی سطح پر خود مختار حکومت سے کٹ کر قوانین ضرورت سے زیادہ مجہول بھی ہو جاتے ہیں اور بہت زیادہ بے لچک بھی، بہت بے جان بھی ہو جاتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ سخت بھی۔ بعض مرتبہ جو چیز اخلاقاً ٹھیک ہوتی ہے قانوناً غلط ہوتی ہے۔ اسی طرح قانونی درستی بذاتہ اقدامات کو عالمی برادری کی نظروں میں جائز نہیں بنا سکتی۔ حکمرانوں اور عوام کے درمیان ایک متحرک تعلق سے آنے والے سیاسی تحکم کے بغیر اقوام متحدہ کے بین الاقوامی قوانین بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اس چیز کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے کہ کوئی عالمی لیویا ثان کی طرح کی کوئی چیز ہونی چاہیے کہ جس کے پاس تہذیب کو درپیش خطرات سے نپٹنے کیلئے کافی مگر محدود اختیارات ہوں، ایک ایسے عہد کے خطرات سے جب انتہائی طاقتور حرفتیں افراد کی پہنچ میں بھی ہیں اور ریاستوں کی بھی اور جہاں اجتماعی اقدامات سے انواع کی بقاء کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

اقوام متحدہ کے بانی تحفظ کے جن اصولوں پر متفق ہوئے تھے ان کا خیال تھا کہ بڑے خطرات دوسری قومی ریاستوں سے لاحق ہوتے ہیں چھوٹے گروپوں، نیٹ ورکوں یا نظاموں سے نہیں۔ تاہم اب دنیا کی بیشتر آبادی کیلئے معاشی زبوں حالی، دہشت گردی اور آب و ہوا کی تبدیلی جیسے خطرات حملے کے خطرے کی نسبت زیادہ اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ رواں صدی کے تیسرے عشرے تک فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی شرح اس سطح تک پہنچ سکتی ہے کہ جسے معمول پر لانا ممکن نہیں رہے گا اور اس آلودگی کا چوتھا حصہ امریکہ و چین سے آئے گا۔ سمندروں کی بلند تر ہوتی سطح سے بنگلہ دیش جیسے ملکوں میں بڑی بڑی آبادیوں کو پہلے ہی خطرہ لاحق ہو چکا ہو گا۔ عین اسی وجہ سے کہ آب و ہوا کی تبدیلی پر قابو پانے کیلئے درکار اقدامات کے اخراجات و فوائد کی تقسیم بہت غیر یکساں ہو گی اتفاق رائے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ تاہم فی الحال کوئی ایسی طاقت نظر نہیں آتی کہ جو مستقبل کی

allurdupdfnovels.blogspot.com

سلامتی کیلئے سب سے زیادہ خطرہ پیدا کرنے والے ملکوں اور صنعتوں کے کان کھینچ سکے۔

نوع انسان کی ان ماحولیاتی نظاموں کو تبدیل کرنے کی صلاحیت کہ جن پر اس کا دارو مدار ہے اور ان کے توازن کو ڈرامائی طور پر درہم برہم کرنے کی صلاحیت ہر چیز کو تبدیل کر دیتی ہے اور پھر قانون کے کافی ہونے کا امکان بھی کم ہو جاتا۔ یہ حکومت کے لئے اس کے خالص ترین مفہوم میں ایک احتیاج یعنی ایک ایسی قوت کی ضرورت پیدا کرتی ہے جو لوگوں کو کسی آفت سے بچا سکے۔

سلامتی کو ہتھیاروں سے درپیش خطرات بھی تقریباً اتنے ہی اہم ہیں ...... ہتھیاروں کی ڈرامائی طور پر ہلاکت آفریں طاقت نے پہلے کی نسبت بہت زیادہ نگرانی کا جواز پیدا کر دیا ہے تاکہ انہیں قابو میں رکھا جا سکے۔

اٹھارہویں صدی کے خاتمے پر لزبن میں1755ء کے زلزلے سے ہونے والی تباہی کا داغ بہت نمایاں ہے۔ تشکیک کے اس عہد میں لوگوں کا خیال تھا کہ خدا نے یہ زلزلہ اپنی طاقت ظاہر کرنے کیلئے بھیجا ہے۔1812ء میں ماسکو کی تباہی نے بڑے پیمانے کے جنگ و جدل کے ایک نئے عہد میں انسان کی طاقت کو ثابت کر دیا۔ ڈریسڈن، ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی نےdeterrance کے دور کا آغاز کیا۔ اس کی جذباتی قوت نے سرد جنگ کے انتہائی ہیجان خیز دنوں میں بھی امن برقرار رکھا۔ شاید وہ دن دور نہیں کہ جب، اس مرتبہ دہشت گردوں کے ہاتھوں کسی اور شہر کی تباہی یا شاید آب و ہوا کی تبدیلی کے سبب پیدا ہونے والی کوئی بہت بڑی قدرتی آفت دنیا پر یہ ثابت کرے گی کہ ریاست کا ایک نیا عہد ضروری ہو گیا ہے۔

عالمی بہبود:

عالمی حکومت کی دوسری ذمہ داری بہبود ہے۔ جیسا کہ ہم ملکوں کے اندر ملاحظہ کرتے ہیں حکومت کا بڑا کام قوانین بنانا ہوتا ہے۔ تجارتی قوانین بہت معقول انداز سے وضع کیے جاتے ہیں لیکن اگر امیر ملکوں کے طاقتور مفاداتی گروہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ تجارتی شرائط ان کے حق میں نہیں جا رہیں[22] تو ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔ بہبود کی فکر عالمی بینک اور عالمی ادارہ صحت کی صورت میں بہت طویل عرصے سے اداراتی شکل اختیار کر چکی ہے اگرچہ اس

allurdupdfnovels.blogspot.com

پر جو وسائل خرچ کیے جاتے ہیں ان وسائل کا عشر عشیر بھی نہیں کہ جو قومی ریاستوں کے توسط سے خرچ ہوتے ہیں۔ ہزاری ترقیاتی اہداف (MDGS) میں بہبود کو زیادہ نمایاں جگہ دی گئی ہے (اگر یہ اہداف پورے ہو بھی جاتے ہیں تو 1.6 بلین افراد غسلخانوں اور 900 ملین پینے کے پانی تک آسان رسائی سے پھر بھی محروم رہیں گے)۔ [23]

عالمی حکومت کیلئے اس سے زیادہ دشوار کام نئے مشترکات یعنی وہ مشترک اشیاء کہ جن پر زندگی کا دارومدار ہوتا ہے، کے ملکیتی حقوق کی تعریف اور نفاذ ہوگا۔ ان میں پانی کے حقوق (جو بیشتر دنیا میں بقاء کے مسئلے کی حیثیت اختیار کر لیں گے)، آلودگی پیدا کرنے کے حقوق اور خلا یا سمندروں کو استعمال کرنے کے حقوق شامل ہیں۔ایک ڈرامائی طور پر غیر مساوی دنیا میں انصاف کی حمایت کر کے کوئی بھی قابل اعتبار عالمی حکومت امیر ترین اور طاقتور ترین ریاستوں کو چیلنج کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تاہم ایک باہم متصل معاشرے میں روشن خیالی، ذاتی مفاد اور شرمندگی کی قوت یکجا ہو کر رویوں کی صورت گری میں طاقتور کردار ادا کر سکتے ہیں (جیسا کہ مثال کے طور پر ایچ آئی وی/ ایڈز کی اہم دواؤں کے سلسلے میں یورپی اور امریکی دوا ساز اداروں کے ملکیتی حقوق کم کرنے کے معاہدوں میں دیکھنے میں آیا ہے)۔

عالمی انصاف

عالمی حکومت کی تیسری ذمہ داری انصاف ہونی چاہیے یعنی بین الاقوامی قانون کے اصول نیز ایسی عدالتیں قائم کرنا کہ جن کے پاس مجرم قرار دینے کے اختیارات کے علاوہ بعض صورتوں میں قومی قوانین کو رد کرنے کے اختیارات بھی ہوں مثلاً جیسے کہ یورپی عدالت انصاف، عالمی عدالت انصاف اور عالمی عدالت فوجداری ہے۔ بعض ملکوں نے خود کو ان عدالتوں سے الگ رکھا ہوا ہے اور وہ ان کی تحقیقات کو قابل توجہ نہیں سمجھتے ۔ بہت سی ریاستیں غیر قانونی اقدامات کی مرتکب ہوتی ہیں لیکن وہ سزا سے بچ نکلتی ہیں مثلاً امریکہ نے 1980ء کے عشرے کے وسط میں وسطی امریکہ میں دہشت گرد نیم فوجی تنظیموں کی مدد کی اور فرانس نے نیوزی لینڈ میں گرین پیس کے خلاف دہشت گردی کا مظاہرہ کیا لیکن نہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

امریکہ کو اس کی بداعمالیوں کی کوئی سزا ملی اور نہ ہی فرانس کو۔

چونکہ عالمی انصاف خود مختار طاقت سے محروم ہے، یہ صرف جزوی طور پر ہی موثر ثابت ہوسکا ہے اور یہ واضح نہیں کہ یہ مستقبل میں کیا رخ اختیار کرتا ہے اور اس کا دائرہ کار کیا ہوگا۔ ایک اندازفکر عالمی برادری کی رکنیت کے فوائد کو انصاف کے مشترک اصول تسلیم کرنے سے مشروط کرسکتا ہے جن کا تعلق جنگ وتجارت کے شعبوں کے علاوہ ماحولیاتی نقصان اور سماج دشمن رویے سے بھی ہوگا (مثلاً آمریتوں کو محدود وسائل فروخت کرنے سے روکا جا سکتا ہے)۔ جبکہ دوسرا اندازفکر سنگین ترین جرائم کے معاملے میں مشترک عدالتی طریق کار پر اتفاق رائے حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔

عالمی علم

عالمی حکومت کی چوتھی ذمہ داری علم اور سچائی کا فروغ ہونا چاہیے۔ فروغ علم کے غیر رسمی نظاموں جن میں سائنسی دعووں کی رفاقتی نظر ثانی کا عالمی نظام بھی شامل ہے، نے عمومی طور پر ان رسمی نظاموں سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے کہ جنہیں اقوام متحدہ اور یورپی اتحاد کی حمایت حاصل ہے۔ دلیل، استدلال اور مکالمہ عملاً بین الاقوامی نظام کی جائز بنانے والی سچائیوں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

آب و ہوا سے متعلق کسی اتفاق رائے پر پہنچنے کیلئے کوشاں بین الاقوامی پینل برائے تبدیلی آب و ہوا سے منسلک ہزاروں سائنسدان سچائی کی متلاشی عالمی برادری کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ گاہے گاہے سچائی کے بہت زیادہ سیاسی تصورات سے راؤ چاؤ کرتا رہا ہے مثلاً1980ء کے عشرے میں نئے عالمی معلوماتی نظام کی بحث میں (جسے ریاستیں مضبوطی سے کنٹرول کرسکتی تھیں) تاہم عالمی اداروں کے طریق کار کے مطابق روز مرہ سیاسی کنٹرول کے فقدان نے سچائی کی جستجو اور ثبوت سے اس سے زیادہ کومٹ منٹ ممکن بنا دی ہے کہ جو قومی ریاستوں کے اندر رہ کر ممکن تھی۔

اہداف کے یہ چاروں مجموعے انہی وجوہات کی بنا پر ظہور پذیر ہوئے ہیں جس بنا پر وہ ملکوں میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ وہ انسانی معاشروں کی ان بنیادی ضروریات کی عکاسی

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرتے ہیں جنہیں افراد، خاندان یا چھوٹے گروہ خود سے پورا نہیں کر سکتے۔ اس چیز کی کوئی ضمانت نہیں کہ ان اہداف کو عملی جامہ پہنایا جائے گا اور کسی موقع پر پسپائی کے آثار بھی اتنے ہی ہو سکتے ہیں جتنے کہ پیش قدمی کے۔ تاہم وہ ہمیں یہ سوچنے کا ایک طریقہ مہیا کرتے ہیں کہ کن ضروریات کا اہتمام عالمی سطح پر ہونا چاہیے اور نچلی سطح کے اداروں (یعنی قومی ریاستوں اور خطوں) پر کس طرح کے دباؤ اور شرائط لگانے کی ضرورت ہے کہ جس سے اچھا بننا آسان اور برا بننا دشوار ہو جائے۔

عالمی حکومت کی عوامی بنیاد ابھی ترقی پذیر ہے۔ بعض حالیہ سرووں کے مطابق عالمی آبادی کا صرف 6 فیصد حصہ خود کو اپنے علاقے، ملک یا خطے سے زیادہ دنیا سے شناخت کرتا ہے۔ تاہم بعض جگہوں پر یہ شرح بہت بلند ہے مثلاً امریکہ میں 20 فیصد اور زیادہ آمدنی والے افراد میں یہ 9.2 فیصد تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف عالمی آبادی کا 48 فیصد حصہ اقوام متحدہ کے حاصل کردہ نتائج کو بہت زیادہ یا کچھ نہ کچھ حد تک تسلی بخش گردانتا ہے۔ اس رائے کے حامل گروہ میں سے 65 فیصد شمالی امریکہ میں آباد ہیں۔[24]

یورپی اتحاد پر بھی اسی طرح کے جواز کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کے اداروں کو قانونی حیثیت اس لیے حاصل ہوئی ہے کہ وہ امن وخوشحالی کا ایک نظام عدل دینے میں کامیاب رہے ہیں (اس کے علاوہ اس نے علم اور یورپی انداز فکر کے فروغ کیلئے بھی کچی پکی کوششیں کی ہیں)۔ یورپ کی سب کامیابیاں عملی اور خاموش خدمت کی کامیابیاں ہیں۔ اس کی تمام تر ناکامیاں عظمت کی جستجو اور فیصلہ سازی کے ایسے طریقوں کی مرہون منت ہیں جو خدمت کا الٹ ہیں: خفیہ، پرحجاب اور اشرافیہ۔

صرف اس بات سے کہ تحفظ یا بہبود عالمی سطح پر ضروری ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ چیزیں عالمی حکومت کی براہ راست ذمہ داریوں میں شامل ہونی چاہئیں۔ ایک عمومی اصول کے مطابق کوئی اکائی جتنی بڑی ہو راست اقدام کی بجائے ارتباط وصف بندی سے اتنا ہی زیادہ کام لیا جانا چاہیے کیونکہ اس میں غلط اطلاعات اور غلطی کا امکان بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ عالمی حکومت کو محافظت کیلئے براہ راست کردار صرف اور صرف ان علاقوں میں مداخلت تک محدود رکھنا چاہیے جن میں قومی یا علاقائی ادارے یہ کردار ادا نہیں کر سکتے، بہبود کو فروغ دینے کیلئے صرف وہاں اقدامات کرنے چاہئیں جہاں دوسرے

allurdupdfnovels.blogspot.com

واضح طور پر ناکام ہو چکے ہوں، تادیب کو وہاں بروئے کار لانا چاہیے جہاں جرائم کی نوعیت بہت سنگین ہو اور جہاں ممکن ہو سکے کارروائی کیلئے مستقل افسر شاہیوں کی بجائے محدود المیعادی سپیشلسٹوں سے کام لینا چاہیے۔

ان مختلف مناصب کو کسی ایک واحد ڈھانچے میں یکجا کرنا بھی ضروری نہیں ۔ یورپ نے یہ کر کے دکھادیا ہے کہ حکومت کو کسی ایک نیٹ ورک میں کیسے منظّم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ادارے ایک دوسرے سے مقابلہ بھی کرتے ہیں اور تعاون بھی اور ان میں ایک براہ راست طریقے سے منتخب پارلیمان ہے جو انتظامیہ اور خود مختار عدلیہ کو مقرر نہیں کرتی اور امور کمیشن ، مجلس وزراء اور پارلیمان کے درمیان تعلقات کا ایک تہہ دار مجموعہ بھی شامل ہے۔

عالمی سطح پر یہ چاروں ذمہ داریاں بہت مختلف قسم کے ادارے انجام دے سکتے ہیں ۔ محافظت کیلئے جو چیز درکار ہے وہ ہے طاقتور انتظامیہ (شاید اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے تجربے پر استوار کوئی عالمی سطح کا پروٹیکٹوریٹ) جو بقاء کو درپیش قلیل المدتی، وسط المدتی اور طویل المدتی خطرات سے نپٹنے کیلئے طاقتور اختیارات کی حامل ہو لیکن اس چیز کیلئے انتہائی سخت قوانین بھی موجود ہونے چاہئیں کہ ان اختیارات کو کیسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ دوسرے بہت سے کاموں مثلاً تجارت ، تبادلے ،معلوماتی بہاؤ، ذہنی ملکیت، چھوتی امراض وغیرہ کیلئے مشترک قوانین درکار ہیں ۔ اس کے علاوہ غربت، پانی کی قلت اور ضروری نئی حرفتوں کی ترقی جیسے معاملات کے لئے الگ ادارے ہونے چاہئیں۔ عدل و انصاف کیلئے نچلے درجے کے اداروں کے ساتھ ایک واضح نسبت سے کام کرنیوالے خود مختار عدالتی انتظامات ہونا ضروری ہیں۔ یہ تمام منصب ارتقاء پا کر قومی ریاستوں سے منسوب ڈھانچوں سے بہت آگے اسی ارتباط کے ان کھلے نظاموں کی طرف جا سکتے ہیں جو رسمی سمت کی بجائے معلومات ، بحث مباحثے اور چھان بین پر منحصر ہوتے ہیں۔ اسی طرح مزید بین الاقوامی قوانین کو مقامی یا قومی عدالتوں کے ذریعے قابل نفاذ بنایا جا سکتا ہے۔ ریاستوں کے روایتی لوازمات مثلاً چند ہزار نمائندوں پر مشتمل عوامی اسمبلیاں، مشترک افواج اور کرنسیاں آئندہ درپیش کاموں کی نسبت نا مناسب ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس قسم کی پیچیدہ جیومیٹری ممکن بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔ تاہم اربوں افراد کے سچے خادموں کا کردار ادا کرنے کیلئے کوئی سے بھی عالمی اداروں کیلئے خصوصی بندشیں نیز اختیارات

allurdupdfnovels.blogspot.com

درکار ہوں گے۔ میں اس سے قبل وہ تمام شرائط (مثلاً مقابلہ، قانون کی حکمرانی، تقسیم اور کھلا پن) گنوا چکا ہوں جو کہ طاقت کے غلط استعمالات کو روکنے کیلئے قومی حکومتوں پر عائد کی جاتی ہیں۔ عالمی اداروں کیلئے انجام کار اس سے بھی زیادہ کڑی بندشیں عائد کرنا ضروری ہوگا۔ کسی عالمی تنظیم کی سب سے بڑی خامی یہ ہوسکتی ہے کہ اس میں مقابلے کا فقدان ہوسکتا ہے۔ ایک طاقتور اور اجارہ دارانہ عالمی حکومت، جیسا کہ کانٹ کو بھی فکر تھی، بڑی آسانی سے ایک جابر جن کی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ اسی لئے تقسیموں، داخلی مقابلے اور تحکم کی بجائے ارتباط وتعاون کے حصول کیلئے کھلے نظاموں کو بروئے کار لانے کو مستحسن خیال کیا جاتا ہے۔

عالمی اداروں پر خصوصی بندشوں کی ضرورت کیوں ہے اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ میں پہلے یہ بات کر چکا ہوں کہ ریاستیں قانون سے ایک مبہم نسبت پر استوار ہوتی ہیں۔ وہ آئین بناتی ہیں لیکن اس کے تابع بھی ہوتی ہیں اور ان کے پاس ضرورت پڑنے پر قانون کو معطل کرنے کا حق بھی ہوتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی موجودگی اس اختیار کے غلط استعمال کے خدشات کو کم کر دیتی ہے۔ تاہم عالمی حکومت کے لئے اس نوع کے خدشات بہت زیادہ ہو سکتے ہیں۔ کسی بھی حکومت کی طرح عالمی لیویاثان کے پاس بھی ہنگامی حالت کے اعلان اور قوانین کو معطل کرنے کا اختیار ہونا چاہیے لیکن ان اختیارات کے استعمال کے ضمن میں اس پر قومی حکومتوں سے بھی زیادہ بندشیں عائد ہونی چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی حکومت کا بعض اعتبار سے نچلے درجوں کے تابع ہونا ضروری ہے۔ عالمی حکومت پر دیگر اضافی پابندیاں اس کے اداروں سے منسلک افراد کی اخلاقیات سے آنی چاہئیں۔ عالمی اداروں نے تاحال اپنی اخلاقیات اور اس بات پر کہ انہیں کیسے دیکھا جاتا ہے کوئی توجہ نہیں دی۔ پیشہ وارانہ تشکیل کو زیادہ ترجیح نہیں دی گئی۔ یورپی کمیشن کئی برسوں سے آڈٹ اور تحقیقات کی مزاحمت اور بھانڈا پھوڑنے والوں کو ملازمت سے فارغ کرتا چلا آرہا تھا اور پھر 1999ء میں فراڈ، اقربا پروری اور غیر ذمہ داری کی ایک رپورٹ سامنے آنے پر کمیشن کی ساری قیادت کو مستعفی ہونے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ تحقیق کرنے والے نے اپنی رپورٹ میں 'کمیشن کے ارکان میں اپنی ذمہ داری قبول کرنے میں بڑھتی ہوئی ہچکچاہٹ'، کا ذکر کیا تھا۔ 'کسی ایسے شخص کا ملنا کہ جس میں احساس ذمہ داری نام کی کوئی تھوڑی سی چیز بھی ہو، مشکل ہوگیا تھا۔[25]

allurdupdfnovels.blogspot.com

اقوام متحدہ میں بھی اس کے ملازمین کے اعلیٰ عزائم کے باوجود پیشہ وارانہ اخلاقیات کا کلچر بہت کمزور رہا ہے۔ اس ضمن میں وہ طریقے بھی مددگار ثابت نہیں ہو سکے ہیں کہ جن کے مطابق دنیا کے مختلف حصوں کیلئے کوٹے مقرر کیے جاتے ہیں اور جو کارکردگی کو صرف ایک ڈھیلے ڈھالے انداز سے انتظام میں لاتے ہیں۔ یہ کوٹے اقوام متحدہ کو قانونی حیثیت دینے کیلئے ضروری ہو سکتے ہیں اور کسی بھی عالمی ادارے کو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس دنیا کی مانند نظر آئے کہ جس کی یہ خدمت کرتا ہے۔ تاہم کوٹوں کا بے لچک اطلاق اگر اخلاقیات اور موثریت کو ضعف پہنچائے تو اس سے جواز کو نقصان پہنچتا ہے۔2004ء میں کیے جانے والے ایک سروے سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ اس ادارے کے عملے کا خیال ہے کہ انتخاب، ترقی اور آنک کے وقت دیانت اور اخلاقی رویے، کو مناسب وزن نہیں دیا جاتا۔ عملے نے اس کے علاوہ بھرتی اور ترقی کیلئے علاقائی کوٹے، واضح اخلاقی ضوابط کے فقدان، ترقی بلحاظ سنیارٹی اور بھانڈا پھوڑنے والوں کے تحفظ اور نظم ونسق پر کسی خارجی نگرانی کے فقدان کے بارے میں شکائت کی۔ (26)

عالمی اداروں سے لے کر عالمی عوام تک براہ راست احتساب ناممکن ہے۔ چھ یا آٹھ بلین افراد کیلئے دور دراز مقامات پر بیٹھے حکمرانوں اور افسر شاہیوں کو منتخب و برخاست کرنے یا ان کی چھان بین کرنے کا کوئی آسان طریقہ موجود نہیں۔ بہت زیادہ اجارہ دارانہ اداروں میں مقابلے کو فروغ دینا بھی آسان نہیں ہوتا۔ تاہم احتساب و مقابلے کا عدم امکان مضبوط اخلاقیات کی ضرورت کو اور بھی دو چند کر دیتا ہے۔ انہیں اعتماد استوار کرنے کے ضمن میں زیادہ بار برداشت کرنا پڑتا ہے۔ عالمی آبادی کی خدمت کی ذمہ داریوں سے زیادہ تحریک انگیز نظام اقدار کا تصور مشکل ہے۔ عالمی حکومت کی ساکھ بنانے کیلئے ان اقدار اور عالمی اقدام کیلئے درکار وسیع تر مہارات کا کار پردازوں کو شعوری طور پر سکھایا جانا ضروری ہے۔ اسی طرح ان کی کڑی نگرانی اور ان کا ان لوگوں پر واضح ہونا بھی اہم ہے کہ جن کی خدمت کی جا رہی ہے۔

مشروط عالمی شہریت

allurdupdfnovels.blogspot.com

مستقبل میں عالمی ادارے بیک وقت کئی جہتوں میں ارتقاء حاصل کریں گے۔ بعض ویسے ہی غیر مشروط رہیں گے کہ جیسے وہ ہیں اور اقوام عالم کو چھوٹے بڑے حقوق بغیر ذمہ داریوں کے پیش کرتے رہیں گے جن میں حملے کے خلاف تحفظ اور اسی امداد کا حق شامل ہے کہ جس میں تھوری سی مالی معاونت کے اور کوئی ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں۔

تاہم غیر مشروط شہریت کی خامیاں بین الاقوامی امور میں بھی اتنی ہی نمایاں نظر آتی ہیں جتنی کہ داخلی امور میں۔ اگر رکنیت کے حقوق کسی قسم کی مشروط ذمہ داریوں کے بغیر ملنا شروع ہو جائیں تو مفت خوری ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ مشترکہ اقدار اور قابل قبول طرز عمل کے متفقہ معیارات کے بغیر معاشرے کے اخلاقی مطالبات کا نیچے جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کے ضمن میں یہ بات پہلے ہی واضح ہو کر سامنے آ چکی ہے۔ ایک ایسے نظام میں کہ جس میں لیبیا جیسے ملک حقوق انسانی سے متعلقہ کمیٹی کی صدارت کر سکتا ہو اور سعودی عرب خواتین کے مقام پر مشاورت دیتا ہو، جواز کے فقدان کا ہونا لازم ہے۔ اس کا ایک متبادل یہ ہو سکتا ہے کہ عالمی حکومت کے اجزاء کی رکنیت کو زیادہ واضح طور پر مشروط کر دیا جائے (جیسے کہ عالمی تنظیم برائے تجارت کی رکنیت پہلے ہی ہے) اور اسے مقررہ اقدار سے زیادہ براہ راست طریقے سے منسلک کر دیا جائے۔ عالمی معاشرے سے خدمت کے حقوق کا انحصار ملک کے اندر شہریوں کی قابل ثبوت خدمت اور رکنیت کے فوائد کا دارومدار عالمی مفاد کیلئے سودمند طرز عمل پر ہونا چاہیے۔ اس طریقے سے تشکیل پانے والی عالمی حکومت یورپی اتحاد کی طرح قوت تجاذب کے توسط سے نمو پائے گی اور اس کیلئے واضح طور پر اقدار کو بنیاد بنایا جائے گا۔ یورپی اتحاد کے یورپ کی طرح اسے تحفظ باہمی شفافیت سے حاصل ہو گا اور یہ لوگوں کو با اختیار بنانے کیلئے مطابقت اور پیمائش کے واضح نظاموں کو استعمال کرے گی تا کہ وہ ریاستوں سے زیادہ کا مطالبہ کر سکیں۔ شرم کی قوت رسمی تعزیرات کی جگہ لے لے گی اور ہر سطح کی حکومتوں کو غربت، آب و ہوا اور صحت کے شعبوں میں کام کرنے والی سماجی تحریکوں کے ساتھ مل کر ارتقاء پانے کا موقع ملے گا۔

اس طرح سے اقوام متحدہ کے ساتھ ساتھ جمہورتیوں کا ایک اتحاد بھی عمل میں آ جائے گا۔ اس کی رکنیت ابتداء میں تو جمہوریت اور حقوق انسانی وغیرہ سے مشروط ہو گی لیکن وقت

allurdupdfnovels.blogspot.com

گزرنے کے ساتھ زیادہ سخت شرائط عائد دی جائیں گی جن میں اہم ترین شرط یہ ہوگی کہ اراکین اپنی افواج کو مشترکہ کمانڈ میں شامل کرنے پر آمادہ ہوں اور اپنے طور پر جنگ لڑنے کے حق سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ تنظیم اپنے کام میں تصادم کے تدارک سے لے کر بیماریوں کی روک تھام تک خدمت کے آدرشوں کو عملی جامہ پہنائے گی۔ یہ پہلے تو اقوام متحدہ کے اندر ہی ایک بڑے گروہ کے طور پر کام کرے گی لیکن بالآخر اقوام متحدہ کے زیادہ تر فرائض کو اپنے ذمے لے لے گی۔

یہ بات واضح نہیں کہ آیا بڑی طاقتیں زیادہ مشروط اور اقدار پر مبنی بین الاقوامی اداروں میں شامل ہوں گی کہ نہیں۔ انہیں یکتائی اور غیر مساوی طاقتوں کے دعوؤں سے دستبردار ہونا ہوگا۔ یقیناً ان کے اس صورتحال میں گرفتار ہونے کا اندیشہ ہے کہ جس کی بات لوی نے قدیم روم میں کی تھی: 'ہم نہ تو اپنی خامیوں کو برداشت کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے علاج کو'۔ تاہم ان کے شہری دوسرے ہم خیال ملکوں کے ساتھ شامل ہونے اور کم محدوش اور کم غیر یقینی ماحول کے بدلے میں خود مختاری سے دستبردار ہونے کو سود مند خیال کر سکتے ہیں۔ بعض حالیہ سرووں سے سامنے آنے والے حقائق واضح طور پر اسی سمت اشارہ کرتے نظر آتے ہیں۔ 2005ء میں عالمی رائے عامہ کے ایک بڑے پول کے مطابق جس میں 24 ملکوں کے 24000 افراد کی رائے معلوم کی گئی تقریباً دو تہائی یعنی 64 فیصد نے ایک زیادہ با اختیار اقوام متحدہ اور 63 فیصد نے اقوام متحدہ کی اسمبلی کی رکنیت کیلئے انتخاب کے حق میں رائے دی۔ ایک بڑی اکثریت نے غیر حکومتی تنظیموں اور یورپ کے زیادہ بڑے کردار کے حق میں بھی رائے ظاہر کی کیونکہ یورپ نے حکومتوں اور تبدیلی کے ضمن میں اپنے بعد الجدیدی انداز فکر کی بدولت دنیا میں حکومت کے سب سے زیادہ قابل رشک ماڈل کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور دنیا اسے امریکہ کی نسبت زیادہ مستحسن نظروں سے دیکھنے لگی ہے۔(27)

زیادہ واضح طور پر مشترک اقدار پر استوار عالمی نظام کی مثالیں پہلے سے موجود ہیں مثلاً قرون وسطیٰ کے یورپ میں قوموں کے اپنے تنگ نظر مفادات کیلئے بھاگ دوڑ کی سطحی تصویر تہذیبی اتفاق رائے کی اس بڑی پیائش کو چھپا لیتی تھی جو قومی اقدامات کی رہبری کرتی تھی اور اس پر قدغن لگاتی تھی۔ اس اتفاق رائے میں یورپی اتحاد یا اقوام متحدہ کی اداراتی

allurdupdfnovels.blogspot.com

شکل جیسی کوئی چیز نہ تھی لیکن حکمران گروہ شادیوں، طاقتور اداروں اور سب سے زیادہ کیتھولک چرچ کے بندھنوں سے آپس میں مربوط ہوتے تھے، قومی سرحدوں کے پار کارروائیاں کرتے تھے اور قومی ریاستوں کے جواز کو چیلنج کرتے تھے۔ عالمی حکومت کیلئے بھی اس کے متوازی ایک راستہ ممکن ہے۔

'حقیقت پسندی' ماضی میں حقیقت پسندانہ تھی کیونکہ اخلاقی رویے کی تعزیرات بہت معمولی تھیں۔ ایک ایسی دنیا میں کہ جس میں مشترک اقدار اور جزا وسزا پر مبنی مضبوط مشترک ادارے موجود ہوں دنیا کے تانے بانے میں اخلاقیات سرائیت کر سکتی ہے۔ یہ حقیقت پسندی کو غیر حقیقت پسندانہ بنا دے گی اور داخلی اقلیم (جس میں سیاست اور اخلاقیات براہ راست مربوط ہوتے ہیں) اور بین الاقوامی اقلیم (جس میں ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بھی دور کے رشتہ داروں کی ہوتی ہے) کے درمیانی خلیج کو پر کر دے گی۔ ایسی دنیا ابھی تک تو محض ایک خواب ہی ہے اور جارح بڑی ریاستوں کی سازشوں کا شکار ہو سکتی ہے لیکن یہ جتنی اب ممکن ہے پہلے کبھی بھی نہ تھی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 15

مستقبل کی خدمت

''آئندہ آنے والی نسلوں نے اب تک میرے لیے کیا کیا ہے؟'' (گراؤچو مارکس)

میں نے گذشتہ صفحات میں قومی و عالمی دونوں قسم کی حکومتوں کے بارے میں تفصیلاً بات کی ہے اور اس چیز کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ عوام کی خدمت کے ضمن میں ان پر کون سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور وہ اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہیں اور کیسے کر سکتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ریاستوں کو صرف آج کے شہریوں کو ہی نہیں بلکہ آنے والے دور کے مفادات کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ جو ریاست صرف موجودہ دور کے شہریوں کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے جتن میں لگی رہتی ہے اور آنے والے کل کا نہیں سوچتی اس کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ معاشرتی مفادات (اور ان ماحولیاتی نظاموں کے مفادات کہ جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے) کو صحیح معانی میں پورا کرنے کیلئے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہی ہے۔ بیشتر معاشرے اس بات کی سمجھ رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ خدمت کے مشن صرف موجودہ لوگوں اور چیزوں تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ یہ کوشش کی جانی چاہیے کہ ہم اپنے پیچھے آئندہ نسلوں کیلئے ایک بہتر دنیا چھوڑ کر جائیں۔

یہ عزائم ان بہت سے گمبھیر مسائل سے متصادم ہوتے ہیں جن کا کہ حکومتوں کو اپنے روز مرہ معمولات میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب میں نے 1997ء میں برطانوی حکومت میں شمولیت اختیار کی تھی تو یہ مسائل اور دباؤ اس قدر شدت اختیار کر گئے تھے کہ مستقبل کی فکر کو فی الحال ایک طرف رکھ دیا گیا تھا کہ اس کو بعد میں دیکھیں گے، پہلے موجودہ مسائل پر

allurdupdfnovels.blogspot.com

توجہ دی جائے۔ اس سے کیا ہوا کہ عوامی خدمات کیلئے مختص اقوام میں تیزی سے تخفیف ہونے لگی، بجٹ برس بہ برس کی بنیاد پر بننے لگے اور بیماریوں اور جرائم پر کی جانیوالی سرمایہ کاری کم ہونے لگی۔1990ء کے عشرے کے وسط تک صورت حال یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ کوئی شخص مرکز اقتدار سے جس قدر قریب ہوتا چلا جاتا تھا اس کا زمانی افق اسی قدر سکڑتا چلا جاتا تھا۔ آپ اندازہ کریں کہ جو اس وقت کے وزیراعظم کے سب سے قریبی معتمد اور مشیر تھے ان کے پاس اتنی توانائی اور وقت نہیں بچا تھا کہ وہ چند ماہ یا بلکہ چند ہفتوں سے بھی آگے کی سوچ سکیں۔ ان کے بلند وبالا آدرش اور سوچیں بس یہاں تک ہی رہ گئیں تھیں کہ ان کی حکومت چند دن مزید کیسے نکال سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں بھی آپ دیکھتے ہوں گے کہ حکومتیں قرض پر قرض چڑھاتی چلی جاتی ہیں، عوامی اثاثوں کا ستیاناس ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ قلیل وسائل کو بیچ بیچ کر مزید قلیل کرتی چلی جاتی ہیں۔

حکومتیں اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچتی ہیں اس کا ان کے طرز عمل پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔1990ء کے عشرے کے وسط کے برطانیہ کی بات کریں تو قلیل اکثریت کی حامل اس حکومت کو باور ہو گیا تھا کہ اس کے مستقبل کا کوئی حال نہیں چنانچہ اس سے وابستہ افراد کی سوچ تھی کہ آنے والے لوگوں اور دنوں کے بارے میں ان کی کوئی ذمہ داری نہیں بنتی لیکن دوسری مثالوں مثلاً1906ء ،1945ء اور1979ء کی حکومتوں کو دیکھیں تو یہ مستقبل کے بارے میں بہت زیادہ احساس ذمہ داری کی حامل نظر آتی ہیں اور اپنے پیچھے ایک پائیدار تبدیلی کے نقوش چھوڑنے کیلئے بہت زیادہ فکر مند اور بھاری خطرات مول لیتی دکھائی دیتی ہیں۔[1]

اچھی حکومت کو مستقبل پر نظر رکھنی چاہیے لیکن بہت سی حکومتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو سائڈ مرر سے پیچھے ہی دیکھتی رہتی ہیں ۔ پرانی جنگوں کو پھر سے لڑتی ہیں اور قدیم دشمنیوں کو از سرنو ہوا دینا شروع کر دیتی ہیں۔1990ء کے عشرے میں سربیا میں برسر اقتدار صدر سلوبوڈان ملوسووچ کو اپنے عوام کی فلاح و بہبود کی تو اتنی فکر نہ تھی وہ اپنی کرسی کو بچانے کیلئے ہر دم1389ء میں لڑی جانے والی جنگ کوسوود کی دبی چنگاریوں کو پھر سے بھڑکانے میں لگا رہتا تھا۔ جب حال پر ماضی اس قدر غالب آ جائے تو پھر مستقبل کی ذمہ داری یا اس کے امکانات کا احساس ماند پڑنے لگتا ہے۔ تاریخی عمق کا احساس نہ رہے تو ملک کو نقصان پہنچنے کا

allurdupdfnovels.blogspot.com

اندیشہ ہوتا ہے اور یہ خدشات بڑھنے لگتے ہیں کہ کہیں ماضی کی غلطیوں کا پھر سے اعادہ نہ ہونے لگے (امریکہ میں استرداد کیلئے اکثر کہا جاتا ہے کہ 'یہ ماضی کی بات ہے')۔ ابن خلدون 'نقاب الٹنے' کے حق میں تھا کیونکہ 'حماقت کی چراگاہ انسانیت کیلئے اچھی نہیں ہوتی'۔ تاہم زیادہ جاننا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ بعض لیڈروں کے پلے اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ زمانہ حال میں عوام کی خدمت کیسے سرانجام دینی ہے لیکن وہ خود کو اور اپنی ناکامیوں کو پرمعانی بنانے کیلئے ہردم عظمت رفتہ اور ماضی میں ہونے والے مظالم کے راگ الاپنے میں لگے رہتے ہیں۔ اگر بہت بھدی، بدنما اور بدمزہ تاریخ کا سامنا ہو جسے کہ مسخ بھی کیا گیا ہو اور اس میں فسانے کی آمیزش بھی ہو تو پھر؟ اس کا علاج یہ ہوتا ہے کہ اس میں مزید اور بہتر تاریخ کو بھی شامل کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آمریت سے نکلنے والے معاشروں میں ماضی کی علامتی مخالفت اور اسے فراموش کرنے کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔ یاد ہے آپ کو کمبوڈیا کے ہن سین نے کھیمروج کے کشتوں کے پشتوں کے بیس برس بعد اپنی قوم سے کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا 'بھائیو! ایک بڑا سا گڑھا کھودو اور ماضی کو اس میں دفن کر دو'۔

بعض حکومتوں کو تاریخ کی بجائے مستقبل کے واہمے آ لیتے ہیں مثلاً گلاگوں کا جواز مہیا کرنے والے یوٹو پیائی کمیونزم یا نسل کشی کا جواز مہیا کرنے والی ہزار سالہ رائخ کا مستقبل۔ تاہم ریاستوں کی سب سے زیادہ عام بیماری گمراہ کن مستقبل نہیں بلکہ ادھورا مستقبل ہے۔ لیڈر اس طرح سے لیڈری کرتے ہیں کہ جیسے آنے والی نسلوں کا ان پر کوئی حق نہیں۔ وہ ڈرامائی واقعات و حوادث پر تو چونک پڑتے ہیں لیکن آہستہ رو اور بتدریج بڑھتے چلے جانیوالے رجحانات کی پرواہ نہیں کرتے اور پھر جدید جمہوری معاشروں پر حاوی قوتیں بھی انہیں شہہ دیتی ہیں۔ انتخابی سیاست بھی صرف موجود کی فلاح و بہبود پر توجہ دیتی ہے، کل کلاں کی کوئی فکر اسے بھی نہیں ہوتی (لوگوں کی آراء معلوم کرنے والی کمپنیوں کو چاہیے کہ کوئی ایسا طریقہ ایجاد کریں جس سے نامولودوں کی رائے بھی پوچھی جا سکے)۔ حریف صارفی منڈیاں حاضر مطلوبات کو ملحوظ خاطر رکھتی ہیں، مستقبل کی ضروریات کو خاطر میں نہیں لاتیں اور سرمائے کی حریف منڈیاں فوری منافع مانگتی ہیں اور مستقبل کو اٹھا کر پرے پھینک دیتی ہیں۔ اگر حکمران کو سب سے زیادہ فکر عوامی رائے کی ہے کہ اس کا گراف اوپر جا رہا ہے یا نیچے یا بانڈ اور کرنسی مارکیٹوں کی تو آئندہ نسل کی ضروریات اوجھل ہونا شروع ہو

allurdupdfnovels.blogspot.com

جاتی ہیں (صدر رونالڈ ریگن اور جارج ڈبلیو بش کے دور میں قرضوں میں اضافے کی یہی وجہ تھی)۔

مستقبل کے بارے میں غیر یقینیت اور تیز تبدیلی کی منطق بتا کر حکومتیں ایک دائمی حال میں رہنے کی توجیہہ بڑی آسانی سے نکال لیتی ہیں۔ پالڈولفو پیٹروچی جولوریزی سے کوئی صدی ایک بعد سائی اینا کا والی تھامیکیاولی کو حال میں رہ کر حکومت چلانے کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ 'میں ممکنہ حد تک کم از کم غلطیوں کی کوشش میں اپنی حکومت یومیہ حساب سے چلاتا ہوں اور اپنے امور گھنٹوں کے اعتبار سے ترتیب دیتا ہوں کیونکہ وقت ہمارے دماغوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ متلاطم حالات یا ذرائع ابلاغ اور روزہ مرہ سیاست کے دباؤ کا ناگزیر ردعمل بتا کر اس قلیل المدتیت کی توجیہہ پیش کرنا آسان رہتا ہے۔ آب و ہوا کی تبدیلی جیسے گہرے، طویل المعیادی اور لاینحل مسائل کی موجودگی میں ضروری قربانیوں سے احتراز کی خواہش ایک فطری امر ہے اور کوئی بہت حوصلہ مند لیڈر ہی عوام کو ان چیزوں کو ترک کرنے کا کہہ سکتا ہے جنہیں کہ وہ مستقبل کے نام پر بہت وقعت دیتے ہیں۔

ماضی کی بہت سی ریاستوں اور تہذیبوں کے نابود ہونے کی کچھ وجوہات یہ بھی ہیں۔ وہ کسی حملہ آور کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے نابود ہوئیں کہ وہ اپنے ان قلیل وسائل (پانی، جنگلات یا زمین) کی حفاظت نہ کر سکیں کہ جن پر ان کا گزارہ تھا۔ ریاست کا ذہن ممکنہ طویل المدتی خطرات سے بچاؤ کے کسی طویل، صبر آزما اور دقیق کام کی بجائے حاضر مسائل و مشکلات میں زیادہ آسانی سے صرف ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو بڑے ترقی یافتہ اور مہذب معاشرے بھی طویل المدت مسائل سے چشم پوشی کر کے اپنا بیڑہ غرق کر بیٹھتے ہیں مثلاً کیلی فورنیا نے چند عشروں کے دورانیے میں ٹیکسوں میں تخفیف کی مقبول عام مگر نا اندیش پالیسیوں کے طفیل امریکہ کے بہترین سکولوں کو بدترین سکولوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

یہ رجحانات ایسے ماحول میں اور بھی دو چند ہو جاتے ہیں کہ جہاں رواں تبصرے کے بھوکے نیوز چینل چوبیس چوبیس گھنٹے شور مچاتے رہتے ہیں جن سے حکومتوں کی روز مرہ زندگی میں کسی گہرائی، ماضی یا مستقبل سے محروم ایک دائمی حال کی بعض خصوصیتیں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ آہستہ روتبدیلی کی بجائے کارگزاری اور بھاگ دوڑ کو زیادہ توجہ ملنا شروع ہو جاتی ہے جس سے فوری نتائج کیلئے ایک بے صبرا پن پیدا ہوتا ہے اور پھر اگر حقیقی نتائج حاصل نہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہوسکیں تو علامتیں اور سوانگ ان کی جگہ لینے لگتے ہیں۔

افلاطون 'مدبر' میں کہتا ہے کہ حکمرانوں کا اصل کام 'مستقبل کی بنتی کرنا' ہوتا ہے۔ اس سے اس کی مراد اس چیز کی ذمہ داری ہے کہ ہم آنے والوں کے لیے پیچھے کیا چھوڑے جا رہے ہیں۔ لیکن جو دوسرے دباؤ اور مسائل آ جاتے ہیں وہ اس آدرش کو مشکل بنا دیتے ہیں۔ لیڈر اس کی طرف اکثر اس وقت آتے ہیں جب ان کی مدت اقتدار ختم ہونے کے قریب پہنچ جاتی ہے لیکن اس وقت تک پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ شاید ہر معاشرے کو جس میں مستقبل کا ہمارا عالمی معاشرہ بھی آجاتا ہے، ایک مستقبل کی پارٹی اور ایسے اداروں کی ضرورت ہوتی ہے کہ جن کا کام ان رجحانات کا مقابلہ کرنا اور معاشرے کی بقاء کی ضروریات کا خیال رکھنا ہو۔ ماضی بعید میں یہ کردار بڑے ادا کرتے تھے۔ وہ معاشرے کے حافظے کو بھی محفوظ رکھتے تھے لیکن خود کو روزمرہ مسائل سے اس قدر الگ بھی رکھتے تھے کہ انہیں پتہ چل جائے کہ دور رس تبدیلیوں کی ضرورت کب ہے۔

جدید ریاست میں ان کرداروں کو تقسیم کرنا پڑا ہے۔ ان کی ضرورت حکومتی مشین کے قلب میں بھی ہوتی ہے تاکہ وہ حکمرانوں کے کان میں سمجھداری کی بات ڈالتے رہیں (مثلاً برطانیہ کا سٹریٹجی یونٹ اور فرانس کا منصوبہ بندی ڈویژن) پھر ان کی ضرورت حکومت کے قرب و جوار کے خودمختار اداروں میں بھی ہوتی ہے کہ جو افق پر نظریں لگائے بیٹھے ہوتے ہیں اور علت و معلول کے سلسلے اور غیر ارادی نتیجے کے ذریعے سوچ رہے ہوتے ہیں۔ مزید برآں ایسے مکالمات کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو بڑے بڑے پیشوں اور عوام کو بتدیلی کی مترتب نوعیت سے ربط میں لاتے ہیں۔[2] شمالی امریکہ کی کچھ ریاستوں نے ایسا کرنے کے نئے طریقے نکالے ہیں، مثال کے طور پر اوریگن ریاست 1989ء سے لاکھوں افراد کو مستقبل کے بارے میں ایک مباحثے میں شریک کر رہی ہے جس میں فنی مہارات، صحت اور بہبود جیسے موضوعات پر بات چلتی رہی ہے۔ اوریگن نے عوامی شراکت کے بعض نمونے بھی متعارف کرائے ہیں جس سے اس سماجی سرمائے اور اعتماد کی کمی سے بچنے میں مدد ملی ہے جنھوں نے باقی امریکی ریاستوں کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ مزید آگے آئیں تو کینیڈا کی ریاست البرٹا میں 2002ء میں ہونے والی اس 'مستقبل کی کانفرنس' کی بات کی جا سکتی ہے جس نے مقامی مجالس میں ہونے والے ہزاروں مباحث سے استفادہ کرتے ہوئے اس بارے میں اتفاق

allurdupdfnovels.blogspot.com

رائے پیدا کرنے کی کوشش کی کہ کیا کیا جانا چاہیے۔

مستقبل کی طرف توجہ ریاست کے ان اجزاء میں پیدا کرنا سب سے زیادہ آسان ہوتا ہے جو موجودہ دباؤ کے اثر سے آزاد ہوتے ہیں مثلاً مرکزی بینکوں، سائنسی ترقی سے متعلقہ اداروں یا ضابط اداروں میں لیکن اس کی سب سے زیادہ ضرورت ریاست کے ان اجزاء میں ہوتی ہے جو سیاست سے قریب ترین ہوتے ہیں جیسے کہ صحت عامہ یا جرائم کیونکہ بصورت دیگر مشکل فیصلوں کی وضاحت نہیں کی جا سکتی اور انہیں قانونی حیثیت نہیں دلائی جا سکتی۔

اس قسم کے کام کیلئے درکار ذہنی سانچے ان ذہنی سانچوں سے بہت زیادہ مختلف ہوتے ہیں جن کی تیز فیصلہ سازی، استدلال یا علمیت کیلئے ضرورت ہوتی ہے۔ ان کیلئے جو چیزیں درکار ہوتی ہیں ان میں غیر متوقع چیزوں کا سامنا کرنے اور انہیں قبول کرنے کی صلاحیت، وہ وقت جو کسی پیچیدہ نظام میں استغراق اور اس میں مہارت حاصل کرنے میں لگتا ہے اور وہ ذہنی جفاکشی شامل ہیں جس کی ضرورت موجودہ حالات سے نکلنے کیلئے پڑتی ہے۔[3]

حکومتوں کو مستقبل کے بارے میں کسی پکی پیش گوئی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایسے طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں کم اور زیادہ دونوں ممکنہ امکانات کیلئے تیار کر سکیں۔ مستقبل کا حال کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتا مگر حال اور اس میں موجود امکانات کو بہتر طور پر سمجھنا ممکن ہوتا ہے۔ 1990ء کے عشرے کے اوائل میں کسی کو بھی توقع نہ تھی کہ آئندہ عشرہ یورپ میں خانہ جنگی لے کر آئے گا جس میں لاکھوں افراد مارے جائیں گے، یا نصف بلین افراد انٹرنیٹ استعمال کرنے لگیں گے، جاپان میں طویل اقتصادی جمود اور امریکہ میں طویل تیزی پیدا ہو گی یا انسانی جینوم کی مکمل میپنگ کر لی جائے گی۔ 2000ء سے قبل کسی کے ذہن میں بھی یہ نہیں گزری ہو گی کہ نیو یارک میں دہشت گرد حملہ ہو گا اور اس میں ہزاروں افراد مارے جائیں گے یا کہ کیلی فورنیا میں بجلی کا نظام درہم برہم جائے ہو گا۔ جس چیز کی پیش گوئی ممکن نہیں حکومت اس کی پیش گوئی نہیں کر سکتی لیکن سمجھدار لوگ اپنے ہی مفروضوں میں گرفتار ہونے سے بچا کرتے ہیں۔

لگتا ہے کہ چھوٹے ملکوں کیلئے اس قسم کا کام زیادہ آسان ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول کے بارے میں زیادہ حقیقت پسند ہوتے ہیں مثلاً سنگاپور اپنے سینئر

allurdupdfnovels.blogspot.com

ناظمین کو باقاعدہ ایسی مشقیں کراتا رہتا ہے جن میں انہیں جنگ، قلت آب اور معاشی بحرانوں کے تجربے سے گزارا جاتا ہے۔ ہالینڈ اور فن لینڈ سمیت شمال یورپی ملکوں نے بھی متبادل مستقبلوں کے تخیل کی صلاحیت کو اداراتی شکل دے دی ہے۔ بڑے ملکوں میں غریبوں کی جاذبیت ذرا زیادہ شدید ہے۔ ماضی کو ہی دیکھ لیں کہ کتنی سلطنتیں کو تاہ بینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے واہموں سے ہی چمٹی رہیں بجائے اس کے کہ وہ ان قوتوں کا سامنا کرتیں کہ جو انہیں مٹانے کے درپے تھیں۔ لیکن ایک ایسے عہد میں کہ جس میں آبادیاں بوڑھی ہوتی چلی جاتی ہیں اور جس میں ایک نسل کے عرصے میں بقاء کو درپیش سب سے اہم چیلنجوں کو حل کرنا ممکن نہیں، اچھی حکومت کیلئے ایک 'حزب مستقبل' کو پروان چڑھانا لازم ہو گیا ہے۔

بورخیس نے اپنی ایک کہانی میں ایک ایسے جانور کا ذکر کیا ہے کہ جو جنگل میں چلتے وقت ہمیشہ آپ کے پیچھے پیچھے رہتا ہے اور خواہ آپ جتنی بھی تیزی سے گھوم کر اسے دیکھنے کی کوشش کریں وہ نظر نہیں آتا۔ یہ مخلوق آنے والی نسل ہوتی ہے۔ یہ آپ کے پیچھے پیچھے آ رہی ہوتی ہے لیکن آپ اس کی آنک کو دیکھ نہیں پاتے، صرف جھلک اور سائے ہی دیکھ پاتے ہیں۔ جہاں تک سیاست وحکومت کا تعلق ہے اس میں کوئی چیز بھی پکی، مستقل یا یقینی نہیں ہوتی اور سیاست وحکومت سے 'سمجھوتے ظہور میں آتے ہیں' حل نہیں'۔ (4) مستقبل کی احتیاجات خدمت کو اسی جذبے سے تشکیل دیا جانا چاہیے ...... عاجز، لچکدار اور تبدیلی سے پیدا ہونے والے پیچوں کے متعلق ذرا سا بے یقین۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 16

ریاست بطور فن پارہ

''علم کی دو انتہائیں ہیں جو آگے جا کر ایک دوسری سے مل جاتی ہیں: ایک تو پیدائش کے وقت ہر انسان کی فطری لاعلمی ہے اور دوسری انتہا وہ ہے جس تک وہ بڑے ذہن سے پہنچتے ہیں جو انسانی علم کے سارے سلسلے میں سے گزرتے ہیں جس کے آخر میں ان پر یہ بات کھلتی ہے کہ انہیں تو پتہ ہی کچھ نہیں اور اس طرح وہ واپس اس لاعلمی تک آ جاتے ہیں کہ جس سے انہوں نے آغاز لیا تھا، لیکن یہ دانا لاعلمی ہوتی ہے جس کو اپنا عرفان مل چکا ہوتا ہے''۔ (پاسکل)

ہیگل ریاست کو ایک 'فن پارہ' قرار دیتا ہے اور اس کا خیال تھا کہ یہ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں پروشیا میں اپنی حتمی شکل کو پہنچی۔(1) شعوری عزم کی کاوشوں کے طور پر بڑے دساتیر اور ریاستوں کا موازنہ بلا شبہ بصری فنون، موسیقی، فلسفے اور شاعری کے بہترین تہذیبی کارناموں سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی انسانی تخیل کے اظہارات ہیں اور انسانی زندگیوں کی کایا کلپ کرنے کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ ان فنون سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔

تاہم بیشتر دوسرے فنی کاموں کے برعکس ان کے تخلیق کار زیادہ ہوتے ہیں اور وہ آزمائش و خطا اور بدلتے حالات کے بے انت ردعمل پر مبنی ہوتے ہی (اس وجہ سے ہیگل کا یہ مفروضہ غلط ہو جاتا ہے کہ ریاستیں کسی دور میں حتمی شکل نام کی کسی چیز تک پہنچتی ہیں)۔ وہ تب بھی آزمائش و خطا، مشاہدہ و علم سے ارتقاء پاتے زیر تکمیل فن پارے تھیں اور اب بھی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں نے گذشتہ ابواب میں ریاستوں کے ارتقاء کے بارے میں ایک بحث کا آغاز کیا تھا۔ میں نے ریاستوں کو ایک ناقابل مفرحد تک اخلاقی اکائیوں کے طور پر پیش کیا ہے کیونکہ ان کا دارو مدار وفاداری، کومٹ منٹ اور جواز پر ہوتا ہے اور وہ صرف دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کیلئے انجام دی گئی خدمت کے توسط سے ہی خود کو قانونی حیثیت دے سکتی ہیں۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اخلاقیات کوئی ایسی چیز نہیں کہ جسے کاروبار حکومت کیلئے بے وقعت تصور کیا جائے۔ یہ خدمت، تسلط یا اعتماد کے ہر تعلق میں ملفوف ہوتی ہے۔ یہ وہ کرنسی ہے جس میں انسانی امور انجام پاتے ہیں اور ماضی میں اسے سیاست سے نکال باہر کرنے (یا کاروبار یا سائنس سے) کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوتی ہیں۔

خدمت کے جن تصورات کی میں نے بات کی ہے ان کا شجرہ نسب بہت طویل اور قدیم ہے اور انہیں ہم خلقی اعتبار سے جدید نہیں کہہ سکتے۔ تاہم جدید دنیا اس بارے میں سیکھ چکی ہے کہ جب جمہوریت کے آلات کے ساتھ فعال عوام، کھلا علم اور موافق عالمی ماحول بھی آ ملے تو حکومتیں خدمت کے اپنے عملی فرائض پر کیسے مرکوز ہو جاتی ہیں اور ان کی خود خدمتی اور واہموں میں کیسے کمی پیدا ہوتی ہے۔

شاید وہ اہم ترین سبق جو دنیا نے سیکھا یہ ہے کہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان تعلق کو وضع دینے میں صف بندی (alignment) کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اچھی حکومت صرف اچھے آئینوں سے یا حکومتی عہدوں پر اچھے افراد کو بٹھا دینے سے ہی حاصل نہیں ہو جاتی۔ دنیا میں ایسی ریاستوں کی بے شمار مثالیں آپ کو ملیں گی کہ جن میں آئین اور دستور تو بہت ترقی پسند اور دیدہ زیب تھے لیکن اس کے باوجود ان میں غاصب اور بدعنوان لیڈروں نے اندھیر مچائے رکھا جو شروعات تو بہت خوبصورت وعدوں اور نظریوں سے کرتے ہیں لیکن بعد میں انہی بداعمالیوں پر اتر آتے ہیں۔ اچھی حکومت ان بہت سی اہم قوتوں کی مطابقت سے وجود میں آتی ہے جو اچھائی کو جزا اور برائی کو سزا دیتی ہیں اور جن میں قوانین اور دساتیر، سیاستدانوں اور افسروں کی ذاتی اخلاقیات، ناقدین و ذرائع ابلاغ کی قوت اور بیرونی دنیا کی اخلاقی آواز شامل ہیں۔ معاشرتی علوم کے توسط سے ہمارے سامنے آنے والی ہر چیز اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ لوگوں کے طرز عمل کا انحصار بہت حد تک اس ماحول پر ہوتا ہے کہ جس میں وہ رہ رہے ہوتے ہیں اور ان لطیف پیغامات پر ہوتا ہے جو کہ اچھے طرز

allurdupdfnovels.blogspot.com

عمل کی حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ حکومتیں اس وقت اچھی ہوتی ہیں جب انہیں اچھا ہونا پڑتا ہے اور جب یہ عوامل مطابقت میں آتے ہیں تو پھر سیاستدانوں اور افسروں کے لئے اخلاقیات پر نہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔

میں بار بار اس بات پر زور دیتا چلا آ رہا ہوں کہ حکومت اور جمہوریت کا ارتقائی سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قوم پرستی، ملائیت یا فسطائیت دوبارہ ظاہر نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں نے بعض ایسے طریقے بھی بتائے ہیں جن سے ایک زیادہ مثبت ارتقاء واقع ہو سکتا ہے۔ ایک طرف اس کا امکان بھی موجود ہے کہ نئی سماجی سافٹ ویئر حرفتوں کی مدد سے معاشروں کے استدلال، بحث و مباحثہ اور اتفاق رائے تک پہنچنے کے انداز میں کس قدر تیز ارتقاء دیکھنے میں آ جائے۔ یہ حرفتیں مزید کچھ وقت کے بعد ووٹنگ اور شوی مباحثہ کے رسمی آلات کی اہمیت کم کر سکتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں اس چیز میں بہت زیادہ گہرائی پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے جس سے کہ ہم جمہوریت مراد لیتے ہیں۔ دوسری طرف شعور کا زیادہ ارادی ارتقاء نظر آتا ہے جو مشق کے توسط سے انسان میں احترام باہمی اور ذاتی ذمہ داری، دوسروں کی آگہی اور اجتماعی استدلال کی عادات پیدا کر سکتا ہے۔ میں اس جانب بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ ریاستیں اپنے معاشروں میں تحلیل ہو کر ڈھانچوں کی بجائے پلیٹ فارموں اور انفراسٹرکچروں سے زیادہ مماثلت کیسے اختیار کر سکتی ہیں اور میں نے ان مشکلات کا اشارہ بھی دے دیا ہے جو نئے عالمی ادارے پیدا کر سکتے ہیں۔

ان سے ہمارے حکومتی نظاموں کی شکل و ہئیت میں بہت زیادہ تبدیلی آ سکتی ہے لیکن اگر میرا خیال ٹھیک ہے تو ان کے کاموں میں نسبتاً بہت کم بتدیلی واقع ہو گی۔ ہر صورت میں ان کی بیشتر توجہ اپنے چار اہم وظائف یعنی محافظت، بہبود، انصاف اور سچائی پر ہی مرکوز رہے گی اور وہ کسی بھی صورت ان بحرانوں اور کشیدگیوں سے بچ نہیں سکیں گی کہ جو حکومتی عملداری سے لازم وملزوم ہوتی ہیں۔

خدمت کے سات ابہامات

ادبی نقاد ولیم ایمپسن نے ابہام کی سات ایسی قسمیں بیان کی ہیں جو ادب و شعر میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

جان پیدا کرتی ہیں۔ میں نے اس کتاب میں ان سات ابہاموں کی بات کی ہے جو سب سے ترقی یافتہ جمہوریت میں بھی خدمت کی نوعیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ادب میں وہ لفظوں میں یہ قوت پیدا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں متاثر کرسکیں لیکن حکومت میں آ کر وہ قدرے زیادہ اضطراب انگیز ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم میں سے بیشتر افراد ایک منظم اور بامعنی دنیا پر اعتقاد رکھنے کے خواہاں ہیں۔ ان ابہاموں کی سمجھ ہر اس شخص کیلئے ایک نقطہ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے جو سیاستدان، افسر، سماجی کارکن یا صحافی بننا چاہتا ہے۔

پہلا: حکومتیں (وسیع ترین مفہوم میں) وہ اصول وضع کرتی ہیں جن سے انہیں چلنا ہوتا ہے اور انتہائی صورتوں میں وہ انہیں معطل بھی کرسکتی ہیں۔

دوسرا: حکومتوں کو اچھی خادمائیں بننے کیلئے مالکنیں بننا پڑتا ہے۔ حکم چلانے پڑتے ہیں اور ان لوگوں کی خواہشات کو بھی پرے پھینکنا پڑتا ہے کہ جن کی وہ خدمت کرتی ہیں۔

تیسرا: ہر حکمران گروہ بعض لوگوں کی نسبت بعض لوگوں کی زیادہ خدمت کرتا ہے اور ابھی تک کوئی بھی شخص حکومتیں چلانے کا کوئی ایسا طریقہ متعارف نہیں کرا سکا کہ جس سے کوئی نہ کوئی گروہ کسی نہ کسی حد تک ان پر تسلط نہ جمائے۔

چوتھا: ہر حقیقی یا تصوراتی حکومت کے کچھ اپنے مفادات ہوتے ہیں جو نہ صرف ان عوام سے مختلف ہوتے ہیں کہ جن کی یہ خدمت کرتی ہے بلکہ یہ ان لوگوں کے مفادات سے بھی مختلف ہوتے ہیں جو اس کے برائے نام قائد ہوتے ہیں۔

پانچواں: کاروبار حکمرانی چھانٹنے، زمرے بنانے اور کنٹرول کرنے کا نام ہے جو شخصی اور متوجہ خدمت کے تصور سے الٹ ہے (اور حکومت کے روز مرہ نظام کے بیشتر حصے کو بالواسطہ طور پر چلانا پڑتا ہے، ایجنسیوں، نیٹ ورکوں اور بیچ کے افراد کے ذریعے یعنی براہ راست قربت اور خدمت کے احتساب کا الٹ)۔

چھٹا: اچھی حکومت خود کیلئے عوام کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ چھان بین، شکائتیں اور بحث مباحثہ کرنا پڑتے ہیں۔ بھیڑوں کا معاشرہ بھیڑیوں کی حکومت کو جنم دیتا ہے۔

ساتواں: اچھی حکومت کے اثمار کا دارومدار اس کی اپنی اور معاشرے کی خدمت کرنے کی نیت پر ہوتا ہے۔ تحفظ، بہبود، انصاف اور علم کے ایسے اہم حکومتی کام کم ہی ہوں گے کہ جو آرام سے ستاتی خلقت کی ہتھیلی میں آ کر تھمائے جا سکتے ہوں۔ اس مفہوم میں بھی اچھی حکومت ایک

allurdupdfnovels.blogspot.com

مشترکہ کاوش ہوتی ہے۔

یہ ابہام اور پیراڈوکس کسی بھی ایسی بالغ سیاست کیلئے لازمے کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جو ماضی میں بہت عام واہموں اور فریبوں کے چکروں سے آگے گزرتی ہے۔ ہم ان ابہاموں کو روک سکتے ہیں لیکن وہ ایسے کسی بھی تصور کو ناممکن بنا کر رکھ دیتے ہیں کہ جس کے مطابق اچھی حکومت کے مطلق آدرش کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اچھی حکومت کی آنک :

چنانچہ کسی حکومت کا اخلاقی موقف لازماً مبہم رہتا ہے۔ تاہم ان ابہاموں کے باوجود اس بات کی آنک ممکن ہے کہ کوئی ریاست کس قدر اچھی ہے اور وہ خدمت کے آدرش سے کتنا قریب ہے۔ ریاستیں اخلاقی اس سے نہیں ہوتیں کہ وہ کہتی کیا ہیں بلکہ اس سے ہوتی ہیں کہ وہ کرتی کیا ہیں۔ وہ اپنے طریقوں سے نہیں بلکہ خدمت سے اخلاقی ہوتی ہیں۔ ان کی بڑی خوبیاں عملی اور قابل محسوس ہوتی ہیں اور ان کی بڑی برائیاں تجریدات اور بلند و بالا بیانات اور تقریروں کی کشش سے ظہور میں آتی ہیں۔

ان خوبیوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور انہیں آنکا جا سکتا ہے۔ ریاستیں بہت سی مختلف تہذیبوں میں اور ہزاروں برسوں سے جو بنیادی اخلاقی دعوے کرتی رہی ہیں وہ ایک ایسا عالمگیر معیار مہیا کرتے ہیں کہ جن سے انہیں آنکا جا سکتا ہے۔ ان معیارات میں یہ چیز شامل ہے کہ کوئی ریاست اپنے شہریوں کی حفاظت کتنے احسن طریقے سے کرتی ہے (جنگ، جرائم یا ماحولیاتی خطرات سے) ان کی فلاح و بہبود کیلئے کیا کرتی ہے (جسے آمدنیوں، خوشی اور معیارِ صحت وغیرہ سے ماپا جا سکتا ہے)، یہ عدل و انصاف کو کس حد تک فروغ دیتی ہے اور بے انصافی کے قلع قمع کیلئے کیا کرتی ہے اور یہ صداقتوں اور علم کی جستجو کی حوصلہ افزائی کیسے کرتی ہے (جسے اس سے ماپا جا سکتا ہے کہ لوگ کیا جانتے ہیں)۔

کسی خاص حکومت کو جانچنے کیلئے ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس نے یہ وظائف ورثے میں ملنے والے حالات میں کتنے اچھے طریقے سے سرانجام دیئے ہیں، اس جیسے دیگر ملکوں کی حکومتوں سے اس کا موازنہ کیسے کیا جا سکتا ہے اور آیا اس نے ورثے میں ملنے والے مالی، انسانی، سماجی اور قدرتی سرمائے کو نمودی ہے یا کہ اس کا ناس مارا ہے۔(2) بین

allurdupdfnovels.blogspot.com

الاقوامی اور عالمی حکومت کی نمودار ہوتی اشکال پر اسی طرح کے سانچوں کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں بری حکومت کے مخصوص ہتھکنڈوں پر نظر رکھنا ہو گی یعنی نفرت و منافرت اور خوف کو ہوا دینا، اثاثوں کا ناس مارنا، جنگ کو آخری حربے کی بجائے مقصود بالذات کے طور پر لینا، بڑوں، وڈیروں اور خصوصی مفاداتی گروہوں کو مراعات دینا اور بد دیانتی، لوٹ کھسوٹ اور غلط اطلاعات کو گنجائش دے کر اخلاقی معیارات پر سمجھوتہ کرنا۔

حکومت کی پیمائش کے معیارات چاہے کوئی سے بھی لیں ان پر بحث وتمحیص کا ہونا لازم ہے۔ تاہم سیاست کے طول وعرض میں اس بات پر حیران کن حد تک زیادہ اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ حکومتوں کو کم از کم اصولی طور پر ماپنے اور آنکنے کے بنیادی معیارات کیا ہونے چاہئیں تاہم اس پر شاید زیادہ اتفاق نہ ہو کہ مختلف ترجیحات کو کتنا کتنا وزن دیا جانا چاہیے۔

اخلاقیات اور بدلاؤ

کسی حد تک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہمیں ویسی ہی حکومت ملتی ہے جس کے ہم مستحق ہوتے ہیں۔ اچھی حکومت مشترکہ تخلیق ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو لوگوں سے مل کر کی جاتی ہے ان پر نہیں کی جاتی۔ اور وہ قومیں جو اپنی جمہوریت میں کوئی حصہ نہیں ڈالتیں اور اس کے لیے کچھ نہیں کرتیں اور طفیلیوں کی طرح صرف دوسروں کی کاوشوں پر جینے کی کوشش کرتی ہیں ان کے پاس معاملات بگڑنے پر آہ و بکا کا جواز نہیں رہتا۔ یہ سیاست کی فطرت ہے کہ انتخاب کیلئے جو چیزیں ہمارے آگے رکھی جاتی ہیں وہ کسی طور بھی مثالی نہیں ہوتیں تاہم حقیقی حکومتوں کے نقائص کو بے عملی اور لاتعلقی کا بہانہ نہیں بنایا جا سکتا۔

سیمل فائنر نے حکمرانی کی تاریخ پر اپنی بلند پایہ تصنیف میں روم کے عوام کہ جو زیادہ لگانوں اور ٹیکسوں پر روتے تھے اور پھر اس کے دفاع میں بھی ناکام رہے، کے بارے میں لکھا ہے:

اگر گال، سپین یا شمالی اطالیہ کا کوئی کسان اس استحصال و بدحالی کو دیکھ سکتا کہ جو آئندہ 500 برسوں میں اس کی آل اولاد اور پھر ان کی آل اولاد اور پھر آگے ان کی پرچھانے

allurdupdfnovels.blogspot.com

والی تھی تو شاید وہ بہت ہی بے وقوف اور بے حس ہوتا کہ اگر وہ اپنی سلطنت کو بچانے کیلئے کوئی بھاگ دوڑ نہ کرتا۔ (3)

شاید مستقبل کا کوئی مورخ بھی آج کے ان لوگوں کے بارے میں ایسے ہی الفاظ استعمال کرے گا جو ایک طرف کھڑے ہوکر مزے سے تماشہ کرتے ہیں جبکہ حکومتیں ماحولیاتی خطرات سے نپٹنے کے جتنوں میں مصروف ہیں۔

جہاں تک حکومت کا تعلق ہے ہم سب کھلاڑی بھی ہیں اور تماشائی بھی۔ اگر ہم صرف تماشائی ہی بنے رہیں تو ہم مفلسی و غلامی کی دلدل میں اتر سکتے ہیں بلکہ اس میں یہ خدشہ بھی ہوتا ہے کہ ہم ریاست کے اس تصور کو بھی بہت زیادہ آسانی سے قبول کر سکتے ہیں جس کے مطابق وہ خود کو حقیقت سے زیادہ دائمی و ابدی سمجھتی ہے۔ تحریکوں کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہمیں بتاتی ہیں کہ سخت کیا ہے اور نرم کیا۔ یہ ہمیں حکومت کی لچک اور پائیداری سے آگاہ کرتی ہیں۔ اس سے اجتماعی حاکمیت کی حکومت یاد آ جاتی ہے اور یہ کہ ہم مشترک علم اور مشترک استدلال کے کس قدر محتاج ہوتے ہیں۔ اور حکومت کو چیلنج کرنے سے اسے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ولیم مورس 'جان بال کا خواب' میں لکھتا ہے کہ:

لوگ جنگ لڑتے ہیں اور ہار جاتے ہیں، اور وہ جس کے لئے جنگ کرتے ہیں ان کی شکست کے باوجود یہ ہو کر رہتا ہے اور جب یہ ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ تو نہیں کہ جو وہ چاہتے تھے اور دوسرے لوگوں کو ایک مختلف نام سے اس کیلئے جنگ کرنا پڑتی ہے کہ جو وہ چاہتے تھے۔

اسے انتہا پسندی کا جوہر کہا جا سکتا ہے۔ اپنی بہترین صورت میں یہ تاریخ کے پیچوں اور موڑوں سے بددل ہوئے بغیر معاشروں کو نئی توانائیاں بہم پہنچاتا ہے۔ یہ زوائدات کو پرے ہٹا دیتا ہے تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ ضروری کیا ہے اور یہ ہم میں یہ سوچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ اس ناقص اور ادھوری دنیا میں بھی چیزیں مختلف اور بہتر کیسے ہو سکتی ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

خلاصہ کلام :

1۔ انسانی ضروریات جتنا بھی کہا جائے اسی قدر مختلف ہیں لیکن بے ترتیب نہیں۔ مختلف زمانوں اور معاشروں میں انسانی احتیاجات کا ناک نقشہ ایک سا چلا آتا ہے۔ ان احتیاجات میں تحفظ، صحت، مادی اشیاء، کنبے، برادری، روحانی تسکین اور آرام کی ضروریات شامل ہیں۔ ان احتیاجات سے ان مطالبات کا ایک یکساں طائفہ جنم لیتا ہے جو کہ لوگ لیڈروں اور ریاستوں سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ان مطالبات میں کہ جو حکومتوں کے اخلاقی فرائض اور عوام کی خادم کے طور پر ان کی نوعیت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں، چار بڑے شعبے آجاتے ہیں۔

محافظت کی ذمہ داری (جنگلی درندوں، موسمی ابتلاؤں اور دوسرے گروہوں اور ریاستوں سے)، بہبود کی ذمہ داری (خوراک، پانی، چھت اور نگہداشت کی بہم رسانی)، فراہمی انصاف کی ذمہ داری (تنازعات کا منصفانہ حل اور زیادتیوں کی تادیب)، اور سچائی کی ذمہ داری (دنیا، کائنات اور دوسرے لوگوں کے بارے میں علم)۔

2۔ یہ کردار خاندانوں میں نبھائے جاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے انسانی گروہ کی سطح پر بھی کوئی نہ کوئی لیڈر یا بڑے ایسے ہوتے ہیں جو یہ وظائف سرانجام دیتے ہیں لیکن زائد وسائل پیدا کرنے والے بڑے بڑے اور گنجان معاشروں کے رواج نے سماجی تنظیم کی نئی نئی شکلوں کو جنم دیا۔ جب لوگوں کو اجنبیوں کی ایک بڑی تعداد اور ہم آہنگی

allurdupdfnovels.blogspot.com

وارتباط اور اعتماد جیسے مسائل سے سابقہ پڑا تو نئے نئے مسئلے پیدا ہونے لگے...... جن میں سے بعض کو بعد میں عمرانی معاہدوں کے ذریعے اصولوں کے ڈھنگ میں لانے کی کوششیں کی جانے لگیں۔

3۔ ریاستوں کے وجود میں آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ گنجان آبادیوں کی بقاء و خوشحالی کیلئے ضروری تھیں لیکن چونکہ ریاست کے نظام پر کنٹرول بھی بہت فائدہ مند تھا، تمام ریاستوں پر چھوٹے گروہوں اور خصوصی مفادات کے حامل افراد نے تسلط جمانا شروع کر دیا اور انہیں بار بار ان لوگوں کے استحصال اور ان پر غلبے کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے کہ جن کی وہ خدمت بھی کر سکتی تھیں۔ جنگ و جدل کی بیشتر تاریخ قبضے کی اس تاریخ کے براہ راست نتیجے کے طور پر ظہور میں آئی۔ بعض اعتبار سے تمام ریاستوں کو ہی مقبوضہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ جمہوری سے جمہوری ریاست بھی طاقت کی ناہمواریوں پر استوار ہوتی ہے اور وہ بیشتر جمہورتیں کہ جن کا مشاہدہ ہمیں آج کے دور میں ہوتا ہے کوئی اتنی جمہوری نہیں بلکہ انہیں چندسری حکومتیں کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ 'عوام کی حکومت' عوام کے ذریعے، عوام کیلئے' والی بات ان پر صادق نہیں آتی۔ بیشتر حکومتیں اکثر خدمت کا لبادہ اوڑھ کر عوام کو فریب دیتی رہی ہیں، اپنے مقاصد سے دغا کرتی رہی ہیں اور لوگوں کی بجائے صرف اپنی خدمت پر ہی زور رکھتی رہی ہیں۔ یہ سمجھنے کیلئے کہ ریاستیں کس طرح کام کرتیں ہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اپنی خدمت بھی کرتی ہیں ...... وہ اپنا وجود برقرار رکھنے کیلئے وجود میں آتی ہیں۔ سرکاری افسروں کے مفادات سیاسی رہنماؤں اور عوام کے مفادات سے مختلف ہوتے ہیں۔ تاہم یہ خود خدمتی اس سے بھی گہرائی میں ریاستی انتظامیہ کی منطق تک جاتی نظر آتی ہے جو بعض وقتوں میں اپنی بقاء کیلئے کسی بھی چیز کو تبدیل کرنے اور کسی بھی چیز کو قربان کرنے کیلئے آمادہ رہتی ہے۔ چنانچہ تمام ریاستوں کے تین خواص ہوتے ہیں ...... خادم کے، زیر حراست آقا کے اور خود اپنے خادم کے۔

4۔ بیشتر انسانی تاریخ کے دوران ریاستوں کو اپنے پہلے خاصے کے مطابق چلنے اور بطور خدام اپنے فرائض ادا کرنے پر مجبور کرنے کیلئے لوگوں کو صرف پر تشدد بغاوت کا ہی ایک حربہ دستیاب رہا ہے جسے کہ وہ بروئے کار لاتے رہے ہیں تاہم وقت گزرنے

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے ساتھ ساتھ دنیا کی مختلف اقوام ایسی بہت سی تدابیر بھی دریافت کر چکی ہیں جو ریاستوں کو خادم کا اپنا فریضہ نبھانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ان تدابیر کو چار بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: مقابلہ بذریعہ انتخابات، تقسیم اختیارات، قوانین کی حکمرانی اور شفافیت، آزاد ذرائع ابلاغ اور معلومات تک آزادانہ رسائی۔ یہ تدابیر فطری قوانین، یا خدایا تاریخی ناگزیریت سے پیدا نہیں ہوتیں۔ انہیں سیکھا گیا ہے اور اہم ترین اسباق ان تدابیر سے لاپرواہ حکومتوں کے پیدا کردہ بیکراں دکھ کو دیکھ دیکھ کر سیکھے گئے ہیں۔ ایک اہم حالیہ مثال 'ثالثی' اور 'توثیق' کی تدابیر کا بڑھتا ہوا استعمال ہے یعنی ریاستوں کے دعاوی اور اقدامات کی پڑتال کیلئے تیسرے فریق کا استعمال۔

5۔ ان مختلف تدابیر کے پھیلاؤ نے حکومتوں کے اخلاقی کردار کو بہت نشوونما دی ہے۔ تاہم ایک حقیقی معانوں میں اچھی حکومت صرف تبھی ممکن ہوسکتی ہے کہ جب ان ساختی تدابیر کے ساتھ بعض دوسری چیزیں بھی میسر ہوں، مثلاً فعال اور طاقتور عوام، عقلمند نقاد اور مبصر اور لیڈروں اور افسروں کی طرف سے اعلیٰ اخلاقی معیارات کی پاسداری۔ ماضی میں ریاستوں کو خادموں کی طرح کام کرنے پر مجبور کرنے کیلئے ڈھانچوں کی کمی کی تلافی اخلاقی معیارات کو کرنا پڑتی تھی۔ آج کے دور میں وہ ایک دوسرے کو تقویت دے کر اس تصور کو آشکار کر سکتے ہیں کہ علم یا اقتدار کا ملنا ایک تحفہ یا عطیہ ہوتا ہے جو اپنے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی لے کر آتا ہے۔

6۔ حکومت کی دیگر قسموں کی طرح جمہوریت بھی انحطاط اور بگاڑ کا شکار ہوسکتی ہے اونچ نیچ کی طرح اقتدار بھی بگاڑ پیدا کر سکتا ہے۔ وہ حکومتیں جو ایک وقت میں بڑی فیاض و رحمدل ہوتی ہیں، سنگ دل ہو جاتی ہیں اور ان اقدار سے قطع تعلقی اختیار کر لیتی ہیں جن کی وجہ سے وہ وجود میں آئی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اچھی حکومت کی جستجو تصورات اور اداروں کی تجدید و احیاء کیلئے ایک مستقل جدوجہد کا نام ہے۔ زیادہ جدوجہد تصورات و تعلقات کو فطری رنگ دینے کے عالمگیر انسانی رجحان کے خلاف کرنا پڑتی ہے یعنی اس رجحان کے خلاف کہ جو انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کو فطری، ابدی اور ناقابل تغیر ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اخلاقی و سیاسی دونوں قسم کے تصورات کے ساتھ ہوتا ہے۔ اکثر وہ ان کاموں سے دور ہو جاتے ہیں کہ جو کرنے کیلئے انہیں بنایا جاتا

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہے۔ حکومت کی خاص الخاص برائیوں میں جبر، غرور، فریب اور چوری جیسے معروف گناہ ہی شامل نہیں بلکہ ان میں تجرید کے استعمال جیسی کچھ زیادہ لطیف برائیاں بھی آ جاتی ہیں۔ حکومت کی بڑی کرنسیوں میں الفاظ، شبیہیں اور افسانے یعنی ایسی حکایات اور دعوے شامل ہیں جو حکومت پر جواز کی قلعی چڑھاتے ہیں۔ جمہوری سیاست میں یہ افسانے شاید غیر جمہوری سیاست سے بھی بڑے پھندوں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ تجریدات وتصورات حقیقتوں پر غالب آ جاتے ہیں، بے سروپا خطابت ناکامیوں کو چھپا دیتی ہے اور لیڈر بیانات کو بڑی آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کرنے لگتے ہیں اور ان کا اعتقاد یہ بن جاتا ہے کہ جب تک وہ مسئلے کو ایک محاورہ بول کر حل کر سکتے ہیں مسئلہ ختم ہوسکتا ہے۔ اچھی حکومت داخلی اعتبار سے بہت عملی اور سادہ ہوتی ہے، شاعری اسے تحریک دے سکتی ہے مگر اکثر و بیشتر وہ اس کی دشمن بھی ہوتی ہے۔

7۔ جمہوریت کا مطلب ایک حد تک ریاست کو ایک حقیقی خادم میں تبدیل کرنا بھی ہے۔ لیکن اس کا مطلب لوگوں کی توانائیاں آزاد کرنا بھی ہوتا ہے تاکہ وہ ریاست سے آزاد اپنی دنیا خود بنا سکیں۔ اسے ممکن بنانے کیلئے ریاستوں کا رخ ان کے سٹرکچر بنانے اور انہیں چلانے کے روایتی منصب سے ہٹا کر ایسے منصوبوں کی طرف بھی کیا جا سکتا ہے جن کا تعلق انفراسٹرکچر یعنی ایسی داخلی صلاحیتیں بنانے سے زیادہ ہوتا ہے جو لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں کہ وہ اپنی دنیائیں خود بنائیں۔ معیشت کے شعبے میں یہ انفراسٹرکچر قوانین، اصولوں اور پیسوں سے آتے ہیں، سماج میں وہ سماجی تحریکوں، مہموں اور سرگرمیوں کی قانونی، مالی اور عملی رعایتوں پر مشتمل ہوتے ہیں، ذاتی زندگی میں ان میں تعلیمی، مالی اور مشاورتی مدد آ جاتی ہے جو لوگوں کو اپنی زندگیوں اور پیشوں کی منصوبہ بندی اور انتظام کے قابل بناتی ہے۔

8۔ ایک متحرک شہری ثقافت اس ساکت جمہوریت کی طرف جھکاؤ کا ایک نعم البدل ہے جس میں مجہول تماشائی حریف وڈیروں کے درمیان چناؤ میں لگے رہتے ہیں۔ یہ اس دعوے کے بھی خلاف ہے کہ قانون اور اصول کسی طرح اخلاقی بحث وعمل کو موقوف کر سکتے ہیں۔ یہ عام تصور کہ حکمرانی کا جھکاؤ لا اخلاق ٹیکنوکریسی کی طرف ہوتا جا رہا ہے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایک مشاہدے کے طور پر نادرست اور ان قواعد وضوابط اور قوانین کی اس رو سے متصادم ہے جس سے ریاستیں اپنے اردگرد کی دنیا کو اخلاقی معانی دینے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ کوئی معاشرہ اس سمت میں جس قدر بڑھتا ہے وہ اس قدر زوال پذیر ہوتا جاتا ہے کیونکہ وہ کومٹ منٹ اور تجدید کے ان سرچشموں کو ہی قطع کر دیتا ہے جن پر کہ اس کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس کا متبادل یہ ہے کہ جدید آئینی معاشروں کے بنیادی قضیے پر ہی شک کا اظہار کیا جائے جو قوم کے تمام ارکان کو غیر مشروط حقوق و مراعات عطا کرتے ہیں اور اس کی بجائے شہریت کے زیادہ مشروط ماڈلوں کو اختیار کر لیا جائے جن میں مراعات کو سختی سے سماجی خدمت سے منسلک کیا جاتا ہے۔

9۔ ایک گنجان آباد اور باہمی طور پر منحصر دنیا میں اچھی عالمی حکومت لازم ہوتی جا رہی ہے۔ ماضی میں استعماری طاقت اکثر جابر حکومتوں کو سہارا فراہم کرتی رہی ہے۔ حالیہ دور میں آئیں تو جہاں ریاستیں لوگوں کی ضروریات پورا کرنے میں ناکام ہو جاتی رہی ہیں عالمی ادارے اس کمی کو پورا کرتے رہے ہیں۔ جب وہ حرکت میں آتے ہیں تو تحفظ، بہبود، انصاف اور سچائی کے فرائض کہ جو دوسری ریاستوں کا حصہ ہو سکتے ہیں اور خود مختاری اور خود انتظامی کے آدرشوں کے درمیان کشیدگی کا پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بالآخر ان کشیدگیوں پر صرف ایک عالمی حکومت کی طرف پیش رفت سے ہی روک لگائی جا سکتی ہے۔ جن عوامل کی بدولت ریاستیں وجود میں آئی تھیں (مثلاً سلامتی کو خطرہ اور عام اشیاء کی فراہمی کے مسائل وغیرہ) اب انہی مسائل کی جھلک عالمی پیمانے پر دیکھنے میں آ رہی ہے۔ قومی سرحدوں سے بالا ایک ایسی حکومت کے جدید ڈھانچوں کی تشکیل و ارتقاء جس میں خدمت کی اقدار موجزن ہوں اور جو قومی ریاستوں کی طرح محافظت، بہبود، انصاف اور سچائی کے کاموں کے لئے وقف ہو، اس نئی صدی کا سب سے بڑا کام ہے اور انسانی بقاء کے لئے لازم بھی۔ یہ نمونے شہروں اور قومی ریاستوں میں ایجاد شدہ اچھی حکومت کے بہت سے آلات سے استفادہ کریں گے لیکن نئی صورت کے بھی ہوں گے۔ عین اس طرح کہ جیسے کسی معاشرے میں عوامی مفاد کا انحصار عوامی کومٹ منٹ پر ہوتا ہے، اسی طرح عالمی

allurdupdfnovels.blogspot.com

اعتبار سے بین الاقوامی کلبوں سے وابستگی کے حقوق کو مزید مشروط اور زیادہ کھلے طور پر اقدار پر مبنی ہونا چاہیے۔

10۔ آج کے شہریوں کی خدمت کے فرائض کے ساتھ مستقبل کی خدمت کے فرائض پر بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ ان فرائض کی رائے دہندگان اور منڈیوں کے روز مرہ دباؤ سے کشیدگی ایک لازمی امر ہے۔ انہیں حکومت کے اندر اور اس کے گردو پیش شعوری طور پر اداراتی شکل دینے کی ضرورت ہے بلکہ ایک 'حزبِ مستقبل' کا قیام بھی عمل میں لایا جانا چاہیے۔ بصورت دیگر ماضی کے بہت سے معاشروں اور تہذیبوں سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ وہ مہلک ترین خطرات کو بھی آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

حواشی

باب 1

1۔ Quoted in 'why is Any Nation a Democracy?' Professor James Q. Wilson lecture to the Manhattan Institute, 1999.

2۔ اپنی روز مرہ زندگی میں ہم انفرادی خصائل یا رویوں جیسے ان عوامل کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں جنہیں نفسیات کی زبان میں سرشتی عوامل (dispositional factors) کہا جاتا ہے اور وسیع تر سیاق و سباق کے حالاتی عوامل (situational factors) کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے کہ جتنی دینی چاہیے۔ جب کوئی اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو زیادہ امکان اس چیز کا ہوتا ہے کہ وہ اسے وسیع تر اقتصادی قوتوں کی بجائے بدقسمتی، ذاتی ناکامیوں یا بد باطن آجر جیسے سرشتی عوامل سے منسوب کرے گا اور جب کہیں نسل کشی ہوتی ہے تو ہمیں بجائے یہ تسلیم کرنے کے کہ بعض حالات میں عام لوگ بھی سفاک قاتلوں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں، ہمیں مجرموں کی نجس مرضیات کو تلاش کرنا زیادہ آسان محسوس ہوتا ہے۔ اسے بنیادی نسبتی غلطی کہا جاتا ہے۔

3۔ See Felicia Huppert et al., The Science of Well-being. Oxford: Oxford University Press, 2003.

4۔ دور حاضر میں کیے جانے والے یہ دعوے کہ ماحولیاتی حالات اور خصوصاً بعض گھریلو جانوروں اور فصلوں کی موجودگی معاشی و معاشرتی ترقی کی صورت گری کرتی ہے ان کی بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں اور نئی دنیا پر قدیمی دنیا کے اضافی تفوق کی بخوبی وضاحت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ کہ جو آب و ہوا (بیماری) دولت اور غربت

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے عالمی نقشوں کی وضاحت کرتے ہیں اس حقیقت سے براہ راست متصادم ہیں کہ تاریخ کے طویل ادوار میں تہذیب اور آبادی کے مراکز گرم اور بیشتر اوقات استوائی خطوں میں پائے جاتے رہے ہیں جبکہ معتدل خطوں میں پسماندگی اور بربریت دیکھنے میں آتی رہی ہے۔ گذشتہ صدی میں گرم علاقوں کی نسبت معتدل علاقوں کے ممالک اس قدر امیر کیوں ہوئے اس کا زیادہ تعلق یورپی استعماریت اور ان نو آبادیوں کے مختلف کردار سے ہے کہ جنہوں نے وسیع پیمانے پر آبادکار برآمد کیے۔

5۔ اسے کوئی پچاس ایک ممالک کی شرح خوشی کے موازنے سے معلوم ہوا کہ 80 فیصد تبدیلی کی وضاحت چھ متغیرات کی مدد سے کی جا سکتی ہے جن میں معیار حکومت، اعتماد اور بدعنوانی شامل ہے۔ ہنگری (87.+) کی نسبت بیلا روس (76.-) کے معیار حکومت میں بہتری بیلاروس کے شہری کی اوسط خوشحالی میں تقریباً اتنا اضافہ کرے گی جتنا کہ آمدنی کی تقسیم کے زیریں تا بالائی decile تک پہنچنے سے ہوتا ہے۔ امکان ہے کہ اس طرح کی بہت سی مزید تحقیقات عمل میں آئیں گی اور مزید اعداد و شمار کی دستیابی سے ان میں بہتری بھی پیدا ہو گی۔

John Helliwell, 'How'sLife? Combning Individual and National Variables to Explain Subjective Well Being' National Bureau of Economic Research, Working Paper 9065, July 2002.

6۔ اس کتاب میں Overlapping الفاظ کے دو جوڑے ہیں جنہیں اکثر ایک دوسرے کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے لیکن وہ کم از کم جزوی طور پر مختلف معانی کے بھی حامل ہیں۔ پہلا جوڑا morals اور ethics کا ہے جنہیں ان کے مآخذ (پہلا لفظ لاطینی، دوسرا یونانی) اور اس عام مفروضے کی بنا پر ممیّز کیا جاتا ہے کہ پہلا روایت سے بنے کسی معاشرے میں ought اور should کے اصولوں کی طرف جبکہ دوسرا عقل سے ماخوذ نسبتاً زیادہ عالمگیر اصولوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دوسرا جوڑا state اور government ان الفاظ پر مشتمل ہے جو ماخذ کے اعتبار سے دونوں ہی لاطینی ہیں اور پہلے جوڑے کی نسبت آپس میں زیادہ مربوط ہیں۔ ریاست ایک نسبتاً زیادہ تجریدی لفظ ہے: ایک ہی علاقے میں رہنے والے لوگ جنہیں دوسرے تسلیم کرتے ہوں اور ایک ہی حکومت کی اطاعت کرتے ہوں۔ عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ریاست لوگوں کی وفاداری پر اجارتی دعویٰ رکھتی ہے۔ حکومت ایک انتظامی اتھارٹی ہوتی ہے جو اس کی خدمت کرتی ہے اور کسی خاص علاقے میں اصولوں کی توضیع و نفاذ کرتے ہوئے لوگوں کے کسی گروہ کی رہنمائی کرتی ہے۔ آجکل میں ان دونوں الفاظ کو عمل اعتبار سے ایک دوسرے کے مترادف تصور کیا جاتا ہے لیکن ماضی کے بہت سے ادوار میں اور امکان غالب ہے کہ مستقبل میں بھی، یہ دونوں الفاظ معانی کے اعتبار سے مختلف سمتیں اختیار کر لیں گے اور بعض ریاستوں میں ایک سے زائد حکومتیں ہوں گی (یورپ میں پہلے ہی یہ صورت حال دیکھنے میں آ رہی ہے)۔

7۔ جیفری اور اینڈریو وارنر 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں 97 ترقی پذیر ملکوں پر تحقیق کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قدرتی وسائل اور اقتصادی ناکامی ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔ تیز ترین نمو ظاہر کرنے والے ممالک عموماً کم قدرتی وسائل کے حامل تھے۔

Jeoffery Sachs and Andrew Warner, Natural Resource Abundance and Growth, Cambridge, Mass. Ntional Bureau of Economic Growth, 1995.

8۔ گنر مرڈلی کی 'ایشیائی ناٹک' جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مذہب و ثقافت نے ایشیاء کی اقتصادی ترقی کے امکانات کو کیسے روکے رکھا جبکہ بیشتر ایشیاء میں تیز نمو کے کئی عشروں کا آغاز ہو رہا تھا اس چیز کی ایک کلاسیکی مثال ہے کہ ثقافت و اقتصاد کے درمیان علتی نسبت قائم کرنے کی کوششیں کتنی گمراہ کن ہو سکتی ہیں۔ گنر مرڈلی، 'ایشیاء ناٹک' قوموں کی غربت پر ایک تحقیق، لندن: ایلن لین، 1968۔

9۔ Helliwell, op. cit.

10۔ بہت سے قدیم فلاسفہ کی نظر میں اچھی حکومت کی دوسری ضمانت اس طبقے کا معیار تھا کہ جس سے حکمران پیدا ہوتے ہیں۔ (بیشتر قدیم یونانی فلاسفہ اشرافیہ طبقے کی طرف اشارہ کرتے ہیں)۔ چند صدیوں بعد ان دانشوروں کے ایک گروہ نے ان تمام مختلف عوامل پر سوچ بچار کی جو سکندریہ کے بڑے کتب خانے میں اپنے حکمرانوں کیلئے بادشاہت، حکمرانی اور جواز پر تحقیق کیلئے کل وقتی بنیادوں پر کام کر رہے تھے۔ ان دانشوروں کے اخذ کردہ نتائج کا فی زمانہ کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

11۔ گذشتہ نصف صدی میں کارل پاپر جیسی ممتاز شخصیات کی طرف سے پیش کئے گئے بیشتر سیاسی نظریات نے آمر ریاستوں کے اقتدار کے سنگین غلط استعمالات کے خلاف ردعمل ظاہر کیا۔ ان کے نزدیک سیاسی فلسفے کا قلبی مسئلہ یہ ہے کہ اختیارات کی تقسیم، آئینی پابندیوں اور اقتدار کے حریف مراکز کے طور پر آزاد منڈی اور سول سوسائٹی کی حوصلہ افزائی کے ذریعے ریاستوں کی بے تحاشا طاقت کو محدود کیسے کیا جائے۔

12۔ دوسرے ملکوں کے دوروں نے مجھ پر یہ حقیقت منکشف کی کہ آپ کسی معاشرے کے متعلق جس قدر آگاہ ہوتے ہیں وہ اپنی تاریخ سے اسی قدر یکتا انداز سے لازم و ملزوم نظر آنے لگتا ہے (اور طاقتور ترین قوموں کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی یکتائی کا قائل بھی کرتی ہیں)۔ یہ کسی حد تک ایک بصری دھوکہ ہوتا ہے: اگر حکومتی و ریاستی مشینری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکومتوں کو درپیش اہداف بہت زیادہ ملتے جلتے دکھائی پڑتے ہیں۔

13۔ Jean Dunbabin, 'France in the Making' 843-1180. Oxford: Oxford University Press, 1985, P.77.

14۔ مارکسسٹ بھی ثبوت اور تجربے کے اتنے ہی خلاف تھے، اگرچہ انہوں نے خدا اور فطرت کی جگہ تاریخ کے بے رحم قوانین کو دے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ استحصال اور غیر مساوی اختیار نے ظاہری دنیا کو اس قدر بگاڑ دیا تھا، نظریہ سازوں اور سیاسی و سماجی کارکنوں کو تبدیلی کی پوشیدہ حرکیات تلاش کرنے کیلئے ان کے اپنے پیچھے دیکھنا پڑا۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ بازار میں اشیاء اور پیسے کا مساوی بنیاد پر تبادلہ کرتے نظر آتے ہوں لیکن تبادلے کی برابری کے پیچھے اختیار و قدر کی گہری ناہمواریاں چھپی ہوتی تھیں۔ حال کی طرف آئیں تو بہت مختلف نظریاتی نقطہ آغاز سے تعلق رکھنے والے بعض جدید اقتصادی نظریہ سازوں نے اولین اصولوں پر استوار منڈی اور ریاست کی ناکامی کے نظریوں سے ریاست کے خاص مناصب اخذ کیے ہیں۔ نظریہ دان کا کام پوشیدہ حقیقتوں پر سے پردہ اٹھانا ہوتا ہے (جیسا کہ کسی حد تک جدید ناول قاری کو وہ چیزیں دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے جنہیں ناول کے کردار

allurdupdfnovels.blogspot.com

نہیں دیکھ پاتے اور جو اس بات پر انحصار کرتا ہے کہ قاری جو بھی پڑھے اسے ظاہری طور پر نہ لے)۔ چنانچہ سرمایہ داریت کا پرفریب اتصال ایک دھوکہ تھا جس کو مارکسی سیاسی معیشت نے مزدور طبقے کے تاریخی مشن کی طرفداری کر کے چیر کر آگے نکلنے کی کوشش کی۔ فرائیڈی نفسیاتی تجزیہ کاری نے بذریعہ علاج مریض کے واہموں سے اور نو کلاسیکی معاشیات نے رویے کی منطقی بنیادوں سے پردہ ہٹایا جو لوگوں کے اپنے محرکات کے بارے میں ان اپنی جانچ سے قطعی مختلف ہو سکتی ہیں۔

15۔ تاہم محسوس ہوتا ہے کہ اس کی عظیم تصنیف کئی صدیوں میں پایہ تکمیل کو پہنچی اور اس میں بہت سے افراد نے اضافے کیے (اور اس کی حتمی شکل کے بارے میں امکان غالب ہے کہ یہ چندر گپت کے کوئی نصف ہزار یے بعد دوسری صدی عیسوی میں منظر عام پر آئی)۔

16۔ ٹامس ایکو نیاس جیسے ممتاز ماہر الہیات نے بھی اپنی تصنیف میں اپنے دلائل کو کشف پر نہیں تجربے پر اساس کیا۔

17۔ اگرچہ اس پر بات ہو سکتی ہے فاصلہ پیدا کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم نہ صرف خود کو اقتدار سے بلکہ انسانی میل جول سے بھی الگ کر لیں جیسا کہ مذہب کی متصوفانہ روایتوں میں ہوتا ہے۔ دنیا کو دھتکار دیا جائے اور ایک فاصلے سے اس کے واہموں کا تجزیہ کیا جائے۔ تاہم متصوفانہ عدم وابستگی سے حاصل ہونے والے علم کو انسانی معاشرے میں آسانی سے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لوگ جو معاشرے میں رہنا چاہتے ہیں واحد راستہ یہ ہے کہ وہ خود کو زندگی کی طغیانیوں میں ڈال دیں اور اس چیز کو مان لیں کہ اس کے اندر آپ کا مقام ہر ادراک کی صورت گری کرے گا اور اس میں ردو بدل پیدا کرے گا اور یہ کہ گو علم حاصل کیا جا سکتا ہے یہ علم خود آگاہ ہوتا ہے جسے اپنی حدود کا شعور ہوتا ہے۔

18۔ ایسے نظریات بھی ہیں جو ریاست کی ندرت پر زور دیتے ہیں اور ایسے بھی کہ جو اس کی کثرئیت (Pluralism) پر زور دیتے ہیں۔ ایسے نظریات بھی ہیں کہ جو ریاست کو ایسی جگہ تصور کرتے ہیں کہ جہاں دوسرے اپنی لڑائیاں لڑیں اور ایسے نظریات بھی جو اس کی خود مختاری پر زور دیتے ہیں اور ایسے بھی جو اس بین الاقوامی سیاسی

allurdupdfnovels.blogspot.com

معیشت کو اجاگر کرتے ہیں جس میں ریاستیں کام کرتی ہیں اور بعض دوسرے نظریات ایسے بھی ہیں کہ جو درحقیقت انہیں بند نظاموں کے طور پر دیکھتے ہیں۔ نظریوں کے ساتھ ایسے نظریے یا غیر نظریے بھی ہیں کہ جو افراتفری اور انتشار اور منطق کی عدم موجودگی پر زور دیتے ہیں۔

Mark Haugaard, ed., 'Power: A reader'. Manchester: Manchester University Press, 2002.

19۔ یہاں میکیاولی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

20۔ ان میں سے بہت سی اشیاء یسعیاہ برلن کے مفہوم میں بھی غیر ہم وزن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی واحد معیار ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

باب 2

1۔ صرف انٹارکٹیکا کو استثنا حاصل ہے۔

2۔ یہ ناہمواری کتنی فطری یا ناگزیر ہے؟ لنگور بن مانس بھی درجات میں منقسم گروہوں میں رہتے ہیں جو عورتوں پر مردوں اور کمزور مردوں پر طاقتور مردوں کی جسمانی بالا دستی کی نافذ کردہ تسلط و اطاعت کی کڑی حد بندیوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ ان کے روز مرہ سماجی ناٹک کا ایک بڑا حصہ مرتبے کیلئے جدوجہد پر مشتمل ہوتا ہے۔ انسانی معاشروں میں کچھ ناہمواریاں اس سے بھی کڑی ہیں۔ انسانی بچہ کسی بھی دوسرے جانور کی نسبت اپنے والدین کا بہت طویل عرصے تک مکمل طور پر محتاج ہوتا ہے۔ (گو اگر والدین بچے کو وقعت دیتے ہیں تو اسے جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے ان پر کس قدر اختیار حاصل ہے)۔ تاہم بن مانسو کی نسبت انسانوں میں جسمانی اختلافات کم ہوتے ہیں اور ان میں جسمانی طور پر واضح دکھائی دینے والے سردار بھی کم ہوتے ہیں۔ قیادت کے فطری طور پر غالب ذریعے کے بغیر، انسانی گروہوں کو زیادہ بولنا اور سننا پڑ سکتا ہے اور مسائل کے حل کیلئے زیادہ محنت کرنا پڑ سکتی ہے۔ شاید دلیل اور بغاوت جسمانی طاقت کے بڑے تضادات سے تہی اس ذہین اور ابلاغی نوع کی قدرتی کیفیات ہیں: کمزوروں کی تسلط کے خلاف آزردگی پر مبنی ایک اٹکل پچو سی مساوات۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

3۔ ڈیوڈ لیوس ولیمز، غار کا ذہن، شعور اور آرٹ کے ماخذ، لندن : ٹیمز اینڈ ہڈسن2002، پ80

4۔ رابرٹ کارنیرو اور ایلمن سروس کے درمیان اس کلاسیکی تنازے کہ آیا جنگ نے معاشروں کی سب سے زیادہ صورت گری کی ہے یا کہ تجارت نے کا اعادہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ رابرٹ کارنیرو، 'ریاست کی ابتداء کے بارے میں ایک نظریہ'، سائنس، نیو سیریز، جلد169، شمارہ3947(2 اگست1970ء)8-733؛ ایلمن سروس، ریاست اور تہذیب کی جڑیں، نیورک یارک، نارٹن،1975۔

5۔ درج ذیل تصانیف کا شمار ماضی قریب میں شائع ہونے والی چند بہترین کتابوں میں ہوتا ہے:

Robert McCormic Adam, 'the Evolution of Urban Society'. Chicago: Aldine, 1966.

Henri Classen and Peter Skalnik, eds., 'The Early State'. The Hague : Mouton Walter de Grayter, Inc., 1976.

Deborah Nicholas and Thomas Charlton, eds., The Archaeology of City States. Washington, DC and London: Smithsonian Books, 1997; and Gary Feinman and Joyce Marcus, eds., 'Archaic States'. Sante Fe, N. Mex. SAR Press, 1998

6۔ Bruce Trigger, 'Understanding Early Civilisation'. Cambridge; Cambridge University Press, 2003, p.201

7۔ انہیں موجودہ دور میں دنیا کے ان حصوں سے ملنے والے بشریاتی شواہد میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں لوگ کسی مرکزی ریاست کی فعال موجودگی کے بغیر رہتے رہے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سردار ہونا اور حریف گروہوں کو کسی زیادہ مربوط اکائی میں متحد کرنے کی کوشش کرنا کیسا ہوتا ہو گا۔ تاہم ان شواہد کو قطعی کی بجائے زیادہ سے زیادہ اشاراتی ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

8۔ غریبوں کے اس زمین کے وارث ہونے کے تصور کی تعبیر قدامت پسندانہ طریقوں میں غریبوں کی اس دنیا میں اطاعت کو قبول کر لینے کی ایک توجیہہ کے طور پر بھی کی جا سکتی تھی، تاہم Gnostics کے وقتوں سے لے کر جدید حریتی الہیات تک بعض افراد نے اس کی تعبیر اس سے زیادہ انقلابی طریقوں سے بھی کی ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

9۔ Trigger, Op. Cit.

10۔ Petr Charvat, 'On People, Signs and States: Spotlights on Sumerian Society' C. 3500-2500BC. Prague: Oriental Institute of the Academy of Czech Republic, 1997.

11۔ 'شو جنگ' یا 'شانگ شؤ'۔

12۔ سندھی تہذیب سے کسی قابل فہم تحریری دستاویز کی عدم دستیابی کا مطلب ہے کہ ہم شاید یہ کبھی بھی نہ جان سکیں کہ آیا وہاں ایک واحد سلطنت تھی، الگ الگ شہری ریاستیں تھیں یا کہ کوئی دوغلا نظام مروج تھا۔

13۔ ژینوفون نے 'پولس' کی بڑی خوبی یہ بیان کی کہ اس میں شہری غلاموں اور مجرموں کے خلاف ایک دوسرے کے محافظوں کا کام کرتے ہیں تاکہ کوئی شہری پر تشدد موت نہ مرے'۔ ژینوفون، ہائیرو، 3,17

14۔ قیدیوں کا مسئلہ T>R>P>S منطقی ساخت کی حامل کسی بھی صورتحال کو بیان کرتا ہے جس میں T کا مطلب نافرمانی کی تحریص (temptation)، R کا مطلب تعاون کا صلہ (reward)، P کا مطلب باہمی نافرمانی کی سزا (punishment)، اور S چوسنے والے (sucker) کا بدلہ ہے۔ اگر آپ تعاون کریں اور دوسرا کھلاڑی نافرمانی کرے تو کیا ہوتا ہے۔

15۔ سمجھدار افراد عوامی اشیاء کم مقدار میں بنانے کی طرف راغب ہوں گے۔

16۔ رابرٹ رائٹ کی کتاب نان زیرو، صفر رقم اور مثبت رقم کھیلوں کے درمیان گیمز تھیوری کے تضاد کے عدسے سے انسانی ارتقاء کو بہت شاندار طریقے سے بیان کرتی ہے۔

Robert Wright, Non-Zero, London: Vintago, 2001.

17۔ اعتماد پیدا کرنے کا یہ کام ثقافت میں بہت گہرائی تک جاتا ہے۔ اس کو مشترکہ عقیدوں اور علامتوں، موسیقی، مشترکہ رسوم اور رقص سے فروغ دیا جا سکتا ہے جن سب نے ابتدائی معاشروں کو ایک واحد جسم کے طور پر محسوس اور عمل کرنے پر مجبور کرنے میں ایسا کردار ادا کیا جو احساسات نیز مفادات کے اعتبار سے متحد تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ آجکل کے یورپ میں مناجاتیوں کی منڈلی کی ریت کو اب بھی

allurdupdfnovels.blogspot.com

مدنی صحت کا ایک عمدہ مظہر تصور کیا جاتا ہے۔ دیکھئے۔

R.D. Puttnam, 'Making Democracy Work', Civic Traditions in Modern Italy'. Princeton; Princeton University Press, 1995.

18۔ مثال کے طور پر جان نیش نے ثابت کیا کہ 'قیدیوں کی دبدھا' طرز کی کھیلوں کی طرح، اگر کھیل محدود ہے تو منطقی حکمت عملی کے طور پر ہر دفعہ نافرمانی کرنا ہو گی چونکہ دونوں فریق آخری موڑ پر نافرمانی کرنے پر مجبور ہوں گی۔ لہٰذا ہر گذشتہ موڑ پر بھی تعاون کو پائیدار بنانے کیلئے مستقبل کا غیر یقینی اور اور غیر حتمی ہونا لازم ہے۔

J.F. Nash, 'Equilibrium Points in N-Person Games'. Proceedings of the National Academy of Sciences of the United States of America, 36 (1950): 48-9.

19۔ Bertrand Lemenicier, 'Fallacies in the Theories of the Emergence of the State', Journal of Libertarian Studies, 2003; Etienne de la Boetie, The Politics of Obedience: The discourse of Voluntary Servitude. Montreal; Black Rose, 1976; James Buchanan, The Limits of Liberty. Chicago; University of Chicago Press, 1975; Douglas North, Sturcture and Change in Economic History. New York: Norton, 1981.

20۔ وہ لکھتا ہے 'اگر اور جس حد تک ریاست کا انتظامی عملہ کامیابی سے اس نظام کے نفاذ میں جسمانی طاقت کے جائز استعمال کی اجارہ داری کا دعویٰ برقرار رکھتا ہے، مسلسل تنظیم کے ساتھ اجباری سیاسی وابستگی کو ریاست کہا جائے گا'۔ ویبر کی تعریف ان ریاستوں پر لاگو ہوتی ہے جنہیں اس نے طاقت کے ڈراوے کی مدد سے کسی علاقے پر نسبتاً ایک بے قاعدہ سیاسی طاقت کی جگہ لیتے دیکھا۔ میکس ویبر، 'سیاست بطور کسب'، تقریر 1918۔

21۔ ارسطو کا کہنا تھا کہ فوجی قوت کی غالب اصناف اور سیاست کے کردار کے درمیان ایک ناگزیر تعلق ہوتا ہے۔ وہ گھڑ سوار فوج کو چند سری حکومت، ہر پلہ فوج کو زمیندارہ جمہوریہ اور بحریہ کو جمہوریت سے منسوب کرتا ہے۔

22۔ Mark Edward Lewis, 'Sanctioned Violence in Early China'. Albany, NY: State University of New York Press, 1990.

23۔ Michael Mann, 'The Sources of Social Power', 2 Vols. Cambridge; Cambridge University Press, 1986 and 1993

24۔ Charles Tilly, 'Coercin, Capital, and European States'. Oxford : Black

allurdupdfnovels.blogspot.com

Well, 1993.

25- Karl A. Wittfogel, 'Oriental Despotism', New Haven, Conn. Yale University Press, 1957.

26- 'Analects',XIII, 7.

27- جمہوری ریاست میں عوام بعض کاموں کی تکمیل کیلئے حکومت کو اختیار دیتے ہیں، جس کے مفادات ان سے مختلف ہوتے ہیں۔ سیاست دان افسر شاہی کی خدمات لیتے ہیں اور اس کے مفادات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مرکزی افسر شاہیاں باہر کے اداروں سے کام لیتی ہیں۔ باہر کے ادارے پیشہ ور افراد کی خدمات حاصل کرتے ہیں جو اکثر خود بھی معاون عملے سے کام لیتے ہیں۔ کنٹرول رکھنے کیلئے ہر قدم پر کئی تدابیر استعمال کی جاتی ہیں: تحریری احکامات اور ٹھیکے متوقع چیز کو رسمی شکل دیتے ہیں۔ مخبری اس چیز کا سراغ لگاتی ہے کہ معاہدے پورے کئے جا رہے ہیں یا نہیں۔ انصاف فراہم کرنے والی طاقتیں معاہدوں سے پھرنے والے عاملوں کو سزا دیتی ہیں۔ بعض ملکوں میں انسپکٹروں اور آڈیٹروں کے لشکروں کے لشکر اس کا سراغ لگانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ کس نے کیا کیا ہے۔ تفویض اختیار کو کنٹرول کرنے کیلئے استعمال کی جانے والی تدابیر کا متناقض نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اعتماد کو نقصان پہنچاتی ہیں کیونکہ وہ اس تصور پر آساس کرتی ہیں کہ تفویضی اختیار استعمال کرنے والے شخص پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں کامیابی اور ناکامی غیر مبہم کم ہی ہوتی ہیں۔ جب اہداف سادہ ہوں، انہیں آسانی سے متعین کیا جا سکے اور ان کی ارزاں طریقے سے نگرانی کی جا سکے تو لیڈروں اور عاملوں کے درمیان تعلقات شفاف اور واضح ہو سکتے ہیں۔ عوام بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ آیا ان کی حکومت نے پڑوسی حکومتوں کی نسبت زیادہ معاشی نمو دکھائی ہے یا نہیں اور حکمران بڑی آسانی سے دیکھ سکتا ہے کہ آیا کسی علاقے کے حاکم نے وعدے کے مطابق سڑکیں تعمیر کی ہیں یا کہ نہیں۔ تاہم بہت سے حکومتی کاموں میں متعدد ایسے اہداف شامل ہوتے ہیں جو نوعیت کے اعتبار سے مبہم ہوتے ہیں مثلاً جرائم میں تخفیف یا ماحول کی بہتری۔ یہ بات مکمل طور پر واضح کم ہی ہوتی ہے کہ کامیابیوں اور ناکامیوں کا ذمہ دار کون ہے حتیٰ کہ اس وقت بھی کہ جب قابل اعتماد انداز سے یہ دیکھنا ممکن بھی ہوتا ہے کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

اصل میں کیا ہوا ہے۔
تفویض اختیارات کے بارے میں ایک حالیہ تجزیہ عالمی بینک کیلئے لکھی جانے والی اس رپورٹ میں سامنے آیا ہے جو جدید جمہوریت کو تفویض اختیارات کے تین مجموعوں کے اعتبار سے بیان کرتی ہے۔'اول' خود مختار عوام قومی مقنّنہ اور انتظامیہ کو (عموماً تحریری آئین کے ذریعے) فیصلہ سازی کا اختیار تفویض کرتے ہیں۔ عوام کے پاس اپنے نمائندے کے صحیح رویے کو یقینی بنانے کیلئے دو بنیادی آلات ہوتے ہیں: انتخابات کے وقت ان کی جگہ دوسرے افراد کو منتخب کرنے کا اختیار اور سیاسی کھیل کے آئینی اصول مقرر کرنے کا اختیار......تفویض اقتدار میں دوسرا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب مقنّنہ اور انتظامیہ کی داخلی تنظیم کی تفصیلات طے کی جاتی ہیں۔ تفویض اختیار کا تیسرا مرحلہ مقنّنہ (یا اس کے سیاسی عمائدین) لیڈر اور مختلف اداروں کو عاملوں کے طور پر لیتا ہے۔

Gary Cox and Mathew Mccubbins, in Mathew McCubbins and Stephen Haggard, eds., 'The Structure of Fiscal and Regulatory Policy'. New York: World Bank, 2001, pp.2-3

28۔ مائیکل وان نے اپنی کتاب 'سماجی طاقت کے ذرائع' میں طاقت کے ان ذرائع کو بڑے جامع انداز سے بیان کیا ہے۔

29۔ جنگیں فوجوں کو صحیح جگہوں پر فیصلہ کن انداز سے مرتکز کر کے جیتی جاتی ہیں۔ جدید طریقہ جنگ اس ارتکاز کی ماہیت کو بدل دیتا ہے، خواہ جوہری ہتھیاروں کی شکل میں یا گوریلا جنگ کے ذریعے جو فوجوں کے ارتکاز کا متبادل راستہ تلاش کرنے اور عوامی طاقت کے ہم وزن سیاسی ارتکاز کو پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

30۔ ریاستوں پر اثر انداز ہونے کی خواہاں تحریکوں اور مفاداتی گروہوں کو یہ سیکھنا پڑتا ہے کہ اپنی قوتیں حکمران گروہ کے فشاری نقاط پر مرتکز کیسے کرنی ہیں ...... ان کی انتخابی اکثریتوں یا ٹیکسوں کی تحصیل کیلئے خطرہ پیدا کر کے، پارٹی کے مالی معاملات خراب کر کے، یا ان کی بین الاقوامی ساکھ یا ریاست کی نظم ونسق برقرار رکھنے کی صلاحیت پر شکوک وشبہات کا اظہار کر کے۔

31۔ ریاستی اقتدار کے ہر ذریعے کی انسان کے بقیہ فطری دنیا سے تعلقات میں اپنی جڑیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

موجود ہیں۔ چرواہے جانورون کے جسموں اور زندگیوں پر ان کی ضروریات، خطرات اور انفرادی امتیازات کو سمجھتے ہوئے حکمرانی کی اپنی صلاحیت پر انحصار کرتے تھے، زرعی معاشروں میں ایک ایسی معیشت میں بقاء کیلئے فصلوں کے موسمی ہیر پھیر پر حکومت لازم تھی کہ جو آب و ہوا کے قریبی مشاہدے سے متعین سرمایہ کاری اور منافع جات پر مشتمل تھی۔ شکاریوں کیلئے دھوکے، فریب اور ڈراوے کے ذریعے شکار کے خیالات پر حکومت بقاء کیلئے ایک کلید کی حیثیت رکھتی تھی۔

32۔ Thomas Barfield, 'The Perilous Frontier, Nomadic Empires and China'. New York. Blackwell, 1989.

33۔ فکری قوت بھی سماجی ترقی کیلئے مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ تہذیب اصل میں ان افکار اور فکری عادات کا مجموعہ ہوتا ہے جو اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ ہم دنیا کو کیسے دیکھتے ہیں اور طرزعمل کے بارے میں کیسے سوچتے ہیں اور ترقی کو اس بڑھتے ہوئے وزن کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے جو پہلے پیسے کا تشدد کی نسبت سے ہوتا ہے (تاجروں کا سپاہیوں کی نسبت غلبہ) اور پھر خود آگاہ علم کا پیسے اور تشدد دونوں کی نسبت ہوتا ہے۔

باب 3

1۔ Quoted in Robert Nozik, 'Anarchy, State and Utopia'. Oxford : Blackwell, 1974.

2۔ Samuel Finer, 'The History of Government from the Earliest Times', Vol. 2. Oxford, Oxford University Press, 1997, P 227.

3۔ Douglass North, Understanding the Process of Economic Change, Princeton, Princeton University Press, 2003.

نارتھ کی یہ کتاب اس مظہر کو انتہائی عمدہ طریقے سے بیان کرتی ہے کہ علم اور اداروں نے معاشی نمو کی صورت گری کیسے کی ہے۔

4۔ H.G. Greel, 'The Beginnings of Bureaucracy in China. The Origin of the Hsien', 'Journal of Asian Studies'. 23 (1964); 153-84.

5۔ Laurence E. Lynn, Jr. 'Public Management, A Brief History of the Field', in E. Ferlie, L. Lynn and C. Pollitt, eds. 'Handbook of Public

allurdupdfnovels.blogspot.com

Management', Oxford University Press.

فریڈرک ولیم اول نے سرکاری اہلکاروں کو تربیت دینا شروع کی تھی اور1720ء کے عشرے میں انتظامی مضامین میں دو یونیورسٹی چیئرز کا افتتاح کیا تھا (اٹھارہویں صدی کے آخر تک ایسی چیئرز کی تعداد23 تک پہنچ چکی تھی) جبکہ فریڈرک اعظم نے امتحانات اور سول سروس کمیشن کا اجراء کیا تھا۔ کیمرل ازم کا سب سے بڑا حامی جوہان جسٹی تھا۔

6۔ انگلستان میں سالانہ شرح قتل تیرہویں اور چودھویں صدی میں 20 فی100000 نفوس سے گر کر بیسویں صدی کے آخر تک 1 فیصد100000 نفوس تک نیچے آئی۔

Manual Eisner, 'Modernization, Self Control and Lethal Violence', British Journal of Criminology, 41 (2001) 618-38.

7۔ Anthony Giddens, 'The Nation State and Violence', Cambridge; Cambridge University Press, 1985, P. 309.

8۔ بہت سی مالی اختراعات کی طرح، انکم ٹیکس اتنی تیزی سے اس لئے پھیلا یہ ٹیکس کا ریاستوں کی بقاء کی صلاحیت پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے (VAT نے ایک صدی بعد اسی کی پیروی کی)۔ شاید، حیران کن طور پر، زیادہ ارتباط نے ریاستوں کیلئے محصولات اکٹھے کرنا زیادہ آسان بنا دیا تھا کیونکہ اس سے معاشی سرگرمی بہت زیادہ واضح ہو جاتی تھی (ریاستوں کیلئے پیداوار کی بجائے بندرگاہوں اور سرحدوں سے گزرنے والی تجارت پر ٹیکس لگانا زیادہ آسان رہا ہے)۔ یہ عام مفروضہ کہ عالمگیریت سے قومی ریاستوں کے ٹیکس بیس کو نقصان پہنچے گا درست ثابت نہیں ہوا۔ اس سے پیداوار کے بہت زیادہ متحرک عوامل پر ٹیکس لگانا مشکل ہو سکتا ہے ...... ٹیکس ہیونز امراء اور عالمی کارپوریشنوں کے ٹیکس چوری کرنا ممکن بنا سکتی ہیں ...... تاہم اس دوڑ میں تاحال ٹیکس وصول کرنے والوں کا ٹیکس چوری کرنے والوں کی نسبت پلہ بھاری رہا ہے۔

9۔ Charles Tilly, 'Stories, Identities, and Political Change', International Social Science Review, Spring, Summer (2002), 255.

10۔ قومی تشخص کو پسی ہوئی قوموں اور طاقتور ریاستوں (روم و فارس تا چین) کیلئے ہمیشہ ایک برقی قوت کی حیثیت حاصل رہی ہے لیکن انیسویں صدی تک قومی خود

allurdupdfnovels.blogspot.com

ارادیت کو ایک عام اصول کی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں رہی۔

11۔ واحد شہنشاہ یا تو حکمران نہیں ہوتے (جیسا کہ جاپان میں) اور یا وہ صحیح معانی میں شہنشاہ نہیں ہوتے (جیسا کہ 1970ء کے عشرے میں وسطٰی افریقہ میں شہنشاہ بوکاسا کی مثال ہے)۔

12۔ اگر نتائج ...... مثلاً صحت اور خوشحالی ...... نیز ان کے حکومتی انتظامات کے اعتبار سے آنکا جائے تو اس فہرست میں نہ صرف یورپی اتحاد اور OECD ممالک آ جاتے ہیں بلکہ ماریشس اور جنوبی افریقہ کے بشمول بعض افریقہ میں، تائیوان، جنوبی کوریا کے بشمول بہت سے ایشیاء کے اور چلی کے بشمول کچھ لاطینی امریکہ کے ملک بھی آ جاتے ہیں۔

13۔ ان میں سے بیشتر معتدل آب و ہوا کے حامل خطوں میں ہیں جیسا کہ دنیا کی بیشتر دولت اب متعدل آب و ہوا کے حامل علاقوں میں ہے جو کئی طرح کی بیماریوں سے نسبتاً پاک ہے اگرچہ وجوہات کا تعلق تاریخ سے بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ ماحولیات سے۔

14۔ رچرڈ روز نے 1985ء کیلئے برطانیہ کیلئے 105600 (بشمول مسلح افواج کے ملازمین، تناقض کی وجہ بھی یہی ہے) کا جرمنی کیلئے 855000 کا اور امریکہ کیلئے 379700 کا تخمینہ لگایا ہے۔

Richard Rose, 'Undurstanding Big Government; The programme approach'. London; Sage, 1984, P.130

15۔ Vito Tanzi and Ludger Schuknecht, 'Public Spending in the 20th Century', Cambridge, Cambridge University Press, 2000.

16۔ ان آلات کا حالیہ جائزہ:

Lester Salamon, 'The Tools of Government' Oxford: Oxford University Press, 2002.

17۔ جمہوری فلاحی سرمایہ داریت کسی بھی تاریخی معیار کی رو سے بہت زیادہ کامیاب رہا۔ یہ ترقی یافتہ ممالک کی کارکردگی کی جانچ کیلئے کی گئی اہم ترین تحقیق کا اخذ کردہ نتیجہ ہے جو آسٹریلوی ماہر سیاسیات رابرٹ گوڈن اور اس کے معاونین نے سرانجام دی۔ ان کا اصل مقصد اس چیز کا تجزیہ کرنا تھا کہ قدامت پسند، لبرل اور سوشل ڈیمو

allurdupdfnovels.blogspot.com

کریٹک کے بشمول مختلف طرح کے نظاموں نے شہریوں کے لئے نتائج حاصل کرنے میں کیسی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس رپورٹ کیلئے امریکہ، جرمنی اور ہالینڈ سے طویل دورانیے پر محیط اعدادوشمار حاصل کئے گئے (صرف یہی وہ ممالک ہیں جن کے متعلق مناسب اعدادوشمار میسر ہیں)۔ اس کیلئے 1970ء کے اواخر سے لے کر 1990ء کے اوائل تک لوگوں کی زندگیوں کی سال بہ سال چھان بین کی گئی:

Robert Goodin et al., 'The Real Worlds of Welfare Capitalism' Cambridge University Press, 1999.

محققین نے نظریاتی طرفداری سے بچنے کیلئے ان معیارات کا تجزیہ بھی کیا جنہیں ہر نظام کے حامی اہم ترین تصور کرتے تھے اور پھر یہ چیز دیکھی کہ اصل میں کیا ہوا، مثلاً سلامتی اور حریفانہ تجارت کے درمیان نسبت کے معاملے میں۔ اس تحقیق کے نتائج واضح تھے۔ تمام نظاموں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا لیکن سوشل ڈیمو کریسی کو فلاحی نظاموں کے تمام اخلاقی طور پر پسندیدہ تمام نتائج کے حوالے سے دیگر دو نظاموں کے مقابلے میں سبقت حاصل رہی۔ اس تحقیق کو صرف چند ایک ممالک اور ایک خاص دور تک محدود رکھا گیا تھا، تاہم یہ سیاسی لوگوں کے دعوؤں کو آزمانے کے لئے مستقبل کی تحقیقات کیلئے ایک مفید راستے کی نشاندہی ضرور کرتی ہے مثلاً یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا کوئی ایسے واضح پیٹرنز بھی ہیں کہ جو سیاسی نظاموں کو سماجی تحرک، مستحکم خاندانوں یا معاشی نمو سے مربوط کرتے ہیں۔ اگر اس تحقیق میں زیادہ ممالک کو شامل کیا جاتا اور زیادہ دورانیے پر محیط اعدادوشمار جمع کیے جاتے تو شاید اس سے ایک مختلف تصویر ہمارے سامنے آتی۔ تاہم یہ مطالعہ کم ازکم اس بات کی تصدیق ضرور کرتا ہے کہ غیر جانبدار تحقیق اس بارے میں بصائر فراہم کرسکتی ہے کہ ریاستیں بطور خادم کس کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

18- By Adam Przeworski and Fernando Limongi, in Adam Przeworski, Michael E. Alvarez, Jose Antonio Cheibub and Fernando Limongi, 'Democracy and Development; Political Institutions and Well-being in the World,' 1950-1990.
'Cambridge Studies in the Theory of Democracy', Cambridge: Cambridge University Press, 2000.

allurdupdfnovels.blogspot.com

19۔ Robert Barro, 'Determinants of Economic Grwoth: A cross country survey'. Cambridge, Mass. Harvard University Press, 1997.

20۔ بھارت اور چین دنیا کی اہم ترین متضاد مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ کبھی یہ کرۂ ارض پر امیر ترین، سب سے زیادہ شہری اور مہذب معاشرے تھے لیکن 1600 اور 1900 کے درمیان جب یورپی استعمار نے ان سرزمینوں کو نگل لیا تو ان کے مقدر کا پہیہ الٹا چلنے لگا۔ ان کی حکومتی روایات بھی کبھی اتنی ہی زبردست اور شاندار تھیں جتنی کہ مغربی ممالک کی لیکن اہل مغرب ان پر آمریت کا لیبل چسپاں کرکے ان کا مضحکہ اڑاتے رہے۔ ہند اور چین اب عالمی تجربات اور اپنی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر از سر نو اپنی حکومتی روایات کو مضبوط کر رہے ہیں۔ ہندوستان ایک مضبوط وفاقی جمہوریت اور طاقتور آزاد ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اور چین ایک سخت اور سفاک یک جماعتی حکومت کے توسط سے۔ ان دونوں ممالک میں حکومت کے اخلاقی پہلو پر سوچ بچار کی مضبوط روایات موجود ہیں جبکہ مغرب کی بیشتر تاریخ میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مفروضے کو ہی اختیار کیا جاتا رہا ہے (حالیہ دور میں وہاں یہ مفروضہ کار فرما ہے کہ حاکمیت کو ادارہ جاتی قوتوں سے متوازن کرکے ہی اچھی حکومت کو ممکن بنایا جا سکتا ہے)۔

21۔ 2005ء میں کیے جانے والے ایک بین الاقوامی گیلپ سروے کے مطابق 79 فیصد افراد کی رائے یہ ہے کہ جمہوریت بہترین نظام حکومت ہے تاہم 65 فیصد لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا ملک عوام کی منشا کے مطابق نہیں چلایا جا رہا۔

22۔ گیلپ انٹرنیشنل ملینیم سروے، 2000۔

23۔ پپا نارس (ہارورڈ) کی تصنیف سیاسی سرگرمی کے ان وسیع رجحانات کی جامع ترین تصویر پیش کرتی ہے۔

Pippa Norris, 'Democratic Phoenix'. Reinventing Political Activism'. New York; Cambridge University Press, 2002.

24۔ Philip Bubbit, 'The Shield of Achilles', New York Alpred A. Knopf. 2002, P.230.

25۔ یہ ان معانی میں سے ایک ہے جو بابٹ مارکیٹ ریاست کے تصور کو دیتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 4

1۔ Al-Yusi, 'Rasa'il', edited by F. al-Qabh (Casablanca, 1981), quoted in Rahma Bourquia and Susan Gilson Miller, eds., 'In the Shadow of the Sultan'. Harvard Midde Eastern Monographs, 1999.

2۔ بادشاہوں اور داناؤں کے درمیان تعلق کی دیگر مثالیں درج ذیل تصنیف میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

Leo Strauss, 'On Tyranny: an interpretation of Xenophon's Hiero. New York: Political Science Classics, 1948.

3۔ یہ وہ تحریص ہے جس میں بیشتر صدر اور وزرائے اعظم گرفتار ہوتے چلے آئے ہیں۔

4۔ جین جیکبز نے تحفظ کی اخلاقیات کو سرپرست اخلاقی سنڈروم کے طور پر بیان کیا جو زمین اور علاقے کی نگہداشت سے متعلق ہوتا ہے جس کے پیچھے پیش بینی، ردعمل، مستعدی اور واہمہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ اقدار افواج، اشرافیہ، سول سروسوں اور پولیس فورسوں میں مشترک ہوتی ہیں اور انہیں جزوی طور پر جدید ماحولیاتی تحریک میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

Jane Jacobs, 'System of Survival'. London: Vintage Press, 1994.

5۔ ایڈم سمتھ اسی لب و لہجے کو اختیار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''تمام حکومتوں کے قوانین چند افراد کی آزادی کو کہ جس سے پورے معاشرے کی سلامتی خطرے میں پڑنے کا احتمال ہوتا ہے محدود کر دیتے ہیں اور انہیں کرنا بھی چاہیے ......جن پر ہر ممکن حد تک معاشرے کے ہر رکن کی اس کے ہر دوسرے رکن کے جبر و نا انصافی سے حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

Adam Smith, 'On the Wealth of Nations', ed. Edwin Cannan, London: Methuen and Co. Ltd. 1904.

6۔ ماضی کی بہت سی دیگر کم خوش ریاستوں کے بارے میں قیاس کرنا مشکل نہیں۔ تاہم قومی خوشی پر اعداد و شمار کوئی زیادہ طویل عرصے سے جمع نہیں کئے جا رہے۔ اس سلسلے میں خوشی کی معاشیات پر برونو فرے کی تصنیف بھی قابل ذکر ہے۔

Bruno Frey, 'Happiness and Economics: How the Economy and Institutions affect human well-being'. Princeton, Princeton University Press, 2002.

allurdupdfnovels.blogspot.com

7۔ سیاسی مقاصد کیلئے اخلاقی افراتفری پیدا کرنے کے بارے میں ایک کلاسیکی بیان درج ذیل تصنیف میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

Stuart Hall, Chas Gritcher, Jony Jefferson, John Clerke and Brain Roberts, 'Policing the Crisis: Mugging, the state, and law and order'. London: Macmillan, 1978.

8۔ John King Fairbank and Merle Goldman, 'China: A new History'. Cambrdige, Mass. Belknap Press, 1998.

9۔ Muhsin Mehdi, 'Alfarabi and the Foundation of Islamic Political Philosophy'. Chicago. University of Chicago Press, 2001, P.128

10۔ Hoyt Cleveland Tillman, 'Ch'en Liang on Public Interest and the Law'. University of Hawaii Press, 1994, P.2.

11۔ H.C.M. Michielse, 'Policing the poor: J.L. Vives and the 16th century origins of modern social administration'. Social Service Review, 64, I (1990) 1-21.

12۔ Howard Glennerster, 'Poverty Policy from 1900 to the 1970s', in 'One Hundred Years of Poverty and Policy'. York : Joseph Rowntree Foundation, 2004.

13۔ 1870ء کے بعد کی صدی میں عوامی مصارف اور لیفٹ آف دی سینٹر حکومتوں کے درمیان صرف ایک کمزور سی نسبت رہی ہے۔

R. Middleton, 'Government versus the Market: The growth of the public sector, economic management and British enonomic performance', C. 1890-1979. Cheltenham. Edward Elger, 1996.

14۔ یہ اعداد و شمار درج ذیل تحریر میں موجود ہیں:

Nick Donovan and David Halpern with Richard Sargeant, 'Life Satisfaction, the State of Knowledge and Implications for Government'. Prime Minister's Strategy Unit, 2002.

15۔ اگر اخلاقی عینک سے دیکھا جائے تو مادیت کی کشش اکثر اوقات مشکوک محسوس ہوتی ہے۔ تاہم جیسا کہ عظیم انگریز شاعر ڈبلیو ایچ آڈن متنبہ کرتا ہے۔

'as a rule it was the pleasure-haters who became unjust' W.H. Auden, 'Voltaire at Ferney', 'Another Time' London Faber and Faber, 1997 (first published 1940).

16۔ Joseph Stiglitz, 'The Economics of the Public Sector' 3rd edition, London. Norton, 2000, p.81

allurdupdfnovels.blogspot.com

17۔ ایلسنا اور دیگر ماہرین نے مفصل شماریاتی تجزیات کی مدد سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وسیع پیمانے پر ہجرت ویلفیئر ڈیلز کی بنیاد کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ نسلی منافرتیں سیاستدانوں کو سوشل سیکورٹی پر کیے جانے والے وصارف کی بنیاد کو نقصان پہنچانے اور استحصال کرنے کا ایک آلہ فراہم کرتی ہیں۔ تاہم زیادہ تفصیل میں جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ تصویر اتنی سادہ نہیں ہے۔ ان یورپی ملکوں میں جہاں بایاں بازو روایتاً مضبوط ہا ہے، نسلیت کا اثر غائب ہو جاتا ہے۔

A. Alesina and E. Glaeser, 'Fighting Poverty in the US and Europe. Oxford: Oxford University Press. 2004. Peter Taylor Gooby, 'Is the future American, or can left politics preserve European Welfare state from erosion through growing social diversity?' Journal of Social Policy, Vol. 34,4 (2005)

18۔ A. Atkinson and J. Stiglitz, 'Lectures in Public Economies, New York, McGraw Hill 1980.

19۔ بہبود کی ذمہ داری کی بہترین حالیہ علامت سیول شہر کے بیچوں بیچ روشوں، فواروں، جھرنوں اور مجسموں کی ایک 6 کلومیٹر طویل پٹی بنانے کیلئے دریا کو ایک شاہراہ کے نیچے سے گزارنا ہے۔ یہ فطرت اور مدنیت کا ایک خوبصورت امتزاج ہے اور سیول کے لی ینگ باک کی جارحانہ قیادت کا مظہر ہے۔

20۔ یونانی زبان میں یہ لفظ nomos تھا۔ اسے عموماً 'قانون' کے مفہوم میں ترجمہ کیا جاتا ہے لیکن یہاں اس کا مطلب قانون سے قبل کی کوئی چیز، اصولوں کا بذریعہ طاقت نفاذ ہے۔

21۔ Benjamin Schwartz, 'China's Cultural Values', Arizona State University Centre for Asian Studies, 1985.

22۔ انصاف کے تصور کی اس توسیع نے شہریوں کے لئے جمہوری طریق ہائے کار کے ساتھ ساتھ اختیار استعمال کرنے کا ایک متوازن راستہ مہیا کیا ہے اور اس نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ انصاف کا تصور محترک رہے۔ اور بعد میں مزید خوبصورت آدرشوں تک پہنچے نیز ماضی کی مثالوں کی طرف اشارہ بھی کرے۔ اس مفہوم میں انصاف زیادہ سیاسی شکل اختیار کر گیا ہے اور معاشرے کے مکالمات سے زیادہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

مربوط ہو گیا ہے، گرچہ یہ نمائندہ حکومت کے رسمی ڈھانچوں سے زیادہ آزاد ہوا ہے۔ حتیٰ کہ لبرل ازم کے جامع ترین نظریہ انصاف کو پیش کرنے والا مصنف جان رالز بھی تسلیم کرتا ہے کہ انصاف کے کسی بھی قابل عمل تصور کو 'مابعد الطبعیاتی نہیں سیاسی' بننے کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اس کی مراد ہے کہ لوگ ان بنیادی اصولوں کی بجائے کہ جن سے وہ اطلاقات ماخوذ ہوتے ہیں انصاف کے اطلاقات پر زیادہ آسانی سے متفق ہو سکتے ہیں۔

23۔ یہ بہت سی کتابوں میں رونالڈ ڈورکن کے کام کا ایک طاقتور محرک رہا ہے جن میں یہ کتاب بھی شامل ہے:

'Taking Right Seriously', Cambridge, Mass. Harvard University Press, 1977, and 'Law's Empire', Cambridge, Mass. Belknap Press, 1986.

انگریزی قانون میں بھی یہی مؤقف اختیار کیا جاتا رہا جس کی حالیہ مثال لارڈ ڈیننگ کی ہے۔

24۔ Nikolas Rose, 'Powers of Freedom'. Cambrdige, Cambridge University Press, 1997.

25۔ آمریتیں ان سچائیوں کے متعلق کم ہی خوش ہوتی ہیں کہ جن پر ان کا انحصار ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی خفیہ پولیس اور تشدد عموماً سچائی کی بجائے محرک کو مسئلہ بناتے ہیں۔

26۔ یکساں فرائض کی اس فہرست سے کچھ ممکنہ امیدواروں کو خارج کر دیا گیا ہے۔ جدید تصورات کے مطابق ریاست کا ایک بنیادی کردار یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے تشخص کے خدوخال کا تعین کرتی ہے۔ تاہم یہ جدید دور سے قبل کی ریاستوں کیلئے اہم کردار نہیں تھا جو لوگوں کے اپنے احساس پر زیادہ حق نہیں جتاتی تھیں اور کوئی بھی اسے اپنے جواز کیلئے لازم خیال نہیں کرتی تھی۔ یہ کہ ریاستوں کو قومی سرحدوں پر استوار ہونا چاہیے ایک جدید تصویر ہے۔ اسی طرح یہ تصور بھی کہ افراد یکساں حقوق کے حامل ہوتے ہیں۔ بلا شبہ یہ اہم تصورات بہت سی جدید ریاستوں کی بنیاد ہیں اور ان کی نسبت قدیم دنیا سے جا ملتی ہے۔ تاہم انہیں بھی زمان و مکان پر محیط بنیادی فرائض قرار نہیں دیا جا سکتا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

Samual Finer, 'The History of Government from the Earliest Times.' Oxford: Oxford University Press, 1997.

27۔ Aristotle, 'Politics', III 07, 28-32, quoted in Richard Mulgan, 'Aristotle on Legality and Corruption'. Private Paper.

28۔ Cicero, in Book I of 'De Officiis', p. 86.

29۔ مفاد عامہ کیلئے استعمال کیا جانے والا لفظ ...... کنگ ...... آغاز میں صرف شاہی سلطنت کا مفہوم ادا کرتا تھا۔ مفاد عامہ اور نجی مفاد کے درمیان یہ تضاد اپنی جگہ اس تضاد سے متعلق تھا جو کہ صحیح اور فائدہ مند (i اور li) کے درمیان تھا اور اچھے بادشاہ (وانگ) اور طاقتور شخص (پا) کے درمیان تھا۔

30۔ صحیح بات یہ ہے کہ اچھے خادم معاشی اجرت حاصل کرنے کی جستجو نہیں کرتے ، وہ جائز انعام قبول کر لیتے ہیں لیکن لوٹ کھسوٹ سے احتراز کرتے ہیں۔

31۔ Ameli Kuhrt, 'Usurpation, Conquest and Ceremonial: from Babylon to Persia',in David Cannadine and Simn Price, eds'., 'Rituals of Royalty, Power and Ceremonial in Traditional Societies'. Cambridge, Cambridge University Press, 1987, p.33.

32۔ بیسوی صدی کے اختتامی تین عشروں کی اصلاحات نے خصوصاً انگریزی بولنے والی دنیا میں گاہک یا شہری کو پہلے رکھنے کا اہتمام کیا اور حکومت کو افسر شاہی کی آسائشوں کی بجائے عوام کی ضروریات کے گرد از سر نو تشکیل دیا۔ جمود کی بجائے تیز رفتاری، ردعمل، شائستگی اور انتخاب کو فروغ دینے کیلئے پرچون فروشی اور مالگذاری جیسی نجی شعبے کی خدمات سے استفادہ کیا گیا۔ کینیڈا نے تو گاہک کی زیادہ تسلی کیلئے اہداف بھی مقرر کیے۔ ان تمام فیشنوں ،مشغلوں اور کرتبوں میں سے جنہیں کہ 1960ء کے عشرے سے نجی شعبے کی اصلاحات سے منسوب کیا جاتا رہا ہے اس اقدام نے سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔

33۔ Richard Easterlin, 'How Beneficient is the Market: a look at the modern history of mortality'. European Review of Economic History, 3,3 (1999); 257-94.

34۔ Referred to in Vito Tanzi and Ludger Schuknecht, Public Spending in the 20th Century: A Global Perspective. Cambridge: Cambridge University Press, 2000. Original source; 'Traite de la science des finances' 2 vols. Paris: Gullaumin 1888.

allurdupdfnovels.blogspot.com

35۔ مثلاً صدارتی قیادت پر ایک عظیم تصنیف اسے 'ثقافتی اتحادوں کو استوار کرنا اور انہیں قائم رکھنے کا فن' اور ایک اور کثیرالنسلی معاشرے کے ثقافتی مسائل کو حل کرنا قرار دیتی ہے۔

Wildarsky and Ellis, 'Dilemmas of Presidential Leadership'. New Brunsevick, NJ: Transaction Publishers, 1989.

36۔ ژاں ژاک روسو نے ریاست کی توضیح کیلئے ایک مزید بہت موثر استعاراتی ڈھانچہ مہیا کیا ہے۔ انسان فطرت کے اعتبار سے نیک ہے لیکن ادارے اسے تبدیل دیتے ہیں (پیدا آزاد ہوتا ہے لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے)۔ معاشرے کو پھر سے نیک بننے کیلئے از سر نو معاہدہ کرنے اور اداروں پر عوامی حاکمیت بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ بیسویں صدی کا ممتاز لبرل اصول دان جان رالز کہتا ہے کہ صرف جائز اور منصفانہ عمرانی معاہدہ ہی ایسا معاہدہ ہوتا ہے جس پر کہ 'لاعلمی کے پردے' کے پیچھے عمل کرنے والا کوئی شخص متفق ہوتا ہے۔

37۔ James Buchanan and Gordon Tullock, 'The Calculus of Consent'. Ann Arbor: University of Michigan Press, 1962.

38۔ ہیگل کے مطابق یہ وقت گزرنے کے ساتھ خود آگاہ، حقیقی معانوں میں خودمختار افراد پیدا کرتا ہے جو ایک دوسرے کی ضروریات کا احترام کرتے ہیں۔

39۔ مثلاً رونالڈ ڈووکن لکھتا ہے کہ ہم اپنے فیصلے خود کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں اس پر اصرار کیلئے آمادہ ہونا چاہیے کہ آئین ہر شخص کے اس حق کی ضمانت دے۔ وہ اسقاط حمل کے بارے میں لکھ رہا تھا لیکن اس کی تحریروں میں زندگی و موت کے انتہائی مسئلوں پر ان آراء کا اطلاق زندگی کے بقیہ تمام شعبوں پر بھی ہوتا ہے۔

Ronald Dworkin, 'Life's Dominion'. London: Harper Collins, 1983, P.237.

40۔ اگر زیادہ لوگ خود کو ایک کورے کاغذ پر پیدا کریں تو خالص خود انتظامی کا تصور بھی زیادہ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن ان کی اکثریت اس خاندان، مذہب، ثقافت اور اکثر اس سیاست کو بھی قبول کر لیتی ہے کہ جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں اور یہ ان کے دیگر انتخابات کی طرح اس کا تعین کرتے ہیں کہ وہ حقیقت میں کیا ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

41۔ زیادہ تر شواہد مطمئن زندگی پر رپورٹ میں مجتمع کیے جاتے ہیں جسے برطانیہ کا گورنمنٹ سٹریٹجی یونٹ شائع کرتا ہے (www.strategy.gov.uk) اسے پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

Donovan and Halpern,op.cit.

کچھ عرصہ قبل رچرڈ لے یارڈ نے ان شواہد کا خلاصہ درج ذیل کتاب میں تحریر کیا:

'Happiness: Lessons from a New Science' London, Allan Lane, 2005

42۔ اس پر بہت زیادہ بحث ہوتی چلی آ رہی ہے کہ خوشی پر کیے جانے والے سروے کس قدر قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ ثقافتی اور لسانی اختلافات ممالک کے مابین براہ راست تقابلات مشکل بنا دیتے ہیں جبکہ متغیر توقعات 2005ء اور 1955ء کی خوشی کے درجوں کا موازنہ دشوار کر دیتے ہیں۔ تاہم بیشتر ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ سروے لوگوں کی حقیقی ذہنی کیفتوں کے بہت حد تک صحیح آئینہ دار ہوتے ہیں، مثلاً قوموں کے اندر لسانی ذیلی گروہوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات پر تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ صرف لسانی اختلافات ہی ان قومی اختلافات کی وجہ نہیں ہوتے جو کہ بار بار دیکھنے میں آتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں مقیم جرمن اور فرنچ زبان بولنے والے لوگ خود کو زندگی کے بارے میں یکساں طور پر بہت مطمئن بیان کرتے ہیں اور وہ سرحد پار بسنے والے اپنے جرمن اور فرانسیسی پڑوسیوں کی نسبت بہت زیادہ مطمئن محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح بیلجیم میں مقیم فرانسیسی زبان بولنے والے افراد فرانس میں مقیم فرانسیسی بولنے والے افراد کی نسبت اپنے فلیمش پڑوسیوں سے زیادہ قریب ہیں۔ زبان کی نسبت قومیت اطمینان کی زیادہ طاقتور مظہر ہے۔ دیگر تحقیقات میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرووں میں مطمئن زندگی کے بارے میں دیئے جانے والے جوابات نفسیاتی خوش حالی کے بارے میں دیئے جانے والے نسبتاً زیادہ مفصل بیانات سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔

43۔ تحقیقات سے بار بار یہ بات سامنے آتی رہی ہے کہ اوسط اعتبار سے شادی شدہ افراد غیر شادی شدہ، مطلقہ یا رنڈوے افراد کی نسبت زیادہ خوش باش ہوتے ہیں (اگرچہ مطلقہ افراد اپنی سابقہ شادی شدہ زندگی کی نسبت زیادہ خوش ہو سکتے ہیں)۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

یہ نسبت مختلف ثقافتوں بلکہ آمدنیوں اور عمروں پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کا اثر بہت قوی ہوتا ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشی کے معاملے میں شادی آمدنی میں بہت بڑے اضافے کے برابر اثر رکھتی ہے۔ اس کے برعکس طلاق، بیوگی اور علیحدگی زندگی کے اطمینان میں کمی پیدا کرتی ہے۔ گذشتہ نسل میں مشاہدہ کی جانے والی تمام تر انقلابی تبدیلیوں کے باوجود خاندان، بطور ایک تصور اور ایک روزمرہ سماجی اکائی، بہت مضبوط ثابت ہوا ہے اور کرسٹو فر لیچ کے بقول اب بھی 'اس سفاک دنیا میں ایک پناہ گاہ' کی حیثیت رکھتا ہے۔

Christopher Lasch, 'Heaven in a Heartless World: The Family Besieged'. New York: Basic Books. 1997

44۔ احتیاج کا یہ ہر زمرہ اپنے سائے کے ہمراہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔ تاریخ کے بیشتر معاشروں میں خاندان، برادری اور مادی اشیاء کو مسترد کرنے کی تحریکیں موجود رہی ہیں۔ مرتاضوں، راہبوں اور تیاگیوں کی انجمنیں ایک ایسے چیلنج اور ایک ایسے آئینے کا کام کرتی رہی ہیں کہ جس میں معاشرہ خود کو دیکھ سکتا ہے۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی استردادی تحریک کسی بڑے گروہ کی شکل اختیار نہیں کر سکی۔ ان میں سے کوئی بھی معاشرے کا حصہ نہیں بن سکی، گو انہوں نے ایسے ادوار میں نشوونما ضرور پائی جب ریاست کی اخلاقی تحریک معطل تھی جیسا کہ سلطنت رومہ کی آخری صدیوں میں ہوا۔

45۔ متشککین اسے روحانی زندگی کی کوئی داخلی خوبی گرداننے کی بجائے چرچ، مسجد یا مندر کی فراہم کردہ کمیونل امداد سے منسوب کرتے ہیں۔

46۔ Michael Marmot, 'Status Syndrome'. London: Bloomsburg, 2004.

47۔ Bruno s. Frey and Aleis Stutzer, 'Happiness, Economy and Institutions'. Economic Journal, Royal Economic Society, Vol. 110, 127 (October, 2000) 918-38.

48۔ '.......... اشتمالی معاشرے میں جہاں کسی بھی شخص کے پاس سرگرمی کا کوئی جداگانہ دائرہ نہیں ہوتا بلکہ کوئی بھی جس شعبے میں چاہے مہارت حاصل کر سکتا ہے، عام پیداوار کو معاشرہ منضبط کرتا ہے اور اس طرح میرے لئے یہ ممکن بناتا ہے کہ میں آج ایک چیز کروں اور کل کوئی دوسری۔ بغیر شکاری، مچھیرا، گڈریا یا نقاد بنے صبح شکار کروں، سہ پہر کو مچھلیاں پکڑوں، شام کو مویشی پالوں اور کھانے کے بعد تنقید کرنا

allurdupdfnovels.blogspot.com

شروع کر دوں، محض اس وجہ سے کہ میرے پاس ایک دماغ ہے۔ کارل مارکس

Karl Marx, 'The German Ideology' Moscow: Progress Publishers, 1964.

49۔ Emmamuel Todd, 'The Explanation of Ideology: Family Structures and Social Systems'. Oxford: Basil Blackwell, 1985.

50۔ خاندانی اصناف اور سماجی یا نظریاتی اثرات کے درمیان نسبتیں براہ راست طور پر علتی نہیں ہوتیں مثلاً ان معاشروں کی نسبت کہ جہاں زمین آگے سے آگے بٹتی چلی جاتی ہے۔ ان ممالک میں جہاں تمام وراثت بڑے بیٹے کے حصے میں آتی ہے۔ کاشت کاری میں خوشحالی کی وجہ سے زیادہ برابری دیکھے میں آ سکتی ہے۔ ایک پیرا ڈکس یہ ہے کہ تسلطی خاندانوں پر استوار معاشروں میں نظم و نسق کی بجائے انارکی اور منافرت کا میلان زیادہ ہوتا ہے۔

51۔ George Lakoff, 'Moral Politics: How Liberals and Conservatives Think'. Chicago. University of Chicago Press, 2002.

باب 5

1۔ Douglass North, 'Understanding the Process of Economic Change'. Princeton. Princeton University Press, 2005, P.67.

2۔ مثلاً قرون وسطیٰ کے انگلستان میں ہنری سوم نے پیسے کو اپنی ذاتی ضروریات پر لگانے کیلئے اپنے 'وارڈ روب' میں اپنا سیکرٹریٹ بنایا تھا۔

3۔ Nikolai KaramZin, 'History of the Russian State'. first published in St. Petersburg, 1818-24. The idea that states were, and still are, to a degree criminal enterprises is expanded in Mancur Olson, 'Power and Prospeity: Outgrowing Communist and Capitalist Dictatorships'. New York: Basic Books, 2000.

4۔ Quoted in Tzvetan Tadorov, 'Hope and Memory'. Princeton: Princeton University Press, 2003, P.202.

5۔ John King Fairbank and Merle Goldman, 'China: A new history'. Cambridge, Mass: Belknap Press, 1998, P.48

6۔ Charles Tilly, 'The Politics of Collective Violence' Cambridge: Cambridge University Press, 2003, p.177

7۔ Jessica Williams, 50 Facts That Should Change the World'. London: Icon Book, 2005.

allurdupdfnovels.blogspot.com

8۔ آئی ایم ایف کے ایک ماہر اقتصادیات کے مطابق اس کے بدعنوانی کے اشاریے میں ایک معیاری اختلاف سالانہ شرح نمو میں 0.5 فیصد فرق اور سرمایہ کاری کی شرحوں میں 4 فیصد فرق سے منسلک تھا۔

Paolo Mauro, George Abed and Sanjeev Gupta, ed., 'Governance, Corruption and Economic Performance'. Washington, DC. International Monetary Fund. 2002.

تاہم بدعنوانی کا خاتمہ آسان نہیں ہوتا: افسر شاہی کا عام ردعمل یہ ہوتا ہے کہ نگرانی اور قواعد وضوابط کو بڑھا دیا جائے لیکن اس سے اخراجات میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہتر حل سادہ طریق کار اور شفافیت ہے۔

9۔ Carl Schmitt, 'The Concept of the Political' Chicago: University of Chicago Press, 1976; Bertrand de Jourenol, 'On Power', New York: Viking Press, 1949.

Ludwing Von Mises, 'Die Gemein wirtschaft Socialism. An economic and socio logical analysis, trans. J. Kahane. London: Jonathan Cape, 1936.

10۔ Quincy Wright, 'A study of War'. Chicago. University of Chicago Press, 1964.

11۔ انہی وجوہات کی بناء پر ایسی شفاف اقتصادی پالیسیوں کا نفاذ بہت زیادہ پرخطر ہوسکتا ہے جن کا مقصد حقوق ملکیت کا تحفظ اور فروغ، قانون کی حکمرانی، تعلیم یافتہ عوام، کم محصولات اور آزاد تجارت ہو (خوش قسمتی سے بعض روشن خیال آمر یہ خطرہ لینے کے مشتاق رہے ہیں)۔

12۔ ابیولا نے پچھلا الیکشن جیت لیا تھا جسے بعد میں فوج نے معطل کر دیا تھا۔

13۔ Gallup International, February, 2005.

14۔ 1978ء کی نام نہاد گیلو وائن ترمیم۔

15۔ Bent Flyvbjerg's study of the sitting of a bus station in Sarhus. Bent Flyvbjerg, 'Rationality and Power in Practice'. Chicago: University of Chicago Press, 1998.

16۔ جن صدروں کو اس قدغن کا سامنا ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ صدر منتخب نہیں ہو سکتے وہ ایک مختلف پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ تاہم انہیں عموماً یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ ان

allurdupdfnovels.blogspot.com

کے بعد صدر کون بنے گا اور آیا ان کا کام جاری رہے گا یا کہ نہیں۔

17۔ سول سروس کمشنرز کی طرف سے2005ء میں شائع کردہ مضامین کے ایک مجموعے 'بدلتے زمانے' میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

18۔ GDH Cole, 'Self Government in Industry'. S.J. Bell, 1917, 18.

19۔ یہ استعارہ2000ء کے عشرے کے اوائل میں برطانوی کیبنٹ سیکرٹری (سول سروس کے سربراہ) سر رچرڈ ولسن نے استعمال کیا تھا۔

20۔ اس میں بعض مستثنیات ہیں:1960ء کے عشرے میں جنوبی ریاستوں میں شہری حقوق کے تحفظ کیلیئے امریکی نیشنل گارڈ کا استعمال ، یا1969ء میں شمالی آئرلینڈ کے کیتھولک باشندوں کی حفاظت کیلیئے برطانوی فوج کا کردار۔ تاہم یہ کردار مستحکم کم ہی ہوتے ہیں اور ان کا جواز بھی نظام کی ایک بلند تر سطح کا حوالہ دے کر پیدا کیا جاتا ہے۔

21۔ Robert Nisbet, 'The Twilight of Authority'. Indianapolis: Liberty Fund, 1975.

22۔ Jack Levy. 'War in the Modern Great System' 1495-1975. Lexington: University Press of Kentucky, 1983.

23۔ Jack Snyder and Edward Mansfield, 'Democratisation and the Danger of Wars' 'International Society', 20.I(1955).

باب 6

1۔ M.T. Clamchy, 'From Memory to Written Record: England 1066-1307'. Oxford: Blackwell Published, 1992.

2۔ بعد میں آنے والے ایک شہنشاہ چائن لنگ نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ''اگرچہ ہم مختلف خاندانوں میں پیدا ہوئے، میں اپنے شہنشاہ کے لئے اس کی دیانت داری کی وجہ سے اس کی عزت کرتا ہوں۔ میں خود ایک شہنشاہ کے طور پر اپنے وزیروں سے یہ امید کرتا ہوں کہ وہ اس کی مثال کی پیروی کریں گے'۔

3۔ James Scott, 'Seeing like a State: How Certain Schemes to Improve the Human Condition Have Failed'. New Haven, Conn.: Yale Univerity Press, 1999.

4۔ Julius Kovesi, 'Moral Nations' London: Routlodge and Kegan Paul, 1967.

allurdupdfnovels.blogspot.com

5۔ کسی بھی معاشرے کے اندر وہ زمرے موجود ہوتے ہیں جنہیں حقوق نسواں کیلئے کام کرنے والے 'بے نشان زمرے' کہتے ہیں۔ یہ وہ خواص ہیں جنہیں بلا سوچے سمجھے فطری خیال کیا جاتا ہے اور ایک ایسا پیمانہ تصور کیا جاتا ہے جس سے ہر دیگر شے جانچی جا سکتی ہے اور ریاستیں اقلیتی گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے خلاف اپنی سرحدوں کو مضبوط کر سکتی ہیں۔

6. Benjamin Constant, 'De l'esprit de conquete'. Neuchatel: Editions Ides et Calendes, 1942.

7. Chris Baker and Pasuk Phongpaichit, 'A History of Thailand'. Cambridge: Cambridge University Press, 2005.

8. Mao, quoted in Philip Sort, 'Mao: A short biography' London: Hodder and Stoughton, 1999.

9. Mao, in Simon Leys, 'Essais sur la ChParis': Robert Loffont, 1998.

10۔ اس دلیل کی ایک انتہائی مشکل مشل فوکو نے حکومتیت پر اپنے مشہور لیکچروں میں پیش کی تھی۔ اس کے مطابق ریاستیں جوں جوں پروان چڑھتی چلی گئیں وہ اپنے معاشروں کا اسی طرح احاطہ کرتی چلی گئیں کہ ریاست کو کنٹرول کرنے والے خود مختار لوگوں کا تصور ایک واہمہ بنتا چلا گیا۔ اس کی بجائے حکومت نے خود ہی حکمرانی شروع کر دی اور نظم ونسق، پیمائش اور نگرانی کا سارا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حکومت کی جگہ حکمران نے لی۔ اس دلیل کو نہ تو جانچا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ کوئی ایسے معیارات فراہم کرتی ہے کہ جن سے اسے جانچا جا سکے اور یہ انسانی عمل کیلئے بھی کوئی جگہ نہیں چھوڑتی۔ لیکن اس میں اس اعتبار سے کچھ نہ کچھ سچائی موجود ہے کہ یہ اس طریقے کی بالکل درست نشاندہی کرتی ہے کہ جس سے ریاست اپنی داخلی منطق پر عمل پیرا ہو سکتی ہے جو اس کے گرد موجود مفادات یا کسی شخص کے ارادوں سے مختلف ہوتی ہے۔

11. Humberto R Maturana and Francisco J. Varela, 'Autopis and Cognition: The Realization of the Living'. Boston Studies in the Philosophy of Science, kulwer Academic Publishers, 1979.

12۔ اس بارے میں خاصا وسیع اور وافر ادب موجود ہے کہ لوگ خود کو اور اپنی تنظیموں کو کیسے معانی دیتے ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

Karl Weick, 'Sensemaking in Organization'. London: Sage Publications, 1995 is one of the classic texts.

13۔ بادشاہ کے اقتدار میں ایک افسر بھی شریک ہوتا تھا، جسے 'پچوآ کوتل' کہتے تھے۔ وہ محل کی انتظامیہ کی نگرانی کرتا تھا (اس خطاب کا لغوی مفہوم 'ناگن خاتون' تھا گو اس عہدے کو ہمیشہ کسی مرد سے پر کیا جاتا تھا)۔

14۔ جنرل رومیل کے بارے میں اس کا بیٹا (جو بعد میں ایک جرمن شہر کا میئر بنا) کہتا ہے کہ وہ اسے متنبہ کیا کرتا تھا کہ اپنے خیالات (الفاظ تو کجا) پر بھی کبھی یقین نہ کرو۔ یہ بات سیاستدانوں اور افسروں پر خاص طور پر صادق آتی ہے۔

15۔ Pierre Bourdieu, 'The State Nobility: Elite schools in the field of power'. Cambridge: Polity, 1996 p.265

16۔ ان میں سے کچھ شواہد کا ذکر بی بی سی کے اعتماد کے موضوع پر پیش کیے گے ایک پروگرام میں کیا گیا تھا۔ 'Honest Politics', BBC Radio 4, October 2005

17۔ ایک بہت مختلف مثال برطانیہ میں حفظان خوراک کا مسئلہ ہے۔1990ء کے عشرے میں حکومت کی حفظان خوراک کی ضمانت دینے کی صلاحیت پر اعتماد اس وقت ختم ہو گیا تھا جب وزراء اور سرکاری سائنسدانوں نے کہا کہ گوشت محفوظ ہے حالانکہ BSE یا 'پاگل گائے' مرض سے متعلقہ خطرات پر جمع کیے شواہد کچھ اور بتا رہے تھے، تاہم بعد میں خوراک کے معاملات کی نگرانی کیلئے قائم کئے گئے ایک نئے ادارے، شفاف فیصلوں اور سائنس کے زیادہ شفاف استعمال نے یہ اعتماد بحال کرنے میں کافی حد تک مدد دی۔

18۔ فیبیئین نے اپنی تصنیف میں اس کہاوت کے حیران کن حد تک پیچیدہ مآخذ کی وضاحت کی ہے۔

Johannes Fabian, 'Power and Performance: Ethnographic Explorations through proverbial wisdom and theatre In Shaba, Zaire. Madison, Wis. University of Wisconsin Press, 1990.

19۔ Bertrand de Jourenel, 'On Power'. New York: Viking Press, 1949, p.116.

20۔ Clifford Geertz, 'Negara: The Threatre State in 19th Century Bali', Princeton: Princeton University Press, 1980.

21۔ J.A. Pocock, 'Ritual, Language, Power: An Essay on the App

allurdupdfnovels.blogspot.com

Meanings of Ancient Chinese Pholosophy'. in Pocock, Politics, Language and Time: Essays on Political thought and history'. Chicago: University of Chicago Press, 1989.

22۔ C. Diehl, 'Byzantium: Greatness and Decline.' New Brunswick, NJ: Ratgers University Press, 1957.

23۔ Michael Walzer, 'On the Role of Symbolism in Political Thought'. 'Political Science Quarterly'. 82 (1967): 191-204.

24۔ Charles Goodsel, 'The Social Meaning of Civic Space: Studying Political Authority through Architecture. Lawrence, Ka: University Press of Kansas, 1988.

25۔ ریاستوں کی خود کو ابدی ظاہر کرنے کی کوششوں میں تاریخ پر کنٹرول ایک اور اہم میدان جنگ رہا ہے۔ ماضی کے کسی رسمی بیان کے بغیر ریاستوں کو خطرہ ہوتا ہے کہ وہ عارضی سطح کی بے جا دست اندازی کرتی دکھائی دیں گی۔ چنانچہ تاریخ کو ایک نامیاتی طور پر ارتقاء پزیر معاشرہ پیش کرنا پڑتا ہے جو جدوجہد اور جبر سے نمو پاتا ہے اور آخر کار ریاست کی شکل میں خود مختاری حاصل کر لیتا ہے۔ رینان کی یہ بات بہت مشہور ہے کہ قومیں وہ معاشرے ہوتے ہیں جن کی یادداشت اور نسیان ساجھا ہوتا ہے (اور فرانسیسی ہونے کے لیے 'سینٹ بارتھولومیو ڈے کے قتل عام کو بھولنا' ضروری ہے)۔

26۔ W. Somerset Maugham, 'The Moon and Sixpence'. New York: Dorvan, 1919.

27۔ Elias Canetti, 'Crowds and Power', trans. C. Stewart, London: Pengiun Books, 1981.

28۔ Hannah Arendt, 'Communicative Power', in Nancy C.M. Hartsock, ed., 'Money, Sex, and Power: Toward a Feminist Historical Materialism Evanston, Ill,: North Eastern University Press, 1985, pp.59-74

29۔ Hannah Arendt, 'On Violence'. New York: Harcourt Brace Joranovich, i970, p.44.

30۔ روڈنی بارکر نے شہنشاہ ٹریجن کی لاٹھ کے بالائی سرے پر اس کی ڈاسیا میں فتوحات سے متعلق غیر مرئی نقش و نگار کی مثال درج کی ہے۔ انہیں دیکھنے کیلئے صرف چند ایک اعلیٰ افسران ہی لاٹھ کے قریب آیا کرتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اس بات کی

allurdupdfnovels.blogspot.com

تصدیق ہے کہ ان کا ہدف اندر کی طرف تھا نہ کہ باہر کی طرف۔

Rodeny Barker, 'Legitimating Identities'. Cambridge: Cambridge University Press, 2001.

31۔ Edward Evan Evans - Pritchard, 'The Nuer'. Oxford: lareClarendon Press, 1940, p. 182.

32۔ Arthur Miller, 'On Politics and the Art of Acting'. New York: Viking, 2001.

33۔ Claude Levi-Strauss, 'Chosedites', Paris: Miniut, 1987.

34۔ Thomas Schelling's work in 'Micro-motives and Macro-behaviour' New York: Norton, 1978, showed how small changes in housing preferences could lead to highly segregated cities.

35۔ Michael Walzer, 'On Toleration' New Haven, Conn: Yale University Press, 1997, pp. 16-17.

36۔ Anthony D. Smith, 'Chosen Peoples: Sacred Sources of National Identity'. Oxford: Oxford University Press, 2003.

37۔ Bhikhu Parekh, 'Rethinking Multiculturalism: Cultural Diversity and Political Theory'. Basing Stoke Macmillan, 2000, p. 235.

38۔ Michael Mann, 'The Dark Side of Democracy: Explaining ethnic cleansing'. Cambridge: Cambridge University Press, 2004.

39۔ Michael Rosen, 'On Voluntary Servitude: False Consciousness and the Theory of Ideology.' Cambridge: Polity Press and Cambridge, Mass. Harvard University Press, 1996, p. 272

40۔ Friedrich Nietzsche, 'Beyond Good and Evil : Prelude to the Philosophy of the Future'. Edinburgh: Foulis, 1907, section 256.

41۔ Howard Gardener, 'Leading Minds: An Anatomy of Leadership. London: Harper Collins, 1996.

باب 7

1۔ Sri Aurobindo, 'Essays Divine and Human' Pondicherry: Sri Aurobindo Ashram, 1994.

2۔ Muhsin Mahdi, 'Al-farabi and the Foundation of Islamic Political Philosophy'. Chicago: University Press of Chicago, 2001, p.131

3۔ Michael Marmot, 'Status Syndrome'. London: Bloomsburg Press, 2004.

4۔ اور ان کی باہمی ایثار اور ارتقائی نفسیات کے دیگر آلات کی مدد سے محض ایک ناقص

allurdupdfnovels.blogspot.com

سی وضاحت کی گئی ہے۔

5۔ Michael Ignatieff's 'The Needs of Strangers', London. Chatto & Windus, 1984.

اسے سخاوت پر ایک غیر معمولی تصنیف تصور کیا جاتا ہے۔

6۔ اس بارے میں حالیہ دور میں کیا جانے والا ایک عمدہ سروے درج ذیل تحریر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

Roy Baumeister and Mark R. Leary, 'The Need to Belong: Desire for Interpersonal Attachments as a Fundamental Human Motivation', 'Psychological Bulletin', 117,3 (1995): 497-529.

7۔ باہمی ایثار پر رابرٹ ٹرورز کے کام کے علاوہ درج ذیل تصنیف میں بھی اس تصور پر قابل قدر مواد موجود ہے۔

Elliott Sober and David Sloan Wilson, 'Unto Others: The Evolution and Psychology of Unselfish Behaviour', Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 1998.

8۔ میکس ویبر نے انسانی عمل کی چار بڑی قسمیں بیان کی ہیں: عقلی، عادی، جذباتی اور قدر۔عقلی۔ اس نے یہ جانچنے کی کوشش کی کہ بعض حالات مثلاً جنگیں لوگوں کو ایک دوسرے کا رخ اختیار کرنے پر کیسے مجبور کرتے ہیں۔ اس کی یہ صف بندی ان سادہ لوح نظریات کی درستگی میں معاون ثابت ہوئی جو انسانی معاملات میں یا تو خام جذبات اور شناختوں کو اولیت دیتے ہیں یا عقلی ذاتی مفاد کو لیکن یہ صرف اس چیز کو اجاگر کرتی ہے کہ کسی گروہ اور اکثر ایک ہی شخص میں کتنی قسم کے رویے، محرکات اور شخصیتیں پائی جا سکتی ہیں۔

9۔ دیکھئے باب 1، نمبر 6

10۔ رابرٹ رائٹ کی کتاب نان زیرو میں حکومت کی ماہیت کی ارتقائی نفسیات کی عینک سے وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

Robert Wright, NonZero. London: Vintage: 2001.

11۔ زندگی کے تخمینوں میں منطقی یکسانیت پیدا کرنے کی کوششیں عموماً ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو موت کے کسی خطرے کو قابل قبول تسلیم کرنے کی سیاسی

allurdupdfnovels.blogspot.com

دشواری اور دوسری وجہ عوامی رویوں کی پیچیدگی ہے، مثلاً سڑک کے حادثات میں ہونے والی اموات کو ریل کے حادثات میں ہونے والی اموات سے بہت زیادہ قابل قبول تصور کیا جاتا ہے کیونکہ ریل کے ضمن میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ڈرائیور کا گاڑی پر زیادہ کنٹرول ہوتا ہے۔

12۔ ذرائع ابلاغ میں اس اقدام پر شک و شبہے کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ محض حکومت کی طرف سے لوگوں کی توجہ داخلی مسائل سے ہٹانے کی کوشش ہے۔

13۔ لیڈروں کو کس طرح کا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے، اس بارے میں 'حقیقت پسند' قدامت پسندانہ خیالات، مشیروں کے معاملے میں سفاک نتائجیت پسندی کا جواز مہیا کرتے ہیں۔ حقیقت پسندوں کے مطابق کسی لیڈر کو کبھی بھی ماتحتوں کی وفاداری کے چنگل میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ اقتدار کا تحفظ سب سے مقدم ہدف ہونا چاہیے اور اس کیلئے انتہائی لچک اور بے حسی درکار ہوتی ہے (متراں کے لیڈروں کی بے رخی کے سلسلے میں پیش کیے گئے مؤقف میں اسی نظریے کی گونج سنائی دے رہی تھی)۔

14۔ John Fairbank, E.L. Dreyer and F.A. Kierman, eds. 'Chinese Ways in Warfare'. Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 1974, p.23.

15۔ تناسب سب سے اہم چیز ہے اور بیشتر جنگوں میں بہت سی شہری آزادیاں اور ریاستوں پر لگی بہت سی قدغنیں برقرار رہ سکتی ہیں، مثلاً چرچل نے دوسری عالمی جنگ کے دوران فسطائی رہنما اوسوالڈ موسلے کو قید کیا مگر جنگ کے خاتمے سے قبل اسے چھوڑ بھی دیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ موسلے اب کوئی خطرہ پیدا نہیں کر سکتا۔

16۔ درج ذیل کتاب میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ ٹامس مور کی یوٹو پیائی روایت اور میکیاولی کی حقیقت پسندانہ روایت کی راہیں سولھویں صدی میں جدا ہو گئی تھیں اور آپس میں صرف اس وقت مدغم ہوئیں جب نازی ازم کے بعد نورمبرگ مقدمات شروع ہوئے۔

باب 8

1۔ Quoted in James MacGregor Burns, 'Transforming Leadership'. New York: Atlantic Monthly Press, 2003, p. 80.

2۔ مہابھارت میں اس تصور کو بھی مسترد کیا گیا ہے کہ رعایا کے پاس اپنے حکمران کو

allurdupdfnovels.blogspot.com

معزول کرنے کا حق ہوتا ہے۔

3۔ Al-Mawardi, 'The Laws of Islamic Governance'. London: Ta-ha Publishers, 1996.

4۔ Hasan Hanafi, 'Alternative Conceptions of Civil Society: A reflective Islamic approach'. in Sohail Hashmi, ed., 'Islamic Political Ethics'. Princeton: Princeton University Press, 2002, p-60.

5۔ Wilhelm Reich, 'The Mass Psychology of Faschism' New York: Orgone Institute Press, 1946, p.53.

6۔ جیمز سکاٹ نے اسے1950ء اور1960ء کے عشرے کے ملیشیا کی نسبت سے بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

James Scott, 'Weapons of the Weak: Everyday Forms of Peasant Resistance'. New Haven, Conn.: Yale University Press, 1985.

7۔ صدر سادی کارنوٹ، وزیر اعظم کینوواس ڈیل کاسٹیلو، ملکہ الزبتھ، شاہ امبرٹو اور صدر مکنلی سب کے سب1894ء سے لے کر1901ء تک کے درمیانی عرصے میں مارے گئے۔

8۔ اگرچہ مقامی انقلاب کی بجائے وہ سرخ فوج کے طفیل مشرقی جرمنی میں ہٹلر کے بعد آئے۔

9۔ بالشکوں اور بہت سے دیگر حلقوں نے دہشت گردانہ کارروائیاں کیں مگر ان سے انقلاب کیلئے موزوں حالات پیدا نہ ہو سکے۔

10۔ Eviatar Zusabel, 'Time Maps'. Chicago: University of Chicago Press, 2004, p.91.

11۔ اس میں کچھ گروہوں اور اشخاص کی حکمرانی کے اختیار سے بریت کے تصور کا ارتقاء بھی آ جاتا ہے۔

Barrington Moore, 'Social Origins of Dictatorship and Democracy' Boston Ill.: Beacon Press, 1967, p. 414

12۔ ریاستیں نیٹ ورک پسند کرتی ہیں مثلاً جب برطانیہ کو2000ء میں ایندھن کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے خلاف عوامی سطح کے احتجاج کا سامنا تھا تو حکومت کی خواہش تھی کہ احتجاج کرنے والوں کے اس بے وضع نیٹ ورک کو ایک رسمی تنظیم کی شکل دے دی جائے جس کے ساتھ مذاکرات کئے جا سکیں اور جس کی خفیہ طور پر نگرانی کی جا سکے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

باب 9

1۔ Norberto Babbio, 'Democracy and Dictatorship' Polity Press: Cambridge, 1997, p.84.

2۔ جمہوریت اور ترقی کے درمیاں نسبتیں پیچیدہ ہیں اور علتی نہیں ہیں۔ دیکھئے:

Darren Acemoglu and Jim Robinson, 'Democracy and Autocracy.

3۔ چارلز کارلٹن کے مطابق 600000 آئر لینڈ میں بھی جو اس کی اس وقت آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ تھا۔

Charles Caslton, 'Geing to the Wars': The Experience of the British Civil Wars, 1638-1651. London: Routledge, 1992.

4۔ فرید ذکریا کی درج ذیل تصنیف میں جمہوریت اور آزادی کے درمیان نازک روابط کے بارے میں بہت دلچسپ تحقیق پیش کی گئی ہے:

Fareed Zakaria, 'The Future of Freedom' New York: W.W. Norton and Co., 2003.

5۔ موسوینی ایسی سیاست کو ترجیح دیتا ہے جس میں باقاعدہ جماعتوں کی بجائے افراد انتخابات میں حصہ لی۔ 2001ء کے انتخابات میں اس کے بڑے حریف کزا بیجی کے فورم فار ڈیموکریٹک چینج کی کامیابی نے اس کے شکوک کی تصدیق کر دی۔

6۔ Hans Rosenberg, 'Bureaucracy, Aristocracy and Autocracy: The Prussian experience 1660-1815', Boston: Beacon Press, 1958.

7۔ Austin Woolrych, 'Britain in Revolution', Oxford: Oxford University Press, 2002.

8۔ John Dunn, 'Setting the People Free: A History of Democracy', London: Atlantic Books, 2005, p-142

9۔ رکلن نے اقتدار کے غلط استعمال کے سد باب کیلئے چھ بڑی ایجادات کا ذکر کیا ہے۔ اس فہرست میں چند ایک کا اضافہ میں نے بھی کیا ہے۔

A. Riklin, 'Politische Ethik', in H. Kramer, ed., 'Politische Theorie Und Ideengesclichte in Gesprachi. Vienna, 1995.

10۔ بالغ مرد موری کو بلا امتیاز حق رائے دہی، 1967ء میں غیر موری سے پہلے ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک ابھی ووٹنگ کیلئے جائیداد کا ہونا ضروری تھا اور موری نسل کے افراد صاحب جائیداد تھے، لہٰذا ان سب کو حق رائے دہی لینا پڑا۔ موری

allurdupdfnovels.blogspot.com

ووٹروں کے غلبے سے بچنے کے لئے حکومت نے موریوں کو چار نشستوں تک محدود کر دیا (1990ء کے عشرے کی انتخابی اصلاحات تک یہ تعداد یہی رہی)۔ یہ مغلوب گروہ کے دوسروں سے قبل حقوق حاصل کرنے کی ایک نادر مثال ہے۔

11۔ Michael Wehlgemuth, Democracy as an Evolutionary Method', in P.Pelican and G. Wegner, eds., 'The Evolutionary Analysis of Economic Policy.' Northampton. Edward Elgar, 2003.

12۔ Hoyt Cleveland Tillman, Ch'en Liang on 'Public Interest and the Law' University of Hawaii Press, 1994, P.16.

13۔ Henry de Bracton, 'On the Laws and Customs of England', C.1258 Cambridge, Mass. Belknap Press, 1968.

14۔ ہینز کریکلر جس نے جنگ عظیم کے بعد1946ء میں جرمنی کا آئین وضع کرنے میں مدد دی تھی، نے عوامی حاکمیت کے خلاف بحث کا آغاز کیا۔ دیکھئے:

John Lukacs, 'Democracy and Populism'. New Haven, Conn. Yale University Press, 2005.

15۔ اگر اسے اس کے صحیح مفہوم میں دیکھا جائے تو مساوات کے تصورات جدید دور کی ایجاد محسوس ہیں لیکن ان کا تعلق بہت قدیم زمانے سے ہے۔ یونانی میں 'آئسوٹومیا' کا مطلب ہے 'قانونی مساوات' اور یوریپڈیز لکھتا ہے کہ 'جب قوانین لکھے جاتے ہیں تو کمزوروں اور تونگروں کے حقوق برابر ہوتے ہیں'۔ بہت سے دیگر معاشروں میں بھی حقوق سے ملتی جلتی چیزیں موجود رہی ہیں (مالینوسکی میلانیزی لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ 'ہر ایک کے حقوق میں کڑا امتیاز اور یقین ہے')۔

Alan Gewirth, 'Reason and Morality', Chicago: University of Chicago Press, 1978, p. 101.

16۔ James Madison, 'The Federalist Papers: Writing of the science of politics', Harmonds worth: Penguin, 1987).

17۔ درج ذیل کتاب میں شہنشاہ ہیل سلاسی کے دربار کی بوالعجبیوں کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

Ryszard Kapuscinski, 'The Emperor' London, Quartet. 1983.

18۔ Wallace E. Oates, 'Fiscal Federalism'. New York, Harcourt Brace Jovanovich, 1972.

19۔ پرانے نظام میں ریاستی اداروں کو اپنے تمام فاضل ذخائر مرکز کے سپرد کرنا پڑتے

allurdupdfnovels.blogspot.com

تھے جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ انتشار و بدنظمی کا طوفان امڈ آتا تھا اور محصولات بغیر کسی ظاہری منطق کے پھر نیچے لڑھکنے لگتے تھے جبکہ مقامی کنٹرول بہت زیادہ مستحکم ثابت ہوا ہے (اگرچہ غریب دیہی علاقوں سے امیر شہری علاقوں کی طرف بہت بڑی تقسیم نو کے عرصے کے دوران)۔

20۔ Quoted in Pranab Bardhan, 'Decentralization of Governance and Development, 'Journal of Economic Perspectives, Fall, 2002.

21۔ تقسیم اختیارات کا نظریاتی جواز یہ ہے کہ اختیارات ایک ایسی سطح پر ہونے چاہئیں جہاں مقتدر حلقوں سے باہر کے افراد کو بھی شامل کیا جا سکے۔ (اسے encompassing principle کہا جاتا ہے)۔ ریاست کا ایک اہم ترین منصب چیزوں کو چاروں طرف سے دیکھنا ہوتا ہے لیکن اگر اختیار کو بہت زیادہ چھوٹی جیبوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ ٹھیک نہیں نکلتا۔ چنانچہ اس نظریے کے مطابق مقامی حکومت کو اس سرگرمیوں اور اخراجات کا ذمہ دار ہونا چاہیے جو دوسروں پر کوئی خارجیت مسلط نہیں کرتی ...... فضلہ، پانی، تعلیم، آگ ...... جبکہ تحقیق، انفراسٹرکچر، آلودگی یا وباؤں کی ذمہ داری اعلیٰ، غالباً قومی سطح پر ہونی چاہیے۔ اس خط فاروق کا ٹھیک ٹھیک تعین بہت مشکل ہے: بعض قسم کی ہیلتھ کیئر میں کوئی خارجیتیں نہیں ہوتیں جبکہ چھوٹی بیماریوں کی روک تھام کے بعض پہلو تمام حدود پھلانگ جاتے ہیں۔ اسی طرح منظّم جرائم بیک وقت ایک بڑے شہر میں مقامی میں بھی ہوسکتا ہے اور عالمی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ بات مسئلے کو اور بھی پیچیدہ کر دیتی ہے کہ اکثر معیشتوں میں عزائم تو بہت ظاہر کیے جاتے ہیں لیکن عملی اعتبار سے کچھ دیکھنے کو نہیں آتا (مثال کے طور پر مدارس کیلئے نصابی مواد یا ڈاکٹروں کی تربیت)۔ مزید برآں حتیٰ کہ جب ایک مقامی اتھارٹی صرف ایسے منصوبوں پر کام کر رہی ہوتی ہے جن میں کوئی خارجیتیں ملوث نہیں ہوتیں، اس کے قرضہ جات مرکز پر بار بن سکتے ہیں۔

22۔ چارلز بوائکس ثابت کرتا ہے کہ وفاقیت جمہوری بقاء کے امکانات میں اضافہ کر دیتی ہے۔

Charles Boix, 'Democracy and Redistribution' Cambridge: Cambridge

allurdupdfnovels.blogspot.com

University Press, 2003.

23۔ Hennah Arendt, 'The Human Condition', Chicago: University of Chicago Press, 1998, p.201.

24۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی ترتیب دی گئی کرپشن کی درجہ بندی شفافیت کی درجہ بندی سے مطابقت رکھتی ہے۔فن لینڈ اور سویڈن سب سے اوپر ہیں۔ سنگاپور بھی ان سے بہت قریب ہے۔ اس ملک کو یہ استثنا بھی حاصل ہے کہ اس میں بدعنوانی پر بھی کامیابی سے قابو پالیا گیا اور یہ اخفاء کا کلچر بھی برقرار رکھے ہوئے ہے۔

25۔ شفافیت کا ایک تناقض یہ بھی ہے کہ ان آلات کا کہ جو مرکز کو کمزور کرنے کیلئے وضع کیے جاتے ہیں، الٹا اثر بھی ہو سکتا ہے۔ نیا علم اکثر لوگوں کو مطالبات کرنے کی وجوہات مہیا کرتا ہے کیونکہ یہ ناہمواریوں اور بلا جواز امتیازات پر سے پردہ کشائی کرتا ہے۔ چنانچہ وفاقیتیں جن کا مقصد تقسیم اقتدار کی روک تھام کرنا تھا اس کی بجائے مرکز میں زیادہ اختیارات کے مطالبات کا باعث بن سکتی ہیں کیونکہ سب پسماندہ علاقے سڑکوں یا سکولوں، مالی انتقالات اور عالمگیر حقوق کے مطالبات بھی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

26۔ یہ اصول اب اس قدر رواج پا چکے ہیں کہ اب ان کا اطلاق معیشت کے بشمول دیگر شعبوں پر بھی کیا جانے لگا ہے جہاں خوش انتظامی کا دارومدار جبری مسابقت (سرکاری کمپنیوں کے ڈائریکٹروں کا انتخاب) قانون کی حکمرانی، چھوٹی اکائیوں میں تقسیم (جب کمپنیاں بہت بڑی ہو جاتی ہیں) اور شفاف طریق کار پر ہوتا ہے۔

27۔ Quoted in Giorgio Agamben, 'State of Exception'. Chicago: University of Chicago Press, 2005, p.69

28۔ عمانوئیل جوزف Sieyes کے مشہور مقالے Qu'est_ce que le tears etat میں اس بنیادی تضاد کو نہایت درستی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آئین خود کو آئین ساز طاقت تصور کرتا ہے۔

29۔ Samuel Fina, 'The History of Government from the Earliest Times'. Oxford: Oxford University Press, 1997.

30۔ سیاسی جماعتیں، اپنے تمامتر نقائص کے باوجود مختلف منصوبوں کے امتزاج اور حکمران اکثریتوں کے اجتماع کیلئے بہت محنت کرنے لگی ہیں اور وہ اخلاقی نظم و ضبط فراہم

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرنے لگی ہیں جو محض افراد پر مشتمل معاشروں میں نہیں ہوتا کیونکہ سیاستدان اس بات سے آگاہ ہوتے ہیں کہ ان کی جماعت کو بحیثیت مجموعی ہر طرح کے تجاوز اور بدعنوانی کیلئے جوابدہ ہونا ہوگا۔

31۔ اٹھارہویں صدی میں کنڈور سے نے وہ حالات دکھائے کہ جن میں ووٹر کی ترجیحات ایک مستحکم نتیجہ پیدا نہیں کرتیں۔ دو سو سال بعد کینتھ ایرو نے اپنی کتاب 'سماجی انتخاب اور انفرادی اقدار' میں اپنا مشہور 'کلیہ ناممکنیت' پیش کیا جس نے یہ ظاہر کیا کہ جب بھی دو سے زائد راستے ہوتے ہیں تو ووٹنگ کے طریق کار قابل اعتماد انداز سے درجہ بندی کا تعین نہیں کر سکتے۔

Kenneth Arrow, 'Social Choice and Individual Values', New York: John Wiley & Sons, 1963.

32۔ Jensen and Meckling, 'Democracy in Crisis', Sydney: The Centre for Independent Studies, 1983.

33۔ Alevis de Tocqeville, 'Democracy in America', Vol.I New York, Alfred A. Knopf, 1945, p.260.

34۔ خوف نے یہ نتائجیت پسندانہ نتائج اخذ کرنے میں مدد دی۔ جرمنی اور سپین جیسے بیسویں صدی کے اوائل میں جمہوری نظام اختیار کرنے والے ممالک کیلئے جنگ کیلئے ترتیب دی گئی ریاست کی اصلاح بہت پر خطر تھی۔ چنانچہ ہر نئی جمہوریت کو فوج، بینکاروں اور سفارت کاروں سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔

35۔ George Bernard Shaw, 'Transition, Fabian Essays in Socialism', London: Fabian Society, 1889.

36۔ کاروباری شعبے میں ایک مقبول مؤقف یہ ہے کہ ناظمین کا واحد فرض شیئر ہولڈر قدر کو زیادہ سے زیادہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کا سیاست میں متوازی اصول کہتا ہے کہ لیڈروں کا واحد اخلاقی فرض وہ کرنا ہوتا ہے جو رائے دہندگان چاہتے ہیں اور رائے عامہ کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔

37۔ میں اپنی درج ذیل تصنیف میں اس پر تفصیل سے بات کر چکا ہوں۔

G.J. Mulgan, 'Politics in an Antipolitical Age. Cambridge: Polity Press, 1994.

38۔ سر مائیکل مارٹن کی 'سٹیٹس منڈروم' کو ناہمواری اور بے کسی اور ناقص صحت کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

درمیان نسبت پر کی جانے والی تحقیقات کا ایک شاندار مرکب قرار دیا جا سکتا ہے۔

Michael Marmot, 'Status Syndrome', London: Bloomsburg, 2004.

عالمی ادارہ صحت کا صحت پر اثر انداز ہونے والے سماجی عوامل پر کمیشن بلا شبہ اس شعبے میں علم میں اضافہ کرے گا۔

39۔ کلاڈ سٹیل اور سٹیریو ٹائپ خطرے کے اصول دانوں کی کئی عشروں پر محیط تحقیق سے مثلاً یہ ثابت ہوا ہے کہ اگر ٹیسٹوں سے قبل سفید فام مردوں کو بتا دیا جائے کہ سفید فام مردوں کی کارکردگی ایشیائی مردوں سے کم ہوتی ہے تو ان کی کارکردگی میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ امریکی سفید فام اور سیاہ فام باشندوں کے درمیان آئی کیو کا فرق کم و بیش اتنا ہے جتنا کہ بھارت، جاپان اور اسرائیل میں اکثریتوں اور پسی ہوئی اقلیتوں کے درمیان ہے۔ اس کے خلاصے کیلئے 'سائنٹفک امریکین' فروری 2005ء، صفحہ 22 ملاحظہ فرمائیں۔

40۔ ونسٹلی آغاز میں ایک انارکسٹ یوٹو پین تھا اور اس کا خیال تھا کہ ریاست ختم ہو جائے گی لیکن بعد میں اس نے یہ مؤقف اختیار کر لیا کہ غیر عقلی جہالت کے جذبے کے خلاف قوانین ضروری ہو جاتے ہیں۔

41۔ Alan Macfarlane, 'The Origins of English Individualism', Oxford: Blackwell, 1978.

42۔ درج تصنیف میں جمہوریت کے پھیلاؤ میں منظّم محنت کش طبقے کے کردار کے بارے میں بہت مفصل انداز سے بات کی گئی ہے۔

Dietrich Rueschemeyer, Evelyne Huber Stephens and John D. Stephens, 'Capitalist Development and Democracy' Chicago: University of Chicago Press, 1992.

43۔ Daron Acemoglu and James Robinson, 'A Theory of Political Transitions', MIT, Department of Economics working paper No.99.26, SSRN, 1999.

44۔ Robert T. Deacon, 'Dictatorship, Democracy and the provision of Public Goods, Department of Economics, University of California Santa Barbara, Departmental Working Paper, 2003.

45۔ David Stasavagem 'Democracy and Education Spending in Africa', Discussion Paper DEDPS/37, London School of Economics, 2003.

allurdupdfnovels.blogspot.com

46۔ ملازمت میں حقوق کیلئے دباؤ عموماً مزدور تحریکوں نے ڈالا ہے۔ ان میں یورپی اتحاد کی محنت کشوں کے مشاورت کے حقوق کو رسمی شکل دینے کی کوششیں اور جرمنی کی سپروائزری بورڈوں میں مزدوروں کیلئے طویل نمائندگی شامل ہے۔

47۔ Robert Michels, 'Political Parties: A sociological study of the oligarchical tendencies of modern democracy'. New York: Free Press, 1949.

48۔ Charles Tilly, 'Social Movements 1768 to 2004 Boulder, Colo, Paradigm Publishers, 2004.

اس تصنیف میں انٹرنیٹ کی مدنی تنظیم کے آنے کے طور پر ترقی اور خامیوں پر سیر حاصل بحث شامل ہے۔

باب 10

1۔ بعض ماحول اس کرشماتی طاقت کو پروان چڑھانے کیلئے خاص طور پر موزوں محسوس ہوتے ہیں۔ کلفرڈ گیرٹز ایک ایسے مراکش کی روداد بیان کرتا ہے جس میں ہر طرف کرشماتی مہمات مسلسل جنم لیتی رہتی تھیں۔ اور طاقتور اشخاص کے کارناموں میں دیوتا کی طاقت کا ظہور ہوتا تھا۔ اسلامی دنیا کے دیگر حصے ابن خلدون کی تصویر میں اس قدر ٹھیک نہیں بیٹھتے۔

Clifford Geertz, 'Islam Observed: Religious development in Morocco', New tbien, conn., Yale University Press, 1968.

2۔ سوروکن کا نظریہ جو سیاست کی بجائے فنون سے اکتساب کرتا ہے، اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ کسی خاص لمحے پر آرٹ کی مختلف اصناف کا مخالف سمتوں میں حرکت کرنا ممکن ہوتا ہے۔

3۔ Charles de Montesquieu, 'De l'Esprit des lois VIII', Chapter I, 1748.

4۔ Christian Meies, 'Caesar', London: Harper Collins, 1995, p.133.

5۔ اس نظریے کے مطابق ہر تہذیب وحدت اور ماورائیت کی تلاش سے جنم لیتی ہے...... ابن خلدون کی تصنیف میں مذکور خانہ بدوشوں کا شعلہ بار جذبہ جو شمالی افریقہ کی تاریخ میں اکثر ایک خالص اور زیادہ روایتی اسلام سے برانگیختہ ہوا۔ بلوغت کے مرکز میں پہنچ کر ہر تہذیب مادی اشیاء یعنی اس دنیا کی اشیاء کی تلاش سے وابستہ ہو جاتی ہے: زمین، اشیاء اور طاقت۔ اس تہذیب میں بسنے والے افراد اپنی داخلی

allurdupdfnovels.blogspot.com

دنیا جس سے وہ اپنی توانائی اخذ کرتے ہیں اور ایک خارجی مادی دنیا میں تقسیم ہو جاتے ہیں جو اطاعت کے مطالبات میں اتنی ہی زیادہ شدید ہوتی ہے۔ جدید مغربی تہذیب ایک ایسے ہی مرکز میں ہے۔ یہ مذہبی دنیا یعنی اس دنیا سے دور ہٹ چکی ہے جس میں لوگ اپنے سے کسی بڑی چیز ...... ایک سخت لیکن معزز خدا ...... کی اطاعت وفرمانبرداری میں آزادمحسوس کرتے تھے۔ اس کی بجائے یہ تہذیب بگاڑ کا شکار ہو چکی ہے جس میں واحد پیمانہ انسان کا اپنا نفس اور اس نفس کیلئے مسرت کا حصول ہے۔

6۔ www.outlookindia.com, 16 January 2006.

باب 11

1۔ نائنا پونیکا کی معروف ترین کتاب 'بودھی مراقبے کا دل' ہے جس میں بدھ مذہب کو نہایت منطقی اور حقیقی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

Nyanaponika Thera, 'The Heart of Buddtist Meditation', Sri Lanka: Buddhist Publication Society, 1992.

2۔ فابٹ ایلیاس کی تصنیف میں اس تصور کے حق میں انتہائی قوی اور موثر دلائل پیش کئے گئے ہیں کہ تہذیب ایک ایسا عمل ہے جس سے لوگ اپنے جذبات اور غصے پر قابو پانا اور تشدد کے استعمال کے رجحان کو روکنا سیکھتے ہیں۔

3۔ Josephine Chiv-Duke, 'To Rebuild to Empire', Lu Cluh's Confusian Pragmatist Approach to the Mid-T'ang Predicament' SUNY Series in Chiese Philosopher and Culture. Albany, NY: State University of New York Press, 2000, p.78

4۔ مختلف قسم کے نفسیاتی ٹیسٹ اور رول پلے جو دوسرے شعبوں میں بڑی اسامیوں اور ذمہ دار عہدوں کیلئے افراد کے انتخاب کیلئے استعمال کیے جاتے ہیں، سیاست میں نظر نہیں آتے۔

5۔ Max Weber, 'Economy and Society', Vol.1, trans. Guenther Roth and Claus Wittich. Berkeley. University of California Press, 1968, p.31.

6۔ بعض دفعہ اخلاقی اغراضات کی بہت موثر انداز سے تادیب کی جاتی ہے جیسا کہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب بھارتی رائے دہندگان نے 19179ء میں اندرا گاندھی کو

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہنگامی حالت کے دوران زیادتیوں کے ارتکاب اور ہزاروں افراد کی جبری نس بدی کی وجہ سے انتخابات میں مسترد کر دیا تھا۔ اٹلی کے کرسچین ڈیموکریٹس کو بھی پے در پے سکینڈلوں کی وجہ سے الیکشن میں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ تاہم اندرا جلد ہی اقتدار میں واپس آ گئی۔

7۔ یہ تصورات کنفیوشس کی فرض کے بارے میں ہدایات سے شروع ہوتے ہیں جو حکمران اور وزیر، باپ اور بیٹے، بڑے اور چھوٹے بھائی، خاوند اور بیوی، دوست اور دوست کے تعلق پر اساس کرتا ہے لیکن اس سے آگے تک بھی جاتا ہے۔

8۔ Chiu, Duke, op. cit., p.92

9۔ Muhsin Mahdi, 'Alfarabi and the Foundation of Islamic Political Philosophy', Chicago: University of Chicago Press, 2001, pp.86-7.

اس تصنیف میں تجربے اور سائنس کے درمیان نسبت پر اس کے پیچیدہ نظریات کو بڑے مفصل انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

10۔ اس فرق کی ایک عمدہ مثال رابرٹ گرین لیف کے خادم قیادت کے بیان میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ گرین لیف زانی عورت کی کہانی میں عیسیٰؑ کو تمام لیڈروں کیلئے ایک مثال کے طور پر دیکھتا ہے۔ جب عیسیٰؑ نے غصے سے بپھرے ہجوم کو دیکھا تو انہوں نے کہا تھا: 'تم میں سے جس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا پہلے وہ پتھر چلائے'۔

Robert Greenleaf, 'Servant Leadership', New York: Paulist Press, 1977.

11۔ جیسا کہ اس وقت کے امریکی وزیر دفاع رابرٹ میکنا مارا نے ثابت کیا یہ اس مظہر کی ایک کلاسیکی مثال تھی کہ خود کو دشمن کی جگہ رکھ کر سوچنے کی صلاحیت کامیابی اور ہزیمت کے درمیان فرق کیسے پیدا کر سکتی ہے۔ اس کا حوالہ 'جنگ کی دھند' نامی فرم میں بھی دیا گیا ہے۔

12۔ Michael Walzer, 'Political Action: The Problem of Dirty Hands', 'Philosophy and Public Affairs', 2,2 (1973): 177

13۔ نجیب محفوظ کے ناول 'اخناتون' میں اس چیز کی خاص طور پر بہت عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے کہ ایک طاقتور فرعون کو اوپر سے انقلاب لانے کی کوشش کرتے اور پھر ناکامی کا شکار ہوتے دیکھنا کیسا محسوس ہوتا ہوگا۔

Nagouib Mahfouz, 'Akhnaton, 'Dweller in Truth', Cairo: Amir University

allurdupdfnovels.blogspot.com

Press, 2000.

14- Dennis Thompson, 'Restoring Responsibility', Cambridge: Cambridge University Press, 2005.

15- ڈیوڈ ہیوم نے مُصنوعی خصائل' کے بارے میں لکھا ہے جن کا تعین کسی پیشے یا ادارے کے افعال کیلئے ان کی موزونیت کے توسط سے ہوتا ہے حکومتی خصائل بہت حد تک اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

David Hume, 'A Treatise of Human Nature,' eds. David Fate Norton and Mary J. Norton. Oxford: Clarendon Press, 2000.

16- Francisco Varela, 'Ethical Know-how'. Stanford, Calif.: Stanford University Press, 1999.

17- Jonathan Glover, 'Humanity: A Moral History of the Twentieth Century', New Haven, Conn.: Yale Nota Bene, 2001.

18- Bhikhu Parekh, 'Rethinking Multiculturalism', Cambridge, Mass: Harvard University Press, 2002, p.205.

19- اس اخلاقی کثرت پسندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام فعال معاشرے اداروں پر انحصار کرنے لگتے ہیں جن میں بہت زیادہ مختلف اقدار اور اخلاقی وتیرے مروج ہوتے ہیں جبکہ کچھ زیادہ بنیادی اصول اور اقدار ان میں مشترک ہوتی ہیں۔ بیشتر فعال لبرل معاشروں میں بہت زیادہ غیر لبرل ادارے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان میں الہامی مذاہب، ایسے خاندان جن میں اکثریت کو کوئی حقوق حاصل نہیں ہوتے اور درجہ بندی کی حامل ایسی کارپوریشنیں ہوتی ہیں جن کا جمہوریت سے دور کا واسطہ نہیں ہوتا۔ بیشتر سخت مذہبی حکومتیں سائنسی عقلیت پر انحصار شروع کر دیتی ہیں جیسا کہ ایران کے جوہری قوت کے پروگرام کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

20- James MacGregor Burn, 'Leaership', London: Harpercollins, 1985.

21- یہ کہ بادشاہ کنوت کی حکایت کو عموماً غلطی سے شاہی غرور کی ایک مثال کے طور پر یاد کیا جاتا ہے صرف اس کہانی کے غیر معمولی کردار کو تقویت دیتا ہے۔

22- اگر وہ اپنی مہارت کو عطا جانیں تو شاید لیڈر اسے جلا دینے کیلئے سیکھنے، مشق کرنے اور تربیت حاصل کرنے پر زیادہ آمادہ ہوں۔ بہت زیادہ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک موسیقار یہ نہیں سوچتے کہ وہ پیدا ہی بہت ماہر ہوئے ہیں۔ تاہم بیشتر حکمران اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

حکام اپنے مناصب کیلئے پوری طرح تیار نہیں ہوتے۔ حکمرانوں میں بنیادی رسمی تربیت کی کمی ہوتی ہے جبکہ حکام ان ریاستوں کے پیچیدہ نظام کو چلانے کے لیے درکار بین الشعبہ علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں جو کہ ماضی کی نسبت بہت زیادہ بڑی ہو چکی ہیں۔

23۔ Lewis Hyde, 'The Gift', New York: Vintage, 1983.

باب 12

1۔ Bertrand de JouvenelOn Power', New York: Viking Press, 1949.

2۔ گیسٹا نوموسکا، جوزف شمپٹیئر اور رچرڈ پوزنر جیسے مختلف الخیال مفکرین نے اس قسم کے دلائل پیش کیے ہیں۔

3۔ Julia Darling, quoted in 'Guardian' newspaper, 11 September 2004.

4۔ Quoted in Quentim Skinner, 'Visions of Politis: Renaissance Virtues'. Cambridge: Cambridge University Press, 2002, p.16.

5۔ Thomas Aquinas, De Regno, in 'Aquinas: Selected Political Writings, Trans. J.G. Dawson, ed. A.P. d'Entreves Tetowa, NJ: Barnes & Noble, 1981. (originally published Oxford: Blackwell, 1948).

6۔ ہٹلر کی زندگی میں واضح تضاد دکھائی دیتا ہے جو اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ زوردار تقاریر اور اخلاقی کردار میں قطعاً کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ مارچ 1924ء میں اس کی ناکام بغاوت کے بعد میونخ میں اس کے مقدمے کے دوران اس کی پہلی تقریر کے بعد ایک جج نے کہا تھا کہ 'ہٹلر کیا زبردست شخصیت ہے'۔

7۔ کامیو کی تخلیق 'باغی' میں باغیوں کی عجیب وغریب نفسیات کو موضوع بنایا گیا ہے جن کا میلان موت اور خودکشی کی طرف ہوتا ہے۔

Albert Camus, 'The Rebel', Paris: Gallimerd, 1951, and Paul Berman, 'Terrorosm and Libralism', W.W. Norton & Company, 2004.

8۔ چارلز ٹلی کی درج ذیل تصنیف میں انہیں ان چار بڑے پیغامات کے طور پر بیان کیا گیا ہے جو سماجی تحریکیں لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں:

Charles Tilly, 'Social Movements 1768 to 2004'. Boulder, Colo.: Paradigm Publishes, 2004.

9۔ مشہور ہے کہ جین فلسفیوں نے سکندر اعظم سے کہا تھا: 'تم بھی ہم سب کی طرح ایک

allurdupdfnovels.blogspot.com

انسان ہو اور تمہیں بھی چند روزہ زندگی کے بعد مر جانا ہے اور تمہارے پاس بھی صرف اتنی ہی زمین باقی رہ جائے گی کہ جس میں تمہیں دفنایا جائے گا۔

10۔ Amartya Sen, 'Democracy and its Global Roots', 'New Republic', October 2003, p.28

11۔ انہیں کسی بھی اعتبار سے جمہوری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم لوگوں کے طرز عمل سے متعلق ہونے کی وجہ سے انہیں ہمارے مقاصد کیلئے دلچسپ کہا جا سکتا ہے۔

12۔ نظریہ عوامی انتخاب کے بڑے حامی جیمز بکانن نے جمہوریت کی تعریف حکومت بذریعہ بحث کے طور پر کی ہے اور اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ انفرادی اقدار فیصلہ سازی کے عمل میں بدلاؤ پیدا کر سکتی ہیں اور کرتی بھی ہیں۔

13۔ John gaventa, 'Strengthening Participatory Approaches to Local Governance: Learning the lessons from abroad', 'National Civic Review', Winter 2004, p.16

14۔ درج ذیل کتاب میں 1840ء اور 1960ء کے عشروں کے کمیونوں کے درمیان بہت زیادہ موازنہ کیا گیا ہے:

Rosabeth Moss Kanter, 'Commitment and Community: Communes and utopia in sociological perspectives', Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 1972.

15۔ Dennis Thompson, 'Restoring Responsibility' Cambridge: Cambridge University Press, 2005, p.211

16۔ James Harrington, 'The Commonwealth of Oceana', 1656

17۔ Skinner, op. cit.

18۔ David Halpern, 'Social Capital'. Oxford: Polity, 2005.

19۔ Pierre Bordieu and Terry Eagleton, 'Doxa and Common Life', New Left Review, 19, J(1992) 111-21

20۔ Richard Wilkinson, 'Comentary: Liberty, fraternity, equality', Int. J. Epidemiology, 3.1 (2002) 538-43.

21۔ مثلاً فرانسیسی انقلاب نے 'پرانے نام کی جاگیردارانہ ناہمواریوں کو ختم کر کے اور اس کے منطقی ڈھانچے کو ننگا کر کے اس نظام کی انتظامی ترکیب کو مستحکم کیا تھا جو حکم اور فرائض اور ذمہ داریوں کی تفویض کی ایک عقلی درجہ بندی تھی۔ نپولین کے تحت

allurdupdfnovels.blogspot.com

ریاستی انتظامیہ کو 'پے درپے انقلاب کے ذریعے تسلسل کو چھوڑے بغیر فرانس کی حکومت چلانا سیکھنا پڑا'۔

Judith A. Merkle, 'Management and Ideology: The Legacy of the International Scientific Management Movement', Berkely: University of California Press, 1980.

22۔ دی جووِنل اس بحث کو ایک قدم اور آگے لے گیا۔ ریاستی طاقت کی بڑھوتری کی بات کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ حکومتیں افراد کو بھاری سماجی ذمہ داریوں (مثلاً بچوں کی تعلیم اور بوڑھوں کی دیکھ بھال) سے خلاصی پیشکش کر کے نشوونما پاتی ہیں۔ دوسرے شعبوں میں وہ لوگوں کی ان جگہوں پر طرفداری کرتی ہیں جہاں کہ وہ کمزور ہوتے ہیں (مثلاً وہ آجروں اور اجیروں کے درمیان معاملات میں اجیروں کی حمایت کرتی ہیں)۔ اس کے نتیجے میں لوگ ریاست کے زیادہ وفادار ہو جاتے ہیں اور اس کے بدلے میں وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ با اختیار محسوس کرنے لگتے ہیں اور انہیں روایتی ذمہ داریوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ ڈی جووِنل کے مطابق یہ عمل بالآخر ایسے افراد پیدا کرنے لگتا ہے جو تمام سماجی بندھنوں سے آزاد ہوتے ہیں یعنی ایسے الگ تھلگ افراد جن کا دوسروں سے تعلق صرف ریاست کی وساطت ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ منڈی کے بارے میں بھی اسی طرح کی بات کی جا سکتی ہے (ڈی جووِنل کے نظریے کے بہت سے نقائص میں سے ایک نقص یہ ہے کہ وہ سی دوسری قسموں کی طاقت اور تسلط کو نظر انداز کر دیتا ہے)۔ خادم ریاست اپنے عوام اور اپنی سرگرمیوں کی بدولت اخلاقی طور پر زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے، جو اصولی طور پر آقا ہوتے ہیں وہ کمزور ہو جاتے ہیں De Jouvenel, op. cit

23۔ رچرڈ پوسنز نے بھی اپنی درج ذیل تصنیف میں یہی دلیل پیش کی ہے:

'Law, Pragmatism and Democracy'. Cambrdige, Mass: Harvard University Press, 2003.

24۔ See Geoff Mulgan and Tom Steinberg, 'Wide Open: Open source methods and their future potential', London: Demos, 2003.

25۔ David Hallpern, Clive Bates, Geoff Mulgan and Stephan Aldridge with Greg Beales and Adam Heathfield, 'Personal Responsibility and Changing Behaviour', Prime Minister's Strategy Unit, Cabinet Office,

allurdupdfnovels.blogspot.com

2004.

26- James Hillman, 'Kinds of Power', New York: Doulleday, 1995, pp.66 ff.

27- John Stuart Mill, Considerations on Representative Government, 1861, p.390.

28- Herbert Spencer, 'Essays', Vol.III. London: Williams & Norgate, 1863, pp.72-3

باب 13

1 - Aaron Wildvsky, 'Speaking Truth to Power: Art and Craft of Policy Analysis', New Brunsaick, NJ: Transaction Books, 1987.

2- مارکس کی ان وجوہ کی بنا پر شواہد سے بے چینی کہ ظاہر کا باقاعدہ طور مسخ کیے جانے کا امکان ہوتا ہے حقائق و تجزیئے کی مشتاق ثقافت سے مطابق نہیں رکھتی۔ بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لینن کے اس رسوائے زمانہ حکم سے بھی بالکل غیر مربوط نہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ 'مزید پروفیسروں کو گولی سے اڑا دو'۔

3- مثلاً حریف تجارتی منڈیاں بھی اتنی ہی غیر فطری ہوسکتی ہیں جتنی کہ کسی تالاب یا جنگل میں مخلوقات کے درمیان حریفانہ کشاکش۔ تاہم وہ بڑی حد تک انسانی تخلیقات ہوتی ہیں جو روایات، قوانین اور ضوابط سے چلتی ہیں۔ وہ ہر مزدور یا تاجر کو فرش صاف کرنے پر صرف ہوئے چالیس گھنٹوں یا ایک کلو کافی کی مناسب قیمت دیتی ظاہر ہوسکتی ہیں۔ تاہم یہ قیمتیں طاقت و استحصال کی گہری نسبتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

4- Simon Schama, 'Citizens'. New York: Viking, 1989.

5- Derek Bok, 'The Trouble with Government', Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 1996.

6 - Mori. com.

7- مثلاً کیلی فورنیا میں تجویز 184 میں وہ اصول بھی شامل کیا گیا تھا جو تیسری مرتبہ جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو طویل دورانیوں تک قید میں رکھنے کا اختیار دیتا ہے۔ یہ پاپولسٹ سیاست اور غیر ذمہ دار ذرائع ابلاغ کی ایک دوسرے میں اضافہ کرنے والی کجیوں کی کلاسیکی مثال تھی۔ اس تصور نے ان سیاستدانوں کی مدد کی جنھوں نے اسے فروغ دیا۔ تاہم جب یہ ضابطہ عمل میں آیا تو شروع میں ایک

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایسے شخص کو 25 برس کی قید بھی سنائی گئی کہ جس کا تیسرا جرم یک پزا چرانا تھا۔ اسی طرح تیسری بار جرم کرنے والے ایک ایسے شخص کو بھی اسی طرح کی سزا دی گئی جس نے سگریٹوں کا پیکٹ چرایا تھا۔ اس ضابطے کے حق میں رائے دینے والے کم لوگ ہی ہوں گے کہ جنہیں یہ علم تھا کہ س کے یہ نتائج نکلیں گے۔

8۔ ذرائع ابلاغ کی طرح آرٹ کی دیگر اصناف بھی اہم ہیں۔ ادب اور فلم میں سیاست اور حکومت کی حقیقت پسندانہ عکاسی کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس سے زیادہ عام وہ کارٹون ہیں جن میں مکروفریب کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ امریکی ثقافت میں صدر کو عموماً یا تو سیدھے سادھے ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے یا پھر ایک ولن کے طور پر۔ برطانوی ثقافت میں ایک طرف تو 'یس منسٹر' جیسے پروگرام ہیں جن میں حکام کو سازشیوں اور سیاستدانوں کو متکبر اور بے وقوف کرداروں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور دوسری طرف 'ہاس آف کارڈز' جیسے پروگرام جن میں سیاستدان اپنا کیریئر آگے بڑھانے کیلئے بلا تردد لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگتے نظر آتے ہیں۔ دانا لوگ بعض اوقات اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ سیاست دراصل اسی چیز کا نام ہے۔

9۔ امریکہ میں 'فیکٹ چیک' جو صدارتی انتخابات کے دوران کئے گئے دعوؤں کو آما پختا ہے اس کی اچھی مثال ہے کہ یہ کیسے کیا جا سکتا ہے...... کسی یونیورسٹی میں قائم، جسے فاؤنڈیشنیں مالی اعانت دیں اور جو سچائی کے علاوہ کسی پر اعتبار نہ کرے۔

10۔ Kaozhengxue'

11۔ ٹیکسوں کے بارے میں مختلف پالیسی پر عمل کرنا بہتر رہتا۔ تاہم اس وقت کسانوں کے فسادات کیلئے کام کرنے والا طاقتور گروہ اس کے خلاف تھا۔

12۔ J. Best, ed., 'Images of issues: Typifying Contemporacy Social Problems', New York: Aldine de Gruytor, 1989; H. Blummer, 'Social Problems as Collective Behaviour', Social Problems, 18(1971); 298-306; J.I. Kitsuso and J.W. Schreider, 'Preface' in J.Best, ed., 'Images of Issues: Typifying Contemporary Social Problems.' New York: Aldine de Gruyter, 1989. pp.xi-xiv; D.R. Loseke 'Thinking about Social Problems'. New York: Aldine de Gruyter. 1997; M. spector and J.I. Kitsuse, 'Constructing Social Problems' New York: Aldine de Gruijter, 1977.

allurdupdfnovels.blogspot.com

13۔ جوناتھن گلوور نے اپنی ایک حالیہ تصنیف میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والی بمباری اور عقوبتی کیمپوں کے بارے میں تفصیل سے بات کی ہے:

Jonathan Glover, 'Humanity: A Moral History of the Twentieth Century', New Haven, Conn.: Yale Nota Bene, 2001.

14۔ Samuel Paul, 'Holding the State to Account: Citizen monitoring in action', Bangalore: Books of Change, 2002.

15۔ وسائل سے مالا مال ریاستوں کے اپنے شہریوں کے مفادات کو داؤ پر لگا کر اپنی جیبیں بھرنے کے رجحان میں کمی کیلئے EITI کی مساعیوں سے ریاستوں، کمپنیوں اور غیر سرکاری تنظیموں کے درمیان وجود میں آنے والی شراکت کو توثیق کے ایک نئے طریقے کی نقیب قرار دیا جاسکتا ہے۔

16۔ گلاگوں نے زار روایت کو جاری رکھا لیکن ان کی تنظیم کا پیمانہ اور ماڈل مختلف طرز کے تھے۔

17۔ بیسویں صدی کی بیشتر ایجادات یونیورسٹیوں میں ہونے والے کام کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔ دیکھئے:

John Kay, 'The Truth about Market', London: Allan Lane, 2005, pp.260 ff

18۔ Geoff Mulgan and David Alburg, 'Public Sector Innovation', Cabinet Office, 2003.

یہ تحریر برطانوی حکومت میں متعارف کرائی جانے والی مختلف اختراعات کو بیان کرنے اور کافی دیر سے چلے آتے خلا کو پر کرنے کیلئے قلمبند کی گئی تھی۔ ہمیں ایسی کوئی تحریر نہیں مل سکی تھی کہ جس میں سرکاری اداروں میں اختراع کے متعلق نظریاتی فریم ورک اور عملی مثالیں موجود ہوں۔

باب 14

1۔ Heny Kissinger, 'Diplomacy', New York: Simon & Schuster, 1994.

2۔ Hans Morgenthan, 'Politics Among Nations', 5th edn. New York: Alfred A. Knopf, 1978, p.42.

3۔ برطانیہ میں قائم عراق باڈی کاؤنٹ اور آکسفورڈ ریسرچ گروپ کے مطابق

4۔ Rupert Smith, 'The Utility of Force', London: Allan Lane, 2005.

allurdupdfnovels.blogspot.com

5۔ 'The Human Security Report', Human Security Centre, University of British Columbia, 2005.

6۔ جیسے کہ رچرڈ روٹری نے ایک جگہ لکھا ہے: 'ملکوں کیلئے قومی غرور کو وہی حیثیت حاصل ہے جو عزت نفس کی افراد کیلئے ہوتی ہے: یہ بہتری کی جانب بڑھنے کیلئے ایک لازمی شرط ہے۔ حد سے زیادہ قومی غرور لڑاکا پن اور استعمار پیدا کرتا ہے جیسے کہ حد سے زیادہ عزت نفس تکبر پیدا کرسکتی ہے۔

Richard Rotry, 'Achieving Our Country: Leftist thought in twentieth century America'. Cambridge, Mass. Harvard University Press, 1998.

7۔ ایلن گیورتھ نے اس بحث کو بہت آگے بڑھایا ہے اور یہ تجویز پیش کی ہے کہ کسی بھی طرح سے کیا ہوا کوئی کام ہی اخلاقیات کی عالمگیر نوعیت کے متعلق مفروضات کو جنم دیتا ہے۔

Alan Gewisth, 'Reason and Morality', Chicago: University of Chicago Press, 1977.

8۔ Stanley Hoffman, 'Duties Beyond Borders: On the Limits and Possibilities of Ethical International Politics', Syracuse, NY: Syracuse University Press, 1981.

9۔ Michael Walzer, 'Just and Unjust Wars', New York: Basic Books, 1977.

10۔ Montesquieu, 'Persian Letters', Harmondsworth: Penguin, 1998, p.235.

11۔ Francisco de Vitoria, in Anthony Pagden and Jeremy Lawrance eds., 'Vitoria: Political Writings', Cambridge: Cambridge University Press, 1991, pp. 315-16

12۔ Geir Lundestad, 'Empire by Integration: The United States and European Integration, 1945-1997', Oslo: University of Oslo, 1997.

13۔ میں عالمی ریاست کی بجائے عالمی حکومت کی بات کرتا ہوں کیونکہ عالمی ریاست قابل اعتبار طور پر اجارے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

14۔ Philip Bobbitt, 'The Shield of Achilles'. New York: Alfred A. Knopf, 2002, p.228

15۔ واشنگٹن قسطنطنیہ سے لے کر ماسکو تک مختلف دیگر ایسے شہر رد کرکے دو کو روم کے جانشین کے طور پر پیش کرتا ہے جو ماضی میں اس منصب کا دعویٰ کرتے رہے۔ واشنگٹن اور قدیم روم میں سینٹ، سیسیرو کی مدح اور شدید مسیحیت اور اسی لذتیت

allurdupdfnovels.blogspot.com

پرستی کا امتزاج مشترک ہے جو کہ آخری برسوں میں روم کا خاصہ تھی۔ دونوں سلطنتوں کی بنیاد اخلاقیات اور طاقت کے ممیّز تصورات پر رکھی گئی۔ چینی ماڈل ابتدائی مرکز میں بھی تقریباً آمرانہ تھا (ہان سلطنت جس نے کہ اپنے سے قبل کی حریف ریاستوں کی جگہ لی، میں فی کس آبادی کے اعتبار سے روم کے مقابلے میں بیس گنا زیادہ سرکاری ملازم تھے، جبکہ روم میں جدید دور کی مستقل افسر شاہی موجود نہیں تھی)۔ چین رسوم اور رویے کی بنیادوں پر استوار ہوا اور اس کی نسبت فرائض، ذمہ داریوں اور رویوں سے عمل میں آئی جس کی چوٹی پر شہنشاہ کی ذات ہوتی تھی۔ روم کا تشکیلی تجربہ بہت مختلف تھا۔ امریکہ کی طرح روم نے بھی شاہی طاقت کی مزاحمت سے جنم لیا تھا۔

16۔ اس کے سٹریٹیجک اہداف کمپریہینسو نیشنل پاور (سی این پی) کے تصور میں آ جاتے ہیں جسے چینی مفکروں نے پروان چڑھایا تھا۔ یہ ایک واحد عدد ہے جس میں فوجی، اقتصادی اور ثقافتی قوت کے مختلف اشاریے یکجا ہو جاتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ اضافہ قوی ترجیح ہوتا ہے۔

17۔ عالمی اقدار کے سروے اور رونالڈ گلہارٹ کی ریسرچ کے مطابق اقدار میں تنوع کم ہونے کی بجائے زیادہ ہو رہا ہے اگرچہ معاشی خوشحالی اور امن سے منسلک بعض مشترک جہتیں بھی مشاہدے میں آ رہی ہیں۔

18- Michael Walzer, 'Thick and Thin', Notre Dame, Ind: University of Notre Dame Press, 1994.

19- Hanskelsen, 'Peace through Law', Chapel Hill: University of North Carolina Press, 1944. (reprinted 2001 by the Lawbook Exchange); Hans Kelsen, 'The Law of the United Nations: A Critical Analysis of its Fundamental Problems'. New York: Frederick A. Praeger, 1964 (reprinted 2000 by the Lawbook Exchange); Hans Kelsen 'General Theory of Law and State, trans. Anders Wedberg. Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 1949.

20- Martin Loughtin, The Idea of Public Law', Oxford: Oxford University Press, 2003, p.90

21- 'The Responsibility to Protect', Report of the International Commission on Intervention and State Sovereignty, International Development

allurdupdfnovels.blogspot.com

Research Centre, 2001.

22۔ اگر کسی مرکز پر متمول شمال کے شہریوں کی قیادت میں کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں ہوتا تو یہ حیرانی کی بات ہوگی۔

23۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق پینے کے پانی تک آسان رسائی کا مطلب 1.6 کلومیٹر ہے۔

24۔ Gallup International Survey, 2005.

25۔ Committee of Independent Exp, 'First Report on Allegations Regarding Fraud, Mismanagement and Neputism in the European Commission, 15 March 1999.

26۔ ان بیانات کا تعلق ڈپلومیٹ کے اقوام متحدہ کے عملے پر کئے گئے سروے سے ہے، جو 2004ء کے موسم گرما میں کیا گیا تھا۔

'United Nations Organization Integrity Survey', Prepared by Deloitte Consulting LLP, 2004 (www.un.org/news/essg/sginteygritysurvey).

'How The World Sees Europe: Who will lead the World?' A 22-nation public opinions poll by Globescan, April 2005.

باب 15

1۔ Avner Offer, 'Why Has the Public Sector Grown so Large in Market Societies?' Oxford: Oxford University Press, 2003.

2۔ یہزکل ڈرور نے اپنی دیگر تحریروں کی طرح اپنی اس کتاب میں بھی سٹریٹیجک حکومت کی بہت حمایت کی ہے:

Yehozkel Dror, 'The Capacity to Govern : A Report to the Club of Rome', Frank Cass, London, 2001.

میری کتاب 'دی آرٹ آف سٹریٹیجی' میں جو 2007ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوگی اس مسئلے پر زیادہ تفصیل سے بات کی گئی ہے کہ حکومتوں کو سٹریٹجک انداز سے سوچنے اور عمل کرنے کی اپنی صلاحیت کو بہتر بنانے کیلئے کیوں اور کیسے کوشش کرنی چاہیے۔

3۔ یہ الفاظ ملٹن اور روز فریڈمین نے اپنی کتاب کے عنوان کیلئے استعمال کیے تھے۔

Milton and Rose Friedman, 'The Tyranny of the Status Quo, New York: Harcourts 1984.

allurdupdfnovels.blogspot.com

4۔ Bertrand de Jouvenel, 'The Pure Theory of Politics', New Haven, Comm.: Yale University Press, 1963, p.211.

باب 16

1۔ ہیگل کا یہ اعتقاد کہ ریاست اپنے ارتقاء کے آخری مرکز تک پہنچ چکی ہے ایسے بہت سے مصنفین کو متنبہ کرتا ہے کہ جو یہ سوچ بیٹھے ہیں کہ تاریخ اور ارتقاء کا خاتمہ ان کے خاتمے کے ساتھ ہی ہونے والا ہے۔

2۔ اب اس بارے میں پہلے کی نسبت بہت زیادہ شواہد دستیاب ہیں کہ مختلف قومیں اور حکومتیں کس طرح کام کرتی ہیں۔ ایسی اندھا دھند تعلیمات جو علتی عوامل کے کسی گروہ سے معاشرتی معلومات کا کوئی مجموعہ منسوب کر دیتی ہیں خطرناک ہوتی ہیں۔ پہیے کا ایک اور چکر ایک عشرے کے فاتحین کو اگلے عشرے کے مفتوحین میں تبدیل کر سکتا ہے۔ تاہم کارکردگی اور سسٹم ڈیزائن کے نقوش کے درمیان بعض وسیع مطابقتیں موجود ہیں۔ وہ اقوام جو معاشی، معاشرتی اور ماحولیاتی اعتبار سے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں وہ نسبتاً چھوٹی اقوام ہیں اور وہ معیشت اور سیاست کے بہت شفاف نظاموں کی حامل ہیں یعنی ایسے نظاموں کی کہ جو کارکردگی اور اختراع کی قدر افزائی کرتے ہیں اور ان میں جمہوری روایات بہت مضبوط ہیں۔